جلد (۳۵) — نمبر (۲)

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہِ فروری سنہ ۱۹۳۹ء

تصویر:۔ جدید ترکی کے ایک نسوانی مدرسے میں سائنس کی تعلیم

چندہ سالانہ ۵؎، ششماہی ۳؎ مع محصول — قیمت فی پرچہ

بزمِ ہمایوں

اگرچہ کانگرس نے جب سے وہ بڑی بن گئی ہے" بڑے دنوں" کی سرپرستی چھوڑ دی ہے پھر بھی بڑے دنوں کی چہل پہل قائم ہے۔ سب بڑی بات تو یہ ہے کہ اتنے دِنوں کی چھٹیاں ہوتی ہیں اور ریل کے کرائے میں تخفیف ہو جاتی ہے جس پر غریب الوطن تو گھروں کا رخ کرتے ہیں اور گھر میں بیٹھے ہوئے لوگ مُنہ اُٹھا کر جدھر جی میں آئے چل دیتے ہیں تاکہ اس ارزانی سے فائدہ اُٹھا کر اپنی جیب خالی کریں۔

کانگرس نہیں لیکن اَور بیسیوں انجمنیں کانفرنسیں سبھائیں اپنے سالانہ جلسے بڑے دنوں میں منعقد کرتی ہیں۔ میں نے بھی اس دفعہ اس سیر تماشے سے لُطف اُٹھایا۔

پہلے لاہور میں انجمن حمایت اسلام کی پنجاہ سالہ جوبلی کا جلسہ ۲۳ دسمبر ۱۹۳۸ء کو شروع ہُوا اور چار روز تک بڑی شان و شوکت سے جاری رہا۔ حسب معمول تقریریں کی گئیں اور نظمیں پڑھی گئیں لیکن ان کے علاوہ سکاؤٹ مظاہرہ مشاعرہ مناظرہ وغیرہ بھی منعقد ہوئے۔ ۲۶ دسمبر کو پٹنہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا چھبیسواں اجلاس ہُوا۔ اُن چالیس پچاس ہزار اشخاص کے اجتماع کا نظارہ جو وہاں جمع ہوئے میں نے بھی اپنی آنکھوں دیکھا۔

موجودہ ہندوستان میں بڑے بڑے مجمعوں کا آغاز بلاشبہ کانگرس کی طرف سے ہُوا۔ اِس کے بعد کچھ اُس سے متاثر ہو کر اور زیادہ تر ملکی و غیر ملکی نئے حالات کے اثر سے ایک عام بیداری ہندوستان کی قوموں میں پیدا ہو گئی۔

پٹنہ میں مسلمانوں کی بیداری کا یہ منظر حیرت افزا تھا۔ صرف یہی نہیں کہ ایک بڑا مجمع تھا۔ بڑے مجمعے تو میلوں ٹھیلوں میں اور میچوں گھڑ دوڑوں میں بھی دیکھنے میں آتے ہیں لیکن جو چیز غیر متوقع تھی وہ لیگ کے اجلاس میں باوجود اِس جمِ غفیر کے خاموشی باقاعدگی اور بالخصوص لوگوں کا ہمہ تن متوجّہ ہونا تھا ورنہ مسلمانوں کے جلسے اکثر صرف جوش کا مظاہرہ ہُوا کرتے تھے۔ حاضرین اِس طرح گویا دم بخود تھے اِس طرح سٹیج کی طرف دیکھنے اور تقریروں کو سنتے تھے اُن کی نگاہوں میں ایک ایسا تجسس تھا وُہ یوں ہمہ تن گوش تھے جیسے اُن کے دل اور اُن کی نظریں ایک خاص مرکز کی طرف کھچی چلی جاتی ہیں۔ عوام کی یہ حالت ایسی تھی کہ خواص بھی اس سے متاثر تھے اور اِس تاثر میں غالباً اُن میں سے کئی محسوس کرتے تھے کہ اب ہم پر ایک عام ذمہ داری کی جگہ عوام کے متعلق ایک خاص ذمہ داری عاید ہو گئی ہے۔ ایسے وقتوں میں" ایک قوم" کی سیرت کا اندازہ ہو سکتا ہے اُس کی قومیت آزمائش کی آگ میں ڈالی جاتی ہے اور زمانہ دیکھتا ہے کہ وہ جل کے راکھ ہو گئی ہے یا کندن بن کے چمکنے لگی ہے؟

مسلمانوں کی تنظیم ہندوستان کے لئے ایک مبارک فال ہے۔ مدت ہوئی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد ہندو بھائی ترقی کے میدان میں اُتر گئے۔ اُنیسویں صدی کے اخیر میں کانگرس نے اُن کو جمع کیا، جنگِ عظیم کے بعد گاندھی جی نے اُن میں ایک نئی رُوح پھونکی، وُہ صدیوں کے بعد جاگے اُٹھے اَور صحیح معنوں میں زندہ ہوئے۔ کچھ اُنہیں دیکھ کر کچھ مسلمان ملکوں کی بیداری سے اور کچھ دُنیا کی عام حالت سے متاثر ہو کر ہندوستان کے غ

مسلمانوں میں بھی جنبش کے آثار نظر آنے لگے۔ ہندو مسلمان ایک ہی ملک کے باشندے ہیں لیکن پھر بھی جیسا کہ خود کانگرس کی عقلمندی اعتراف کر چکی ہے اِن دونوں کا کلچر ایک حد تک جُدا جُدا ہے۔ لہٰذا ملک کی ترقی کا تقاضا ہے کہ یہ دونوں اپنی اپنی جگہ ترقی کریں اپنے اپنے کلچر کو فروغ دے کر اپنی اپنی جماعت میں زندگی پیدا کریں۔ اِس جُداگانہ قومی تنظیم سے ہمیں ڈرنا اور گھبرانا نہ چاہیئے، صرف یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ اس جُداگانہ تنظیم میں اُن کے رہنما پُرخلوص اور دُور اندیش ہوں جو مشکل اوقات میں اپنی قوم کی کشتی کے ہوشیار ملاح ثابت ہوں اور مناسب وقت پر ہمسایہ قوم سے سمجھوتا کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔

یہ تو ہے جُداگانہ تنظیم کی کہانی لیکن اِس کے ساتھ ہی ساتھ ایک مشترک تنظیم بھی ہے اور ہونی چاہیئے۔ پٹنہ سے رخصت ہو کر میں چند روز الہ آباد میں ٹھہرا۔ وہاں سر تیج بہادر سپرو سے ملاقات ہوئی اور ہندو مسلمانوں کے مشترک کلچر پر بات چیت ہوئی۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے اُردو کی اہمیت پر زور دیا اور کہا کہ اُردو ہندی کے متعلق جو سیاسی جھگڑے ہو رہے ہیں مجھے اُن سے سروکار نہیں، نہ میں کانگرس کا ممبر ہوں نہ مسلم لیگ سے مجھے غرض ہے لیکن ہاں یہ ضرور ہے کہ زبان کے معاملے میں مَیں ہر طرح اُردو کا حامی اور مددگار ہوں کیونکہ اُردو ہمارے مشترک قومی تمدن کا سب سے صحیح نمونہ ہے۔ فرمانے لگے کہ زبان کے معاملے میں اگر پچیس کروڑ آدمی بھی ایک طرف ہو جائیں گے تو مَیں اُردو والوں کا ساتھ دُوں گا۔ پھر زبان کی نوعیت کا ذکر ہُوا۔ کہا کہ نہ میں بڑے بڑے عربی الفاظ کا دلدادہ نہ بھاری بھرکم سنسکرت الفاظ کا۔ ایک مزے کی بات اُنھوں نے سنائی کہ میرے پاس چند ہندو مسلمان نوجوان آگئے اور دَورانِ گفتگو میں شکایت کرنے لگے کہ آپ کی زبان مصنوعی ہے جو دیہاتی لوگوں سے بہت مختلف ہے۔ میں نے کہا ہاں مجھ سے غلطی ہوئی کہ آپ سے کہا "تشریف لائیے" شاید بہتر ہوتا کہ میں "بیٹھ رے سالے" کہتا۔

سر سپرو کا خیال ہے کہ نئی ہندی ہندوستانی کی تحریک زبان اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے خطرناک ہے۔ اُردو سب کی زبان ہے اور اُس کی صحیح شکل وہ ہے جو شمالی ہندوستان میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

لیکن آج کل تو ایک طوفانِ بےتمیزی برپا ہے، ہر شے فرقہ واری کا رنگ اختیار کر رہی ہے، بیچاری اُردو کا مُنہ بھی کالا کیا جا رہا ہے، بلکہ اُس سے اُس کا نام بھی چھینا جا رہا ہے۔ اس زبردستی کے عمل میں ضروری ہے کہ ٹھنڈے دِل سے سوچنے والے اپنی اس قومی زبان کی حفاظت کریں اور اُس کی ترقی میں حصّہ لیں۔

چند روز ہوئے مولانا عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقیٔ اُردو لاہور تشریف لائے۔ اسی سلسلے میں ۲۷ جنوری کو میرے ہاں ایک مختصر سی اُردو چائے پارٹی میں پنجاب کے بعض اُدبا کے درمیان تبادلۂ خیالات ہُوا۔ سیاسی سرگرمی والو! کبھی کبھی ہم ادب کے پیاسے باہم مل بیٹھیں تو کیا حرج ہے؟

بشیر احمد

جہاں نما

ہندوستان کی موجُودہ ضروریات

ڈاکٹر جے سی گھوش صدر شعبۂ کیمیا ڈھاکہ یونیورسٹی نے "انڈین سائنس کانگریس" کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے اس بات پر بہت زور دیا کہ ہندوستان کو اب سیاسی ہنگامہ آرائیوں، جوشیلی تقریروں اور جماعتی مخاصمتوں کو چھوڑ کر اپنی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کی تجاویز پر عمل کرنا چاہیئے۔

اسی خیال کا اظہار ہندوستان کے مختلف صوبوں کے وزرائے تجارت کی کانفرنس کی اس قرارداد سے ہوتا ہے کہ "افلاس، بے روزگاری، تحفظِ ملک اور اقتصادی ترقی کے عقدوں کا حل صنعتی کارخانوں کے قیام کے بغیر نہیں ہو سکتا"۔

یہ ملک اس قدر غریب ہے کہ جب تک اس کی مالی حالت بہتر نہ ہو یہ اپنی حفاظت کا بندوبست بھی نہیں کر سکتا۔ ہندوستان کو ایک زبردست بحری اور ہوائی بیڑے کی ضرورت ہے لیکن روپے کے بغیر نہ جہاز بن سکتے ہیں نہ طیارے۔ ہندوستان ہر سال فوجی مصارف کا رونا روتا ہے۔ در اصل فوجی مصارف غیر ضروری نہیں بلکہ ہندوستان غریب ہے اور اس بوجھ کے اٹھانے کے قابل نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم تجارت اور صنعت و حرفت کو فروغ دے کر ملکی حفاظت کے لئے اس سے بہتر سامان مہیا کریں کیونکہ دُنیا کے حالات روز بروز اس سرعت سے تبدیل ہو رہے ہیں کہ کسی کو معلوم نہیں کل کیا ہوگا۔

اگر "انڈین نیشنل کانگریس" واقعی سوراج حاصل کرنا چاہتی ہے تو اُسے بقولِ صدر "سائنس کانگریس" "ملک کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے اور قومی دولت کے بڑھانے کی طرف زیادہ توجہ کرنی چاہئے"۔ اگر وہ اس ایک بات میں کامیاب ہو گئی تو ہندوستان بہت جلد حقیقی طور پر آزاد اور دشمنوں سے محفوظ ہو سکتا ہے۔

ہمیں "شہنشاہیت" کو مِٹانے پر زیادہ زور صرف کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اپنی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ تخریب کے بجائے تعمیر بہر حال ہمارے لئے بہتر رہے گی۔ ہمیں پہاڑ کے ساتھ ٹکر مارنے سے پہلے خود پہاڑ کی طرح مضبوط بن جانے کی ضرورت ہے۔ ہندوستان تعمیری طریقِ عمل کرنے کے بغیر نہ مضبوط ہو سکتا ہے نہ حقیقی طور پر آزاد۔

مہاتما گاندھی کے بعض پیرو مشینوں اور کارخانوں کے مخالف ہیں۔ اُن کے لئے پنڈت جواہر لعل نہرو کے یہ الفاظ شاید مفید ثابت ہوں "یورپ کے سائنٹیفک کلچر اور ہمارے کلچر میں ایک فطری آویزش سی نظر آتی ہے۔ اگر مغربی ثقافت سیاسی فاتح کے رُوپ میں نہ آتی تو اس قسم کی کوئی آویزش نہ ہوتی۔ ثقافت کو سیاسی تعصبات سے بالاتر رہنا چاہئے۔ مَیں نے سپین میں سائنس کا ناجائز استعمال دیکھا ہے۔ ہندوستان کو اپنی رُوحانی ثقافت اور مغرب کی مشینی تہذیب کے ملاپ سے ایک ایسی صُورت پیدا کر دینی چاہئے کہ سپین کے مظالم کی نوعیت کے ہنگاموں کا امکان باقی نہ رہے"۔

مسٹر سبھاش چندر بوس صدر "انڈین نیشنل کانگریس" نے "آل انڈیا سٹوڈنٹس کانفرنس" کو حال ہی میں یہ پیغام دیا تھا کہ "ہم اب آزادی کی منزل

کے قریب پہنچ گئے ہیں جس طرح ہمارے لئے آزادی حاصل کرنے کا خیال اہم ہے آئندہ نسل کے لئے آزادی کو برقرار رکھنے کا خیال اہم ہوگا لیکن یاد رکھئے کہ آزادی صرف رواداری اور باہمی اتحاد کی حکمتِ عملی سے قائم رہ سکتی ہے۔" -

اگر مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان سمجھوتا ہو جائے تو اس قسم کی روادارانہ فضا بہت جلد پیدا ہو سکتی ہے اور اس کے نتیجے میں آزادی کی منزل قریب تر آسکتی ہے۔

اب ملک کی قیادت مجنون غیر مآل اندیش اور خود غرض "محبانِ وطن" کے ہاتھ میں نہیں رہنی چاہیے جو اپنے ذاتی مفاد کے لئے قوم کے سیاسی اور مذہبی جذبات سے کھیلتے ہیں اور قوم کو نقصان پہنچا کر اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔ اب جنگجویانہ آوازے کسنے کی ضرورت نہیں نہ نفرت اور عداوت کے گیت گانے کا موقع ہے۔

ایران میں اصلاحات کا دَور دورہ اور مُلّاؤں کا خاتمہ

ڈبلیو لنڈن کلف نے "ایشیا" میں ایک مضمون لکھا ہے جس میں ایران کی اُن اصلاحات کا ذکر کیا گیا ہے جو رضا شاہ کے عہد میں نافذ ہوئی ہیں۔

ایرانی زبان کو یکساں بنانے کے لئے زبردست کوشش جاری ہے۔ اِس مقصد کے لئے ایک لسانی ادارہ قائم کیا گیا ہے جو وقتاً فوقتاً ایسے الفاظ کی فہرست شائع کرتا رہتا ہے جو زبان سے خارج کردینے کے قابل سمجھے جاتے ہیں۔ یہ الفاظ عموماً عرب، ترکی اور روس کے نووارد ہوتے ہیں۔ یہ ادارہ اِن الفاظ کو خارج کرکے اُن کے لئے خالص ایرانی مرادفات شائع کردیتا ہے۔

فارسی رسم الخط کی خاص طور پر قدر افزائی کی جارہی ہے۔ مثلاً رومن رسم الخط کے مقابلے میں فارسی رسم الخط میں لکھے ہوئے تار کم اُجرت میں جاتے ہیں۔ جن خطوں کے پتے رومن رسم الخط کے بجائے فارسی میں لکھے ہوں وہ مقابلتہً جلد پہنچا دیئے جاتے ہیں۔

غیر ملکیوں کے لئے سرکاری دستاویزیں بھی فارسی ہی میں لکھی جاتی ہیں البتہ "فرنگیوں" کی آسانی کے لئے ایک فرانسیسی ترجمہ بھی مہیا کردیا جاتا ہے۔

مذہبی اور معاشرتی اصلاح کی طرف بھی توجہ کی گئی ہے چنانچہ مُلّاؤں کا قریب قریب خاتمہ کردیا گیا ہے۔ آج سے دس سال پہلے تک مُلّا تمام مذہبی اور بیشتر تمدنی معاملات پر حاوی تھے۔ تمام سلطنت مُلّاؤں سے پامال ہو چکی تھی۔ لیکن اب مُلّاؤں کے بڑے بڑے عماموں اور چوغوں کا جلوہ ڈھونڈے سے بھی نظر نہیں آتا۔ کہتے ہیں پورے اصفہان میں اب صرف سات مُلّا باقی ہیں۔ لیکن جن مُلّاؤں کو سلطنت کی طرف سے باقی رہنے کا حق حاصل ہے اُن کا اثر و اقتدار بھی بہت محدود کردیا گیا ہے اور سیاسیات میں دخل دینے سے تو وہ قطعاً روک دیئے گئے ہیں۔

مُلّاؤں نے دوسری اصلاحات کی طرح لباس کی اصلاح کو روکنے کی بھی بہت کوشش کی۔ بالخصوص مشہد کے مُلّاؤں نے عمامے کے قائم رکھنے پر بہت زور دیا۔ لیکن حکومت اس نکتہ سے خوب واقف تھی کہ عمامے اور ہیٹ کا مسئلہ دراصل حکومت اور مُلّاؤں کے اقتدار

کا مسئلہ ہے۔ چنانچہ مُلّا قید کر دیئے گئے اور ۱۹۳۶ء میں یہ اصلاح عام طور پر رائج ہو گئی۔

اس کامیابی نے حکومت کو موقع دیا کہ زنانہ لباس کی طرف بھی توجہ کرے۔ مُلک کی نوجوان لڑکیوں کے دلوں میں پُرانی قیود سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک زبردست جذبہ پہلے سے موجُود تھا۔ چنانچہ اس باب میں حکومت کو دشواری پیش نہ آئی اور ضروری اصلاحات آسانی سے رائج ہو گئیں۔

اِن اصلاحات کے نتائج بالخصوص خانگی زندگی کے لئے بہت مفید ثابت ہوئے ہیں۔

تعدّدِ ازواج کی رسم نظری طور ہی پر نہیں عملی طور پر بھی تقریباً بالکل مٹ گئی ہے، کیونکہ معیارِ زندگی کے بلند ہو جانے کے ساتھ مصارف اس قدر بڑھ گئے ہیں کہ اب ایک شخص دوسری بیوی کی عشرت پر ایک ریڈیو یا ایک موٹر کار کو ترجیح دے سکتا ہے

شادی اور طلاق کے معاملات میں مُلّاؤں کے بجائے دیوانی عدالتوں کے اقتدار سے یہ فائدہ ہُوا ہے کہ طلاق پہلے کی طرح مضحکہ انگیز طور پر آسان نہیں رہی اور وقتی جذبے کے ماتحت "عارضی نکاح" (متعہ) کرنے کی رسم بھی مٹتی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مُلّاؤں کے مقابلہ میں عدالتوں کو "مرد عورت کے حقوق کی مساوات" کے مسئلے سے زیادہ ہمدردی ہے۔

قوم کی زندگی پر ان اصلاحات کا عام اثر بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ ایرانیوں میں ایک نئی خودداری اور اس کے ساتھ اعتمادِ نفس پیدا ہو گیا ہے۔

سر رادھا کرشنا کا انتباہ

بنارس ہندو یونیورسٹی کے سالانہ جلسۂ تقسیمِ اسناد میں تقریر کرتے ہوئے سر رادھا کرشنا نے یہ اعلان کیا کہ اگر سلطنتِ برطانیہ نے مناسب وقت کے اندر ہندوستانیوں کو اس قابل نہ بنا دیا کہ وہ اپنے ملک پر خود حکومت کر سکیں تو وہ اُس تباہی سے نہ بچ سکے گی جو دُوسری ایسی ہی عظیم الشان اور مستحکم سلطنتوں کے حصّے میں آتی رہی ہے۔

مشرقِ اقصےٰ میں ابھی سے ہندوستان کے امن و امان کے لئے ایک بہت بڑا زلزلہ پرورش پا رہا ہے اور سیام اور برما میں اس کے جھٹکے محسوس بھی ہونے لگے ہیں۔ جرمنی اس کوشش میں ہے کہ ایشیائے کوچک، عراق، ایران اور افغانستان کے راستے سرحدِ ہندوستان تک اپنا اثر و رسوخ بڑھا لے۔ دُنیا کی اس خطرناک صُورتِ حالات میں جب تین بڑی سلطنتیں طاقت کے استعمال پر تُلی ہوئی ہیں، انگلستان کے لئے لازم ہے کہ وہ محض قول سے نہیں بلکہ عمل سے دکھا دے کہ وہ جمہوریت اور آزادی کے اعتقاد پر ثابت قدم ہے اور یوں آزاد سلطنتوں کی ایک ایسی متحدہ طاقت پیدا کرے جو اس اعتقاد کی حفاظت کے لئے کام آ سکے۔ برطانیہ کا اپنا مفاد، اور بین الاقوامی اخلاق اور انصاف اس بات کا متقاضی ہے کہ ہندوستان کو حکومتِ خود اختیاری دے دی جائے۔ سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایک ایسی فیڈریشن قائم کی جائے جس کی بنیاد گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر نہ ہو بلکہ جو ہندوستان کی مختلف جماعتوں میں اتحاد پیدا کرنے کا ذریعہ بن سکے اور جو صوبوں اور ریاستوں کے درمیان

[illegible] استوار تعلقات پیدا کر دے۔

چین میں جاپان کے مظالم

مادام چیانگ کائی شک نے چین میں جاپانی فوجوں کے مظالم کا تذکرہ کرتے ہوئے "سان فرانسسکو کرانیکل میگزین" میں لکھا ہے کہ جہاں جہاں جاپانیوں نے قدم رکھا ہے اُنھوں نے تباہی و بربادی پھیلا دی ہے۔ اُنھوں نے زمین کی چھاتی پر اور ہمارے سینوں اور دلوں پر ایسے گہرے زخم لگائے ہیں جن کا اندمال ممکن نہیں۔ اُنھوں نے قدیم شہروں اور دیہاتوں کے مردوں عورتوں اور بچوں کو یکساں اپنے مظالم کا نشانہ بنایا ہے اور اُن کی حالت غُولِ بیابانی سے بدتر کر دی ہے۔ اتنا ظلم اور جبر اس نیلگوں آسمان کے نیچے کبھی نہیں ہوا ہوگا۔ لیکن اس "مہذّب" دَور میں کوئی ایسا بین الاقوامی قانون نہیں جو ہمیں بچا سکے کوئی ایسی قوم نہیں جو جاپان سے ان بے جا مظالم کے لئے احتساب کرے۔

بہت سے جاپانی سپاہی بھی اپنے فوجی حاکموں کے مظالم کے دل سے حامی نہیں ہیں نہ سب کے سب رضاکارانہ طور پر یہ ظلم و ستم ڈھاتے ہیں۔ اس باب میں خود جنرل چیانگ کائی شک کی شہادت موجود ہے:۔

> "اس وحشیانہ طریقِ جنگ میں حصّہ لینے کے مقابلے میں بعض جاپانی سپاہیوں نے خودکشی کو ترجیح دی۔ کبھی اُنھوں نے ایک دُوسرے کو ہلاک کر دیا۔ کبھی گلے میں پھندا ڈال کر لٹک گئے اور ان کی جیبوں میں سے اکثر ایسے خطوط برآمد ہوئے جن میں اُنھوں نے جاپانی فوج کے نام اپنا "آخری پیغام" چھوڑا تھا۔"

حامد علی خاں

تصویر

"جدید ترکی کے ایک نسوانی مدرسے میں سائنس کی تعلیم"۔ یہ تصویر اور ترکی کے متعلق بعض اور تصویریں جو آئندہ چھپیں گی ہمیں محترمہ فاطمہ بیگم صاحبہ منشی فاضل کی عنایت سے حاصل ہوئی ہیں۔ محترمہ موصوفہ ترکی اور یورپ کا سفر کر چکی ہیں اور اب لاہور کے ایک نسوانی دارالعلوم کی پرنسپل ہیں۔ ان تصاویر کے لئے ہم محترمہ فاطمہ بیگم صاحبہ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

"ہمایوں"

جدید ترکی کے ایک زنانہ مدرسے میں سائینس کی تعلیم
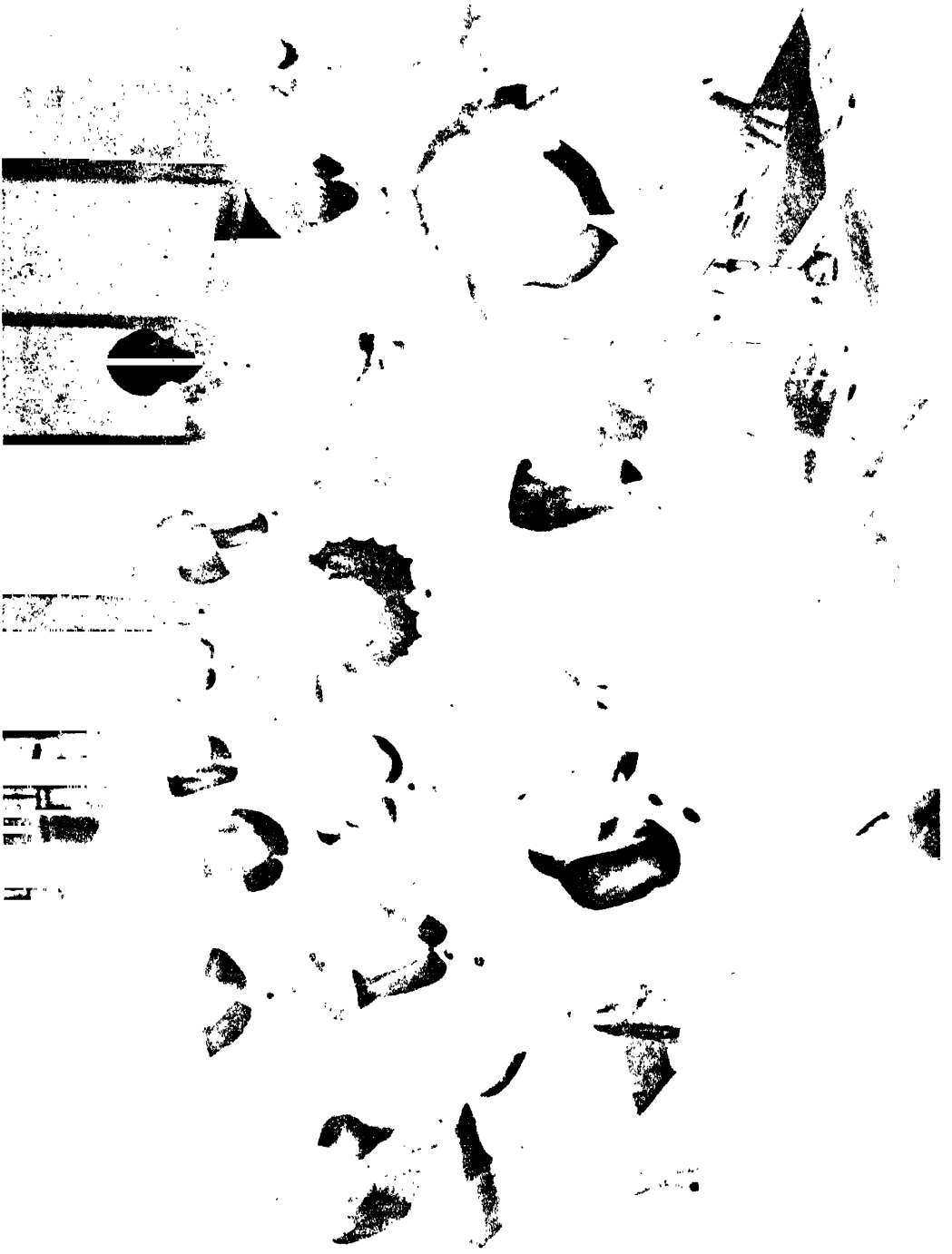
ڈاکٹر بھٹناگر کا پیغام حکومتِ پنجاب کے نام

"تعصب اور فرقہ بندی کو مٹانے کے لئے اُردو کو ترقی و توسیع دی جائے"

۸ ار دسمبر ۱۹۳۸ء کو انجمنِ اُردو پنجاب کے زیرِ اہتمام "یومِ اُردو" منانے کے لئے لاہور میں جو پُر رونق جلسہ ہُوا اس کی صدارت کے فرائض مشہور فاضل سائنسدان ڈاکٹر ایس ایس بھٹناگر بالقابہ صدرِ شعبۂ کیمیا پنجاب یونیورسٹی نے انجام دیئے۔ اس اجلاس میں حکومتِ پنجاب کے صدرِ اعظم سر سکندر حیات خاں اور دوسرے اکابر بھی رونق افروز تھے۔ ذیل میں ڈاکٹر صاحب کا نکتہ آموز اور ہنگامہ خیز خطبۂ صدارت درج کیا جاتا ہے۔

حضرات۔ میاں بشیر احمد صاحب سکرٹری انجمن اُردو پنجاب اُن زبردست ہستیوں میں سے ہیں جو باوجود اپنی صحت اور قدوقامت کے اچھے اچھے گراں ڈیل اور قوی انسانوں کو اپنی دلفریب اور شیریں گفتار سے ایک لمحہ میں ڈھا کر اپنا مطیع بنا سکتے ہیں۔ اگر اس امر کی صداقت پر کسی کو یقین نہ ہو تو اُن کو آپ بیتی سناتا ہوں۔ دو ہفتہ ہوئے کہ میرے دفتر کے دروازے پر کھٹکھٹانے کی خفیف سی آواز سُنائی پڑی۔ ابھی مشکل سے نو بجے ہوں گے۔ میں نے عرض کی کہ تشریف لے آیئے دیکھتا کیا ہوں کہ میاں صاحب تشریف لائے ہیں تعظیم سے میرا سر جُھک گیا۔ مصافحہ کرنے کے بعد میں نے آنحضرت کی تشریف آوری سے جو مسرت مجھے نصیب ہوئی اُس کا شکریہ ادا کیا۔ میاں صاحب فرمانے لگے کہ بھئی تمہاری تلاش میں صبح سے سرگرداں ہوں۔ پہلے گالف روڈ پر گیا۔ وہاں سے پتہ لگا کہ آپ ۲۶ جیل روڈ پر مقیم ہیں وہاں سے خبر ملی کہ آپ اپنی نئی کوٹھی میں تشریف لے گئے ہیں وہاں پہنچا تو معلوم ہُوا کہ آپ ساڑھے آٹھ بجے سے پیشتر ہی اپنے تجربہ گاہ میں چلے جاتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ آخر کار آپ کو یہاں آپکڑا کام یہ ہے کہ ۱۸ دسمبر کو یومِ اُردو منانا قرار پایا ہے اور آپ کرسئ صدارت پُر رونق افروز ہوں گے۔ میں نے بہت عذر پیش کئے، بہت سمجھایا کہ یہ عزت کسی بزرگ اور باوقار اہلِ قلم کو ملنی چاہئے مگر آپ نے دو چار منٹ میں ہی مجھے قائل کر دیا اور میں نے میاں صاحب کے حکم کی تعمیل کرنا منظور کر لیا۔

میاں صاحب کا سب سے زبردست داؤ پیچ جو اس کشمکش میں کارگر ثابت ہُوا وہ یہ تھا کہ یومِ اُردو میں ہر قوم و ملت کے افراد کی شرکت لازمی ہے کیونکہ عوام الناس میں یہ خیال زور پکڑتا جا رہا ہے کہ ہنود اُردو اور ہندوستانی کی نسبت ہندی کی اشاعت میں زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ میری غیرت یہ گوارا نہ کر سکی کہ جس زبان کے خوشہ چینوں میں پنڈت دیا شنکر نسیم، منشی ہرگوپال تفتہ، منشی بالمکند بے صبر، منشی بنواری لال شُعلہ، پنڈت رتن ناتھ سرشار، منشی بہاری لال مشتاق، لالہ تلوک چند محروم اور دوارکا پرشاد اُفق جیسی معزز ہستیاں ہوں اس کی ترقی اور بہبودی کے لئے جو جلسہ آج ہونا قرار پایا ہے اُس میں شریک نہ ہوں۔

قوم کی زبان بنانا اور اسے ہر پہلو سے ترقی دینا ایک شخص یا ایک جماعت یا ایک جرگہ کا کام نہیں اس کے لئے ہر فرد بشر اور ہر جماعت اور ہر ملت کی مجموعی کوششیں درکار ہیں۔ اُردو کی ترقی صرف بے اصول توسیع سے نہیں ہوسکتی۔ اُردو کو ہندوستانی کے جانے پر جو اصرار ہے اُس سے ہمیں کیا انکار ہے اُردو تو ہندوستانی کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔ مگر یہ کہنا کہ ہندوستانی کی توسیع کے لئے اُس میں تامل، تیلگو، گجراتی، بنگالی اور سنسکرت اور انگریزی کے بے شمار الفاظ ٹھونسے جائیں زیادتی ہے کم ازکم میں اس قسم کی اُردو کی توسیع کو اُردو کا خاتمہ تصور کرتا ہوں۔ ابھی چند روز ہوئے کہ ایک صوبہ کی لیجسلیٹو کونسل میں ایک تقریر اس نئی زبان میں ہوئی۔ حاضرین کی دلچسپی کے لئے اس تقریر کے چند فقرے پیش کرتا ہوں:۔

"مسٹر پریزیڈنٹ۔ میں اس موشن پر سپیچ دینے کی آگیا کا ادھکاری ہوں۔ سرکار کی اُردو سے چاہے اس کی اپوزیشن ہو چاہے سپورٹ ہو آئی اینڈ مائی پارٹی اس تحریک کی اگھور اپوزیشن کرے گی۔ ہمارے کنٹری کا ہر چائلڈ اور ہر ینگ مین ہماری سائیڈ پر ہے اور ہمیں پرفیکٹ لشواس ہے کہ اوور وہیلمنگ مجورٹی سے ہمیں پورن سکسیس ہوگی۔"

ہر زبان کی بہبودی اور ترقی اس بات پر منحصر ہے کہ اس کی توسیع میں زبان کی تہذیب اور تدوین بھی شامل ہو۔ اس کی علمی استطاعت میں اگر الفاظ اور محاورات کا اضافہ ہو تو باعثِ فخر ہے مگر ایسا نہ ہونا چاہئے کہ اس اضافہ سے زبان کی فصاحت و بلاغت، شیرینی اور ترنم اور وہ خوبیاں جو پہلے سے اُس میں موجود ہیں زائل ہو جائیں۔ نہ صرف تحریر بلکہ تقریر بھی ان طوفان خیز اور انقلاب آمیز اصلاحوں کے بارگراں کی متحمل نہیں جو بعض رہبرانِ ملک بغیر سوچے سمجھے ہماری زبان میں داخل کرنے کی تلقین کر رہے ہیں۔ زبان کا حسن اس میں ہے کہ اُس کی زیبائش اور آرائش کے لئے ایسے موتی استعمال کئے جائیں جو برتنے کے بعد اصلی پائے گئے ہوں۔ اگر خال خال محاورات نئے ہوں تو وہ سونے پر سہاگے کا کام دے سکتے ہیں مگر غیر ملکی غازہ سے کسی من موہنی صورت کو سرخ و سپید مٹی کی مورت بنانا کونسی صناعی ہے۔

یہ امر ثبوت کا محتاج نہیں کہ اُردو کسی خاص مذہب اور ملت سے تعلق نہیں رکھتی اور ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے۔ صرف یہ زبان ہی ہے جو در اصل ہندو مسلم اتحاد کی زندہ نشانی ہے اور اس کی توسیع اور حفاظت ہمارا قومی فرض ہے۔ اس کام میں پنجاب، دکن، دہلی اور لکھنؤ کے ساتھ مل کر ممتاز اور نمایاں حصّہ لے سکتا ہے۔ اس میں عالم فاضل سیاستدان، تاجر، سیاح، کھلاڑی، مؤرخ، سائنسدان غرضکہ ملک کے ہر فرد کی شرکت لازمی اور مفید ہے۔ بقول کیفی سہ

صاحبِ علم و فن و فہم و ادب ہیں درکار باغ اُردوئے معلّٰی میں تب آئے گی بہار

میرا یقین ہے کہ ہندوؤں کی یہ شکایت کہ اُردو فارسی اور عربی الفاظ کی کثرت سے از حد ثقیل ہوتی جاتی ہے اور مسلمانوں کا یہ گلہ کہ ہندوستانی ہندی اور سنسکرت کی آمیزش سے ذلیل ہوتی جا رہی ہے۔ واقعی بجا ہے۔ مگر اس کا علاج یہ نہیں کہ ہم خواہ مخواہ اُن صوبوں اور حکومتوں سے بیزار ہو جائیں جو یہ رنگ پیدا کرنے کی گنہگار رہیں۔ جب زبانیں بڑھتی ہیں اور پروان چڑھتی ہیں تو اس قسم کی دقتیں ضرور پیش

آتی ہیں مگر انشا پرداز اور نقاد رفتہ رفتہ ان مسئلوں کو حل کر لیتے ہیں۔ سب سے زیادہ مشکل یہ ہے کہ ابھی تک اُردو کی ترقی میں طبقۂ نسواں نے جو دراصل زبان کی حفاظت کرتا ہے اور جس کے دامنِ عاطفت میں تہذیب پرورش پاتی ہے کوئی حصّہ نہیں لیا۔ اگر ہندوستان میں مرد اور عورت خواہ وہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں زندگی کے تمام مراحل میں ہم رکاب ہو جائیں تو یہ دقت جو اِس وقت قطعی لاعلاج دکھائی پڑتی ہے آسانی سے رفع ہو سکتی ہے۔ نہ تو مسلمانوں کے گھروں میں ایسی ثقیل اُردو بولی جاتی ہے کہ اُس کے سمجھنے کے لئے مولانا ظفر علی کو تشریف آوری کی تکلیف اُٹھانی پڑے اور نہ ہندو گھرانوں کی مستورات اس قسم کی ہندی بولتی ہیں جو سنسکرت الفاظ سے بھرپور ہو اور پنڈت جی کی مدد کے بغیر معمولی ہندوستانی اُسے سمجھ بھی نہ سکے۔ زمانہ بصورتِ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔ اس لئے ہر ہندوستانی کا یہ فرض ہے کہ خواہ ابھی اُسے نوکریوں میں انگریزوں کے برابر تنخواہ ملے یا نہ ملے۔ خواہ اُس کو بیٹیوں اور حرفتوں میں ابھی وہ آسانیاں بہم نہ ہوں جو اور قوموں کو ہیں خواہ اُسے سوراج ملے یا نہ ملے پہلے یہ کوشش کرے کہ ہماری ملکی زبان ایک ہو جائے۔ اگر یہ ہو گیا تو اور مشکلات خود بخود حل ہو جائیں گی۔ اس وقت پنجاب کی حکومت کی باگ ڈور اہلِ پنجاب کے ہاتھ میں ہے۔ پنجاب کو اُردو سے گہرا تعلق ہے۔ اُردو کے گُلدستۂ سخن میں مناظرِ قدرت کی رنگینیوں کی آمیزش کی ایجاد اس شہر لاہور ہی میں ہوئی۔ یہ امر مسلّمہ ہے کہ پنجاب اُن خطّوں میں سے ہے جنہیں اُردو سے خصوصیت ہے۔ اُردو کی ترقی و توسیع حکومتِ پنجاب کا فرضِ اولیں ہے۔ اگر پنجاب کو تعصب اور فرقہ بندی کے مرض سے نجات دلانا حکومت کا مقصد ہے تو اس مقدس ارادہ میں کامیابی کی صورت تب ہی ہو سکتی ہے جب اس صوبہ میں اُردو ملکی زبان قرار دی جائے۔ پنجاب کو تمدنی اور ملکی ترقی کے لحاظ سے بہت اُونچا رتبہ حاصل نہیں۔ مگر اس صوبہ کا وقار اس میں ہے کہ ہندوستان کی ملکی زبان یعنی اُردو کی سب سے اعلےٰ خدمات انجام دینے کا سہرا اس کے سر ہو اور ہر پنجابی فخر سے کہہ سکے کہ آزاد ہندوستان میں سیاسیانہ شان صنعت اور حرفت، زراعت اور دولت خواہ کسی صوبہ کی کمائی ہو لیکن ہندوستان کی ملکی زبان یعنی اُردو کم از کم پنجاب کی مرہونِ منت ہے، کاش کہ حکومتِ پنجاب آزادی کی جنگ کے بعد فخر سے کہہ سکے کہ ہم نے ملک کو ایک زبان دے کر آزادی کے سب سے مشکل اور دقیق مسئلوں کو حل کیا ہے۔ حکومت اکثر اوقات اقتصادی اثرات سے ڈر کر اُن دُور اندیشیوں سے بے بہرہ ہو جاتی ہے جو اصلی آزادی کی طرف لے جاتی ہیں۔ مگر مجھے یقینِ کامل ہے کہ یہ حکومت زبان کے بارے میں اپنے اہم فرائض ادا کرے گی۔ ؎

کیوں نہ اُمیدِ رہبری ہو مجھے
خضر کا رہنما سکندر ہے

ایس۔ ایس بھٹناگر

اجنتا

دکن میں اجنتا کے قدیم مندر جو پہاڑوں میں پتھر کی عظیم الشان چٹانوں کو کاٹ کر بنائے گئے ہیں فنِ تعمیر، سنگتراشی اور بُت سازی کے نادرِ روزگار نمونے ہیں۔

"ہمایوں"

جہاں خونِ جگر پیتے رہے اہلِ ہُنر برسوں
جہاں گھُلتا رہا رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں

جہاں کھِنچتا رہا پتھر پہ عکسِ خیر و شر برسوں
جہاں قائم رہے گی جنّتِ قلب و نظر برسوں

جہاں نغمے جنم لیتے ہیں رنگینی برستی ہے
دکن کی گود میں آباد وُہ خوابوں کی بستی ہے

شراب و شعر کی تاثیر ہے ٹھنڈی ہواؤں میں
بہارِ زندگی غلطاں ہے سبزے کی اداؤں میں

نوائے سرمدی آتی ہے جھرنوں کی صداؤں میں
بیاں ممکن نہیں وُہ لطف آتا ہے دُعاؤں میں

یہاں صدیوں سے رائج پُرسکوں شیریں مقالی ہے
یہاں کا ذرّہ ذرّہ مظہرِ شانِ جمالی ہے

در و دیوار پر ہیں نقشِ حسن و عشق کی گھاتیں
پیامِ زندگی دیتی ہیں شرمیلی ملاقاتیں

جواں برسات کے دن جان لیوا چاندنی راتیں
فضا میں گونجتی رہتی ہیں ہر دم دلنشیں باتیں

یہاں پیری پہ ہو جاتا ہے دھوکا نوجوانی کا
سبق دیتا ہے ہر چہرہ حیاتِ جاودانی کا

جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقشِ لاثانی
تصدق جن کے ہر خط پر تحیر خانۂ مانی

مشکل ہے شباب و حسن میں تخئیلِ انسانی
تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوقِ عریانی

گلستانِ اجنتا پر جنوں کا راج ہے گویا
یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

بہانہ مل گیا دستِ جنوں کو حسن کاری کا
اثاثہ لوٹ ڈالا شوق میں فصلِ بہاری کا

چٹانوں پر بنایا نقش دل کی بیقراری کا
سکھایا گر اُسے جذبات کی آئینہ داری کا

دلِ کہسار میں محفوظ اپنی داستاں رکھ دی
جگرداروں نے بنیادِ جہانِ جاوداں رکھ دی

ہنرمندوں نے تصویروں میں گویا جان بھر دی ہے
ترازو دل میں ہو جاتی ہے وہ کافر نظر دی ہے

اداؤں سے عیاں ہی لذتِ دردِ جگر دی ہے
کھلیں گے راز اس ڈر سے دہن پر مہر کر دی ہے

یہ تصویریں بظاہر گو یونہی خاموش رہتی ہیں
مگر اہلِ نظر پوچھیں تو دل کے راز کہتی ہیں

کرشمہ ہے یہ سب اہلِ جنوں کی سعیِ پیہم کا — جنہیں احساس تک باقی نہ تھا کچھ شادی و غم کا
دلوں پر عکس کھنچ آیا تھا جن کے حسنِ عالم کا — قلم کو نقش ازبر ہو گیا تھا اسمِ اعظم کا

چٹانوں پر شباب و حسن کی موجیں رواں کر دیں
فسوں کاروں نے رنگوں میں مقید بجلیاں کر دیں

جہاں چھوڑا خوشی سے عشق کے پیغام کی خاطر — خوشامد اہلِ دنیا کی نہیں کی نام کی خاطر
نہ چھانی خاک در در کی کسی انعام کی خاطر — جئے بھی کام کی خاطر مرے بھی کام کی خاطر

زمانے کی جبیں پر عکس چھوڑے ہیں نگاہوں کے
رہیں گے نقش ان کے نام مٹ جائینگے شاہوں کے

سکندر علی وجد

نھّا رام، ننھّا تو تھا لیکن شرارتوں کے لحاظ سے بہت بڑا تھا۔ وُہ چہرے سے بےحد بھولا بھالا معلوم ہوتا تھا۔ کوئی خط یا نقش ایسا نہیں تھا جو شوخی کا پتہ دے۔ اُس کے جسم کا ہر عضو بھدے پن کی حد تک موٹا تھا۔ جب وہ چلتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فٹ بال لُڑھک رہا ہے۔ عمر بمشکل آٹھ برس کی ہوگی مگر بلا کا ذہین اور چالاک تھا۔ لیکن اُس کی ذہانت اور چالاکی کا پتا اُس کے سراپا سے لگانا بہت مشکل تھا۔ مسٹر شنکر اچاریہ ایم اے، ایل ایل بی، رام کے پتا کہا کرتے تھے کہ "مُنہ میں رام رام اور بغل میں چھری" والی مثال اِس رام ہی کے لئے بنائی گئی تھی۔

رام کے مُنہ سے رام رام تو کسی نے سُنا نہیں تھا مگر اُس کی بغل میں چھری کے بجائے ایک چھوٹی سی چھڑی ضرور ہوا کرتی تھی جس سے وُہ کبھی کبھی ڈگلس فیئر بینکس یعنی بغدادی چور کی تیغ زنی کی نقل کیا کرتا تھا۔

جب رام کی ماں یعنی مسز راما شنکر اچاریہ اُس کو کان سے پکڑ کر اُس کے باپ کے سامنے لائیں تو وُہ بالکل خاموش تھا۔ آنکھیں خشک تھیں، اُس کا ایک کان جو اُس کی ماں کے ہاتھ میں تھا دوسرے کان سے بڑا معلوم ہوتا تھا، وہ مُسکرا رہا تھا۔ مگر اِس مسکراہٹ میں بلا کا بھولا پن تھا۔ اُس کی ماں کا چہرہ غصّے سے تمتمایا ہوا تھا، مگر اُس کے چہرے سے یہ پتہ چلتا تھا کہ وُہ اپنی ماں سے کھیل رہا ہے اور وہ اپنے کان کو ماں کے ہاتھ میں دے کر ایک خاص قسم کا لُطف اُٹھا رہا ہے جس کو وُہ دوسروں پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔

جب رام، مسٹر شنکر اچاریہ کے سامنے لایا گیا، تو وہ آرام کُرسی پر جم کر بیٹھ گئے کہ اُس نالائق کے کان کھینچیں، حالانکہ وہ اُس کے کان کھینچ کھینچ کر کافی سے زیادہ لمبے کر چکے تھے اور اُس کی شرارتوں میں کوئی فرق نہ آنے پایا تھا۔ وہ عدالت میں قانون کے زور پر بہت کچھ کر لیتے تھے، مگر یہاں اس چھوٹے سے لونڈے کے سامنے اُن کی کوئی پیش نہ چلتی تھی۔

ایک مرتبہ مسٹر راما شنکر اچاریہ نے کسی شرارت پر اُس کو پرمیشور کے نام سے ڈرانے کی کوشش کی تھی۔ اُنہوں نے کہا تھا "دیکھ رام، تُو اچھا لڑکا بن جا، ورنہ مجھے ڈر ہے کہ پرمیشور تجھ سے خفا ہو جائیں گے۔"

رام نے جواب دیا تھا "آپ بھی تو خفا ہو جایا کرتے ہیں اور میں آپ کو منا لیا کرتا ہوں" اور پھر تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اُس نے یہ پُوچھا تھا "باپوجی، یہ پرمیشور کون ہیں؟"

مسٹر شنکر اچاریہ نے اُسے سمجھانے کے لئے جواب دیا تھا "بھگوان، اور کون ——— ہم سب سے بڑے"

"اس مکان جتنے؟"

"اس سے بھی بڑے ——— دیکھ اب تو کوئی شرارت نہ کیجیو، ورنہ وہ تجھے مار ڈالیں گے!" مسٹر شنکر اچاریہ نے اپنے بیٹے پر ہیبت طاری کرنے کے لئے پرمیشور کو اس سے بھی زیادہ ڈراؤنی شکل میں پیش کرنے کے بعد یہ خیال کر لیا تھا کہ اب رام سُدھر جائیگا اور کوئی شرارت نہ کرے گا مگر رام جو اس وقت خاموش بیٹھا تھا اپنے ذہن کی ترازو میں پرمیشور کو تول رہا تھا۔ کچھ دیر غور کرنے کے بعد جب اُس نے بڑے بھولے پن سے کہا تھا" باپو جی! ——— میں بھاگوں گا نہیں ——— آپ مجھے پرمیشور دکھلایئے!" تو مسٹر راما شنکر اچاریہ کی ساری قانون دانی اور وکالت دھری کی دھری رہ گئی۔

کسی مقدمے کا حوالہ دینا ہوتا تو وہ اس کا فائل نکال کر دکھا دیتے یا اگر کوئی اُن سے تعزیراتِ ہند کی کسی دفعہ کے متعلق سوال کرتا تو وہ اپنی میز پر سے وُہ موٹی کتاب اُٹھا کر کھولنا شروع کر دیتے جس کی جلد پر اُن کے اس لڑکے نے چاقو سے بیل بُوٹے بنائے رکھے تھے، مگر وُہ پرمیشور کو پکڑ کر کہاں سے لاتے جس کے متعلق اُنہیں خود اچھی طرح معلوم نہیں تھا کہ وُہ کیا ہے، کہاں رہتا ہے اور کیا کرتا ہے۔

جس طرح اُن کو یہ معلوم تھا کہ دفعہ ۳۷۹ چوری کے فعل پر عاید ہوتی ہے، اِسی طرح اُن کو یہ بھی معلوم تھا کہ مارنے اور پیدا کرنے والے کو پرمیشور کہتے ہیں، اور جس طرح اُن کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ جس قانون کے ماہر بنے ہوئے ہیں، اُس کی اصلیت کیا ہے، ٹھیک اُسی طرح اُن کو پرمیشور کی اصلیت معلوم نہ تھی۔ وہ ایم۔اے، ایل ایل بی تھے مگر یہ ڈگری اُنہوں نے ایسی اُلجھنوں میں پھنسنے کے لئے نہیں بلکہ دولت کمانے کے لئے حاصل کی تھی۔

وُہ رام کو پرمیشور نہ دکھا سکے اور نہ اُس کو کوئی معقول جواب ہی دے سکے۔ اس لئے کہ یہ سوال ہی کچھ اس طرح اچانک طور پر کیا گیا تھا کہ اُن کا دماغ بالکل خالی ہو گیا۔ وہ صرف اس قدر کہہ سکے تھے "جا، رام، جا، میرا دماغ نہ چاٹ، مجھے بہت کام کرنا ہے!"

اس وقت انہیں کام واقعی بہت کرنا تھا مگر وُہ پُرانی شکستوں کو بھول کر فوراً ہی اس نئے مقدمے کا فیصلہ کر دینا چاہتے تھے۔

اُنہوں نے رام کی طرف غصّے سے بھری ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اپنی دھرم پتنی سے کہا "آج اس نے کون سی نئی شرارت کی ہے ——— مجھے جلدی بتاؤ، میں آج اسے ڈبل سزا دوں گا!"

مسز اچاریہ نے رام کا کان چھوڑ دیا اور کہا "اِس مُوئے نے تو زندگی وبال کر رکھی ہے، جب دیکھو ناچنا، تھرکنا، کودنا ——— نہ آئے کی شرم نہ گئے کا لحاظ ——— صُبح سے مجھے ستا رہا ہے کئی بار پیٹ چکی ہوں مگر یہ اپنی شرارتوں سے باز ہی نہیں آتا۔ نعمت خانے میں سے دو کچے ٹماٹر نکال کر کھا گیا ہے۔ اب میں سلاد میں اس کا سر ڈالوں"۔

یہ سُن کر مسٹر راما شنکر اچاریہ کو ایک دھکّا سا لگا۔ وہ خیال کر رہے تھے کہ رام کے خلاف کوئی سنگین الزام ہوگا مگر یہ سُن کر کہ اُس نے نعمت خانے سے صرف دو کچے ٹماٹر نکال کر کھائے ہیں، انہیں سخت نا اُمیدی ہوئی۔ رام کو جھڑکنے اور کوسنے کے لئے اُن کی سب تیاری ایکا ایکی سرد پڑ گئی۔ اُنہوں نے ایسا محسوس کیا کہ اُن کا سینہ ایک دم خالی ہو گیا ہے، جیسے ایک مرتبہ اُن کی موٹر کے پہیئے کی ساری ہوا نکل گئی تھی۔

ٹماٹر کھانا کوئی جُرم نہیں تھا، اس کے علاوہ ابھی کل ہی مسٹر راما شنکر اچاریہ کے ایک دوست نے جو جرمنی سے طب کی اعلیٰ سند لے کر آئے تھے۔ اُن سے کہا تھا کہ اپنے بچوں کو کھانے کے ساتھ کچے ٹماٹر ضرور دیا کیجئے، کیونکہ اُن میں کثرت سے وٹامنز ہوتی ہیں۔ مگر اب چونکہ وہ رام کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے اور اُن کی بیوی کی بھی یہی خواہش تھی، اس لئے اُنہوں نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد ایک قانونی نقطہ سوچا اور اس انکشاف پر دل ہی دل میں خوش ہو کر اپنے بیٹے سے کہا "میرے نزدیک آ اور جو کچھ میں تجھ سے پُوچھوں سچ سچ بتا۔"

مسز راما شنکر اچاریہ چلی گئیں اور رام خاموشی سے اپنے باپ کے پاس کھڑا ہو گیا۔

مسٹر راما شنکر اچاریہ نے پوچھا "تُو نے نعمت خانے سے دو کچے ٹماٹر نکال کر کیوں کھائے"

رام نے جواب دیا "دو کہاں تھے ـــــ ماتا جی تو جھوٹ بولتی ہیں"

"تُو ہی بتا کتنے تھے؟"

"ڈیڑھ ـــــ ایک اور آدھا" رام نے یہ الفاظ انگلیوں سے آدھے کا نشان بنا کر کہے" دوسرے آدھے سے ماتا جی نے دوپہر کو چٹنی بنائی تھی۔"

"چلو تو، ڈیڑھ ہی سہی، پر تُو نے یہ وہاں سے اُٹھائے کیوں؟"

رام نے جواب دیا "کھانے کے لئے"

"ٹھیک ہے، مگر تُو نے چوری کی۔" مسٹر راما شنکر اچاریہ نے قانونی نقطے کو پیش کیا۔

"چوری! ـــــ باپو جی، مَیں نے کوئی چوری نہیں کی، ٹماٹر کھائے ہیں، مگر یہ چوری کیسے ہوئی۔" یہ کہتا ہُوا وہ فرش پر بیٹھ گیا اور غور سے اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ چوری تھی ـــــ دُوسرے کی چیز کو اُس کی اجازت کے بغیر اُٹھا لینا چوری ہوتی ہے۔" مسٹر راما شنکر نے یوں اپنے بچے کو سمجھایا اور خیال کیا کہ وہ اُن کا مفہوم اچھی طرح سمجھ گیا ہے۔

رام نے فوراً ہی کہا "مگر ٹماٹر تو ہمارے اپنے تھے ـــــ میری ماتا جی کے!"

مسٹر راما شنکر اچاریہ بٹپٹا گئے مگر فوراً ہی اپنا مطلب واضح کرنے کی کوشش کی" تیری ماتا جی کے تھے ـــــ ٹھیک ہے، پر وہ تیرے تو نہ ہوئے، جو چیز اُن کی ہے، وہ تیری کیسے ہو سکتی ہے ـــــ دیکھ سامنے میز پر جو تیرا کھلونا پڑا ہے، اُٹھا لا، مَیں تجھے اچھی طرح سمجھاتا ہوں۔"

رام اُٹھا اور دوڑ کر لکڑی کا گھوڑا اُٹھا لایا اور اپنے باپ کے ہاتھ میں دے دیا "یہ لیجئے"

مسٹر راما شنکر اچاریہ بولے "ہاں، تو دیکھ، یہ گھوڑا تیرا ہے نا؟"

"جی ہاں"

"اب اگر میں اِسے تیری اجازت کے بغیر اُٹھا کر اپنے پاس رکھ لوں تو یہ چوری ہوگی" پھر مسٹر راماشنکر اچاریہ نے مزید وضاحت سے کام لیتے ہوئے کہا "اور میں چور"

"نہیں پتاجی، آپ اسے اپنے پاس رکھ سکتے ہیں، میں آپ کو چور نہیں کہوں گا ــــ میرے پاس کھیلنے کے لئے ہاتھی جو ہے ــــ کیا آپ نے ابھی تک دیکھا نہیں ــــ کل ہی منشی دادا نے لاکے دیا ہے ــــ ٹھیریئے، میں ابھی آپ کو دکھاتا ہوں"، یہ کہہ کر وہ تالیاں بجاتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا اور مسٹر راماشنکر اچاریہ آنکھیں جھپکتے رہ گئے۔

دوسرے روز مسٹر راماشنکر اچاریہ کو ایک خاص کام سے پُونا جانا پڑا۔ اُن کی بڑی بہن وہیں رہتی تھی۔ ایک عرصے سے وہ چھوٹے رام کو دیکھنے کے لئے بے قرار تھی، چنانچہ ایک پنتھ دو کاج کے پیشِ نظر مسٹر راماشنکر اچاریہ اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لے گئے، مگر اس شرط پر کہ وُہ راستے میں کوئی شرارت نہ کرے۔ ننھا رام اس شرط پر بوری بندر اسٹیشن کے پلیٹ فارم تک قائم رہ سکا، اُدھر دکن کوئین چلی اور اِدھر رام کے ننھے سے سینے میں شرارتیں مچلنا شروع ہوگئیں۔

مسٹر راماشنکر اچاریہ سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ کی چوڑی سیٹ پر بیٹھے اپنے ساتھ والے مسافر کا اخبار دیکھ رہے تھے اور سیٹ کے آخری حصّے پر رام کھڑکی میں سے باہر جھانک رہا تھا اور ہوا کا دباؤ دیکھ کر یہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اُسے لے اُڑے تو کتنا مزا آئے۔

مسٹر راماشنکر اچاریہ نے اپنی عینک کے گوشوں میں سے رام کی طرف دیکھا اور اُسکو بازو سے پکڑ کر نیچے بٹھا دیا۔

"تُو چین بھی لینے دیگا یا نہیں ــــ آرام سے بیٹھ جا" یہ کہتے ہوئے اُن کی نظر رام کی نئی ٹوپی پر پڑی جو اُس کے سر پر چمک رہی تھی۔

"اُسے اُتار کر رکھ نالائق، ہوا سے اُڑ جائے گی"۔

اُنہوں نے رام کے سر پر سے ٹوپی اُتار کر اُس کی گود میں رکھ دی۔

مگر تھوڑی دیر کے بعد ٹوپی پھر رام کے سر پر تھی اور وہ کھڑکی کے باہر سر نکالے دوڑتے ہوئے درختوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ درختوں کی یہ بھاگ دَوڑ رام کے ذہن میں آنکھ مچولی کے دلچسپ کھیل کا نقشہ کھینچ رہی تھی۔

ہوا کے جھونکے سے اخبار دوہرا ہوگیا اور مسٹر راماشنکر اچاریہ نے اپنے بیٹے کے سر کو پھر کھڑکی کے باہر پایا۔ غصّے میں اُنہوں نے اُس کا بازو کھینچ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور کہا " اگر تُو یہاں سے ایک انچ بھی ہلا تو تیری خیر نہیں"۔ یہ کہہ کر اُنہوں نے ٹوپی اُتار کر اُس کی ٹانگوں پر رکھ دی۔

اس کام سے فارغ ہو کر اُنہوں نے اخبار اُٹھایا اور وُہ ابھی اُس میں وہ سطر ہی ڈھونڈ رہے تھے جہاں سے اُنہوں نے پڑھنا چھوڑا تھا کہ رام نے کھڑکی کے پاس سرک کر باہر جھانکنا شروع کر دیا۔ ٹوپی اُس کے سر پر تھی یہ دیکھ کر مسٹر شنکر اچاریہ کو سخت غصّہ آیا۔ اُن کا ہاتھ

عُقاب کی چیل کی طرح ٹوپی کی طرف بڑھا اور چشم زدن میں وہ اُن کی سیٹ کے نیچے تھی۔ یہ سب کچھ اس قدر تیزی سے ہُوا کہ رام کو سمجھنے کا موقع ہی نہ مِلا۔ مُڑ کر اُس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا، مگر اُن کے ہاتھ خالی نظر آئے، اِسی پریشانی میں اُس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا، تو آگے ریل کی پٹڑی پر بہت پیچھے ایک خاکی کاغذ کا ٹکڑا اُڑتا نظر آیا—— اُس نے خیال کیا کہ یہ میری ٹوپی ہے۔

اس خیال کے آتے ہی اُس کے دِل کو ایک دھکّا سا لگا۔ باپ کی طرف ملامت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اُس نے کہا

"باپو جی—— میری ٹوپی!"

مسٹر راما شنکر اچاریہ خاموش رہے۔

"ہائے میری ٹوپی" رآم کی آواز بلند ہوئی۔

مسٹر راما شنکر اچاریہ کچھ نہ بولے۔

رآم نے روتی آواز میں کہا "میری ٹوپی!" اور اپنے باپ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

مسٹر راما شنکر اچاریہ نے اُس کا ہاتھ جھٹک کر کہا "گرا دی ہوگی تُو نے—— اب روتا کیوں ہے؟" اس پر رام کی آنکھوں میں دو موٹے موٹے آنسو تیرنے لگ گئے۔

"پر دھکّا تو آپ ہی نے دیا تھا" اُس نے اتنا کہا اور رونے لگ گیا۔

مسٹر راما شنکر اچاریہ نے ذرا ڈانٹ بتائی تو رآم نے اور زیادہ رونا شروع کر دیا۔ اُنھوں نے اُسے چُپ کرنے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئے۔ رآم کا رونا صرف ٹوپی ہی بند کرا سکتی تھی۔ چنانچہ مسٹر راما شنکر اچاریہ نے تھک ہار کر اُس سے کہا۔ "ٹوپی واپس آ جائے گی مگر شرط یہ ہے کہ تُو اُسے پہنے گا نہیں!"

رام کی آنکھوں میں آنسو فوراً خشک ہو گئے، جیسے تپی ہوئی ریت میں بارش کے قطرے جذب ہو جائیں۔ وہ سرک کر آگے بڑھ آیا۔

"اُسے واپس لائیے!"

مسٹر راما شنکر اچاریہ نے کہا "ایسے تھوڑی واپس آ جائے گی—— منتر پڑھنا پڑے گا۔"

کمپارٹمنٹ میں سب مسافر باپ بیٹے کی گفت گو سُن رہے تھے۔

"منتر—— !" یہ کہتے ہوئے رآم کو فوراً ہی وہ قصہ یاد آ گیا جس میں ایک لڑکے نے منتر کے ذریعے سے دوسروں کی چیزیں غائب کرنا شروع کر دی تھیں "پڑھیئے پتا جی!"

یہ کہہ کر وُہ خوب غور سے اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگا گیا منتر پڑھتے وقت مسٹر راما شنکر اچاریہ کے گنجے سر پر سینگ اُگ آئیں گے۔

مسٹر راما شنکر اچاریہ نے اُس منتر کے بول یاد کرتے ہوئے جو اُنھوں نے بچپن میں "اندر جال کمل" سے زبانی یاد کیا تھا کہا "تو پھر

شرارت تو وہ کرے گا۔"

"نہیں باپو جی" رام نے جو منتر کی گہرائیوں میں ڈوب رہا تھا، اپنے باپ سے شرارت نہ کرنے کا وعدہ کیا۔
مسٹر راما شنکر اچاریہ کو منتر کے بول یاد آگئے اور اُنہوں نے دل ہی دل میں اپنے حافظے کی داد دے کر اپنے لڑکے سے کہا "لے اب تو آنکھیں بند کر لے۔"

رام نے آنکھیں بند کر لیں اور مسٹر راما شنکر اچاریہ نے منتر پڑھنا شروع کیا۔
"اونگ نما کا میشری، مدمدیش اُوتما دے بھرینگ پر اسواہ" مسٹر راما شنکر کا ایک ہاتھ سیٹ کے نیچے گیا اور "سواہ" کے ساتھ ہی رام کی ٹوپی اُس کی گدگدی رانوں پر آگری۔
رام نے آنکھیں کھول دیں ــــ ٹوپی اُس کی چپٹی ناک کے نیچے پڑی تھی اور مسٹر راما شنکر اچاریہ کی نکیلی ناک کا بانسہ عینک کی سُنہری گرفت کے نیچے تھرتھرا رہا تھا ــــ عدالت میں مقدمہ جیتنے کے بعد اُن پر یہی کیفیت طاری ہوا کرتی تھی۔
"ٹوپی آگئی" رام نے صرف اس قدر کہا اور چپ ہو رہا اور مسٹر راما شنکر اچاریہ، رام کو خاموش بیٹھنے کا حکم دے کر اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ ایک خبر کافی دلچسپ اور اخباری زبان میں بے حد "سنسنی خیز" تھی۔ چنانچہ وہ منتر وغیرہ سب کچھ بھول کر اُس میں کھو گئے۔
دکن کوئین بجلی کے پروں پر پوری تیزی سے اُڑ رہی تھی ــ اس کے آہنی پہیوں کی یک آہنگ گڑگڑاہٹ، اخبار کی سنسنی پیدا کرنے والی خبر کی ہر سطر کو مَوسیقی مدد بخش رہی تھی۔ مسٹر راما شنکر اچاریہ یہ سطر پڑھ رہے تھے۔
"عدالت میں سناٹا چھایا ہوا تھا، صرف ٹائپ ایسٹر کی ٹک ٹک سنائی دیتی تھی۔ ملزم ایکا ایکی چلایا ــــ "باپو جی۔"
عین اس وقت رام نے اپنے باپ کو زور سے آواز دی "باپو جی" اور مسٹر راما شنکر اچاریہ کو یوں معلوم ہوا کہ زیر نظر سطر کے آخری الفاظ کاغذ پر اُچھل پڑے ہیں۔
رام کے تھرتھراتے ہوئے ہونٹ بتا رہے تھے کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔
مسٹر راما شنکر اچاریہ نے ذرا تیزی سے کہا "کیا ہے؟" اور عینک کے ایک گوشے میں سے ٹوپی کو سیٹ پر پڑا دیکھ کر اپنا اطمینان کر لیا۔
رام آگے سرک آیا اور کہنے لگا "باپو جی، وہی منتر پڑھیئے!"
"کیوں؟" یہ کہتے ہوئے مسٹر راما شنکر اچاریہ نے رام کی ٹوپی کی طرف غور سے دیکھا جو سیٹ کے کونے میں پڑی تھی۔
"آپ کے کاغذ جو یہاں پڑے تھے، میں نے باہر پھینک دیئے ہیں۔"
رام نے اس کے آگے کچھ اور بھی کہا مگر مسٹر راما شنکر اچاریہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا ــ بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ اٹھ کر اُنہوں نے کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا، مگر ریل کی پٹڑی کے ساتھ تتلیوں کی طرح پھڑپھڑاتے ہوئے کاغذی پُرزوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا۔

"تو نے وہ کاغذ پھینک دیئے ہیں جو یہاں پڑے تھے؟" اُنہوں نے اپنے داہنے ہاتھ سے سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

رام نے اثبات میں سر ہلا دیا "آپ ہی منتر پڑھیئے نا!"

مسٹر راما شنکر اچاریہ کو ایسا کوئی منتر یاد نہ تھا جو سچ مچ کی کھوئی ہوئی چیزوں کو واپس لا سکے۔ وہ سخت پریشان تھے۔ وہ کاغذات جو اُن کے بیٹے نے پھینک دیئے تھے، ایک نئے مقدمے کی مثل تھی جس میں چالیس ہزار کی مالیت کے قانونی کاغذات پڑے تھے — مسٹر راما شنکر اچاریہ ایم اے ایل ایل بی کی بازی اُن کی اپنی چال ہی سے مات ہو گئی تھی۔ ایک لمحے کے اندر اندر اُن کے قانونی دماغ میں کاغذات کے بارے میں سینکڑوں خیالات آئے۔ ظاہر ہے کہ مسٹر راما شنکر اچاریہ کے مؤکل کا نقصان اُن کا اپنا نقصان تھا مگر اب وہ کیا کر سکتے تھے — صرف یہ کہ اگلے اسٹیشن پر اتر کر ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیں اور دس پندرہ میل تک اُن کاغذوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہیں۔ ملیں نہ ملیں، یہ اُن کی قسمت۔

ایک لمحے کے اندر اندر سینکڑوں باتیں سوچنے کے بعد آخر میں اُنہوں نے اپنے دل سے فیصلہ کر لیا کہ اگر تلاش پر بھی کاغذات نہ ملے تو وہ مؤکل کے سامنے سرے سے انکار ہی کر دیں گے کہ اُس نے اُن کو کبھی کاغذات دیئے تھے۔ اخلاقی اور قانونی طور پر یہ سراسر ناجائز تھا مگر اس کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔

اس تسلی بخش خیال کے باوجود مسٹر راما شنکر اچاریہ کے حلق میں تلخی پیدا ہو رہی تھی، ایکا ایکی اُن کے دل میں آئی کہ کاغذوں کی طرح وہ رام کو بھی اُٹھا کر گاڑی سے باہر پھینک دیں مگر اس خواہش کو سینے ہی میں دبا کر اُنہوں نے اُس کی طرف دیکھا۔

رام کے ہونٹوں پر ایک عجیب و غریب تبسم منجمد سا ہو رہا تھا۔

اُس نے ہولے سے کہا "باپو جی، منتر پڑھیئے!"

"آرام سے بیٹھا رہ، ورنہ یاد رکھ گلا گھونٹ دوں گا —" مسٹر راما شنکر اچاریہ بھنا گئے۔

اُس مسافر کے لبوں پر جو غور سے باپ بیٹے کی گفتگو سن رہا تھا، ایک معنی خیز مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

رام آگے سرک آیا "باپو جی، آپ آنکھیں بند کر لیجیئے، میں منتر پڑھتا ہوں!"

مسٹر راما شنکر اچاریہ نے آنکھیں بند نہ کیں، لیکن رام نے منتر پڑھنا شروع کر دیا۔

"اونگ میانگ شیانگ — لدمدا گا .... فرودما .... سواہ" اور سواہ کے ساتھ ہی مسٹر راما شنکر اچاریہ کی گوشت بھری رانوں پر کاغذوں کا ایک پلندہ آ گرا۔

اُن کی ناک کا بانسہ عینک کی سنہری گرفت کے نیچے زور سے کانپا۔

رام کی چپٹی ناک کے گول اور لال لال نتھنے بھی کانپ رہے تھے!

× × × × × × × × × × × ×

سعادت حسن منٹو

ایک فرمائشی غزل

خواب میں اُن کو جا کے دیکھ لیا ‏ ‏ ‏ اُن کو، اُن سے چھُپا کے دیکھ لیا

میری دیوانگی کا کیا کہنا ‏ ‏ ‏ رُخ سے پردہ اُٹھا کے دیکھ لیا

نہ چھُپے میری آنکھ سے نہ چھپے ‏ ‏ ‏ تم نے خود کو چھُپا کے دیکھ لیا

میرے دل سے کبھی نکل نہ سکے ‏ ‏ ‏ تم نے دامن چھُڑا کے دیکھ لیا

تُم سے مِلنے کی آرزُو نہ گئی ‏ ‏ ‏ خاک میں بھی مِلا کے دیکھ لیا

نہ رکھا تم نے ایک دن بھی قدم ‏ ‏ ‏ ہم نے آنکھیں بچھا کے دیکھ لیا

اَور بھی دُور ہو گئے مجھُ سے ‏ ‏ ‏ دستِ کوتہ بڑھا کے دیکھ لیا

اِنفعالِ گناہ کم نہ ہُوا ‏ ‏ ‏ قبر میں مُنہ چھُپا کے دیکھ لیا

نہ لگا، جی کِسی جگہ نہ لگا ‏ ‏ ‏ ہر جگہ، جی لگا کے دیکھ لیا

اے غضب، غم یہاں بھی آ پہنچا ‏ ‏ ‏ محل اُونچے بنا کے دیکھ لیا

حاصلِ عمر کا پتہ نہ چلا ‏ ‏ ‏ عمر ساری گنوا کے دیکھ لیا

خاک حاصِل ہُوا نہ اَے امجد
ہر طرف خاک اُڑا کے دیکھ لیا

سید احمد حسین امجد حیدرآبادی

نئی دُنیا

بدل گئی وُہ پرانی دُنیا جدھر نظر کی جہاں نیا ہے
نیا زمانہ نئے ہیں بندے زمیں نئی آسماں نیا ہے

نئے ہیں غنچے نئی ہیں کلیاں نئے شجر گلستاں نیا ہے
نئی ہے فصلِ بہارِ گلشن چمن میں رنگِ خزاں نیا ہے

نئی ہیں صیاد کی نگاہیں نیا بچھایا ہے دام اُس نے
نئے ہیں صحنِ چمن کے طائر قفس نیا آشیاں نیا ہے

نیا ہی دشت اور نئی ہی وادی نیا ہی جادہ نئی ہی منزل
نیا ہے رستہ دکھانیوالا جرس نیا کارواں نیا ہے

نئے ہیں یہ ساکنانِ دُنیا نئی طرح کے ہیں ان کے مسکن
نرالی ہے بود و باش اِن کی مکیں نئے ہیں مکاں نیا ہے

نئی مساجد نئے منادر نئے مؤذن نئے پجاری
خدا نیا ہے دُعا نئی ہے جبیں نئی آستاں نیا ہے

نئی ہے محفل نیا ہے ساقی نیا سبو اور نئی صراحی
نیا ہے بادہ نئے ہیں میخوار اور پیرِ مغاں نیا ہے

نئے طریقے نئے سلیقے نئے قوانین ہیں ادب کے
نیا زمانہ نئی روش ہے نئی ہیں باتیں سماں نیا ہے

کہاں ہیں عہدِ کہن کے قصے کہاں ہیں وُہ تذکرے پرانے
نئی زباں ہے نئے فسانے جہاں کا طرزِ بیاں نیا ہے

کہاں وُہ دن اور کہاں وُہ راتیں کہاں ہیں اب وُہ پرانی باتیں
نئے ہیں لیل و نہار ناشادؔ اور دورِ زماں نیا ہے

رام پرشاد ناشادؔ

ہندوستانی موسیقی

پکے راگ اور کچے راگ کے الحاق کے متعلق چند تجاویز

(یہ مضمون، ر نومبر ۱۹۳۸ء کو میوزک کانفرنس الہ آباد میں پڑھا گیا)

جو مضمون میرے سپرد ہوا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ کلاسیکل میوزک اور لائٹ میوزک میں کس طرح سے الحاق پیدا کیا جاسکتا ہے اور وہ کونسا طریقہ ہے جس سے یہ ایک دوسرے کے قریب آجائیں۔ یعنی ہم مستند موسیقی اور غیر مستند موسیقی یا عام اصطلاح کے مطابق پکے راگ اور کچے راگ دونوں سے فائدہ اُٹھاسکیں۔

شاید آپ کو اس امر سے اتفاق ہوگا کہ یہ مضمون اپنے اندر ایک دشواری رکھتا ہے اور بالخصوص آج کل اس کے متعلق کوئی آخری اور حتمی فیصلہ کرنا دقت طلب ہے۔

جہاں ڈراما اور ریڈیو کی ترقی نے اس فن کو پھیلایا اور پبلک کو مستفید ہونے کے لئے آسانیاں بہم پہنچائیں وہیں ہرکس وناکس کو خود فروشی کا موقع بھی دے دیا ہے نیز ناواقفانِ فن اور عطائی حضرات نے اسے اپنے پروپیگنڈے اور نام ونمود کا ذریعہ سمجھا ہے اور چونکہ ان دونوں شعبہ ہائے تفریح کے مخاطب کثرت سے عوام ہیں اس لئے یہ غیر مستند چیزیں سُنا کر اُن کے غیر تربیت یافتہ اور پست ذہنوں سے خراجِ تحسین وصُول کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

وہ حضرات جو مستند موسیقی کے دلدادہ ہیں اور بزرگوں کی اس امانت کو نہایت دیانت داری کے ساتھ سینوں سے لگائے بیٹھے ہیں لوگوں کی اس کج روی کو دیکھ کر انہیں قلق ہوتا ہے۔ موسیقی کے وہ اصُول وقواعد جو اساتذہ اور ماہرینِ فن نے باندھے ہیں جب غیر ذمہ دار اور برخود غلط حضرات کی طرف سے اُن کی پائمالی ہوتی ہے تو انہیں ناگوار ہوتا ہے اور وہ کسی طرح بھی اس بات کو برداشت نہیں کرسکتے کہ اس مقدس فن کی اس بے دردی سے توہین کی جائے۔

دوسری طرف وُہ لوگ ہیں جو اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم ہیں۔ جنہوں نے اس فن کو کسی باکمال استاد سے حاصل نہیں کیا۔ اس کی مشق و مہارت میں عرق ریزی اور جانفشانی سے کام نہیں لیا بلکہ وہ محض مذاقِ فطری اور طبیعت کے رجحان پر بھروسا کئے ہوئے ہیں وہ کبھی پکے راگوں کو پسند نہیں کرتے اور اُن کی طبیعت ہمیشہ کچے راگ گنیوں کی طرف مائل ہوتی ہے۔ جب وُہ ایسی چیزیں سنتے ہیں جن کے سمجھنے میں انہیں دقت

ہوتی ہے، اور وہ داد نہیں دے سکتے نزشکایت کرتے ہیں اور بعض دفعہ تمسخر بھی کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس تضحیک و تمسخر میں حق بجانب ہیں اس لئے کہ ؎ فکر ہر کس بقدر ہمت اُوست

نیز عوام سے دقیق نکاتِ فن پرکھنے کی اُمید کرنا ایک ایسا خیال ہے جس کا واقعیت سے بہت کم تعلق ہے۔

ہندوستان میں لائٹ میوزک یعنی غیر مستند موسیقی کو پھیلانے میں سب سے زیادہ حصّہ ڈرامے نے لے لیا ہے اور جیسا کہ معلوم ہے، ہندوستانی ڈراما کو قدیم اسلوب سے نکال کر یورپین سانچہ میں ڈھالنے والے سب سے پہلے پارسی حضرات ہیں۔ اس قوم کی تاجرانہ نگاہ نے فرانسیسی opera کی وضع پر دکان سجائی۔ فرانسیسی ڈراما کی یہ خصوصیت تھی کہ اکثر مطالب کو نظم میں گا کر ادا کیا جاتا تھا چنانچہ قدیم ہندوستانی ڈراما میں بھی یہ فرانسیسی خصوصیت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ اسٹیج پر بادشاہ سے لے کر غلام اور ایک مہاتما سے لے کر عام دُنیادار تک ہر شخص گاتا ہؤا نظر آتا ہے۔ پھر جیسا کہ میں نے اُوپر بیان کیا کہ ڈراما کے مخاطب اکثر عوام ہوتے ہیں اگر اُن کے سامنے یہ نظمیں پکّے راگوں میں ادا کی جاتیں تو وہ بجائے محظوظ ہونے کے بے لطفی محسوس کرتے۔ نیز شاید تمثیلی مواقع اور مصالح کے لحاظ سے ہر چیز کو پکّے راگوں میں ادا کرنے کا وقت بھی نہ ہوتا اور بہت ممکن ہے کہ بعض دفعہ اداکار کی حرکات و سکنات میں فرق پڑ کر اظہارِ مطلب بھی پورے طور پر نہ ہو سکتا۔ اس لئے ایک ایسی موسیقی ایجاد ہو گئی جس میں مشرقی مذاق کے ساتھ یورپین انداز کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ اور غالباً اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ ہمارے ڈراما کی جائے پیدائش بمبئی ہے اور پارسی حضرات کے ہاتھوں میں پرورش پائی ہے۔ خود بمبئی کو ایک ساحلی مقام ہونے کی وجہ سے کوئی معیاری مشرقی شہر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ نیز پارسی حضرات بھی یورپین تہذیب میں ڈوبے ہوئے ہیں اور انہیں اکثر مشرقی موسیقی کی گہرائیوں سے بے خبری ہے۔

لہٰذا ڈراما میں وہی چیز آگئی جسے ہم لائٹ میوزک کہتے ہیں۔ اور چونکہ انسان قدرتاً نقل کا دلدادہ ہے اس لئے برقی سُرعتِ رفتار کے ساتھ "لائٹ میوزک" تمام ہندوستان میں پھیل گئی۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ہم ایسی کوشش کریں کہ لائٹ میوزک کو نیست و نابود کر دیں یا کلاسیکل میوزک کی وقعت کم کر دی جائے اور اسے عوام کے ہاتھوں کا کھلونا بنا دیا جائے ؛

نہیں ایسا نہیں! اپنی اپنی جگہ دونوں کی ضرورت ہے اگر ہم کلاسیکل میوزک کی جگہ عام چیزوں پر زور دیں تو ہمارے اس مقدس فن کا درجہ گر جائے گا اس لئے کہ علاوہ اُس مسرتِ قلبی اور سرورِ طبع کے جسے صرف وہی لوگ محسوس کرتے ہیں جنہوں نے اس بحرِ عمیق میں غوطہ زنی کی ہے ہماری موسیقی ایک قدیم تہذیب کی یادگار ہے اور ہمارے آبا و اجداد کے اعلیٰ تخیل اور بلند معیار زندگی کی بولتی چالتی تصویر ہے یہ ہماری نگاہوں کے سامنے اس زمانہ کا سماں باندھ دیتی ہے جبکہ اطرافِ عالم میں بربریت اور وحشت کا دَور دَورہ تھا آج کے مہذب ممالک میں تہذیب کا چراغ نہ جلا تھا اور ہندوستان کے حکما نکتہ سنج موسیقی سے جذبِ روحانی، صفائے باطن اور تزکیۂ نفس کا کام لے رہے تھے۔ وہ راگ اور راگنیوں سے من کے مندر میں معرفت کا چراغ جلاتے تھے۔ سُر اور تال سے رُوح کی سوتی ہوئی قوتیں جاگ اٹھتی تھیں۔ ستارہ سے تو جہٹ

کر صرف پرمیشر سے دھیان لگ جاتا تھا اور وہ ہر چیز سے خالی الذہن ہو کر صرف الیشور کی بھگتی میں لگ جاتے تھے آتما کی شانتی اور رُوحانی حالت کو بلند کرنے میں ہندوستانی موسیقی کو ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔

یہ مسلمہ امر ہے کہ ہر ایجاد کی کوئی نہ کوئی غرض وغایت ہوتی ہے جہاں تک اس فن کا تعلق ہے اس کے اسباب اختراع میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حکمائے ہند نجوم سماوی کو مدرک بالذات، ذی رُوح، صاحبِ نفسِ ناطقہ اور اس عالم میں متصرف اور مؤثر مانتے تھے اور جو تغیرات و حوادث مثلاً سعادت و نحوست یا فتح و شکست، غلبہ و اسیری اور رہائی ان پر وارد ہوتے تھے ان کو ستاروں کے اثرات پر محمول کرتے تھے۔ جب اُن کے دل میں یہ اعتقاد راسخ ہو گیا تو اُنہوں نے ایک ایسی چیز کی ضرورت محسوس کی جو آڑے وقت میں اُن کی ڈھارس بندھائے اور اچھے وقت میں فرحت و سرور کا ذریعہ ہو۔ چنانچہ اُنہوں نے تاثیرات سماوی پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے برت، خیرات، ترکِ دنیا، ترکِ لذات اور الیشور کی بھگتی کو ذریعہ قرار دیا۔ وہ خدا کے حضور میں نہایت تضرّع و زاری، توبہ و استغفار اور عجز و انکسار کے ساتھ دُعائیں اور مناجات کرتے تھے۔ الیشور ان کی دعاؤں کو سنتا تھا اور اُن کے سر سے بلاؤں کو ٹال دیتا تھا۔ عبادت کے وقت یہ مناجاتیں ایک خاص لحن میں گائی جاتی تھیں۔ اس لحن کی تاثیر سے ان کی آتما کو شکتی اور شانتی، اُن کی رُوح کو تسلّی، اطمینان اور سکون محسوس ہوتا تھا۔ اور اس حقیقت میں کوئی شک نہیں کہ ہماری موسیقی اطمینانِ قلب کا سرچشمہ ہے۔ یہ توجہ کو ظاہر سے باطن کی طرف پھیر دیتی ہے اور انسان ماسوی اللہ سے بے خبر ہو کر اُس سرچشمۂ وحدت میں فنا ہو جاتا ہے جو تمام کائنات کا منبع اور موجودات کا نقطۂ اوّل ہے۔ اہلِ باطن اور صوفیا اس کو غذائے رُوحانی اور انجلائے باطن کے لئے استعمال کرتے ہیں اور ہمارے سادھوؤں کی عبادت کا ایک اعلیٰ جزو ہے۔ کسی راگ کے بول تانیں اور لئے سُن کر انسان کی رُوح اپنے مرکزِ اعلیٰ کی طرف پرواز کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

بہر حال ہمارے قدما رفتہ رفتہ موسیقی کو مختلف کاموں میں استعمال کرنے لگے۔ جنگ میں قوتِ شجاعت کو اُبھارنے کے لئے ایک خاص قسم کا راگ جسے "مشجّع" کہتے ہیں گایا جانے لگا۔ پھر راگوں کی تاثیر سے بیماریوں کو دُور کرنے لگے اور شفاخانوں میں شغل کے لئے گانے لگے۔ غم واندوہ کو مسرت و شادمانی سے بدلنے کے لئے علیحدہ راگ ترتیب دیئے گئے۔ غرض ہر موسم ہر وقت اور ہر موقع کے لحاظ سے بہت سے راگ اور راگنیاں پیدا ہو گئیں۔ پھر ہر راگ اور راگنی کا ایک خاص سماں باندھا گیا اور اُن کے اوصاف کو محسوس صورت میں بیان کرنے کے لئے مصوّروں نے تصویریں بنائیں۔

اس مقام پر میرا روئے سخن خاص طور سے اُن حضرات کی طرف ہے جن کو اس فنِ لطیف کی محافظت کا دعوےٰ ہے اور جن کو خزانۂ الٰہی سے یہ نعمت تفویض ہوئی ہے کہ وہ اپنے فرائض کو نہ بھُولیں اور جس غرض کے لئے یہ فن معرضِ وجود میں آیا تھا اُسے اس کے مرکز سے نہ ہٹنے دیں۔

ہماری موسیقی محض کھیل تماشوں کے لئے نہیں بلکہ یہ ایک مستقل سائنس ہے۔ اس میں خدا پرستوں کے لئے رُوحانی تسلّی، بیماروں کے لئے شفا، متلاشیانِ مسرت کے لئے خوشی، ٹوٹے ہوئے دِلوں کے لئے اطمینان اور تھکے ماندے لوگوں کے لئے دماغی راحت کا

سامان موجود ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم ایسی مقدس چیز کو محض لہو ولعب کی مجالس اور عیاشی کے لئے استعمال کریں یا ہمارا انتہائی مقصد کسی سرمایہ دار کو خوش کر کے چند روپے وصُول کرنا ہو۔ ضرورت ہے کہ اس فن کو فن ہی کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ اور اس کے لئے اپنے وطن کے علوم وفنون سے محبت کے علاوہ تمام قوم کے مجموعی تعاون کی بھی ضرورت ہے۔ اس کو اس کی علتِ غائی تک پہنچانے کے لئے تمام قوموں کو حصہ لینا چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے لئے اختراع وایجاد کا سہرا ہنود کے سر ہے مگر مسلمانوں نے اس میں جو اضافہ کیا اور اس کی نشوونما میں جو حصہ لیا وہ بھی کچھ کم نہیں۔

چنانچہ مسلمان اپنے دورِ حکومت میں ہمیشہ اس فن کی ترقی میں مصروف رہے۔ دکن کی ریاستوں اور سلطنتِ مغلیہ نے ہمیشہ اہلِ فن کی قدر اور سرپرستی کی۔ غالباً ہم سب کو اپنے ملک کی مائہ ناز شخصیت امیر خسرو کا نام یاد ہوگا۔ بہار راگ اور بسنت کے موجد وہی ہیں۔ بین کو مختصر کر کے ستار بھی انہیں نے نکالا۔ ابراہیم عادل شاہ والیٔ بیجاپور ایک ماہر موسیقی داں تھا۔ اس کے زمانہ میں اس فن کو بڑی ترقی ہوئی۔ خود اُس نے نورس نامہ تحریر کیا جس کا مقدمہ سہ نثر ظہوری مشہور ومعروف کتاب ہے دربارِ اکبری کے پروردہ امام فن تان سین کا نام تو ہر شخص کی زبان پر ہے ہی۔ سلطان حسین جونپوری نے اسے پندرھویں صدی میں کافی ترقی دی۔

غرض ہندوستان کی تمام قوموں میں اس کے ماہر گزرے ہیں اور یہ جلسہ خود اس امر کی بین شہادت ہے کہ ہم سب ہندوستانی اس فن کو خاص اپنی ملک سمجھ کر عزیز رکھتے ہیں۔

لیکن ہر شخص اتنا خوش نصیب نہیں کہ اس بلند پایہ پر پہنچ سکے اور اس امر کا مدعی ہو سکے کہ میں نے اس بحرِ ناپیدا کنار کو عبُور کر لیا ہے۔

معزز سامعین!

بات اس قدر دلچسپ تھی کہ میں کہتے کہتے اس کی وسعتوں میں کھو گیا اور ع

کہاں نکل گیا آیا تھا میں کہاں کے لئے

بہرحال موسیقی ایسی چیز ہے کہ ہر انسان کو اس سے کچھ نہ کچھ لگاؤ ضرور ہوتا ہے چنانچہ مثل مشہور ہے کہ گانا اور رونا کون نہیں جانتا۔ اپنی دلبستگی اور وقت گزارنے کے لئے ہر شخص گاتا ہے۔ مزدور اپنے احساسِ محنت کو کم اور راہ رو مسافت کی خستگی کو رفع کرنے کے لئے گاتے ہیں۔ صرف افرادِ انسانی ہی نہیں بلکہ پرندے بھی گاتے ہیں اور جانور بھی سمجھتے ہیں۔ عرب کی حدی خوانی مشہور ہے اگلے زمانہ میں گوالے دُودھ دوہتے وقت ایک خاص راگ گاتے تھے جس سے جانور مطیع ہو جاتا تھا۔ سری کرشن جی کی بانسری کی آواز سے جنگل کے جانور آپ کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔

ایک بچہ بھی گاتا ہے لیکن ہم اُس سے کسی باقاعدگی یا دلفریب تانوں کی اُمید نہیں کر سکتے۔ اسی طرح ہمیں عوام سے بھی

کسی فنی مہارت اور اصولِ موسیقی کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ وُہ اپنا شوق پورا کرنے اور دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے اپنی طبعی اپج سے گاتے ہیں۔ اور موجودہ زمانہ میں فلم اور ناٹک والوں کو چونکہ زیادہ تر انہیں لوگوں کو مخاطب کرنا ہوتا ہے لہٰذا وہ بھی بلند معیار سے گر کر انہی عام چیزوں کو پیش کرتے ہیں۔

سب سے پہلے ضروری امر یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کو ابتدا ہی سے "کلاسیکل میوزک" سکھائیں تاکہ پکے راگ ان کی رگ رگ میں رچ جائیں اور وہ کبھی غیر معیاری چیزوں کی طرف متوجہ ہی نہ ہوں۔ جب پبلک کا مذاق بدل جائے گا تو ناٹک والے خود بخود اپنی روش بدل دیں گے۔

عوام کے ذوقِ نغمہ سنجی کو ہم ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ جب ایک بچہ اسکول میں داخل ہوتا ہے تو سب سے پہلے اُستاد اُسے اسکول کے علمی ماحول سے مانوس کرتا ہے پھر اُس کو ابجد پڑھائی جاتی ہے پھر وُہ قانونی جماعتوں میں ترقی کرتا ہے اور رفتہ رفتہ کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرتا ہے۔

یہی حال موسیقی کا بھی ہے، لوگوں کا ہلکے راگ گانا ان کا علمی ماحول اور ابجد خوانی ہے انہیں اس منزل سے گزرنا بھی ضروری ہے لیکن ہمیں اس منزل میں قیام کرنا موزوں نہیں۔ بلکہ اس ذوق سے فائدہ اُٹھا کر اُن کو کلاسیکل میوزک کی طرف متوجہ کر دیا جائے اگر ایک بچہ لائٹ میوزک کے گانوں کو آسانی سے یاد کر لیتا ہے تو اوّل اوّل مشق و مہارت کے لئے یاد کر لینے دینا چاہیئے اور پھر اُسے آگے بڑھانا چاہیئے۔

اس امر کے لئے ضروری ہے کہ جگہ جگہ بلند پایہ اسکول کھولے جائیں، یونیورسٹیاں موسیقی کو اپنے نصاب میں داخل کریں اور اس فن کو علمی حیثیت سے علم سینہ نہیں بلکہ علم سفینہ بنا دیا جائے۔ چنانچہ الٰہ آباد اور لکھنؤ نے اسکول کھول کر اور بنارس یونیورسٹی نے اپنے نصاب میں داخل کر کے اس فن کی جو خدمت انجام دی ہے وُہ اس کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اِن مقامات کی تعلیم کے آثار ظاہر ہونے لگے ہیں اور جو طالب علم یہاں سے نکلتے ہیں اُنھوں نے کافی امتیاز حاصل کر لیا ہے۔ مختصر یہ کہ جب پبلک کا مذاق بلند ہو جائے گا تو لائٹ میوزک اور بے راہ روی کا خود بخود خاتمہ ہو جائے گا۔

لیکن زمانہ کا تقاضا ہے کہ کلاسیکل میوزک کا مرتبہ برقرار رکھنے کے لئے ضرورتِ وقت کے مطابق اس میں بھی کچھ ترمیم کی جائے۔ ایک وقت تھا کہ ضروریاتِ زندگی بہت مختصر تھیں اور جتنی تھیں وُہ آسانی سے پُوری ہو جاتی تھیں لہٰذا لوگوں کو کافی فرصت تھی۔ گویّے اطمینان سے گاتے تھے اور شائقین بے فکری سے سنتے تھے لیکن اب حالات بدل گئے ہیں اور سامعین کے پاس وقت کی بڑی قلّت ہے، لہٰذا مصلحتِ وقت اب یہ اجازت نہیں دیتی کہ گویّے بہت دیر تک اپنے ساز درست کریں اور پھر گھنٹوں ایک ہی راگ کو الاپتے رہیں اس لئے اب موسیقی کو مقبولِ عام بنانے کے لئے ضروری ہے کہ راگ کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ تمہید میں وقت ضائع نہ ہو۔ سرگمیں جو اس کی بڑی صنعت

کو دکھاتی ہیں انہیں کوزہ میں بند کیا جائے اور الاپ کو کم کیا جائے۔ البتہ گویّے اپنی نجی مشق میں اس گرامر کو اچھی طرح استعمال کریں۔

نیز ہماری موسیقی میں ایک خاص کمی تحریر کی ہے جیسا کہ میں نے بالائی سطور میں اشارہ کیا ہے اس مضمون کو تحریر میں لانے کی ضرورت ہے تاکہ حادثاتِ زمانہ سے یہ فن محو نہ ہو جائے۔

اگرچہ یہ علم اب تک سینہ بسینہ چلا آتا ہے لیکن انسان میں نسیان کا مادہ موجود ہے اور وہ بسا اوقات نہایت قیمتی باتیں بھی بھول جاتا ہے۔ مثلاً کرنواب علی مرحوم اور بھات کھنڈے صاحب بمبئی نے اسے تحریر کرنے کی کوشش کی ہے اور ہم اُن کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں۔

اس مقام پر غور طلب امر یہ ہے کہ ہم تحریرِ موسیقی کے لئے کونسا طریقہ اختیار کریں اس وقت ہمارے سامنے دو طریقے ہیں ایرانی اور انگریزی۔ پُونے کی ایک سوسائٹی مغربی طریقہ پر کتابیں طبع کرتی ہے لیکن اس طریقہ سے سیکھنے میں ذرا دیر لگتی ہے۔ لیکن مشق سے سب کام آسان ہو جاتے ہیں۔ پھر اس کا یہ فائدہ بھی ہوگا کہ آدمی دونوں کو سمجھ سکتا ہے۔ اگرچہ دونوں میں بڑا فرق ہے مگر بعض باتیں ایک دوسرے کی معاون بھی ہو سکتی ہیں۔ مجھے اپنی رائے پر اصرار نہیں ہاں اس امر کی ضرورت سمجھتا ہوں کہ اہلِ فن دونوں طریقوں کا مطالعہ کریں جس کو بہتر سمجھیں اختیار کریں۔

مضمون بہت طویل ہو گیا۔ میں آخر میں صرف ایک بات کہہ کر آپ حضرات سے رخصت ہوتا ہوں اور وہ یہ کہ ہم اہلِ مشرق اپنے بزرگوں کی میراث میں کچھ اضافہ کرنے کے عادی نہیں ہیں اور ان کی تحقیق کو اتنا کامل سمجھتے ہیں کہ اس میں نقطہ لگانا بھی گناہ خیال کیا جاتا ہے حالانکہ تجربہ شاہد ہے کہ ہر فن میں ترقیات کی گنجائش ہے۔

اساتذۂ موسیقی سے میری درخواست ہے کہ انہی راگ راگنیوں پر قناعت نہ کریں جو قدما چھوڑ گئے ہیں بلکہ ان میں اضافہ کریں اور اُن کے نئے نئے استعمالات معلوم کریں۔ مجھے افسوس ہوتا ہے کہ آج کل جب کہ ہر سائنس ترقی کر رہی ہے یہ فنِ لطیف رُو بہ تنزل ہے اور ہم اس کی اہمیت کو کھوتے جا رہے ہیں۔ اگر زمانۂ اکبری میں تان سین پیدا ہوا تو اسی مٹی سے دوبارہ ایسے باکمال پیدا کیوں نہیں ہو سکتے۔ فقط

کے ایل رلیا رام

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

تُو اور مَیں

(اپنے عزیز دوست عبدالرحمٰن کے نام معنون کرتا ہوں جن کے اشعارِ منثور نے اس نظم کا پس منظر قائم کیا۔)

وقت نے تیرے خیالات بدل ڈالے ہیں

اب ترا حُسن سرِ بام نہیں میرے لئے
اب کوئی وصل کا پیغام نہیں میرے لئے
عشقِ رفتہ کے تصوّر سے پشیماں ہے تُو
اپنے اُس گزرے ہوئے عہد پہ حیراں ہے تُو
آہ! جن آنکھوں میں دیکھی تھی محبت مَیں نے
اُنہیں آنکھوں میں چھپی دیکھی ہے نفرت مَیں نے
اب ترے ہونٹ نہیں میرے لئے آبِ حیات
اب اُنہیں ہونٹوں پہ ہیں میرے لئے لفظِ ممات
یہ دُعا ہے تری مَیں جلد فنا ہو جاؤں
اِس جوانی ہی میں دُنیا سے جُدا ہو جاؤں
تاکہ مِٹ جائے ترے "اوّلیں رومان" کی یاد
اور ماضی کی خلش سے ہو ترا دل آزاد
ہے مگر میرے خیالات کا انداز وہی
میرے نغمے ہیں وہی اور مرا ساز وہی
مرے لب پر یہ دُعائیں ہیں کہ تُو زندہ رہے
اور ترے ساتھ ترا حُسن بھی پائندہ رہے
تاکہ محفوظ رہے میری محبّت کا نشاں
مرے گزرے ہوئے لمحاتِ مسرت کا نشاں

عطاءاللہ سجّاد

آرزو

آرزُو، جلوۂ آئینۂ نادانی ہے
آرزُو، غازۂ رُخسارِ پشیمانی ہے
آرزُو سجدہ گزارِ صنمِ فانی ہے

جمع ہوتے ہیں بہت خوابِ پریشاں اِس سے
چاک ہوتا ہے محبّت کا گریباں اِس سے
غیرتِ عشق، ازل سے ہے گریزاں اِس سے

ہر نفَس کو ہوَس آلُود بنا دیتی ہے
عالمِ زیست کو محدُود بنا دیتی ہے
آرزُو غیر کو معبُود بنا دیتی ہے

آرزو، داغ ہے دامانِ محبّت کے لئے
آرزو، ننگ ہے مردانِ محبّت کے لئے
آرزو کفر ہے ایمانِ محبّت کے لئے

ناشناس دلِ محبوب، اگر ہے تو یہی،
حائلِ منزلِ محبوب، اگر ہے تو یہی،
بالیقیں غافلِ محبوب، اگر ہے تو یہی

مسکنِ برقِ وفا سوز ہے خرمن اِس کا
گوشۂ عشرتِ فانی ہے نشیمن اِس کا
دُور کچھ دستِ ہوس سے نہیں دامن اِس کا

عشق خورشیدِ جہاں تاب ہے، خود تاب ہے یہ
عشق بے خواب، خرابِ ہوسِ خواب ہے یہ
عشق اسباب شکن، بندۂ اسباب ہے یہ

عشق آزاد، یہ وابستۂ دامِ جذبات
عشق خود دار، یہ خود رفتۂ جامِ جذبات
عشق جذبات پہ غالب، یہ غلامِ جذبات

عشق محجوب، یہ رُسوا سرِ بازارِ جہاں،

عشق آزادِ دو عالم، یہ گرفتارِ جہاں
عشق مسجودِ جہاں ہے، یہ پرستارِ جہاں

عشق بیزارِ طلب، اور طلب آموز ہے یہ
عشق تمکینِ جنوں، اور خرد افروز ہے یہ
عشق ہے سوزِ خودی، اور خودی سوز ہے یہ

یہ وہ جذبہ ہے جو پستی سے بہت دور نہیں
یہ وہ شعلہ ہے، کہ جس میں اثرِ نور نہیں
شورِ منصورؒ ہے لیکن دلِ منصورؒ نہیں

آرزو، شمع ہوس ظلمتِ ایوانِ حیات
آرزو، شعلہ زنِ پاکئ دامانِ حیات
آرزو، مرگ ہے اے محرمِ عرفانِ حیات

روشؔ صدیقی

معصوم قاتل

(۱)

سید عرفان علی صاحب دہلوی، ایک مشہور خاندان کے فرد تھے، ان کی والدہ انہیں چھوٹا سا چھوڑ کر سدھار گئی تھیں، شفیق والد نے پالا پوسا، اردو فارسی خود پڑھائی، پھر انگریزی تعلیم کی غرض سے سرکاری اسکول میں داخل کر دیا۔ خداداد ذہانت کے علاوہ سید صاحب کو دلی شوق تھا، ہر درجے میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہوتے ہوتے دسویں جماعت تک پہنچ گئے۔

عین اس وقت کہ امتحان کی تیاری میں مشغول تھے، بڑے میر صاحب علیل ہوئے، چھوٹتے ہی آنکھیں لگ گئیں، سید صاحب نے خوب خوب حقِ فرزندی ادا کیا، دوا دوش میں دقیقہ نہ اٹھا رکھا، تیمارداری میں راتیں کالی کیں اور ان پریشانیوں کے باوجود امتحان میں بھی بیٹھے ادھر کامیابی کا مژدہ آیا، ادھر اسی روز ان کے سر سے والدِ ماجد کا سایہ اٹھ گیا، اس سانحہ سے سید صاحب کا کچھ ایسا دل ٹوٹا، وہ جی اچاٹ ہوا، تعلیم و تعلّم کا سلسلہ توڑ گوشہ نشین ہو گئے۔

خدا بخشے بڑے میر صاحب مرحوم ان کی شادی تو اپنی زندگی ہی میں کر گئے تھے، اب خسر صاحب کو جو داماد کی افسردہ خاطری کا حال معلوم ہوا، تو بہت کڑھے، دل دہی کے خیال سے لڑکی کی رخصت کر دی۔

اس نیک بی بی نے بھی خاوند کی خدمت گزاری میں کسر نہ اٹھا رکھی، کٹھ پتلی کی طرح اشاروں پر چلتی کہ میاں کا جی بہلا رہے۔

سید صاحب کو اتنی میراث پہنچی تھی، کہ بلا منتِ غیرے تا زیست گزر بسر کر سکتے تھے، تاہم عزیز و اقارب دوست احباب نے سمجھایا، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا ٹھیک نہیں، جد و جہد کا ہی نام زندگی ہے، بیکاری میں ہزار فتنے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، انسان کو کچھ نہ کچھ شغل ضرور چاہئے!

رفتہ رفتہ سید صاحب کسی قدر راہ پر آئے، نکھٹو پن سے طبیعت گھبرانے لگی، ان کے خسر صاحب کسی وقت ریاست دھولپور میں سپرنٹنڈنٹ رہ چکے تھے، ایک بار جو پنشن لینے گئے، انہیں پولیس میں بھرتی کراتے آئے۔

پڑھے لکھے ذی ہوش آدمی، اس پر بڑے بڑوں کی سفارش، رنگروٹی کی میعاد ختم ہوتے ہی، پہرہ چوکی کے بجائے انہیں شہر کی کوتوالی میں کارِ تحریر پر لگا دیا گیا۔

بیشک پولیس بدنام ہے اور واقعی پولیس والے کرتے بھی ظلم زیادتی ہیں، لیکن پانچوں انگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں، ہمارے

سید صاحب ایک تربیت یافتہ نیک فطرت انسان تھے، اپنی دیانت داری مستعدی اور کارگزاریوں کے باعث بہت جلد سب انسپکٹری تک ترقی کر گئے۔

اس عہدے پر فائز ہونے کے بعد وہ جس جس حلقہ میں رہے کسی کو شکایت کا موقع نہ دیا، نہایت تن دہی و جانفشانی سے فرائض منصبی انجام دیتے رہے، سنگین جرائم کا کھوج لگایا، عجیب عجیب وارداتیں پکڑیں، چوری ڈکیتی کا قلع قمع کیا، پیچیدہ معاملات سلجھائے، اور رشوت کے نام پھوٹی کوڑی کے روادار نہ ہوئے۔

اُن کی ترقی کو بمشکل دو ہی سال گزرے ہوں گے، نئے سپرنٹنڈنٹ صاحب نے صدر مقام سے ایک ایسے تھانہ میں ان کا تبادلہ کر دیا، جو پختہ سڑک اور ریلوے اسٹیشن سے فاصلہ پر تھا، اُنہوں نے سوچا کہ نئی جگہ ہے نہ جانے کیا اُفتاد پڑے، کیسی کیسی دقتیں پیش آئیں اس واسطے ہفتہ بھر کی چھٹی لے کر اپنی اہلیہ اور بچے کو خسر صاحب کے پاس دہلی چھوڑ آئے۔

(۲)

اس تھانہ میں پہنچے تو یہاں بھی اُن کی مقبولیت شروع ہو گئی، سید صاحب کے برتاؤ سے وہاں کے لوگ باگ بہت خوش ہوئے جا بجا چرچا ہونے لگا، کہ بھئی اب کا تھانہ دار تو بہت اچھا آیا ہے، چراغ لے کر ڈھونڈو تو ایسا شریف آدمی نہ ملے گا۔

کسی کے یہاں کوئی تقریب ہوتی سید صاحب ضرور مدعو کئے جاتے، ایک بار کسی شادی میں بلائے گئے۔ وہاں اُسی نواح کی ایک طوائف "حتو" کا مجرا ہوا، ویسے تھی تو وہ کہنے کو دیہاتی، مگر بلا کی مردم شناس، نہایت تیز طرار اپنے فن میں طاق، پوری پوری مشاق خوب ناچی گائی، وہ وہ بزت بھاؤ کیا، محفل پر چھا گئی۔ اس وقت نہ جانے حتو کی کون سی ادا سید صاحب کو بھا گئی، آپ لٹو ہی تو ہو گئے۔ اُس کا اتا پتہ لے لیا، اور اس تقریب کے بعد کبھی کبھار اس کے گھر آنے جانے لگے۔

اس آمد و رفت سے خلا ملا بڑھتا گیا، کچھ ایسی میرزان پٹی حتو جان اپنے کنبہ قبیلے سمیت اسی قصبہ میں آ بسی، پھر تو وہ پینگیں بڑھیں وہ پینگیں بڑھیں سو حیلے حوالوں سے سید صاحب نے اُس کو خانہ نشین کر لیا۔

اب تو حتو کے متعلقین بڑے سٹ پٹائے، لگے واویلا کرتے، دُہائی تہائی مچاتے پھرے، کیسے کیسے پھن پیٹے، کن کن ذریعوں سے کیا کیا کوششیں کیں، ایک نہ چلی، آخر رو پیٹ کر بیٹھ رہے۔

اِدھر ذات برادری کی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑیں، اُدھر حتو نے آہستہ آہستہ سید صاحب پر رنگ چڑھانا شروع کیا، کچھ ایسے ڈھرے پر ڈالا، مزاج ہی بدل دیا، مانا کہ اپنی فطرت کے خلاف اُنہوں نے رشوت ستانی کا بازار تو گرم نہیں کیا تاہم موقع بے موقع ڈالی نذرانے کی صورت میں کچھ نہ کچھ ضرور قبول کرنے لگے۔

اس زرخیز علاقہ میں اُوپر کی آمدنی یعنی دستِ غیب کی کافی گنجائش تھی، تھوڑے ہی عرصہ میں حتو کے پاس نقرئی طلائی زیورات

کے چھرے جوڑ ہو گئے، کچھ وقت گزرنے کے بعد تیج تہوار پر اس کے متعلقین سلام کے بہانہ آنے جانے لگے، پھر کبھی کبھی سید صاحب سے اجازت لے کر حستو انہیں کچھ نقد و جنس دے دیا کرتی تھی، رفتہ رفتہ گھڑی دو گھڑی کے لئے اس کو اپنی اماں اور ماموں وغیرہ کے پاس آنے کا موقع بھی ملنے لگا۔

مطلب یہ کہ سید صاحب اچھی طرح حستو کے قابو میں آ گئے، جو ہتّے چڑھتا ہضم کر لیتی، شروع شروع میں اُنہوں نے بیوی بچے کے لئے ایک آدھ منی آرڈر کیا تھا، پھر تو وہ آنکھوں پر ٹھیکری رکھی، ایسا کانوں میں تیل ڈالا، خطوں کا جواب دینا بھول گئے گویا دُنیا میں ان کا کوئی ہے ہی نہیں، بس حستو ہی سب کچھ ہے۔

اسی حال میں پانچ سال گزر گئے، سید صاحب نے گھر بار کی سُدھ نہ لی، کتنی ہی چھٹیاں نکل گئیں، آدمی آئے، خط و کتابت ہوئی، اُن کے کان پر جُوں نہ رینگی۔

ایک دن گھر کے لفافہ میں اُن کے بچہ کے ہاتھ کا لکھا ہُوا ٹیڑھا بھڑنگا سا پرچہ نکلا، بیوی کا خط تو اُنہوں نے یوں ہی رہنے دیا، بچے کا پرچہ دیکھنے لگے، اس پرچہ میں دو تین ٹوٹے پھوٹے فقروں کے بعد تحریر تھا:۔

"ابا جان! آج ایک لڑکے کے باپ نے مجھے ناحق مارا ہے ...... اُس وقت سے کئی دفعہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہوں ..... کہ میرے ابا یہاں نہیں ہیں ..... اب آپ کب تک آئیں گے ... جلدی سے آجایئے ...."

چھاتی پر دھکا لگا، اور جیسے سچ مچ کلیجہ پاش پاش ہو گیا ..... روتے روتے آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹنے لگیں۔

سُورج ڈھل چکا تھا، تھوڑی دیر اُداس اُداس رہے پھر تھانہ سے اُٹھ کر نڈھال بےحال گھر چلے آئے۔

آج پہلا دن تھا کہ حستو اُنہیں بارِ خاطر معلوم ہوئی، اس کی ہر بات ناگوار گزرنے لگی، صُورت سے جی بیزار ہو رہا تھا، پہلے تو وہ خاک نہ سمجھی، پھر ان کے میلے تیوروں سے تاڑ گئی کہ ہاں کچھ دال میں کالا ہے، لگی چاپلوسی کی باتیں کرنے، سید صاحب نے مطلق پروا نہ کی۔ ایسے گم سم ہوئے، حستو کو آدھی بات کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔

(۳)

رات کا کھانا کھانے بیٹھے تو نوالہ اٹکنے لگا، آخر دسترخوان سے اُٹھ کر پلنگ پر جا پڑے، حستو آئی اور ہمدردانہ لہجہ میں ٹھنک ٹھنک کر کہنے لگی:۔

"اے صدقے کیسا مزاج ہے آپ کا؟"

سید صاحب نے بُری طرح جھڑک دیا:۔

"اِس وقت بولنے کو جی نہیں چاہتا، طبیعت ٹھیک نہیں ہے ہماری ..... جاؤ سو رہو!"

اصل بھید تو وہ جانیں یا خدا اُنہوں نے کسی کو بتایا نہیں، ہاں حسنو کی زبانی اتنا ضرور معلوم ہُوا تھا، کہ اُس رات سیدصاحب نے ہاتھ پیر پٹخنے اور کراہ کراہ کر سویرا کر دیا۔

اس واقعہ کے چار دن بعد تک وہ کھوئے کھوئے سے رہے، پانچویں روز کانسٹیبل نے دروازے پر آواز دی، دوڑے دوڑے گئے اور اُلٹے قدموں واپس آکر مُسکراتے ہوئے کہا:۔

"حسنو! ذرا تم اپنے گھر چلی جاؤ!۔۔۔ جب بُلاؤں تب آنا!!"

اُس نے پُوچھا "کیا بات ہے؟"

جواب دیا "کچھ نہیں، تم چلی جاؤ۔۔۔ فوراً۔۔۔ جاؤ۔۔۔ جاؤ۔۔۔ چلی جاؤ۔۔۔ ابھی جاؤ!"

کیونکہ وہ ہمیشہ اُس کے ساتھ کوئی نہ کوئی آدمی کر دیا کرتے تھے، اس واسطے اس نے پُوچھا:۔

"کس کے ساتھ جاؤں؟"

بولے:۔ "اس وقت آدمی وادمی کوئی نہیں، اکیلی ہی چلی جاؤ۔۔۔ ہائیں ہائیں۔۔۔ کیوں دیر لگا رہی ہو۔۔۔ جاؤ۔۔۔ بس کہہ دیا جاؤ!"

پھر سیّد صاحب جلد جلد صافہ باندھنے لگے، اور حسنو مایوس ہوکر ایک بدحواسی کے سے عالم میں جُوتیاں سٹر سٹر کرتی دروازے سے باہر ہوگئی۔

(۴)

حسنو کو گھر پہنچے کوئی دس پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے، معلوم ہُوا سیّد صاحب کے بیوی بچّے دلّی سے آگئے، ہاں ہاں یُوں کہو، ضرور اُنہوں نے خط و کتابت کی ہوگی، جب ہی تو، ورنہ کل تیسرے پہر بیل گاڑی اور دو چوکیدار ریلوے اسٹیشن پر کیوں بھیجتے۔

جس گھر میں سیّد صاحب اور حسنو نظر آیا کرتے تھے، اب وہی گھر اُن کے بیوی بچّے اور تیرہ چودہ سالہ چھوٹے سالے کی آمد سے گویا سوتے سوتے جاگ اُٹھا، ایک عجیب چہل پہل ہوگئی۔

پچھلی رات ریلوے اسٹیشن سے گاڑی ہنکی تھی، کوئی نو ساڑھے نو بجے تک یہ لوگ ساتھ خیریت کے یہاں پہنچ گئے، بیوی دلّی سے اپنے ساتھ گھر کی ماما نوکرنی لیتی آئی تھیں، سبزی ترکاری کے سوائے گھر میں اور سامان موجود ہی تھا، پکانے ریندھنے کی تیاری ہونے لگی جیسے کوئی بہت بڑا قصور ہوا ہو، اس وقت سیّد صاحب کی بیوی سے نظر نہ ملتی تھی، مارے خجالت کے سر نیچا ہوا جاتا تھا، جب ہی تو کھُل کر بات نہ کر سکے، یُوں ہی دو ایک اُکھڑے اُکھڑے سے فقرے کہہ کر مردانی نشست میں چلے آئے، چوکیدار کو سودا سلف کے لئے بھیجا، اور آپ نشستگاہ کے گاؤ تکیہ سے ٹک کر خاموش بیٹھ گئے۔

ابھی کچھ سوچنے نہ پائے تھے، خوشنما سرپوش سے ڈھکا ہوا ایک طشت ہاتھوں پر رکھے ہوئے اُن کا بچہ آیا اور شہری تہذیب کے مطابق آداب بجالایا۔

سرپوش اُٹھا کر جو دیکھتے ہیں، تو گھنٹے والے کا حلوا سوہن، پیٹھے کی مٹھائی، سنگترے، سیب، پٹاری کے انگور وغیرہ بڑے سلیقہ سے چُنے ہوئے تھے، دیہات کے ویرانوں اور گنواروں کی صحبت سے سیّد صاحب کا جی اُکتا گیا تھا، سالہا سال بعد دِلّی کی معاشرت جھلکی، آہ! بھولی بسری باتیں یاد آنے لگیں، تخیلات کا طوفان اُٹھا، حواس قابو میں نہ رہے، اپنے نُورِ دیدہ کو نظر فریب زرق برق پوشاک میں دیکھ کر آپے پھُولے نہ سماتے تھے، بیقرار ہو کر اُسے چھاتی سے چپٹا لیا، اس طرح پیار کرنے لگے، جیسے ابھی دو ڈھائی سال کا ہی ہے۔ حالانکہ وہ وقت پانچ برس پیچھے جا چکا تھا۔

کہاں وہ سرد مہری، ہزار ہزار کوششوں کے باوجود پروا نہ کی کہ ہمارا کوئی ہے، کہاں یہ حال گویا زندگی بھر کی شفقت ابھی ابھی ختم کر دیں گے، کبھی اپنے ہاتھ سے بچّے کو مٹھائی کھلانے لگتے تھے، کبھی پیار کر کر کے نہالوں نہال ہوئے جاتے تھے۔

(۵)

سیّد صاحب نے بچّے کے خوب خوب تماشے کئے، اس کھیل میں وُہ ایسی بے صبری سے کام لے رہے تھے جیسے وقت غنیمت ہے، پھر بھلا ایسا موقع کاہے کو آنے لگا۔

میز پر ایک بھرا بھرایا مزل لوڈنگ پستول رکھا تھا، اُس طرف جو نظر گئی تو سیّد صاحب کو خیال آیا، بچّوں کے گھر میں بڑی احتیاط چاہئے، یا تو اِسے چلا کر خالی کر دیں، یا خیر ٹوپی ہی اُتار لیں۔

بچّے سے کہا:۔

"بیٹا! ذرا وہ تو اُٹھا لا، دیکھ سنبھل کر لائیو، ہاں!"

جب وہ لے آیا، تو پوچھا:۔

"کیوں بیٹا! یہ کیا ہے؟"

جورسے بھوروں کا پلا بچّہ، جس نے بسم اللہ کے گنبد سے قدم نہ نکالا تھا، اُسے دِلّی کے گھروں میں بھلا پستول کہاں دکھائی دیتا، بھولے پن سے بولا:۔

"خبر نہیں!"

سیّد صاحب نے کہا:۔

"اچھا بیٹا! بیٹھ جا!!"

وُہ اُن کے سامنے ادب سے دو زانو ہو گیا۔

مارے لاڈ کے آپ اس کا ننھا سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سمجھانے لگے۔

"دیکھ بیٹا! اِس کو کُندا، اِسے چانپ، اِسے گھوڑا، اِسے لبلبی، اسے دیدوان، اِسے نپل، اِسے نال، اور اِس کو مکھی کہتے ہیں، نپل پر یہ چھوٹی سی ٹوپی چڑھی ہوئی ہے، گھوڑا دباؤ تو اُوپر کو اُٹھے گا، پھر ٹوپی اُتار کر ذرا آہستہ سے لبلبی چھوڑ دیجیو اِس طرح گھوڑا بدستور نپل پر آ رہے گا، سمجھا بیٹا!!"

نئی چیز تھی، بچے کو گھوڑا اُٹھانے میں دقت ہوئی، لیکن زور لگا کر اُٹھا لیا، جوں ہی وہ دو پائے پر پہنچا، انگوٹھے نے لغزش کی، اور اتفاقاً لبلبی بھی دب گئی۔ . . . .

ایک ہولناک دھماکے کے ساتھ گھر میں بچے کی ڈراؤنی چیخ سُنائی دی، سید صاحب کی بیوی دھک سے رہ گئیں، فوراً ماما اور چھوٹے بھائی کو دوڑایا۔ . . . . . .

آہ! نشست میں بارُود کا ہلکا ہلکا دُھواں چھایا ہُوا تھا۔ سہما ہُوا بچہ کونے میں سر دیئے ہوئے مِلا، گولی سید صاحب کی پیشانی توڑتی نکل گئی، خُون میں تربتر لاش تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہو رہی تھی۔

میرزا فہیم بیگ فہیم چغتائی

خرچ، جمع اور خیرات

جو کچھ میں نے خرچ کیا، کبھی میرے پاس تھا۔

جو کچھ میں نے جمع رکھا، میں نے کھو دیا۔

جو کچھ میں نے خیرات میں دیا، اب بھی میرے پاس ہے۔

اِلتجائے محبت

شرابِ محبت سے مخمور ہوں میں مری زندگی مبتلائے محبت
محبت کے تیروں کا مارا ہوا ہوں مرا دل ہے درد آشنائے محبت

مبارک مجھے ہجر میں آہ و زاری مبارک مجھے قلب کی بیقراری
ہے دردِ محبت دوائے محبت یہی رنجوریٔ دل شفائے محبت

محبت میں عمر اپنی ساری گنوا دی اسی راہ میں اپنی ہستی مٹا دی
مری پائمالی عروجِ تمنا مری پستیاں ارتقائے محبت

ادائے حسیں کس قدر دلربا ہے تری ہر جفا حسنِ جانِ وفا ہے
نگاہیں تری خالقِ آرزو ہیں تری چتونیں ہیں خدائے محبت

محبت کا انجام ناکامیاں ہیں مری بیدلی حاصلِ زندگی ہے
مرے دل کے جذبات کا آئینہ ہے مرا نالۂ نارسائے محبت

مرے سازِ ہستی کے تاروں سے پیدا مری نامرادی کا ہے راگ دیکھو
مرے دل کے غمخانۂ آرزو میں لگا دی غمِ عشق نے آگ دیکھو

نہیں وصل کی آرزو میرے دل میں کہ دردِ جدائی سے مسرور ہوں میں
میسر ہے تیرا غمِ عشق مجھ کو زہے خوش نصیبی کہ رنجور ہوں میں

ترے حسن کی مستیاں کیا بلا ہیں کہ ہوشِ خودی سے مجھے کھو دیا ہے
نگاہوں نے تیری پلائی ہے ایسی کہ صہبائے جنت سے مخمور ہوں میں

اثر آہ سوزاں کا اپنی دکھا دوں ابھی تختِ آفرینش ہلا دوں
مگر پھر بھی کرتا ہوں میں جبر دل پر کہ آدابِ الفت سے مجبور ہوں میں

ترے وصل کا شوق پیدا ہو کیونکر نہیں قرب کی تاب قلب و جگر میں
ترا جلوۂ حسن ہے آشکارا مگر کیا کروں چشمِ بے نور ہوں میں

مسلم مرا شیوۂ جاں نثاری وفا میری مستغنیٔ آزمائش
سمایا ہوا ہے ترا شوق دل میں ترے صدقِ الفت سے معمور ہوں میں

شبِ ہجر صبحِ مسرت ہے مجھ کو، مری خستگی عین راحت ہے مجھ کو
نہ ہو ملتفت دیکھ کر میری حالت کہ یہ رنج وجہِ مسرت ہے مجھ کو

فیض قادری

انقلابِ فرانس کا ایک منظر

میری آنتوانت کی زندگی کے آخری لمحے!

خورشیدِ خاوری کرۂ ارض کو منور کرنے کے لئے کشمکش میں مصروف تھا۔ صبح کے چار بجے تھے اور فرانس کی بدقسمت ملکہ میری آنتوانت کی زندگی کا آخری دن شروع ہو رہا تھا۔ وہ قید خانہ کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں انتہائی سکون کے ساتھ موت کے انتظار میں گھڑیاں گن رہی تھی قید خانے کے محافظ نے ملکہ کے حکم پر کاغذ قلم اور دوات پیش کی اور اُس نے مندرجۂ ذیل خط اپنی بہن کے نام لکھا:۔

۱۵/ اکتوبر ۱۷۹۳ء ۴½ بجے صبح

میری پیاری بہن!

"میں تمہیں آج آخری مرتبہ خط لکھ رہی ہوں۔ مجھے سزائے موت دی جا رہی ہے اور میں کچھ عرصہ میں تمہارے بھائی سے جا ملوں گی۔ مجھے اُمید ہے کہ میں بھی موت کے وقت اُسی کی طرح ثابت قدم رہوں گی۔ میرے بیٹے کو اپنے باپ کے آخری الفاظ کبھی نہ بھولنے چاہئیں، اور میں انہیں آج پھر دُہراتی ہوں کہ وہ ہماری موت کے انتقام کی کبھی کوشش نہ کرے۔ میں خدا سے خلوصِ دل کے ساتھ اپنے گناہوں کی جو زندگی میں مجھ سے سرزد ہوئے معافی مانگتی ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ وہ اپنی رحیمی کے صدقے مجھے بخش دے گا۔ میرے بیکس اور یتیم بچوں کو میری طرف سے پیار کرنا۔ اُن سے ہمیشہ کی جُدائی کا خیال میرے دل کو پارہ پارہ کئے دیتا ہے۔ الوداع۔ ہمیشہ کے لئے الوداع!"

خط ختم کرنے کے بعد ملکہ نے خط کو ہر جگہ بوسہ دیا شاید اس خیال سے کہ الفاظ کے ساتھ اُس کے ہونٹوں کی گرمی اور آنسوؤں کی نمی بھی اُس کے پیارے بچوں تک پہنچ جائے۔ اس کے بعد ملکہ نے دُعا کی اور چند گھنٹے آرام کیا۔ بیدار ہونے پر مادام بالٹ کی بیٹی نے اُسے کپڑے پہنائے اور بالوں میں کنگھی کی۔ ملکہ نے سیاہ لبادہ جو وہ اپنے خاوند کی موت کے وقت سے پہنے ہوئے تھی اُتار دیا اور اس کے بجائے سفید پہن لیا۔ صرف ایک سیاہ فیتہ جو اُس کی ٹوپی پر بندھا ہُوا تھا دُنیا کو اُس کے ماتم کی اور اُس کے دل کو اُس کی بیوگی کی یاد دلا رہا تھا۔

موسم خزاں کی ٹھنڈی اور زردی مائل دھند ویلئے سین پر چھائی ہوئی تھی جس سے سورج کی چند شعاعیں نہایت مشکل سے گزر کر پیرس کی سربفلک عمارات پر پڑ رہی تھیں۔ شہر کے مکانات کی تمام کھڑکیاں اور چھتیں تماشائیوں سے بھری تھیں۔ گیارہ بجے جلاد چند سپاہیوں کے ساتھ قید خانے میں داخل ہُوا۔ ملکہ کے چہرے پر کسی قسم کی کمزوری اور خوف کے آثار نہ تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے

اُسے بحیثیت ایک ملکہ کے مرنے کی طاقت بخش دی ہے۔ زنداں کی سیڑھیوں سے اُتر کر اُس کی نظر قیدیوں کی اُس گاڑی پر پڑی جس کی طرف سپاہیوں کے قدم اُٹھ رہے تھے۔ وُہ کچھ جھجکی۔ شاید اُلٹے پاؤں واپس جانا چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ فرانس کے لوگ اپنی نفرت کو کسی حد تک چھپالیں گے اور اُس کے لئے بھی مقتل میں لے جانے کے لئے ایسی ہی بند گاڑی مہیا کریں گے جیسی اُس کے خاوند کے لئے کی گئی تھی۔ لیکن اپنے جذبات کو دبا کر اُس نے تسلیم خم کر دیا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اُس کے ہاتھ چونکہ بندھے ہوئے تھے اس لئے ملکہ کو گاڑی کے ہچکولوں کی وجہ سے اپنا توازن برقرار رکھنے میں بڑی دقت ہوئی لیکن اس کے باوجود اُس نے اپنے شاہی وقار کو کم نہ ہونے دیا۔ جہاں جہاں سے گاڑی گزرتی رہی لوگوں کا ایک بے پناہ ہجوم ٹھٹھوں اور چیخ پکار سے اُس کا استقبال کرتا رہا۔ لیکن اتنے بڑے ہجوم میں بعض اشخاص ایسے بھی تھے جن کی نظروں میں اگرچہ رحم کی جھلک نہیں تھی لیکن مایوسی ضرور تھی۔ ملکہ کی نظر بار بار مکانوں کی اوپر والی چھتوں تک جاتی جہاں جمہوریت کے سہ رنگے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ ٹلریز کے باغ کے دروازے کے سامنے گاڑی کچھ عرصہ کے لئے ٹھہر گئی۔ میری آنتوانت نے اپنے پُرانے محل کو حسرت بھری اور اشک آلود آنکھوں سے دیکھا اور گزشتہ زندگی کا تمام نقشہ اُس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ پہیوں کے اور دو تین چکر پورے کرنے کے بعد گاڑی گلوٹین تک پہنچ گئی۔ جلاد اور پادری کے سہارے وہ گاڑی سے اُتری اور گلوٹین کی سیڑھی پر چڑھ گئی۔

ملکہ نے دو زانو ہو کر دُعا مانگی اور کہا الوداع میرے پیارے بچو میں تمہارے باپ کے پاس جا رہی ہوں۔ جلاد نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گلوٹین کو نیچا کیا اور آناً فاناً ملکہ کا سر دھڑ سے الگ جا پڑا۔ جلاد کے نائب نے سر کو بالوں سے پکڑ کر چاروں طرف گھمایا اور فضا "جمہوریت زندہ باد" کے نعروں سے گونج اُٹھی۔

(ترجمہ) محمد شفیع

وہ کب آتی ہے

وُہ اُس وقت نہیں آتی، جب دوپہر کے سُورج کی چمک میں پھُول جگمگاتے ہیں

دن بہت زیادہ روشن ہوتا ہے

اور اُس وقت بھی نہیں آتی جب کام اور کھیل کُود کے بعد آدمی سستاتا ہے

لیکن جب رات کو ہمارے پر چھائیں ڈالتی ہے اور سمندر کی جانب سے پُرشور طوفانی آوازیں آتی ہیں

وہ ستاروں کی روشنی میں، شمع کی روشنی میں، اور خوابوں کی روشنی میں میرے پاس آتی ہے

ہربرٹ ٹرنچ

غزل

م بخود ہے عقل ذرّے میں بیاباں دیکھ کر ‏ ‏ ناخدا درکار ہے قطرے میں طوفاں دیکھ کر

حدِ منزل کا تصوّر کرکے تھک جاتا ہوں میں ‏ ‏ پست ہو جاتی ہے ہمّت بارِ عصیاں دیکھ کر

گ کہتے تھے مجھے وحشی نہ آتا تھا یقیں ‏ ‏ سرنگوں ہونا پڑا چاکِ گریباں دیکھ کر

وش ہوئے اہلِ چمن آئی زمانے میں بہار ‏ ‏ رو دیئے ہم اپنی بربادی کا ساماں دیکھ کر

ے نہ ہو بدنام میخانے کی رسوائی نہ ہو ‏ ‏ مے عطا کر میرے ساقی ظرفِ رنداں دیکھ کر

کشتگانِ ناز میں شاید ترا محسنؔ بھی ہے

چلنے والے چل ذرا گورِ غریباں دیکھ کر

محسنؔ اعظم گڈھی

غزل

ترا برہمن تری یاد میں ترے در پہ سر بسجود ہے
اُسے شوقِ سجدہ ضرور ہے، نہ قیام ہے نہ قعود ہے

ترے ہجر میں شہِ دوسرا کبھی آہ ہے۔ کبھی ہے فغاں
یہی میرا تجھ پہ سلام ہے۔ یہی میرا تجھ پہ درود ہے

نہ کوئی بھی مجھ کو سمجھ سکا، نہ کسی پہ حال مرا کھُلا
مگر ایک دیکھتی آنکھ ہے وُہی ایک چشمِ حسُود ہے

مرے بننے میں جو بگاڑ ہے وُہی ایک بھُول سی آڑ ہے
اُسے کس طرح سے مٹاؤں میں وُہی میری اصلِ وجُود ہے

یہ گلُوں کا صبح کو جھُولنا وُہ شفق کا شام کو پھُولنا
یہ زمیں پہ شانِ نزُول ہے وُہ فلک پہ رنگِ صعُود ہے

آغا شاعر قزلباش دہلوی

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

بمبئی کی آزاد فضا میں چھ سال رہنے کا نتیجہ یہ ہُوا کہ شاہد میں جہاں اور بہت سی بُرائیاں پیدا ہوئیں وہیں اُسے شراب نوشی کا چسکا بھی بُری طرح پڑ گیا، اس میں شک نہیں کہ اس کی تجارت دِن دُونی رات چوگنی ترقی کر رہی تھی لیکن یہ دخترِ رز اس کی بربادی کا سامان کر رہی تھی، آج بھی حسبِ معمول ہمارا نوجوان دوست شام کا کھانا کھا کر اپنے چند کاغذات کا پلندہ بغل میں دبائے باہر جانے کے لئے تیار ہُوا، آج غالباً پہلی بار اس کی بیوی نے اس سے یہ سوال کیا کہ جب تم اور گلباز دونوں دوست ہو اور یہ تجارتی معاملہ جس کے لئے تم روزانہ اس کے یہاں جاتے ہو، جتنا ضروری تمہارے لئے ہے اتنا ہی ضروری اس کے لئے ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ وہ تمہارے گھر ایک دفعہ بھی نہ آئے اور تم روز دوڑ دوڑ کر اس کے پاس جاؤ، کیا نفع ہوگا تو صرف تمہیں لوگے گلباز اس میں شریک نہ ہوگا، شاہد نے موقع کی نزاکت کو محسوس کر لیا اور نہایت دانشمندی سے برجستہ جواب دیا کہ گلباز تو بخوشی یہاں آئے لیکن میں خود ایسے شخص کو اپنے گھر میں دیکھنا پسند نہیں کرتا، یقیناً شاہد کا یہ جواب مسز شاہد کے لئے بہت ہی تعجب انگیز تھا، چنانچہ اس نے حیرت سے پوچھا "کیوں، وہ کیسا آدمی ہے؟"

شاہد۔ وُہ بہت ہی بدتمیز آدمی ہے اور کریہہ الصورت تو ایسا ہے کہ آدمی کو فوراً قے آ جائے، باتیں ایسی بیہودہ کرتا ہے کہ عورتیں شرم سے مُنہ چھپا لیتی ہیں۔

مسز شاہد۔ افسوس! پھر بھی تمہیں ایسے لوگوں سے مِلنا پڑتا ہے۔

شاہد۔ (ایک لمبی سانس لے کر) کیا کیا جائے، کاروبار کی مجبوریاں بہت سخت ہوتی ہیں،

مسز شاہد۔ ٹھیک ہے، خیر جاؤ . . . لیکن ہاں دیکھنا ذرا جہاں تک ممکن ہو جلدی واپس آنا،

شاہد۔ مَیں کوشش تو کروں گا جلد آنے کی لیکن اس بدبخت کو بے خوابی کی بیماری ہے اور وہ اس قدر بے حس واقع ہُوا ہے کہ دوسروں کے آرام و تکلیف کا مطلق خیال نہیں کرتا، بہر حال جہاں تک ممکن ہو گا مَیں جلد آنے کی کوشش کروں گا۔

شاہد اپنی عیاری پر یا بقول اپنے حکمت و دانش پر نازاں اور متبسم فوراً گھر سے روانہ ہو گیا اور تقریباً پندرہ منٹ بعد وُہ اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ گیا، وُہ منزلِ مقصود کیا تھی، ایک ہوٹل جس میں شراب خانہ بھی تھا،

شاہد کے تمام دوست شرابی اور جواری تھے، اور وہ خود بھی پرلے درجے کا شرابی، جواری اور اوباش ہو گیا تھا، وہ طرح طرح کے بہانوں سے رات گھر سے باہر گزارتا، اپنے دوستوں کے ساتھ شراب پیتا اور جوا کھیلتا، لیکن یہ بہانے آخر کب تک چل سکتے تھے اس کی بیوی حقیقت سے آگاہ ہو گئی اس لئے اس کا گھر سے باہر نکلنا دشوار ہو گیا۔ چنانچہ اس نے اپنی بیوی کو یہ پٹی پڑھائی کہ وہ اور ایک دوسرا تاجر گلباز خان دونوں مل کر ایک تجارتی کمپنی بہت بڑے پیمانے پر قایم کر رہے ہیں اور اس کمپنی کے معاملات سلجھانے اور شرائط وغیرہ طے کرنے کے لئے اس کو گلباز کے پاس جانا ضروری ہوتا ہے، شاہد اپنی اس چال میں کامیاب ہو گیا۔

ہوٹل کے میکدہ میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ جام چڑھانے لگا، اس کے ایک ساتھی نے نہایت افسردگی کے ساتھ کہا "یار، دُنیا میں بیوی سے بڑھ کر کوئی لعنت نہیں، آج نہ جانے کن مشکلوں سے یہاں آسکا ہوں لیکن کل تو یقیناً گھر میں قید رہنا ہی پڑے گا کیونکہ میری سراپا حماقت بیوی نے محض مجھے پریشان کرنے کی غرض سے کل رات کو ایک دعوت کا بندوبست کیا ہے"۔ شاہد نے یہ سُن کر ایک فرمائشی قہقہہ لگایا اور بولا "اگر بیوی کے چنگل سے خلاصی پانا چاہتے ہو تو گلباز خان نامی ایک شخص سے ملاقات پیدا کرو"۔ اس پر اس کے کئی دوست بیک آواز چلا اُٹھے کہ بھئی یہ گلباز خان کون ہے؛

شاہد نے ایک اور بلند قہقہہ لگایا اور بولا "سنو، گلباز خان ایک پچاس برس کا بوڑھا فرتوت ہے ایسا کریہہ الصورت کہ آدمی اسے دیکھ کر کھانا نہ کھا سکے، بڑا ہی بے ہودہ، بدتمیز، غیر مہذب اور ناشائستہ آدمی ہے"۔ اس کے ساتھیوں نے اصرار کیا کہ صاف صاف بتاؤ یہ گلباز خان کون ہے"۔

شاہد۔ اچھا تم لوگ مصر ہو تو سنو، گلباز خان ایک بہت بڑا رئیس اور تاجر ہے، ایک بہت ہی کامیاب فرم کا مالک ہے، میں اس سے روزانہ رات کے وقت ملنے جاتا ہوں اور تجارتی معاملات پر بحث کیا کرتا ہوں"۔

ایک دوست نے ہنس کر کہا "کیا واقعی اس نام کا کوئی شخص دُنیا میں ہے یا یہ محض تمہاری تخیل آرائی ہے؟"

شاہد نے ایک فاتحانہ تبسم کے ساتھ جواب دیا "تم لوگ عجیب احمق ہو، اتنی صاف بات تم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی، ارے میں نے گلباز کو اپنے دماغ سے پیدا کر لیا ہے اور اپنی بیوی سے یہ کہہ کر کہ گلباز خان میرا شریکِ کار ہے اور اس تجارتی معاملات میں گفتگو کرنی ہے، روز یہاں آ جاتا ہوں، تم لوگ بھی یہی کر سکتے ہو"

یہ سُن کر شاہد کے تمام دوستوں نے قہقہہ لگایا اور اس کی فراست و دانائی کی داد دی، لیکن یہ کسی نے خیال نہ کیا کہ وہاں پاس ہی ایک نوجوان اپنا مُنہ اخبار سے چھپائے ہوئے بیٹھا ہے، اس نوجوان نے بھی شاہد کی "دانشمندی و تدبر" کی یہ دلچسپ داستان سُنی اور دانت پیس کر دل ہی دل میں کہنے لگا "اس خبیث نے مجھے اپنے دفتر سے صرف اتنی سی بات پر نکال دیا کہ میں نے ایک گلاس شراب کا اس کی بوتل سے پی لیا تھا، مردود کہیں کا، خود تو بیوی کو دھوکا دیتا ہے اور شراب پیتا ہے اور دوسروں پر یہ دارو گیر!"

اس نوجوان کا نام آفتاب تھا اور وہ شاہد کے دفتر میں کلرک تھا، تقریباً دو ماہ ہوئے تھے کہ شاہد نے اسے علیحدہ کر دیا تھا اور اسی وقت سے وہ بے چارہ بے روزگار تھا، مفلسی بڑی ہی بُری چیز ہوتی ہے، آفتاب اپنی زندگی سے تنگ آ گیا تھا، دفعتہً اس کے دماغ میں ایک بات آئی اور ہونٹوں پر ایک تبسم جس میں حقارت تھی، اور اُس نے یہ طے کر لیا کہ کچھ بھی ہو میں اس ترکیب پر ضرور عمل کروں گا۔

(۲)

دوسرے دن شام کو چار بجے آفتاب شاہد کے مکان پر گیا، وُہ جانتا تھا کہ اس وقت شاہد گھر پر نہیں رہتا اور واقعہ بھی یہی تھا۔

اس نے ملازم سے کہا "میرا نام گلباز خاں ہے، میں اپنے دوست شاہد کو ایک ضروری پیغام دینے آیا ہوں"

ملازم نے مسز شاہد کو جا کر یہ خبر دی، مسز شاہد پہلے تو کچھ سہم سی گئی کیونکہ شاہد نے گلباز کی ہئیت اور اس کی بدتمیزی کے متعلق پہلے ہی اس کے کان بھر دیئے تھے لیکن چونکہ وہ اپنے شوہر کے اکثر دوستوں کے سامنے بے پردہ آنے کی عادی تھی اس لئے وُہ اُس کے نئے دوست اور شریک کار سے ملنے کے لئے ڈرتے ڈرتے ملاقات کے کمرے میں آئی۔ اس یقین کے ساتھ کہ کسی بہت ہی کریہہ الصورت شخص کو دیکھے گی لیکن جب اس کی نظر آفتاب پر پڑی تو وُہ حیران ہو گئی، اس نے دیکھا کہ ایک خوبصورت نوجوان نہایت شائستہ مہذب سامنے کھڑا ہے۔ اس نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اپنی حیرت و استعجاب کو دُور کرتے ہُوئے پوچھا:۔

"آپ مسٹر گلباز خاں ہیں؟"

آفتاب ۔ جی ہاں، معاف کیجئے گا آپ کو تکلیف دی، میں مسٹر شاہد کو ایک ضروری پیغام دینے آیا تھا۔

مسز شاہد۔ کیا آپ ہی مسٹر گلباز خاں ہیں؟ میرے شوہر کے کاروبار میں شریک۔

آفتاب۔ جی ہاں، میں نے ان کے دفتر میں فون کیا تھا لیکن وہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں، چونکہ میں بمبئی سے باہر جا رہا ہوں اس لئے مناسب سمجھا کہ ذرا مل لُوں تو ٹھیک ہے۔

مسز شاہد کو اب بھی یقین نہیں آتا تھا کہ وُہ شخص واقعی گل باز خاں ہے۔ چنانچہ اُس نے پھر پُوچھا "کیا آپ مسٹر گلباز خاں کے صاحبزادے ہیں؟"

آفتاب ۔ معزز خاتون، مَیں خود گلباز ہوں، میرے والد کو انتقال کئے تو عرصہ گزرا۔

مسز شاہد۔ تو آپ وہی مسٹر گلباز خاں ہیں جن سے تجارتی معاملات میں گفتگو کرنے کے لئے میرے شوہر روز رات کو جایا کرتے ہیں؟

آفتاب ۔ جی ہاں، میں ہی وہ شخص ہوں، اور میں بیحد نادم ہوں کہ شاہد صاحب کو روز میری وجہ سے تکلیف اُٹھانا پڑتی ہے، مگر کیا کیا جائے کاروباری معاملات کچھ ایسے پیچیدہ ہوتے ہیں کہ آدمی بے بس ہو جاتا ہے، اُمید ہے کہ آپ مجھے معذور سمجھیں گی۔

مسز شاہد۔ مگر حیرت ہے کہ آپ آج تک ہمارے یہاں کبھی تشریف نہ لائے، میں تو یہ سمجھی تھی کہ شاید آپ کبھی نہ آئیں گے، خیر خُدا کا شکر ہے

کہ آج آپ آگئے، ہاں "وہ" یہ بھی کہتے تھے کہ آپ بہت عدیم الفرصت رہا کرتے ہیں۔

آفتاب۔ جی ہاں، یہ حقیقت ہے، کیونکہ تجارتی معاملات . . . . . .

مسز شاہد۔ لیکن یہ ہمارے لئے عین مسرت کا باعث ہوگا اگر آپ کسی روز یہاں کھانا تناول فرمائیں،

آفتاب۔ محترم خاتون، آپ کی دعوت رد کرنا میں خلاف تہذیب سمجھتا ہوں، میں انشاء اللہ ضرور کسی دن آؤں گا، لیکن ابھی تو آپ مسٹر شاہد سے یہ کہہ دیجئے گا کہ میں ایک ہفتہ کے لئے بمبئی سے باہر جا رہا ہوں۔ لہٰذا ایک ہفتہ تک مجھ سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔

مسز شاہد۔ خیر یہ تو میں کہہ دوں گی، لیکن یہ تو فرمائیے کہ آپ ہماری دعوت کب قبول فرماتے ہیں۔

آفتاب۔ آج بدھ ہے، انشاء اللہ آئندہ بدھ کو حاضر ہوں گا۔

(۳)

جب شاہد رات کے کھانے سے فارغ ہو چکا تو مسز شاہد نے کہا "کیا آج بھی تمہیں گلباز خاں کے پاس جانا ہے؟"

شاہد۔ ہاں، اس سے تو مفر نہیں، وہ غریب میرے انتظار ہی میں ہوگا۔

مسز شاہد نے ایک لمحہ سکوت کے بعد پوچھا "تم نے گلباز کی عمر کتنی بتائی تھی؟"

شاہد۔ پچاس کے لگ بھگ ہو گی۔

مسز شاہد۔ کیا واقعی وہ بہت بدصورت ہیں؟

شاہد۔ اجی بالکل بندر معلوم ہوتا ہے۔

مسز شاہد نے چمک کر کہا "ہوں! تم مجھے بیوقوف بنا رہے ہو۔"

شاہد۔ (حیرت سے) کیا کیا، تم کیا کہہ رہی ہو؟

مسز شاہد۔ (نہایت غصہ سے) تم جھوٹے ہو، میں گلباز کو دیکھ چکی ہوں۔

شاہد۔ تم کیا بک رہی ہو؟

مسز شاہد۔ میں بک رہی ہوں؟ میں کہتی ہوں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے گلباز کو دیکھا ہے، لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم اتنا ناپاک جھوٹ کیوں بولتے رہے ہو؟

شاہد۔ (حیرانی و خفت کے ساتھ) تو تم گلباز کو دیکھ چکی ہو؟

مسز شاہد۔ ہاں آج چار بجے میں نے انہیں دیکھا ہے، وہ خود آئے تھے اور کہہ گئے ہیں کہ میں ایک ہفتہ کے لئے بمبئی سے باہر جا رہا ہوں، اس دوران میں تم سے ملاقات نہیں ہو سکتی، میں نے آئندہ بدھ کو رات کے کھانے پر بھی ان کو مدعو کیا ہے۔

شاہد کی حالت حیرت و استعجاب سے بری ہو رہی تھی، وُہ چلّا کر کہنے لگا "تم نے دعوت دی ہے، گلباز کو، کیسے، ذرا سوچو تو سہی، تم کیا کہہ رہی ہو۔
مسز شاہد۔ہاں ہاں، بس زیادہ نہ بنو، تمہارا بھرم کھُل چکا ہے۔ آخر تم کو اتنا ناپاک جھوٹ بولنے کی کیا پڑی تھی، کیا تمہیں گلباز کی خوبصورتی اور جوانی پر رشک آتا ہے۔
شاہد۔ رشک! ہاں شاید . . . . . خیر . . . . . رشک تو مردوں کی ایک عام بیماری ہے،
مسز شاہد۔ (دانت پیس کر) تو کیا تم نے مجھے ایسی ویسی عورت سمجھ لیا ہے، ہوں!
شاہد نے اب خاموش ہو جانا ہی بہتر سمجھا چنانچہ مسز شاہد اسے بڑی دیر تک صلواتیں سُناتی رہی لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا، آخر کار چند لمحوں کے بعد بولا "پیاری آج دفتر میں کام بہت تھا، میں تھک کر بالکل چوُر ہو گیا ہوں اور سویرے ہی سو جانا چاہتا ہوں، مذاق نہ کرو، سچ سچ بتادو کہ تم نے کسے مدعو کیا ہے،
مسز شاہد نے نہایت متانت و سنجیدگی سے جواب دیا "مسٹر گلباز کو، میں قسمیہ کہتی ہوں کہ میں نے مسٹر گلباز کو مدعو کیا ہے، تم واقعی بہت تھکے ہوئے ہو، اس وقت تمہارا دماغ بھی درست نہیں ہے، بہتر ہے کہ تم سو جاؤ۔

(۳)

شاہد کے یہ چند روز بڑی تشویش میں گزرے، آخر بدھ کا فیصلہ کُن دن آ ہی گیا اور ملازم نے مسٹر گلباز خان کے آنے کی خبر دی، شاہد کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور وہ حیرت و پریشانی سے آنے والے کی راہ تکنے لگا، دفعتًہ کیا دیکھتا ہے کہ آفتاب اس کے دفتر کا سابق کلرک سامنے کھڑا ہے۔ آفتاب نے بڑی ہی بے تکلفی سے دوستانہ طریق پر شاہد کو سلام کیا اور کہنے لگا "مسز شاہد کا ممنون ہوں کہ اُنہوں نے آج مجھ کو مدعو فرمایا، مگر بھئی شاہد آج ہی دوپہر کو سفر سے لوٹا ہوں۔"
شاہد نے بمشکل حواس درست کر کے کہا "مسٹر گلباز، مزاج تو بخیر رہا، اُمید ہے کہ تمہارا یہ سفر بھی خوشگوار اور مفید ثابت ہُوا ہوگا۔"
شاہد کے حیرت و استعجاب کی انتہا نہ تھی، اس کے ہوش و حواس سچ تو یہ ہے کہ ٹھکانے نہ تھے، وُہ حیران تھا کہ آخر یہ کیا معمّا ہے۔ اس کمبخت کو یہ راز کیسے معلوم ہو گیا، غرض کھانا کھا لینے کے بعد مسز شاہد یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں کہ تم دونوں اپنی کاروباری باتیں کرو۔
تنہائی پا کر شاہد نے آفتاب سے پوچھا "یہ کیا حرکت ہے، تم نے ایسا کیوں کیا؟"
آفتاب۔ آپ نے چند روز ہوتے ہیں، شراب خانہ میں گلباز خان کی نسبت جو کچھ کہا تھا، وُہ میں نے سُن لیا تھا اور سوچا کہ میں گلباز خاں بن کر آپ کی مدد کیوں نہ کروں۔
شاہد نے لال پیلے ہو کر اور آنکھیں نکال کر کہا "لیکن میں تمہیں ابھی پولیس کے حوالہ کرتا ہوں۔"
آفتاب۔ جی نہیں، آپ یہ نہیں کر سکتے، میں آپ کے ساتھ بحیثیت گلباز خاں کے کھانا کھا چکا ہوں۔ اس کے علاوہ یہ بھی یاد رکھئے

کہ اگر آپ مجھ کو پولیس کے حوالے کر دیں گے تو میں آپ کو مسز شاہد کے حوالے کر دوں گا۔

شاہد نے دانت پیس کر کہا "بدمعاش! تو مجھ سے کیا چاہتا ہے؟"

آفتاب نے نہایت متانت سے جواب دیا "جب سے آپ نے مجھے دفتر سے جواب دیا سوائے پریشانی کے اور کچھ نصیب نہیں۔ چاہتا ہوں کہ وقتاً فوقتاً آپ کے دسترخوان پر کھانا کھاتا رہوں۔ آپ کو گلباز خاں کی ضرورت ہے تاکہ آپ رات کو باہر رہ سکیں، میں آپ کا موقع بہم پہنچاتا رہوں گا، اور اگر آپ کو یہ منظور نہیں تو پھر میں گلباز خاں ہونے کی حیثیت سے آپ کی بیوی کو خبر دوں گا کہ میں ہمیشہ کے لئے کسی شہر کو منتقل ہوا جاتا ہوں"۔

شاہد نے دانت پیس کر آفتاب کو بہت کچھ بُرا بھلا کہا اور پھر کچھ دیر کے لئے میں کامل سکوت رہا۔

آفتاب ۔ دیکھئے اگر آپ میری صرف ایک شرط منظور کر لیں تو میں آپ کو زیادہ تکلیف دینا نہیں چاہتا۔

شاہد نے شکست خوردہ لہجہ میں کہا "تمہاری شرط کیا ہے، بولو"۔

آفتاب ۔ مجھے پھر سابق عہدے پر بحال کر دیجئے۔

شاہد ۔ مجھے منظور ہے بشرطیکہ تم پھر کبھی میری یا میری بیوی کی دعوت پر یہاں آنا منظور نہ کرو۔

آفتاب نے وعدہ کر لیا اور وہ دوسرے دن پھر شاہد کے دفتر میں کام کرنے لگا۔

(ماخوذ از انگریزی) **عبدالرزاق قریشی**

مَیں نے کیا دیکھا

مَیں نے دیکھا تصوّر میں
لمبی لمبی ڈاڑھیوں والے مولویوں کو
جنّت کے مرغزاروں میں
خوفزدہ حوروں کے پیچھے
خوشی سے چھلانگیں لگاتے، اکڑتے، شور مچاتے

مہدی علی خاں

میرا گاؤں

رہوں گا اپنے وطن کے بہشت زاروں میں
عمیق گھاٹیوں میں اُونچے کوہساروں میں

یہ کچے مٹی کے گھر، یہ غریب رشتہ دار
یہ ٹیڑھی سیدھی سی بوسیدہ چھپروں کی قطار

یہ تنگ گلیوں میں جمگھٹ حسین لڑکوں کے
یہ جال کھیتیوں میں اُونچی نیچی سڑکوں کے

یہ منہ اندھیرے ہی بیلوں کی گھنٹیوں کی صدا
یہ صبح صبح گھروں سے دُھواں سا اُٹھتا ہُوا

یہ چھت پہ بیٹھی ہوئی بھولی بھالی دوشیزہ
یہ بانکا ترچھا سا اِک نوجوان جاتا ہُوا

یہ اُونچے اُونچے درختوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں
اُفق پہ بکھرے ہوئے بے شمار ننھے گاؤں

یہ سرد راتوں میں چوپال پر بھڑکتی آگ
یہ ہیر رانجھا کی اُلفت کے ہلکے ہلکے راگ

یہ پتھروں پہ تھرکتا ہُوا حسیں نالا
کنارے بیٹھا ہُوا کھیتیوں کا رکھوالا

مقابلے پہ کبڈّی کے نوجوانوں میں
شکست و فتح کا اظہار چند گانوں میں

یہ سیدھے سادے عقیدے، یہ بھولے بھالے خیال
ہَوس سے پاک جوانی ہَوس سے پاک جمال

مرے ندیم! سُوئے شہر مَیں نہ جاؤں گا
اِنہیں حسین فضاؤں میں گھر بناؤں گا

احمد ندیم قاسمی بی۔اے

قانون کے ناخدا

(۱)

"او ٹانگے والے! ہردیالپور چلو گے؟"

احمد کی اُمیدوں کے کھیت یکایک لہلہا اُٹھے ——"جی ہاں! جی ہاں! ضرور جاؤں گا! آیئے، بیٹھئے!"—— یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے ٹانگے کو آہستہ آہستہ دو چار قدم آگے بڑھایا، اس وقت وُہ خوشی سے بے خود ہُوا جاتا تھا۔ دو دن سے اس کی بیوی گھر پر بیمار تھی، اور آج اس کی دوا کے لئے اسے پیسوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس وقت صبح ہی صبح سواری مل جانے کے سبب سے وُہ بہت مسرور ہُوا۔

"لیکن کرایہ آٹھ آنے ہی دُوں گا، منظور ہے؟"

"جی ہاں! جی ہاں! آیئے! جو خوشی ہو دے دیجئے گا۔"

اس کے کرایہ دار نے ابھی پائدان پر قدم رکھا ہی تھا کہ احمد کے کانوں میں ایک گرجتی ہوئی آواز پڑی۔

"ابے او ٹانگہ والے! اِدھر آنا! داروغہ جی تھانے بُلاتے ہیں!"—— بیچارے احمد کی اُمیدوں کی عمارت یکایک منہدم ہو گئی جیسے کسی شدید زلزلے نے اُس کو بُری طرح مسمار کر دیا ہو۔

"لیکن میں تو سواری لے کر جا رہا ہوں"۔

تھانے کے سپاہی نے کہا "سواری کا بچہ! اِدھر آ . . . باتیں بناتا ہے، داروغہ جی کو خود ایک جگہ جانا ہے۔"

احمد کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اُسے دُنیا ویران نظر آنے لگی۔ اپنے کرایہ دار کو اُس نے مایُوسانہ نگاہوں سے دیکھا اور پھر آہستہ آہستہ ٹانگے کو تھانے کی طرف لے گیا جو وہاں سے چند ہی قدم پر تھا۔

(۲)

احمد نے داروغہ جی سے پوچھا "کہاں جانا ہے ماں باپ؟"

داروغہ جی نے قہر آلود نظروں سے دیکھ کر کہا "جہاں جاؤں گا دیکھ ہی لے گا، ابھی سے کیوں مرا جاتا ہے . . . . بدمعاش کہیں کا!"

اس کے بعد پہلے وہ خود اور پھر ان کے چار موٹے تنومند رفقا یکے بعد دیگرے ٹانگے پر آ ڈٹے!

قانون کی رو سے احمد کو چار سے زیادہ آدمی بٹھانے کی اجازت نہ تھی لیکن اس وقت وہ کس کو منع کرتا، کس طرح منع کرتا۔ داروغہ جی

تو قانون کے ناخدا تھے۔ اُن کو کیونکر روکا جا سکتا تھا۔

"چل! نرسنگھ پور جائیں گے!"

"نرسنگھ پور!! یہاں سے پُورے چار میل، خدا کی پناہ!" احمد دل ہی دل میں کڑھتا ہُوا روانہ ہوگیا۔
راستہ میں اُسے اپنی بیمار بیوی اور بھوکے بچوں کا اندوہناک خیال ستانے لگا۔ "اگر میں آج کچھ بھی نہ کما سکا تو میری بیوی دوا کے بغیر مر جائے گی۔ میرے بھوکے بچے بلبلا بلبلا کر نڈھال ہو جائیں گے۔" وُہ ان تصورات میں ڈوبا ہُوا چلتا رہا، چلتا رہا، یہاں تک کہ نرسنگھ پور آگیا۔

ایک گھر کے پاس ٹانگہ رکوا کر داروغہ جی نے کڑک کر پوچھا "شیام سُندر بابو کہاں ہیں؟"

ایک ملازم نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا "لوہانی پور گئے ہیں سرکار!"

"آئیں گے کس وقت؟"

"شام تک"

"اُف! اب تو بنا بنایا کام بگڑ جائے گا۔" اس کے بعد داروغہ جی نے سرگوشیوں میں اپنے ساتھیوں سے کچھ باتیں کیں اور پھر بولے" اچھا میں وہیں جا کر اس وقت اُن سے مل لیتا ہوں"۔

اُنہوں نے احمد سے کہا "لوہانی پور چلو!" اس انداز سے، جیسے وُہ اُن کا زرخرید غلام تھا۔
"لوہانی پور!! یہاں سے شمال کی جانب پھر پُورے نو میل! معاذ اللہ!"— لیکن احمد کی مجال تھی کہ وہ زبان سے ایک لفظ بھی کہتا۔ اگر وہ ذرا زبان ہلاتا تو اُسے ٹانگے کے لائسنس سے بلاشبہ دست بردار ہو جانا پڑتا۔

پُورے ڈیڑھ گھنٹے میں وہ دس بجے لوہانی پور پہنچے۔

شیام سندر بابو گھر میں سامنے ہی بیٹھے تھے۔

داروغہ جی احمد کو یہ ہدایت دیتے ہوئے کہ "یہیں ٹھہرو ہم آتے ہیں" گھر میں داخل ہوگئے۔

احمد اُسی جگہ ایک پیپل کے درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ ایک گھنٹے بعد اُسے نیند آگئی۔

"ابے اُٹھ! بارہ بج گئے اور پڑا ہوا ہے، کاہل کہیں کا!" احمد آنکھیں ملتا ہُوا اُٹھ بیٹھا، سامنے داروغہ جی کھڑے دانت پیس رہے تھے۔ خدا خدا کر کے واپس تھانے پہنچے۔ اُترنے سے قبل داروغہ جی نے اپنے رفقا میں سے ایک سے پوچھا جو تھانہ کا جمعدار تھا۔

"گھوڑا تو اس کا اچھا ہے، اسی پر کیوں نہیں کل کلیان پور چلتے؟"

جمعدار صاحب نے جب ہاں میں ہاں ملائی تو داروغہ جی بولے:۔"کل اِسی وقت ٹانگہ لے آنا۔ ایک جگہ جانا ہے، خیال رکھنا۔ ایک

منٹ کی دیر بھی نہ ہونے پائے ورنہ جانتا ہے . . . . !"

داروغہ جی نے اپنی گول گول غضبناک آنکھوں سے خستہ حال احمد کو گھورا اور تھانے میں داخل ہو گئے۔

(۳)

گھر سے نکلے ہوئے چھ گھنٹے ہو چکے تھے۔ لیکن احمد کی جیب میں داروغہ جی کی عنایت سے پھوٹی کوڑی بھی موجود نہ تھی۔ اُس نے سوچا کہ گھر جا کر ایک بار اپنی بیمار بیوی کی حالت اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے لیکن پھر خیال کیا کہ بغیر دو چار آنے کمائے وہاں جانے سے کیا حاصل! پیسے ہوں گے تو اُس کے لئے دوا بھی خرید سکوں گا، بال بچوں کے لئے کھانے کی چیزیں بھی مہیا کر سکوں گا لیکن یوں میں اُن کے کس کام آ سکتا ہوں۔ یہی سوچ کر اُس نے فیصلہ کیا کہ ایک آدھ گھنٹہ اور قسمت آزمائی کر کے گھر جاؤں گا۔

جہاں ٹانگوں کے ٹھہرنے کی جگہ بنی ہوئی تھی، وہاں پندرہ بیس ٹانگہ والے پہلے سے جمع تھے۔ احمد نے بھی اپنا ٹانگہ وہیں لا کر کھڑا کر دیا اور قسمت کے فیصلہ کا انتظار کرنے لگا۔

"بڑا بازار چلئے! دو آنے فی آدمی! . . . . . دو آنے . . . . . . دو آنے!"

سیکنڈ منٹ بنے اور منٹ گھنٹے لیکن احمد کو ایک سوار بھی نہ ملا۔ بیسیوں آئے، بیسیوں گئے، کتنے ان میں سے بڑے بازار جانے والے بھی تھے لیکن احمد کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی، اس کو ایک آدمی بھی نہ مل سکا، انتہائی مایوسی و افسردگی کے ساتھ احمد نے اپنے گھر کی راہ لی۔

(۴)

"ایک گھونٹ پانی!" یہ الفاظ احمد کی بیوی نے کروٹ بدلتے ہوئے کہے۔ وہ اس وقت بخار سے تپتی جا رہی تھی۔

ایک طرف ایک میلی پرانی صراحی پڑی تھی جس کا اوپر کا حصّہ کبھی کا ٹوٹ چکا تھا۔ احمد چٹائی پر سے اُٹھا اور ایک مٹی کے پیالے میں پانی انڈیل کر بیوی کو پلایا۔

"اُف! . . . . درد . . . . سے . . . . سر . . . . پھٹا . . . جاتا . . . . ہے!"۔۔۔ احمد نے یہ شکستہ الفاظ سُنے، اُس نے اپنی رفیقہ کا زرد چہرہ اور دھنسی ہوئی آنکھیں دیکھیں جن کے گرد نقاہت سے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے اور اُس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

وہ مجبور تھا! ایک مفلس قلاش! جس کے پاس کھانے تک کو ایک پائی نہ ہو وہ دوا کہاں سے خرید سکتا ہے۔ اتنے میں اُس کے دونوں بچے باہر سے آ گئے۔ ایک گیارہ سال کا تھا اور دوسرا پانچ سال کا!

بڑے نے کہا "بابا دکاندار چیزیں اُدھار نہیں دیتا۔ کہتا ہے، تیرا باپ وعدہ خلاف ہے، پہلے کل کے پیسے مانگ۔ لا تو پھر تجھے آٹا چاول اُدھار دوں گا۔"

چھوٹے نے کہا "کل تہوار ہے باوا، میرے لئے پٹاخے نہیں لائے، محلے کے سبھی لڑکے پٹاخے چلا رہے ہیں"۔
احمد نے ایک سرد آہ بھر کر کہا "ہمارے لئے تہوار نہیں بیٹا! تہوار اُن کے لئے ہے جن کے پاس پیسے ہوں"۔

(۵)

احمد خود دُکاندار کے پاس گیا لیکن اُس نے اُدھار دینے سے صاف لفظوں میں انکار کر دیا۔ اب اُن کے لئے بجز اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ اُمید موہوم کے سہارے، پھر ایک بار قسمت آزمائی کے لئے چل پڑے۔ چنانچہ غروبِ آفتاب سے کچھ قبل ہی وہ تانگہ لے کر بازار پہنچ گیا اور اِرد گرد کا چکر لگانے لگا۔ اُس کی نظروں کے سامنے دُوسرے تانگہ والوں کو سواری مل ہی چکی تھی لیکن اس کی اپنی قسمت پر جیسے نحوست کی مُہر ثبت ہو چکی تھی، دو گھنٹے کی مسلسل جد وجہد کے باوجود بھی ایک شخص تک اس کے پاس نہیں پھٹکا۔
آخر مایوسی کے ساتھ دن کی طرح وہ پھر گھر کی جانب روانہ ہُوا۔ راستہ میں ایک سڑک ذرا سنسان ملتی تھی۔ ابھی احمد اُس سڑک کی طرف مُڑا بھی نہیں تھا کہ اُس کے کانوں میں آواز آئی۔
"او ٹانگہ والے! دھرم سالہ چلو گے؟"
احمد نے دُور ہی سے ٹانگہ روک کر کہا "آیئے! آیئے!!"
جب وہ قریب پہنچ گئے تو اُس نے روشنی میں دیکھا کہ وہ تعداد میں پانچ ہیں، چار جوان مرد اور ایک کمسن بچّہ!
"لیکن چار سے زیادہ کی تو اجازت نہیں سرکار!"
"اجازت! ارے رات کے وقت تم کو کون دیکھتا ہے، چلو، چلو، آٹھ آنے دُوں گا"۔
"آٹھ آنے!" ۔۔۔ احمد کی آنکھیں مسرت سے چمکنے لگیں۔
"صبح سے تو ایک پائی بھی نہیں کمائی . . . . اس وقت اپنے ہاتھ سے آئی ہوئی سواری نکل جانے دوں تو پھر بھُوکے بچے کہاں سے کھائیں گے . . . . . اس کے علاوہ رات کے وقت آخر دیکھتا ہی کون ہے اور خدا نخواستہ ایسا ہُوا بھی تو کیا ہرج ہے، یہ تو ایک ذرا بچّہ ہے!" ۔۔۔ یہ سوچ کر احمد کو کچھ اطمینان سا ہو گیا اور وہ اُن کو بٹھا کر دھرم سالہ کی طرف چل پڑا۔
اس وقت اس کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ وہ سڑک پر ٹانگہ چلا رہا تھا لیکن اُس کے دل میں چاندی کے اُس چمکتے ہوئے ٹکڑے کا تصوّر تھا جس سے وہ عنقریب اپنی بیمار بیوی کے لئے دوا، اپنے بچوں کے لئے پٹاخے اور گھر بھر کے لئے کھانے پینے کا سامان مہیا کرنے والا تھا۔
انہیں خیالات میں مستغرق وُہ چلا جا رہا تھا، چلا جا رہا تھا اور دُنیا اُس وقت اُسے ایک میٹھا خواب معلوم ہو رہی تھی۔ لیکن دفعتہً ایک بجلی کے کھمبے کے پاس سے اُس کے کانوں میں ایک کرخت آواز آئی، جس نے اُس کے خوابوں کا قصرِ رنگیں متزلزل کر دیا۔

"ٹانگہ روک کہاں بھاگا جاتا ہے، ظالم کہیں کا!"

اب جو احمد نے نظر اُوپر اُٹھائی تو دیکھا وہی داروغہ جی جن کے لئے اُس نے دن کے چھ قیمتی گھنٹے ضائع کئے تھے، کھمبے سے لگے کھڑے تھے۔

"پانچ آدمی بٹھالیا! . . . . بیرحم کہیں کا، جیسے جانتا ہی نہیں کہ اس گھوڑے میں بھی جان ہے"!

احمد کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی، ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اُس نے دِل ہی دِل میں سوچا "اگر میں اس سواری کو قبول نہ کرتا تو کتنی جانیں جاتیں "۔ لیکن داروغہ جی سے کچھ کہنے کی اُسے ہمّت نہ ہوئی۔

دن کے وقت جب مسلسل چھ گھنٹوں تک ڈھائی ڈھائی مَن کے پانچ چوبے بیٹھے رہے تو گھوڑے کے لئے ہمدردی نہ ہوئی لیکن اس وقت ایک بچّے کے زاید ہو جانے سے گھوڑے کی زندگی مَوت کے بھنور میں آپھنسی تھی۔

"ٹانگے کا نمبر کتنا ہے؟"

"دو . . . سو . . . . تیرہ"

داروغہ جی نے نمبر کو اپنی نوٹ بُک میں لکھ کر کہا —— "اس بیرحمی کے لئے تجھے دس روپے جرمانہ کیا گیا"!

(۶)

احمد نے فرطِ غم سے اپنی گردن جھکالی —— اور دُنیا اُسے پہلے سے بھی زیادہ تاریک نظر آنے لگی۔

جمیل احمد کندھاپوری
بی۔ا ے

اپنے خیمے دُور لیکن اپنے دل نزدیک رکھو

(عربی ضرب المثل)

اپنے لبوں کی یوں پاسبانی کرو گویا وہ محل کے دروازے ہیں اور بادشاہ اندر ہے

(ایڈون آرنلڈ)

چینی شاعری کا ایک ورق

دوست کی جُدائی میں

وینگ شیانگ ۲۰۰ قبل مسیح کا ایک چینی شاعر ہے۔ شی کنگ، وینگ شیانگ کا دوست تھا اور ان کی دوستی اتنی مشہور تھی کہ لوگ انہیں "دوستارے" کہا کرتے تھے۔ کسی بات پر دونوں دوستوں میں اختلاف پیدا ہو گیا اور شی کنگ اپنے دوست کو چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔ شاعر نے اُس کی جُدائی میں بے شمار پاکیزہ نظمیں کہیں۔ تحقیقات کے باوجود اس امر کا پتہ نہیں مِل سکا کہ شی کنگ پر ان نالہائے فراق کا کیا اثر ہُوا اور وہ واپس آیا یا نہیں؛ ذیل میں ہم چند نظموں کا ترجمہ پیش کرتے ہیں :-

(۱)

میری آنکھیں تمہیں ڈھونڈتی ہیں
لیکن نہیں پاتیں
میرے کان تمہارے شیریں نغمے
سننے کو ترستے ہیں
لیکن نہیں سُن سکتے
میری زبان تم سے
کچھ کہنا چاہتی ہے
لیکن الفاظ جنبشِ لب سے پہلے
مر جاتے ہیں
کیونکہ انہیں سننے والا موجود نہیں!
لیکن
شی کنگ!
میرا دل نہیں مانتا
کہ تم نے
واقعی مجھے چھوڑ دیا ہے!

(۲)

شی کنگ!
کیا سُورج اپنی روشنی کھو چکا ہے؟
اگر ایسا نہیں
تو پھر تم مجھے
نظر کیوں نہیں آتے؟

(۳)

زندگی کا رستہ
بہت کٹھن ہے
میرے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں

"تانگہ روک کہاں بھاگا جاتا ہے، ظالم، کمیں کا!"

اب جو احمد نے نظر اُوپر اُٹھائی تو دیکھا وہی داروغہ جی جن کے لئے اُس نے دن کے چھ قیمتی گھنٹے ضائع کئے تھے، کھمبے سے لگے کھڑے تھے۔

"پانچ آدمی بٹھالیا! . . . . بیرحم کمیں کا، جیسے جانتا ہی نہیں کہ اس گھوڑے میں بھی جان ہے"۔

احمد کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی، ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اُس نے دِل ہی دِل میں سوچا "اگر میں اس سواری کو قبول نہ کرتا تو کتنی جانیں جاتیں" ۔۔۔ لیکن داروغہ جی سے کچھ کہنے کی اُسے ہمت نہ ہوئی۔

دن کے وقت جب مسلسل چھ گھنٹوں تک ڈھائی ڈھائی من کے پانچ چوبے بیٹھے رہے تو گھوڑے کے لئے ہمدردی نہ ہوئی لیکن اس وقت ایک بچے کے زاید ہو جانے سے گھوڑے کی زندگی موت کے بھنور میں آپھنسی تھی۔

"تانگے کا نمبر کتنا ہے؟"

"دو . . . سو . . . تیرہ"

داروغہ جی نے نمبر کو اپنی نوٹ بک میں لکھ کر کہا ۔۔۔ "اس بیرحمی کے لئے تجھے دس روپے جرمانہ کیا گیا"۔

(۶)

احمد نے فرطِ غم سے اپنی گردن جھکالی ۔۔۔ اور دُنیا اُسے پہلے سے بھی زیادہ تاریک نظر آنے لگی۔

جمیل احمد کندہاپوری
بی-اے

اپنے خیمے دُور لیکن اپنے دل نزدیک رکھو

(عربی ضرب المثل)

اپنے لبوں کی یوں پاسبانی کرو گویا وہ محل کے دروازے ہیں اور بادشاہ اندر ہے

(ایڈون آرنلڈ)

چینی شاعری کا ایک ورق

دوست کی جدائی میں

ویگ شیانگ ۲۰۰ قبل مسیح کا ایک چینی شاعر ہے۔ شی کنگ، ویگ شیانگ کا دوست تھا اور ان کی دوستی اتنی مشہور تھی کہ لوگ انہیں "دو ستارے" کہا کرتے تھے۔ کسی بات پر دونوں دوستوں میں اختلاف پیدا ہو گیا اور شی کنگ اپنے دوست کو چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔ شاعر نے اُس کی جُدائی میں بیشمار پاکیزہ نظمیں کہیں۔ تحقیقات کے باوجود اس امر کا پتہ نہیں مِل سکا کہ شی کنگ پر ان نالہائے فراق کا کیا اثر ہُوا اور وہ واپس آیا یا نہیں؛ ذیل میں ہم چند نظموں کا ترجمہ پیش کرتے ہیں:-

(۱)

میری آنکھیں تمہیں ڈھونڈتی ہیں
لیکن نہیں پاتیں
میرے کان تمہارے شیریں نغمے
سننے کو ترستے ہیں
لیکن نہیں سُن سکتے
میری زبان تم سے
کچھ کہنا چاہتی ہے
لیکن الفاظ جنبشِ لب سے پہلے
مر جاتے ہیں
کیونکہ انہیں سننے والا موجود نہیں!
لیکن
شی کنگ!
میرا دل نہیں مانتا
کہ تم نے
واقعی مجھے چھوڑ دیا ہے!

(۲)

شی کنگ!
کیا سُورج اپنی روشنی کھو چکا ہے؟
اگر ایسا نہیں
تو پھر تم مجھے
نظر کیوں نہیں آتے؟

(۳)

زندگی کا رستہ
بہت کٹھن ہے
میرے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں

دوست!
تم بھی مجھے چھوڑ گئے
اب میں منزل پر کیسے پہنچوں گا؟

(۴)

شی کنگ!
آسمان ہنستا ہے
کیونکہ میں
تمہاری جدائی میں
رو رہا ہوں

(۵)

لوگ کہتے ہیں
کہ تم اب واپس نہیں آؤ گے
لیکن میں اگر تمہارا انتظار نہ کروں
تو اپنی نگاہوں میں
مجرم سمجھا جاؤں گا

(۶)

یہ پہاڑ
کتنے دشوار گزار ہیں!
اور تم بھی
مجھے تنہا چھوڑ کر چلے گئے

(۷)

شی کنگ!
مجھے یقین تھا کہ سُورج سرد ہو سکتا ہے
لیکن تمہاری پاک محبت
اپنی گرمی نہیں کھو سکتی
مگر تم نے مجھے ٹھکرا کر
یہ ثابت کر دیا
کہ محبت کی کامرانی کے سوا
اِس ناپاک دُنیا میں
سب کچھ ہو سکتا ہے!

(۸)

مَیں دُنیا کی ہر مصیبت
برداشت کر سکتا ہوں
بلکہ مَیں تو آفتوں کا
انتظار کرتا رہتا ہوں
کیونکہ مصیبتیں میری رُوح کی غذا ہیں
لیکن
شی کنگ!
مجھ سے تمہاری بے اعتنائی
برداشت نہیں ہو سکتی

(۹)

ابھی
ایک اُمید باقی ہے
اور
وہ تمہاری واپسی کی!

حمید نظامی

ہندو اور اُردو زبان

"ہندو لیڈر قوم پرستی کی آڑ میں ملک سے غداری نہ کریں"

(ملک دوار کا ناتھ)

جناب مدیر صاحب رسالہ "ہمایوں" لاہور

تسلیم۔ گذشتہ اتوار بتاریخ ۱۸ دسمبر میری بھی صلاح تھی کہ میں یوم اُردو میں مندرجہ بالا مضمون کے متعلق کچھ عرض کروں لیکن بہت سی مصروفیات کی وجہ سے حاضر نہ ہو سکا اس لئے چند سطور یہاں لکھنا چاہتا ہوں۔ "دوارکا ناتھ"

یہ بات آج کل بہت سنی جاتی ہے کہ اُردو مسلمانوں کی مذہبی اور قومی زبان ہے۔ ہندوؤں کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بات نہ صرف اَن پڑھ طبقہ کہتا ہے بلکہ بڑے بڑے لیڈر جن پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس سے متفق ہیں۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ یہ بات کہاں تک درست ہے۔ کسی زبان کا کسی قوم کے ساتھ تعلق ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس قوم کے افراد کی اکثریت کا اندازہ لگایا جائے کہ آیا وُہ اس زبان کو مندرجہ ذیل امور میں استعمال کرتی ہے یا نہیں۔

(۱) بول چال (۲) تحریرات (۳) مذہبی ضروریات (۴) پریس (۵) ذریعۂ تعلیم

جہاں تک بول چال کا تعلق ہے ہندوؤں کا کافی حصّہ اسے استعمال کرتا ہے۔ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ زبان زیادہ تر مشرقی پنجاب، دہلی، صوبجاتِ متحدہ، بہار، صوبجات متوسط، مغربی بنگال اور راجپوتانہ کی ریاستوں میں بولی جاتی ہے۔ یہ وُہ علاقے ہیں جہاں ہندوؤں کی زبردست اکثریت ہے اور مسلمان بڑی تھوڑی اقلیت میں ہیں۔ اگر یہ زبان مسلمانوں کی ہوتی تو اس کا بول چال کے معاملے میں وہی حال ہوتا جو عربی کا ہے۔

جہاں تک تحریر کا تعلق ہے اس میں بھی ہندو اصحاب کی تعداد ماضی و حال میں مسلمانوں سے بہت زیادہ ہے۔ اس وقت بھی سر سپرو، علامہ برج موہن کیفی، سدرشن جیسے اصحاب اور بہت سے ہندو شعراء اسی زبان میں لکھتے ہیں۔ ہندوؤں کی اکثر و بیشتر کتابیں اسی زبان میں ہیں۔ منشی پریم چند پہلے آدمی ہیں جنہوں نے اِس زبان میں مختصر افسانہ نویسی کی بنیاد ڈالی۔

جہاں تک مذہبی کاموں کا تعلق ہے ہندوؤں کے تمام کام اسی زبان کے ذریعے سے ہوتے ہیں۔ مسلمان اصحاب تو اپنی نماز عبادت عربی میں کرتے ہیں لیکن لکھو کھا ہندو روزانہ گیتا، رامائن، بھاگوت کا پاٹھ اسی زبان کے ذریعے سے کرتے ہیں۔ ہندوؤں کی تمام مذہبی

کتابوں کا ترجمہ اس زبان میں ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کی اس سے آدھی کتابوں کا ترجمہ بھی نہیں ہؤا۔ ہندوؤں کے تمام جلسوں میں چاہے وہ آریہ سماج کے ہوں یا سناتن دھرم کے اسی زبان کے ذریعے سے تقریریں اور نظمیں ہوتی ہیں۔ ایشور کی پرارتھنا وغیرہ بھی اُردو میں ہوتی ہے۔

پریس کے بارے میں اتنا لکھنا کافی ہے کہ ہندوؤں کا چیدہ چیدہ پریس اُردو میں ہے۔ پرتاپ، ملاپ، ویربھارت اور دیگر ہندو اخبارات کی اشاعت مسلمان اخباروں سے کئی گُنا زیادہ ہے۔ ہزاروں قسم کے رسالے چاہے وہ سیاسی ہوں یا مذہبی، اقتصادی ہوں یا معاشری ہمارے اسی زبان میں نکلتے ہیں۔ جہاں تک ذریعۂ تعلیم کا تعلق ہے پنجاب کے تمام، دہلی اور یو پی کے اکثر ہندو سکولوں کا ذریعۂ تعلیم اُردو ہے حیدرآباد میں ہندوؤں کی آبادی ۹۰ فیصدی ہے۔ وہاں بھی یہی ذریعۂ تعلیم ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندو اس کے دشمن کس طرح ہو سکتے ہیں۔ اگر مسلمان دُشمن ہوں تو خیر سمجھ میں آسکتا ہے کیونکہ مسلمانوں کا وہ طبقہ جو ہندوستان کو چھوڑ کر عرب اور ایران کے خواب دیکھتا ہے ممکن ہے کہ کل تک عربی کا مطالبہ کرے۔ لیکن شکر ہے خدا کا کہ کوئی فرقہ پرست سے فرقہ پرست مسلمان بھی یہ مطالبہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا مصر، فلسطین، سوڈان اور دیگر ممالک کے مسلمان بڑے ترقی یافتہ تصوّر کئے جاتے ہیں مگر ان سب کی زبان عربی ہے۔ ہندوستانی مسلمان اس بات میں سب سے افضل ہیں کہ باوجود تعداد میں آٹھ کروڑ ہونے کے ان کو عربی، فارسی سے ذرا دلچسپی نہیں۔ ان کا ان زبانوں میں کوئی پریس نہیں۔ حالانکہ دُنیا کے تمام مسلمانوں نے جن کو ہم بڑا قوم پرست سمجھتے ہیں عربی کو اپنی زبان بنا رکھا ہے۔

مسلمانوں کا اُردو سے ویسے بھی کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ جہاں جہاں ان کی آبادی ہے وہاں تو اُردو بہت کم ہے۔ مسلمانوں کی زیادہ آبادی صُوبہ سرحد، مغربی و وسطی پنجاب، سندھ، مشرقی بنگال میں ہے۔ سرحد کی زبان پشتو ہے۔ پنجاب کی پنجابی، سندھ کی سندھی بنگال کی بنگالی ہے۔ مسلمانوں کا بہت کم طبقہ اس زبان کو استعمال کرتا ہے۔ اس لئے اُن لیڈروں سے جو قوم پرستی کی آڑ میں اس کی مخالفت کرتے ہیں عرض ہے کہ اس زبان پر رحم کھائیں۔ وہ اپنی قوم کے ساتھ غداری کے مرتکب نہ ہوں۔ اُردو کی بنیاد ہندو مُسلم اتحاد پر رکھی گئی ہے۔ اس اتحاد کی دیوار کو ڈھانے کی کوشش نہ کریں۔ ورنہ جو کچھ بھی ہندو مسلمانوں میں میل ملاپ ہے وُہ بھی جاتا رہے گا اور ہمارے دیش میں خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔

ملک دوارکا ناتھ

لاہور

راز و نیاز

ترے گیسوؤں کو پریشان کر کے
تجھے رشکِ سنبل بنایا ہے میں نے

ترے رُخ پہ چھپڑ کا ہے خونِ تمنّا
ترے رُخ کا غازہ بنایا ہے میں نے

تڑپتی ہوئی بجلیوں کی چمک میں
تجھے مُسکرانا سکھایا ہے میں نے

جبیں پر تری سُرخ ٹیکا لگا کر
ستاروں کو نیچا دکھایا ہے میں نے

سُنا کر تجھے سامری کے فسانے
ان آنکھوں کو جادو سکھایا ہے میں نے

اگر میں بنا ہوں محبت کا دریا
تجھے ماہِ تاباں بنایا ہے میں نے

تری سادگی سے پریشان ہو کر
تجھے شوخ و رنگیں بنایا ہے میں نے

وہ ساون، وہ جھولا، وہ بے باک پینگیں
تجھے کیسا کیسا ڈرایا ہے میں نے

چھلکنے لگے تیری آنکھوں میں موتی
یہاں تک تجھے گُدگُدایا ہے میں نے

ترے شوخ ہونٹوں کی موجوں سے اکثر
محبت کا طوفاں اُٹھایا ہے میں نے

تری جھوٹی خفگی کا تھا علم مجھ کو
مگر تجھ کو سچ مُچ منایا ہے میں نے

تجھے بے وفائی کا الزام دے کر
وفاؤں کو اپنی جتایا ہے میں نے

ترے حسن پر نکتہ چینی بھی کی ہے
تجھے بے سبب بھی کُڑھایا ہے میں نے

ستا کر، جلا کر، رُلا کر، ہنسا کر
تجھے مدّتوں آزمایا ہے میں نے

معین احسن جذبی

سیلِ نشاط

پھر ہاتھ میں ہے زلفِ سیہ فام اِن دِنوں
پھر آ رہے ہیں راہ پہ ایام اِن دِنوں

پھر انجمن میں ہے لبِ زہرہ ترانہ سنج
پھر زمزمہ طراز ہے بہرام اِن دِنوں

پھر گوش و ہوش غرقِ سرود و نشاط ہیں
پھر رُوبرو ہیں چنگ و مے و جام اِن دِنوں

پھر ہر سخن نویدِ مسرت ہے سر بسر
پھر ہر نظر ہے لُطف کا پیغام اِن دِنوں

پھر مہربان حُسنِ تغافل شعار ہے
پھر کامراں ہے عاشقِ ناکام اِن دِنوں

پھر لُوٹتا ہوں گیسو و رُخسار کی بہار
پھر دلفریب ہیں سحر و شام اِن دِنوں

پھر ہے بغل میں جلوہ نما وُہ سکونِ جاں
پھر گمشدہ ہیں کلفت و آلام اِن دِنوں

پھر اُس کے جلوہ سے در و دیوار مست ہیں
پھر جنتِ نگہ ہے لبِ بام اِن دِنوں

پھر سُن رہا ہوں غیب کے پیغام اے نظیر
پھر کھُل گیا دریچۂ الہام اِن دِنوں

اصغر حسین خاں نظیر لودھیانوی

محفلِ ادب

ملکہ وکٹوریا کی داستانِ عشق

(ملکہ وکٹوریا اور جنرل یورف کی پرائیویٹ ڈائری کے اوراق)

بادشاہ بھی عام انسانوں کی طرح دل رکھتے ہیں لیکن سیاسی مصلحتیں ان کے عشق کو کس طرح پامال کر دیتی ہیں اس کا اندازہ ملکہ وکٹوریا اور ولیعہد رُوس کی مندرجۂ ذیل داستانِ محبت سے ہو سکتا ہے۔

۱۸۳۹ء کے موسم بہار میں ولی عہد روس، الگزینڈر (جو بعد میں الیگزینڈر دوم کے نام سے زار بنا) لندن میں وارد ہوا اور ملکہ وکٹوریا کا مہمان ہوا۔ ملکہ کی عمر اس وقت بیس سال کی تھی۔ ملکہ نہایت حسین تھی۔ ولی عہد روس اکیس برس کا تھا اور مردانہ حسن کا نمونہ سمجھا جاتا تھا، نہایت خوش مزاج تھا۔ رُوسی زبان کے علاوہ فرانسیسی، انگریزی، جرمن زبانیں بھی بڑی مہارت سے بولتا تھا۔ شرمیلا تھا اور اعلیٰ تربیت یافتہ۔

مہمان اور میزبان دونوں نوجوان تھے اور غیر شادی شدہ، دونوں عصمت وعفت کے جوہروں سے آراستہ تھے اور معصوم دل رکھتے تھے۔ پہلی ہی نظر میں دونوں کو محسوس ہوا کہ ایک دوسرے کی طرف کھنچے جا رہے ہیں مگر سمجھ نہ سکے کہ اس کشش کا سبب کیا ہے۔

ملکہ نے پہلی ملاقات کے بعد ہی یہ سطریں اپنی ڈائری میں لکھی ہیں جن سے اُس کی معصومیت اور دِلی جذبات کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

"سنیچر ۴ مئی ۱۸۳۹ء ـــ آج ساڑھے بارہ بجے دوپہر کو میں اپنے دفتر گئی تاکہ ولی عہد روس کا خیر مقدم کروں جن کا لارڈ پال مرسٹن نے مجھ سے تعارف کرایا۔ ولی عہد کے ساتھ کونٹ اورلوف اور کونٹ پوزودی بورگو تھے۔

"میں نے شہزادے کو اپنے قریب بٹھایا، یہ مجھے بلند قد سرو قامت معلوم ہوا۔ حسین چہرہ ہے، خوبصورت پیشانی ہے۔ اگرچہ مجموعی طور پر کامل حُسن کا مالک کہا نہیں جا سکتا۔ اس کی آنکھیں نیلی اور بڑی ہیں، ناک پتلی ہے، مُنہ نظر فریب ہے جس پر جادو بھری مسکراہٹ نمودار تھی۔

"پھر میں شاہزادہ کو بڑے ایوان میں لے گئی جہاں اُس نے اپنے مصاحبوں سے میرا تعارف کرایا۔ پھر میرے بازو میں ہاتھ دے کر مجھے میری جگہ پر لے آیا۔ میں بیچ میں بیٹھی، ایک طرف شاہزادہ تھا دوسری طرف پرنس ہنری۔ . . .

"میں نے شاہزادہ کو بہت لطیف اور شرمیلا پایا۔ مجھے یقین ہے کہ جب تک وہ یہاں رہے گا مجھے بڑی خوشی نصیب ہو گی۔ گمان غالب ہے کہ نیکی سادگی خوش مزاجی شاہزادے کے فطری اوصاف ہیں۔ وہ مجھ سے صرف ایک ہی برس عمر میں بڑا ہے۔

"واقعی شہزادہ بہت لطیف ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی طرف بے اختیار کھنچی جاتی ہوں۔ وہ بہت خوش اخلاق اور سادہ مزاج ہے حقیقت یہ ہے کہ اس میں زبردست کشش ہے۔"

اس ملاقات کے دو دن بعد حُسنِ اتفاق سے یا خفیہ تدبیروں کی وجہ سے یہ واقعہ پیش آیا کہ ملکہ اپنے گھوڑے پر سوار تفریح کر رہی تھی۔ راستے میں شہزادہ مل گیا وہ بھی گھوڑے پر سوار تھا دونوں بہت دُور تک گھوڑے دوڑاتے چلے گئے پھر نہایت ہی مسرور لوٹے۔

اس واقعہ کا ذکر جنرل سرگ یورث سچ نے اپنی ڈائری میں اس طرح کیا ہے :۔

"منگل ۷ مئی ـــــ ولی عہد نے آج مجھ سے اس سیر کا ذکر کیا جو اس نے ملکہ وکٹوریا کے ساتھ کی تھی۔ گفتگو سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت اسی تمنا میں رہتا ہے کہ ملکہ سے بار بار ملتا رہے، میں نے آج زار کو مفصل رپورٹ لکھ بھیجی ہے۔ رپورٹ میں ولی عہد کی خیریت کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے کہ یہاں لوگ کہہ رہے ہیں کہ لارڈ ملبورن کی وزارت جلد ہی مستعفی ہونے والی ہے"

دو دن کے بعد جنرل کی پریشانی بڑھ جاتی ہے کیونکہ وہ اپنے شاگرد ولی عہد کو ملکہ کی طرف زیادہ مائل دیکھتا ہے، مگر اس پاک جذبہ کو بھی سیاسی عینک سے دیکھتا ہے چنانچہ لکھتا ہے :۔

" ۹ مئی ـــــ کل شام ہم شاہی محل میں جلسہ رقص میں شریک ہونے کے لئے مدعو ہیں، ولی عہد ہر وقت مجھ سے ملکہ اور اس کے حُسن ہی کا ذکر کرتا رہتا ہے۔ کبھی اس تذکرے سے اُکتاتا نہیں، شاید ملکہ کے حُسن اور اچھے برتاؤ نے شاہزادہ کا دل بالکل ہی موہ لیا ہے لیکن اس میں تعجب کی بھی بات کیا ہے، ملکہ واقعی نہایت حسین ہے ہمیں ان دونوں کی گہری دوستی سے فائدہ اُٹھا کر انگلستان اور روس کے تعلقات کو زیادہ سے زیادہ مستحکم کر دینا چاہئے۔ میری رائے میں موجودہ موقع سے بہتر کوئی اور موقع کبھی اس مقصد کے لئے پیش نہیں آئے گا۔ کیا عجب ہے نوجوان شاہزادہ کا حُسن معاشرت وُہ اچھے نتائج پیدا کر دے جو اس کے والد زار کی حکمتِ عملی سے پیدا نہیں ہو سکے!"

رقص کا جلسہ ہُوا، اور ملکہ نے ولی عہد روس کے ساتھ رقص کیا۔ اس جلسے میں دونوں زیادہ بے تکلف ہو گئے۔ جنرل اپنی ڈائری میں لکھتا ہے:-

" ۱۱ مئی ۱۸۳۹ء ـــــ کل کا جلسہ بہت شاندار اور بہت ہی پُر لطف تھا۔ ولی عہد کا رقص زیادہ تر ملکہ ہی کے ساتھ رہا۔ جب وہ ملکہ سے ملتا ہے تو بے حد خوش ہوتا ہے۔ میرے خیال میں ملکہ کو بھی ولی عہد سے مل کر نہایت مسرت ہوتی ہے۔ بلکہ خود ملکہ کے چہرے سے انتہائی انبساط ٹپکتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ دونوں نمونے کے زن و شوہر بن سکتے ہیں۔ چار بجے صبح ہم جلسے سے واپس ہوئے۔ راستے میں ہماری گاڑی کے گھوڑے بدک گئے مگر ولی عہد کو ذرا خبر نہ ہوئی کیونکہ وہ اپنے خیالات میں غرق تھا!"

ملکہ وکٹوریا اپنے روزنامچہ میں لکھتی ہیں :۔

" ۱۰ مئی ۱۸۳۹ء ـــــ دس بجے رات کو میں بڑے ایوان میں داخل ہوئی جہاں درباری صف بستہ تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ میں آکر جلسے کا افتتاح کروں۔ ولی عہد فوراً میرے پاس چلا آیا۔

"میں نے ولی عہد کے ساتھ رقص شروع کر کے جلسے کا افتتاح کیا ایک بجے رات کو ہم نے کھانا کھایا اور پھر ناچ میں مشغول ہو گئے پھر ولی عہد کے ساتھ کھڑکی پر گئی جہاں سے اسکاٹ لینڈ کی دو ناچنے والیوں کے رقص کا نظارہ کیا۔ ولی عہد بھی اس رقص سے بہت محظوظ ہُوا۔ ساڑھے چار بجے

میں اپنی خوابگاہ میں نہایت ہی مسرور واپس آئی۔"

ولی عہد اگرچہ کم عمر تھا مگر سلطنت کا وارث تھا۔ اُس نے جلد ہی محسوس کیا کہ جذبات کے دھارے میں اس طرح بہنے کا نتیجہ کیا ہوگا کئی روز اُس نے اپنی عقل کو دل پر فتح دلانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اور مجبور ہو کر اپنے اتالیق جنرل سے سب کچھ کہہ دیا۔

جنرل لکھتا ہے:۔

"اتوار ۱۲ مئی — ابھی ابھی میں ولی عہد کے پاس سے آیا ہوں معلوم ہوتا ہے میری عقل، دماغ سے اُڑ جاتی ہے۔ ولیعہد کا مُنہ فق تھا حواس بگڑے ہوئے تھے۔ زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ اسی حال میں اُس نے مجھے بتایا کہ ملکہ سے محبت کرتا ہے اور ملکہ بھی اس سے محبت کرتی ہے۔

"اُف ہولناک! خوفناک جذباتی طوفان کا مجھے سامنا کرنا ہے! میں کس قدر پریشان ہوں مجھے اس پورے معاملہ پر بے حد حیرت ہے کیونکہ دونوں کی ملاقات پر ابھی آٹھ دن بھی نہیں گزرے۔

"مَیں نے ولی عہد پر اپنے دلی خطرے ظاہر نہیں کئے بلکہ غور کرنے کے لئے مناسب مہلت طلب کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے بہت اچھا کیا کیونکہ اپنے اصلی خیالات اگر فوراً پیش کر دیتا تو ولی عہد کی نہ جانے کیا حالت ہوتی۔"

دوسرے دن ولی عہد کی حالت اور بھی ابتر ہو گئی۔ جنرل لکھتا ہے:۔

"پیر ۱۳ مئی — ولی عہد نے مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ شام کے اوقات اس کے ساتھ گزارا کروں، وُہ بہت دیر تک تیوری چڑھائے چُپ سناٹے میں بیٹھا رہا۔ پھر دفعتہً کھڑا ہو گیا اور کمرے میں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اس طرح ٹہلنے لگا جیسے متوالا ہے۔ پھر آ کر میرے قریب بیٹھ گیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایسے حزین لہجہ میں کہنے لگا، جیسا میں نے اُس سے کبھی سُنا نہیں تھا۔

"جنرل، مجھے ملکہ وکٹوریا سے محبت ہو گئی ہے۔ میں یہ بھی یقین کرتا ہوں کہ ملکہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ جب سے میں نے تمہیں دیکھا ہے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی۔ میں تم سے اعتراف کرتا ہوں کہ عمر میں پہلی مرتبہ مجھے وہ عورت نظر آئی ہے جس کی طرف میرا دل بے اختیار کھنچ گیا ہے مجھے ایسی محبت ہو گئی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا، ملکہ کے بغیر مَیں کیونکر زندہ رہ سکوں گا! ہاں میں ملکہ پر فریفتہ ہو گیا ہوں اور ناممکن ہے کہ زندگی بھر کسی اور عورت سے محبت کر سکوں!"

"ولی عہد اسی طرح دیر تک باتیں کرتا رہا۔ اس کی گفتگو سے میرے دل کو سخت چوٹ لگی، بہت ترس آیا، لیکن میں نے دل کڑا کر کے اُسے بتایا کہ ملکہ سے جو ربط پیدا ہوا ہے اُس کا نتیجہ شادی کے سوا کچھ ہو نہیں سکتا۔ مگر شادی کی صورت صرف یہی ہے کہ ولی عہد اپنے وطنی فرض سے فرار کرے اور روس کے تاج و تخت سے دست بردار ہو جائے، مگر یہ ایسی بات ہے جسے نہ ولی عہد کا ضمیر گوارا کر سکتا ہے نہ کوئی ذی عقل اُسے ایسی بات کا مشورہ دے سکتا ہے!

"ولی عہد میری بات سُن کر قائل تو ہوا، مگر اس قدر افسردہ رہا کہ الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتا۔ پھر وہ مجھ سے ایسی حالت سے اُٹھا ہُوا کہ میری

آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"میں سخت حیرت میں ہوں سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟ زار کو خبر دوں یا مزید حالات کا انتظار کروں؟ بڑے پس و پیش میں ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ زار کو جب اپنے ولی عہد کا یہ قصہ معلوم ہوگا تو کس قدر برہم ہوگا!"

دو دن کے بعد ولی عہد کی حالت ایسی ہوگئی کہ جنرل کے لئے خاموش رہنا ناممکن ہوگیا۔ اُس نے لکھا ہے:۔

"بدھ ۱۵ مئی — ولی عہد کی کیفیت مجھے نہایت پریشان کر رہی ہے خود اُس نے مجھ سے کہا کہ موجودہ پوزیشن کا برداشت کرنا اس کے اختیار سے باہر ہے۔ عشق جنون کی صُورت اختیار کرتا جاتا ہے میں اس نوجوان شہزادے کو اپنے بیٹے کی طرح چاہتا ہوں، یہی سبب ہے کہ اس کی تکلیف دیکھ کر میرا دل پھٹتا ہے غم اُسے کھائے جاتا ہے، اور مجھ سے یہ حالت دیکھی نہیں جاتی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ لندن کو جلد از جلد خیرباد کہہ دی جائے میں اسی بات کی کوشش کروں گا۔"

"جمعرات ۱۶ مئی — ۳۰ ماہِ حال کو یہاں سے واپسی طے ہوگئی ہے، مگر ولی عہد چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مُدت یہاں رہے۔ میں اس کی خواہش کا بڑی مضبوطی سے مقابلہ کروں گا۔

"شاہزادہ مجھے بار بار یقین دلانے کی کوشش کر رہا ہے کہ اگر وُہ ملکہ کو شادی کا پیغام دے گا تو وہ فوراً قبول کرلے گی۔ اس کی دلی آرزو ہے کہ ملکہ اس کی زوجیت میں آجائے لیکن افسوس یہ کیونکر ممکن ہے! کیا ملکہ منظور کرے گی کہ اپنے تخت سے دستبردار ہو کر سینٹ پیٹرز برگ جائے؟ یا پھر ولی عہد کو اپنے تخت سے محروم ہو کر لندن میں رہنا ہوگا؟ اگر یہ ممکن ہے نہ وہ تو پھر کیا شوہر یورپ کے ایک سرے پر رہے گا اور بیوی یورپ کے دوسرے سرے پر؟ یہ سب باتیں محال ہیں۔ خدایا، اس مشکل میں میری مدد کر۔ شاہزادے کی بھلائی کے سوا میری زندگی کا کوئی مقصد نہیں، خدایا دستگیری فرما اور اس بھنور سے شاہزادے کو اور مجھے نکال لے۔ میرا فرض بالکل صاف ظاہر ہے۔ میری ذمہ داری میں کوئی سمجھوتہ نہیں ہوسکتا۔ ولی عہد کہہ چکا ہے کہ صرف مجھی کو اپنا دوست اور معتمد علیہ یقین کرتا ہے، لیکن میں جانتا ہوں کہ اس خاص معاملہ میں شاہزادے کی خوشی میں پوری نہیں کرسکتا۔ اس کی خواہش احمقانہ ہے میں ہرگز اس کی تائید نہیں کرسکتا۔ میں مجبور ہوں کہ نہایت استقلال سے اپنا فرض انجام دوں اور میں یہی کرتا رہوں گا چاہے نتیجہ کچھ بھی نکلے۔"

اب جنرل نے طے کیا کہ فیصلہ کُن ضرب لگا کر اس قصے کا خاتمہ کردینا چاہیے۔ اس مقصد کے لئے ضروری تھا کہ خود ملکہ پر بھی اُس کے ارکانِ دولت اور دوستوں کے ذریعہ دباؤ ڈالا جائے چنانچہ جنرل اپنی ڈائری میں لکھتا ہے:۔

"۲۲ مئی — آج میں نے ملکہ کی خاص سہیلی لیڈی . . . . . سے طویل گفتگو کی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ ملکہ بھی اُس سے اقرار کرچکی ہے کہ وہ گرینڈ ڈیوک (ولی عہد) سے نہایت گہری محبت کرنے لگی ہے، ملکہ نے کہا کہ عمر بھر میں اُس نے یہ پہلا نوجوان دیکھا ہے جس نے اس کا دِل موہ لیا ہے حتیٰ کہ اب وُہ اس سے جُدائی میں کسی قسم کی مسرت کا احساس بھی کر نہیں سکتی! لیڈی . . . . . نے کہا ملکہ نہایت خوش ہوگی اگر شاہزادہ شادی کا پیام دے گا بلکہ ملکہ بڑی بے چینی سے اُس گھڑی کا انتظار کر رہی ہے جب ولی عہد اپنی زبان پر شادی کا لفظ لائے گا!

"میری طرح لیڈی . . . . کو موجودہ صورتِ حال خطرناک معلوم ہوتی ہے ۔ وُہ اُن پیچیدگیوں کے تصوّر ہی سے کانپ جاتی ہے جو شاہزادے کی اس رغبتِ رشتہ سے پیدا ہوں گی ، لیڈی ۔ . . . نے مجھ سے صاف کہہ دیا کہ اگر شاہزادہ ایسی حرکت کرے گا تو اپنے آپ کو ، زار کو اور روسی سلطنت کو انتہائی نازک پوزیشن میں ڈال دے گا ۔ وہ ایک ایسی غیر معمولی حالت پیدا کر دے گا جس کا تدارک کوئی انسان بھی کر نہیں سکے گا ۔ لیڈی . . . . نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وُہ بھی بڑی مستعدی سے اس خطرناک صُورتِ حال کو دُور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گی "

ملکہ اپنی ڈائری میں لکھتی ہے :۔

" ۲۷ مئی ـــــ آج کا دن نہایت دلفریب ہے ۔ آسمان کھلا ہُوا ہے اور سُورج چمک رہا ہے ۔ کون انسان ہے جو اس نظارہ سے مسرور نہیں ، لیکن مجھے ذرا خوشی نہیں ۔ میرا دِل تنگ ہے عجیب قسم کی افسردگی مجھ پر چھا گئی ہے ۔

" میں کھڑکی پر کھڑی تھی کہ گرینڈ ڈیوک (ولی عہد) کو آتے دیکھا سات بجے شام کا وقت تھا ۔ اُس نے مجھے سلام کیا ۔ ہم دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے ۔ یہاں تک کہ کھانے کا وقت آگیا ۔ ہم دسترخوان پر گئے جہاں ولی عہد کے مصاحب اور میرے درباری موجود تھے ۔

" پھر ناچ شروع ہُوا ۔ میں نے ولی عہد کے ساتھ رقص کیا ۔ واقعی شاہزادے کے ساتھ ناچنے میں بڑا ہی لُطف آتا ہے ، وہ بہت ماہر ہے اور اُس کے ساتھ رقص کرنے والی کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہزادہ اُسے اُڑائے لئے جا رہا ہے ۔ بہت ہی دلچسپ اور نیک مزاج نوجوان ہے ۔ اُس کے دِل کے خیالات اُس کی پیشانی سے پڑھے جا سکتے ہیں . . . . "

آخر کار وزیرِ اعظم لارڈ ملبورن سے میری طویل گفتگو ہوئی ۔ میں نے اُس سے کہا کہ یہ کھیل کُود میرے لئے بہت مفید ہے ۔ طبیعت کی افسردگی اس سے دُور ہو جاتی ہے ۔ وزیرِ اعظم مُسکرایا مگر اس مسکراہٹ میں ہزاروں خشکیاں چھپی ہوئی تھیں ۔ پھر کہنے لگا :۔

" لیکن بعد میں آپ کو بڑی کوفت اُٹھانا پڑے گی ۔ آپ کو اپنی تندرستی کا خیال رکھنا چاہئے ۔ اس طرح کی محنتیں آپ کے حق میں مضر ہیں ۔ آپ کو شکایت ہے کہ دِل گھبراتا ہے اور اس کی وجہ آپ اُس ذہنی انتشار کو قرار دیتی ہیں جو چند ہفتے سے آپ کو لاحق ہے ۔ آپ کو لوگوں سے بیزاری ہو گئی ہے ۔ ہم میں کوئی نہیں جو اس بیزاری کو محسوس نہ کر رہا ہو ۔ کیا آپ کو اندیشہ نہیں کہ سرکاری کاموں سے بھی آپ کو بیزاری پیدا ہو جائے ، اور اس طرح آپ ایک بہت ہی بُرا نمونہ پیش کریں ؟ "

" میں نے وزیرِ اعظم کو بہت سمجھانا چاہا کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا میرے دِل کی حالت کچھ بھی ہو ، مگر میں اپنے سرکاری فرائض پُوری مستعدی سے انجام دیتی رہوں گی ، مگر وزیرِ اعظم نے میری ایک نہ سُنی اور کہنے لگا :۔

" پچھلے چند ہفتوں سے آپ کی زندگی غیر فطری ہے ، اسی قدر نہیں بلکہ آپ جیسی نوجوان خاتون کے حق میں غیر معقول بھی ہے ۔ میں آپ سے انتہائی دوستی اور اخلاص سے گفتگو کر رہا ہوں ، میری درخواست ہے کہ آپ اپنی تندرستی اور جوانی کا زیادہ اہتمام رکھیں ، آپ کے سامنے ابھی پوری زندگی پڑی ہے آئندہ زندگی میں تمام معقول آرزوئیں اور ممکن تمنائیں پوری ہو سکتی ہیں ، لیکن بعض مسرتیں ناممکن ہوتی ہیں ۔ قدرتی طور پر نہ ہوں تو

بعض حالات انہیں ناممکن الحصول بنا دیتے ہیں، پھر کیا سبب ہے کہ آپ ناممکن کی خواہش پرورش کر کے اپنے دل کو پریشانی میں مبتلا کرتی ہیں؟"

"میں نے کہا، لیکن کیا ملکہ بھی انسان نہیں ہوتی؟ کیا ملکہ کو بھی حق نہیں ہے کہ دوسرے انسانوں کی طرح مسرت حاصل کرے؟"

وزیر اعظم نے اپنا بھاری سر جھکا لیا، پھر دیر کے بعد اٹھایا اور مجھے بغور دیکھ کر کہنے لگا:۔

میڈم! یقیناً آپ بادشاہ لوگ بھی انسان ہی ہوتے ہیں مگر سب انسانوں جیسے انسان نہیں کیونکہ آپ لوگوں کا ایک اعلیٰ مشن ہوتا ہے اور اس مشن میں آپ کی شخصیت کو اس قدر فنا ہو جانا چاہئے کہ آپ انسان نہیں صرف بادشاہ ہی رہ جائیں جیسے قربانی ممکن نہیں جب تک بادشاہ اپنے مشن کی بلندی تک بلند نہ ہو جائے اور اس راہ میں اپنے بہت سے ذاتی خیالات اور بہت سی خواہشیں قربان نہ کر ڈالے۔ بادشاہ تخت نشین ہوتا ہے تو حقیقت میں اس قربانی کی دستاویز پر اپنی مہر ثبت کر دیتا ہے۔ اپنے اس عہد سے بادشاہ کسی حال میں بھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ تخت سے دستبردار ہو کر بھی نہیں کیونکہ اگر وہ تخت سے دستبردار ہوتا ہے تو بدعہدی کی ذلت کے ساتھ فرض سے بھاگنے کی ذلت کا بھی مستحق بن جاتا ہے!"

"اس بوڑھے مدبر کی یہ گفتگو سن کر جو اس کے ٹھوس عقیدوں پر مبنی ہے، میں بےبس ہو کر اس آنسو کے چھوڑ دینے پر مجبور ہو گئی جو دیر سے میری آنکھوں میں ڈبڈبا رہا تھا۔ اس نے میرے رخسار پر آنسو دیکھے تو انتہائی شفقت سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس کا بوسہ لیا اور کہنے لگا:۔

"علیا حضرت، تو اب ہم میں بات پختہ ہو گئی، آج رات میں اطمینان سے سو سکوں گا!"

آخر جدائی کا وقت آ ہی گیا۔ ملکہ اپنی ڈائری میں لکھتی ہے:۔

"۲۹ مئی ــــ میں اپنی خوابگاہ کے متصل کمرے میں گئی۔ گرینڈ ڈیوک لارڈ پالمرسٹن کے ساتھ آیا تاکہ مجھ سے رخصت ہو، اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔ اس دبانے میں اس کی روح کی تمام گرمی سمٹ آئی تھی۔ اس کا رنگ اڑا ہوا تھا، اور آواز بھرائی ہوئی تھی۔ مجھ سے کہنے لگا "بیگم میری آواز بند ہوئی جاتی ہے سمجھ میں نہیں آتا کس طرح اپنے احساس کو ظاہر کروں!" پھر اس نے میرا، میرے رعایا کا اور میری قوم کا اس استقبال کے لئے شکریہ ادا کیا جسے اس نے نہایت شاندار اور مؤثر بتایا۔ اس نے کہا اس استقبال نے انگلستان اور روس کے تعلقات ہمیشہ سے زیادہ مضبوط کر دیئے ہیں، اور یہ کہ وہ پہلے ہی موقع پر پھر انگلستان آنے کی کوشش کرے گا۔ اس کے بعد اس نے پھر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے دبایا۔ میں نے بھی دونوں ہاتھ پھیلا دیئے، اس کا سر اپنے منہ کے قریب کیا اور دونوں رخساروں کا بوسہ لیا۔ اس نے مجھ سے ایسا معانقہ کیا جس میں محبت اور بھائی چارے کے جذبات نمایاں تھے۔ اس لمحہ میرا احساس بہت ہی عجیب تھا۔ ایسا معلوم ہوا کہ ایک دوست کی روح مجھ سے چھینی جا رہی ہے نہ کہ ایک لطیف مہمان رخصت ہو رہا ہے۔ اس مہذب نوجوان کو رخصت کرتے ہوئے مجھے گہرا غم محسوس ہوا ایسا خیال ہوا کہ واقعی میں اس سے محبت کرتی ہوں یا کم سے کم اس کی طرف گہرا میلان رکھتی ہوں!"

اب دیکھئے جنرل، ولی عہد کی حالت کس طرح بیان کرتا ہے:۔

"۳۰ مئی ۱۸۳۹ء ــ کل ہم نے ملکہ وکٹوریا سے روانگی کی اجازت چاہی۔ رخصت کے بعد جب خلوت میں ولی عہد سے میری ملاقات ہوئی تو بیچارا نوجوان بےاختیار ہو گیا۔ مجھ سے لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اتنا رویا کہ ہچکی بند گئی۔ پھر مجھ سے کہنے لگا "اس جدائی کو عمر بھر بھول نہیں سکتا۔ میں نے وکٹوریا سے معانقہ کیا۔ اس نے بھی مجھ سے معانقہ کیا۔ اس نے میرے رخسار پر جو بوسہ ثبت کیا ہے بہترین یادگار ہے۔ یہ بوسہ قبر میں بھی میرے ساتھ جائے گا!"

میں نے شاہزادے کو سمجھانا چاہا مگر وہ اس طرح رو رہا تھا کہ میری کوئی بات بھی سُن نہ سکا۔ آخر میں نے زور سے اُس کی پیٹھ ٹھونک کر کہا
آقا، آپ بادشاہ ہیں، اور بادشاہ کے لئے روا نہیں کہ اپنی رعایا کے سامنے رو لے۔
شاہزادے نے روتے ہوئے جواب دیا "دوست معاف کرو۔ مجھ پر ایسی مصیبت ٹوٹی ہے کہ میں برداشت ہی نہیں کر سکتا!"
میں نے کڑے لہجے میں کہا "میرے آقا، بادشاہ بنیے!"
"یہ سُن کر شاہزادہ پھر مجھ سے لپٹ گیا اور بڑے ہی جوش سے مگر روتے ہوئے اُس نے کہا "مہربان! کیا تمہارے لئے انسان ہونا آسان نہیں ہے؟"
"پھر وہ مجھے چھوڑ کر بستر پر جا گرا اور روتے ہوئے کہنے لگا "اگر بادشاہی یہی ہے تو وائے بادشاہوں کی مصیبت!"

"دین و دُنیا"

اورنگ زیب اور تانا شاہ

"اچھا تو نماز ہو رہی ہے!" تانا شاہ نے کہا اور ساتھ ہی اُس کا چہرہ غصے سے تمتا گیا۔
"مَیں نہیں سمجھتا تھا کہ مغل ہمارے نشانہ بازوں کی اتنی تحقیر کریں گے! قلعہ کے اس قدر قریب اور ہمارے تیر و تفنگ کی زد میں کھڑے ہو کر نماز جماعت ادا کرنا مصلحت اور دُور اندیشی سے یقیناً بعید ہے!! کیا اورنگ زیب جیسا دُور اندیش اور ہوشیار بادشاہ بھی غلطی کر سکتا ہے؛ نہیں ہرگز نہیں۔ ایک صریحی تحقیر ہے۔ دیکھنا! ہے کوئی یہاں اچھا نشانہ باز؟"
اورنگ زیب کئی مہینوں سے گولکنڈہ کا محاصرہ کئے ہوئے ہے۔ مغل فوجیں چاروں طرف سے ایک مہیب سمندر کی پرجوش موجوں کی طرح قلعہ کی فصیلوں سے آ کر ٹکراتی ہیں اور ہر ہر دفعہ دکنی سپاہی پہاڑوں کی چٹانیں بن کر انہیں پیچھے ہٹا دیتے ہیں۔ اِس وقت آفتاب کی تمازت میں کافی کمی ہو گئی ہے اور مغلیہ لشکر اپنی پوری قوت کے ساتھ حملوں پر حملے کئے جا رہا ہے۔ ان صفوں کے ذرا پیچھے دو تین ہموار قطاریں نظر آتی ہیں کیونکہ اورنگ زیب اور اس کے کئی ایک مصاحب ابھی ابھی نماز کے لئے صف بستہ کھڑے ہوئے ہیں۔ چند لمحے گزرنے نہیں پاتے ہیں کہ امام یکایک تڑپ کر آگے کی طرف گر پڑتا ہے۔
"خوب! شاباش!! نام رکھ لیا۔ دیکھنا صف میں سے ایک اور شخص امامت کے لئے آگے بڑھ رہا ہے .... ہاں چھوڑنا نہیں، کوئی امام نہ بچے ...... اِس کو کہتے ہیں انتقامِ تحقیر!!"
شاہی حکم بجلی بن کر دُوسرے امام پر گرتا ہے اور وُہ بھی دکنی گولنداز کا نشانہ ہو جاتا ہے۔
دو تین پیش اماموں کے یکے بعد دیگرے اس طرح نذرِ اجل ہو جانے کے بعد امامت کے لئے صف میں سے آگے بڑھنا کسی معمولی دل و دماغ والے کا کام نہیں! اِس سرے سے اُس سرے تک پس و پیش کا ایک عجیب عالم چھا جاتا ہے لیکن ابھی چند لمحے بھی گزرنے نہیں پاتے ہیں کہ خود اورنگ زیب امامت کے لئے بڑھتا نظر آتا ہے، اور اب گولکنڈہ کا شاہی نشانہ باز بندوق خالی کرنے ہی کو ہے کہ تانا شاہ لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔
"ظالم! کیا ایک بادشاہ کو بھی نشانہ بنائے گا؛ دِکھائی نہیں دیتا کہ خود اورنگ زیب اِس وقت امام ہے!!"

"سب رس"

چند مغربی کہاوتیں

اچھا درخت جوں جوں پُرانا ہوتا ہے زیادہ سایہ دار ہوتا ہے۔

جس کے پاس زیادہ دولت ہوتی ہے وہ بھی اتنا ہی غمگین ہوتا ہے جتنا وہ شخص جس کے پاس روپیہ بہت کم ہوتا ہے۔

رشتہ داروں کے ساتھ کھاؤ پیو مگر معاملہ نہ کرو۔

ایک لمحہ کا صبر بعض دفعہ دس سال کے آرام کا سبب ہوتا ہے۔

ادنیٰ خاندان میں بہترین ہونا اچھا ہے بہ نسبت اس کے کہ اعلےٰ خاندان میں بدترین ہو۔

نادہند سے ایک تنکا بھی مل جانا اچھا ہے۔

بہرے آدمی کا دروازہ کھٹکھٹانا یا نہ کھٹکھٹانا دونوں برابر ہیں۔

نیکی بہت جلد پُرانی ہوجاتی ہے۔

دیوالیہ ساہوکار اپنے پُرانے حسابات تلاش کرتا ہے۔

بھیڑیے کی سردیوں میں پرورش کروگے تو گرمیوں میں تم کو کھالے گا۔

فائدہ سے اتنی خوشی نہیں ہوتی جتنا نقصان سے رنج ہوتا ہے۔

جسم کا مرض دماغ کی جہالت سے بہتر ہے۔

مینڈک کو طیش آیا لیکن تالاب کو خبر بھی نہیں ہوئی۔

انسان کو اس کی فکر نہ کرنی چاہئے کہ وہ کہاں پیدا ہوا تھا بلکہ اس کی فکر چاہئے کہ وہ کہاں رہ سکتا ہے۔

اونٹ شکر ڈھوتا ہے لیکن کانٹے کھاتا ہے۔

اگر میری داڑھی میں آگ لگے دوسرے اُس جگہ سے سگار سلگائیں۔

گھوڑا اُسی کا ہے جو اُس پر سوار ہے۔ تلوار اُسی کی ہے جس کے میان میں ہے اور پل اُسی کا ہے جو اُس پر چل رہا ہے۔

بیوقوفوں سے پتھر کا تذکرہ نہ کرو۔ کہیں وہ تمہیں مار نہ دیں۔

جو شخص صبح کو نہیں ہنستا وہ دوپہر کو بھی نہیں ہنستا۔

چرواہا چاہے امیر ہی کیوں نہ ہوجائے اُسے بھیڑوں ہی کی بُو آتی ہے۔

دیوار کے کان ہوتے ہیں اور میدان کی آنکھیں۔

بعض اوقات ایک لمحہ میں وہ ہوسکتا ہے جو ایک سال میں نہیں ہوسکتا۔

لوگ آپس میں بھائی ہوتے ہیں لیکن اُن کی جیبیں آپس میں بہنیں نہیں ہوتیں۔

عزت کا پھول قبر پر کھلتا ہے۔

محبت کی وجہ سے وقت گزر جاتا ہے اور وقت کی وجہ سے محبت گزر جاتی ہے۔

آدمی شادی کے بعد جانا جاتا ہے۔

مصائب کو بھول جانا چاہئے۔

سید عبدالحی بی اے، ایل ایل بی

"عصمت"

مطبوعات

نسیمِ خیال۔ یہ "ہمایوں" کے جادو طراز افسانہ نگار مسٹر کرشن چندر ایم۔اے کے تیرہ افسانوں کا خوبصورت مجموعہ ہے جو مکتبۂ اُردو لاہور نے نفیس جلد اور نفیس کتابت و طباعت کے ساتھ شائع کیا ہے۔ مسٹر کرشن چندر سے ناظرینِ "ہمایوں" خوب واقف ہیں۔ وُہ اُردو کے چند بہترین نئے رنگ کے افسانہ نگاروں کی صفِ اوّل میں ایک ممتاز جگہ کے مالک ہیں۔ اُن کی زبان اور اندازِ بیان دلکش اور روح پرور ہے۔ اُن کے الفاظ نوکِ قلم سے ٹپک کر تصویر بن جاتے ہیں اور اِن تصویروں میں حرکت ہی نہیں آواز بھی ہوتی ہے۔ ان کی بیباک نفسیاتی تحلیل اور پُرخلوص جذباتی مصوّری نے افسانے اور شعر کے ڈانڈے مِلا دیئے ہیں۔ عہ کی حقیر رقم اس کتاب کی قدروقیمت کے مقابلے میں کچھ نہیں۔

بی دُنیا کا سالنامہ۔ سالناموں کے میدان میں "ادبی دُنیا" اس سال اپنے سب حریفوں یا حلیفوں سے بازی لے گیا ہے سالنامہ سنہ ۱۹۳۹ء بڑی تقطیع کے پونے تین سو صفحات پر شائع ہُوا ہے۔ مضامین نظموں افسانوں اور ڈراموں کی یہ کثرت ہے کہ فہرستِ مضامین کو دیکھ کر ہوش ٹھکانے نہیں رہتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مَوج در مَوج حروف کا ایک طوفان برپا ہے۔ مولانا صلاح الدین صاحب بی۔اے مدیرِ "ادبی دنیا" کی ادبی اور کاروباری خوش سلیقگی ہر ہر صفحہ سے نمایاں ہے۔ ہندوستان بھر کا کوئی اچھا شاعر، افسانہ نویس، ڈراما نگار، عالم یا ادیب اُن کی مدیرانہ "ہل من مزید" کے سامنے تسلیم خم کرنے سے نہیں بچ سکا۔ اگر کوئی ادیب اس طویل و عریض فہرستِ مضامین میں غایب ہے تو وُہ بڑا ہی ارذیل ہوگا۔ رنگین اور یک رنگ تصاویر کی کثرت بھی "حساب کتاب" کی قید سے فارغ نظر آتی ہے۔ ان کے گننے کے لئے بہت وقت درکار ہے اسلئے فی الحال صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ تصویریں بے شمار ہیں اور اس کثرت کے ساتھ حسنِ ذوق کا پتا بھی دیتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک اوسط درجے کا کاروباری آدمی اگر عہ میں ادبی دُنیا کا یہ سالنامہ خرید لے تو وُہ سال بھر کے لئے کسی اور رسالہ کی خریداری کی زحمت سے بچ سکتا ہے۔ اب تک جتنے مضامین راقم کی نظر سے گزرے ہیں، وہ دلچسپ نکتہ آموز اور صحیح ذوقِ ادب کے آئینہ دار ہیں۔ خود ایڈیٹر صاحب کا ایک ڈراما "سنت تکارام" نظم و نثر پر اُن کی حیرت انگیز قدرت کا گواہ ہے۔ ایڈیٹر صاحب دلکش اور لطیف اشعار بھی نثر کی طرح برداشتہ قلم اور بے تکان لکھتے چلے گئے ہیں۔ یہ ایک ایسا ملکہ ہے جو بہت کم اُدبا کو حاصل ہوتا ہے۔

ادبی محاسن کے علاوہ ایک قابلِ توجہ چیز اس سالنامے کے بے شمار اور تُو بر تُو خوبصورت زر افشاں اشتہارات ہیں۔ اُردو کے کسی موجودہ یا گزشتہ اخبار یا رسالے میں ہم نے کبھی اس کثرت سے اعلےٰ درجے کے اشتہارات نہیں دیکھے۔ اس کامیابی پر ادبی دُنیا کے حریف ہی نہیں بلکہ حلیف بھی اگر رشک کھائیں تو بے چارے حق بجانب ہیں۔

پانچ روپے بھیج کر اگر آپ ادبی دُنیا کے خریدار بن جائیں تو یہ سالنامہ آپ کو بلا قیمت مِل جائے گا۔

"ہمایوں" کے سالگرہ نمبر کے متعلق معاصرین کی رائیں

"دین و دنیا" دہلی

معاصر "ہمایوں" نے اس سال بھی حسب معمول نہایت خوشنما سالگرہ نمبر شائع کیا ہے۔ ہمایوں اس وقت اپنے اعلیٰ مضامین کے اعتبار سے تمام ادبی رسائل میں ایک امتیازی درجہ رکھتا ہے۔ ہمایوں کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے تمام مضامین معیاری اور بلند پایہ ہوتے ہیں چنانچہ یہ خاص نمبر بھی بہترین اور اعلےٰ مضامین کا مجموعہ ہے۔

اس خاص نمبر میں تقریباً تیس تینتیس مضامین ہیں جو سب کے سب نہایت اعلیٰ معیار کے مضامین ہیں۔ رسالہ میں تصاویر بھی دی گئی ہیں لیکن تصاویر پر مغربی رنگ غالب ہے۔ ضخامت تقریباً سو صفحات۔ اس خاص نمبر کی قیمت بارہ آنے۔

"تہذیب نسواں" لاہور

جنوری ۱۹۳۹ء کا "ہمایوں" سالگرہ نمبر ہے جس کی بزم ادب میں ہندوستان کے بہت سے مقتدر اہل قلم شریک ہیں۔ شروع میں میاں بشیر احمد صاحب نے "جہاں نما" کے عنوان کے تحت دنیا بھر کے وہ تمام اہم واقعات درج کئے ہیں۔ جو ۱۹۳۸ء میں پیش آئے۔ یہ مضمون معلومات کے لحاظ سے بہت مفید ہے اور اس میں مضمون نگار نے جامعیت اور اختصار کو یکجا کر دیا ہے۔

خان بہادر میاں عبدالعزیز صاحب "فلک پیما" ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، پروفیسر فیاض محمود، مسٹر کرشن چندر، حضرت نشتر جالندھری اور مولانا حامد علی خاں کے مضامین نظم و نثر بہت خوب ہیں۔

ایک سہ رنگی اور سات سادہ تصویریں ہیں۔ سرورق بھی مصور ہے۔ تمام تصویریں بہت پاکیزہ ہیں اور اڈیٹر کے "ذوق حسن" اور "حسن ذوق" کی آئینہ دار۔ کاغذ کتابت اور طباعت عمدہ ہیں۔ ضخامت ۱۰۴ صفحے۔ قیمت بارہ آنے۔

"ہمایوں" کے سالگرہ نمبر کے متعلق

معاصرین کی رائیں

"دین و دنیا" دہلی

معاصر "ہمایوں" نے اس سال بھی حسب معمول نہایت خوشنما سالگرہ نمبر شائع کیا ہے۔ ہمایوں اس وقت اپنے اعلیٰ مضامین کے اعتبار سے تمام ادبی رسائل میں ایک امتیازی درجہ رکھتا ہے۔ ہمایوں کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے تمام مضامین معیاری اور بلند پایہ ہوتے ہیں چنانچہ یہ خاص نمبر بھی بہترین اور اعلےٰ مضامین کا مجموعہ ہے۔

اس خاص نمبر میں تقریباً تیس تیس مضامین ہیں جو سب کے سب نہایت اعلیٰ معیار کے مضامین ہیں۔ رسالہ میں تصاویر بھی دی گئی ہیں لیکن تصاویر پر مغربی رنگ غالب ہے۔ ضخامت تقریباً سو صفحات۔ اس خاص نمبر کی قیمت بارہ آنے۔

"تہذیب نسواں" لاہور

جنوری ۱۹۳۹ء کا "ہمایوں" سالگرہ نمبر ہے جس کی بزمِ ادب میں ہندوستان کے بہت سے مقتدر اہلِ قلم شریک ہیں۔ شروع میں میاں بشیر احمد صاحب نے "جہاں نما" کے عنوان کے تحت دُنیا بھر کے وُہ تمام اہم واقعات درج کئے ہیں۔ جو ۱۹۳۸ء میں پیش آئے۔ یہ مضمون معلومات کے لحاظ سے بہت مفید ہے اور اس میں مضمون نگار نے جامعیت اور اور اختصار کو یکجا کر دیا ہے۔

خان بہادر میاں عبدالعزیز صاحب "فلک پیما" ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، پروفیسر فیاض محمود، مسٹر کرشن چندر، حضرت نشتر جالندھری اور مولانا حامد علی خاں کے مضامینِ نظم و نثر بہت خوب ہیں۔

ایک سہ رنگی اور سات سادہ تصویریں ہیں۔ سرورق بھی مصور ہے۔ تمام تصویریں بہت پاکیزہ ہیں اور ایڈیٹر کے "ذوقِ حسن" اور "حسنِ ذوق" کی آئینہ دار۔ کاغذ، کتابت اور طباعت عمدہ ہیں۔ ضخامت ۱۰۴ صفحے۔ قیمت بارہ آنے +

"ہمایوں" کے سالگرہ نمبر کے متعلق معاصرین کی رائیں

"دین و دُنیا" دہلی

معاصر "ہمایوں" نے اس سال بھی حسب معمول نہایت خوشنما سالگرہ نمبر شائع کیا ہے۔ ہمایوں اس وقت اپنے اعلیٰ مضامین کے اعتبار سے تمام ادبی رسائل میں ایک امتیازی درجہ رکھتا ہے۔ ہمایوں کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کے تمام مضامین معیاری اور بلند پایہ ہوتے ہیں چنانچہ یہ خاص نمبر بھی بہترین اور اعلیٰ مضامین کا مجموعہ ہے۔

اس خاص نمبر میں تقریباً تیس پینتیس مضامین ہیں جو سب کے سب نہایت اعلیٰ معیار کے مضامین ہیں۔ رسالہ میں تصاویر بھی دی گئی ہیں لیکن تصاویر پر مغربی رنگ غالب ہے۔ ضخامت تقریباً سو صفحات۔ اس خاص نمبر کی قیمت بارہ آنے۔

"تہذیب نسواں" لاہور

جنوری ۱۹۳۹ء کا "ہمایوں" سالگرہ نمبر ہے جس کی بزمِ ادب میں ہندوستان کے بہت سے متعدد اہلِ قلم شریک ہیں۔ شروع میں میاں بشیر احمد صاحب نے "جہاں نما" کے عنوان کے تحت دُنیا بھر کے وُہ تمام اہم واقعات درج کئے ہیں۔ جو ۱۹۳۸ء میں پیش آئے۔ یہ مضمون معلومات کے لحاظ سے بہت مفید ہے اور اس میں مضمون نگار نے جامعیت اور اختصار کو یکجا کر دیا ہے۔

خان بہادر میاں عبدالعزیز صاحب "فلک پیما" ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، پروفیسر فیاض محمود، مسٹر کرشن چندر، حضرت نشتر جالندھری اور مولانا حامد علی خاں کے مضامینِ نظم ونثر بہت خوب ہیں۔

ایک سہ رنگی اور سات سادہ تصویریں ہیں۔ سرورق بھی مصوّر ہے۔ تمام تصویریں بہت پاکیزہ ہیں اور ایڈیٹر کے "ذوقِ حسن" اور "حسنِ ذوق" کی آئینہ دار۔ کاغذ، کتابت اور طباعت عمدہ ہیں۔ ضخامت ۱۰۴ صفحے۔ قیمت بارہ آنے +

دیوانِ غالب اُردو

دُنیا بھر میں لاثانی، فی غلطی ایک روپیہ انعام

ہمارا دعویٰ ہے کہ ہمارا شائع کردہ دیوانِ غالب
صحت کے اعتبار سے تمام مروّجہ دواوین سے افضل ہے
اور صرف یہی ایک نسخہ ہے جسے اغلاط سے پاک،
صحیح اور مستند کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اسے اُن کتب کی تطبیق
سے مرتّب کیا گیا ہے جن کی کاپیاں خود مصنف مرحوم کی نظر سے
گزر چکی ہیں اِس کے علاوہ چھاپے کی غلطیاں اس کتاب میں نام کو
بھی نہیں۔ جو صاحب ایسی غلطیاں ڈھونڈ نکالیں گے وُہ فی
غلطی ایک روپیہ انعام پائیں گے (ایک غلطی کے لئے صرف
ایک ہی انعام مقرر ہے۔ اس معاملہ میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا)
لکھائی چھپائی دیدہ زیب، بڑھیا کاغذ۔ کپڑے کی مضبوط مطلّا جلد
رنگدار کنارے۔ قیمت صرف دو روپے (عہ)۔
اس سے بہتر آرٹ کاغذ سنہری کنارے، مراکو کے چمڑے کی شاندار
جلد مع بڑھیا بکس۔ ایک بیش بہا چیز ہے۔ قیمت صرف للعہ

المشتہر

پاپولر بک ایجنسی امرتسر

شفا رجسٹرڈ

معدہ کی تمام خرابیوں کا واحد اور کامیاب علاج

شفا امراضِ معدہ کے لئے چوٹی کی اکسیر دوا ہے۔
شفا ہیضہ، متلی، قے وغیرہ سے فوراً شفا بخشتی ہے۔
شفا بھوک بڑھانے اور غذا کو ہضم کرنے کیلئے بہترین تحفہ ہے۔
شفا معدے کی فضول رطوبتوں کو دُور کر غذا ہضم کرنے کے قابل بناتی
ہے۔ اور کچھ عرصہ کے استعمال سے دائمی قبض خود بخود جاتا رہتا ہے۔
شفا دُودھ پلانے والی عورتوں کے دُودھ کو صحت مند اور ہضم ہونے کے
قابل بناتی ہے اور دُودھ پینے والا بچہ خُوب موٹا تازہ اور طاقتور ہو جاتا ہے۔
شفا کی ایک چٹکی بعد از غذا استعمال کر لینے سے پانی لاگ اور آب ہوا کی
ناموافقت کا خطرہ نہیں رہتا۔ سفر و حضر میں فوراً استعمال کریں۔
شفا کی ایک چٹکی کسی قسم کی ٹانک دوا یا ثقیل غذا کے بعد استعمال کرلیا جائے
تو منٹوں میں ہضم کر کے اُسے جزوِ بدن بناتی ہے۔
شفا قیمت میں ارزاں، فوائد میں بینظیر، مزیدار اور خوشبودار سفوف ہے۔

مُفت:۔ حمیدیہ جنتری ۱۹۳۹ء اپنی گوناگوں خصوصیتوں اور دلچسپ
مضمونوں کے ساتھ شائع ہو رہی ہے۔ ضرورتمند اصحاب ایک کارڈ لکھ کر
بالکل مفت طلب کریں (جن اصحاب کے آرڈر آچکے ہیں انہیں ایک ہفتہ تک پہنچ جائیگی)

ملنے کا پتہ: منیجر حمیدیہ فارمیسی رجسٹرڈ لاہور (مصری شاہ۔ رحیم پارک)

ایک ۱۰۰ سو برس کی عُمر کا راز

جو سنہ ۱۸۳۹ء سے سنہ ۱۹۳۹ء تک پہنچ کر

کارخانہ

اصغر علی محمد علی تاجرِ عطر لکھنؤ

نے حاصل کی

مال کی عمدگی، دیانت داری اور خوش معاملگی

ہے

سید عبداللطیف پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائیل پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں ۲۲۔ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔

قواعد

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ایک آنے کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جاسکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ایک آنے کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے، ششماہی تین روپے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸ آنے

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجئے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ۔ لاہور

The Title Page and Picture Printed at Half-Tone Press

فہرستِ مضامین

نمبر (۳)

"ہمایوں" بابت ماہِ مارچ ۱۹۳۹ء

تصویر: خوبصورتی

چندہ سالانہ صہ ششماہی سعہ (مع محصول) قیمت فی پرچہ ۸/

بزمِ ہمایوں

میرے ایک دوست نے جنہیں اہلِ ہمایوں خوب جانتے ہیں اور جو آسمان پر پرواز کرتے ہوئے بھی زمین والوں پر نظرِ عنایت رکھتے ہیں تھوڑا عرصہ ہوا میری ایک "مُدیرانہ درخواست" کے جواب میں اپنے ایک خط میں لکھا:۔

"خوش رہو۔ تمہاری ہدایت پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔ اُس بُڈھے سے جو روز میرے سُوٹ پہنتا ہے میری اچھی نکٹائیاں گلے میں باندھتا ہے اور میری پُرانی ڈائریاں دیکھ کر یہ کہتا ہے کہ یہ میرے کارنامے ہیں مجھے ہر قسم کی غلطی کی توقع ہے۔ یہ غلطی خدا کرے کہ تمہارا کہنا مان لے تو مجھے تعجب نہ ہوگا۔ اگر مجھے شباب میں یہ علم ہوتا کہ اپنا قیمتی وقت اِس قسم کے ناآشنا بُڈھے کے لئے برباد کر رہا ہوں تو کبھی اپنے کام میں اتنی محنت نہ کرتا۔ خود اپنے لئے ایک عجیب الخلقت stranger بن رہا ہوں۔

"ہمایونیت" بہت اچھی چیز ہے، اسے ضرور نبھاؤ۔ یہ بھی ایک قسم کی وفا ہے جو ناروا نہیں مگر کبھی کبھی اپنے آپ کو یعنی اُس بشیر کو جو آج کل "فدائے لیگ" اور "نذرِ اُردو" ہے اُن نگاہوں سے بھی دیکھ لیا کرو جو آج سے دس سال پہلے فدائے حقیقت بشیر کی تھیں۔ اُس زمانے میں تم Ideal کے سرگرم متلاشی تھے اور Ideal کا علم تم چاہتے تھے کہ آزادی سے لہرائے۔ آج کل کا مصلحتوں کا شکار بشیر اُس Ideal کے رضاکار بشیر سے بہت دُور ہے۔ تمہارے میرے سمیت سب انسان یُونہی بھٹکتے رہتے ہیں۔ ہم سب کا حقیقی خدا تغیّر ہے۔ آج کچھ کل کچھ۔ خدا گیا قوم آئی۔ قوم گئی ذاتی وقار و وجاہت کی دُھن سمائی:۔

آئینِ جہاں گاہے چنیں گاہے چناں باشد

کچھ اُداس سا ہو رہا ہوں۔ کوئی جلی کٹی نئی [illegible] لکھ کر دِل خوش کرلُوں گا۔"

تمہارا ع

اِس کے جواب میں مَیں نے لکھا کہ آپ کے اِس خط نے مجھے بھی کچھ اُداس سا کر دیا۔ اپنی سرگرمیوں میں تھوڑی دیر کے لئے سوچ بچار پر مجبور کر دیا۔

اس کے جواب میں وُہ پھر لکھتے ہیں:۔

"پہلے خط میں جو تم نے لکھا کہ میرے فقرے نے اُداس کر دیا سو بات یہ ہے کہ اگر تم حق پرستی چھوڑ کر مصلحت پرستی اختیار کرو اور میں حُسن پرستی چھوڑ کر زر پرستی اپنا شعار کرلُوں تو زندگی کچھ بے معنی سی ہو جاتی ہے، ورنہ مجھے تو ہر بات پر ہنسنا ہے۔ معنی کی کوئی قید نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ وُہ جو بہت محنت سے بے انتہا شوق سے بعض گہرائیوں کا مطالعہ کر چکا ہوں وہ Intellectual honesty پر مجبور کرتا ہے ہر وقت

کی ہنسی بھی ہنسی نہیں رہتی۔ اِسی لئے اپنے پُرانے بشیر کو یاد کر کے وُہ فقرہ تمہیں لکھ دیا۔ تم رستی چھوڑ دو میں وفا چھوڑ دُوں۔ تو پھر یہ دُنیا واقعی ایک بھیانک دوزخ ہے۔ سمجھے!"

تمہارا ع

میری "مدیرانہ درخواست" "ہمایوں" کے نصب العین کے متعلق تھی جو "ہمایوں" کے سب سے بڑے مقالہ نگار کی خدمت میں پیش کی گئی۔ "ہمایوں" کی دُنیا میں سب سے بڑا خود "ہمایوں" ہے اور "ہمایونیت" کا نباہ اُس کے اِدارے اور اُس کے مقالہ نگاروں کے فرائض میں پہلا خوشگوار فرض ہے۔

میرے عزیز دوست نے جو حقیقت اور مصلحت کی عقلی و اخلاقی بحث چھیڑ دی ہے وُہ ہر پُرخلوص انسان کے لئے مشعلِ راہ ہو سکتی ہے۔ اپنے متعلق میں اُن کی خدمت میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ میری موجودہ روش "مصلحت" پر مبنی نہیں بلکہ مجھے اب حقیقت یہی نظر آتی ہے۔ خالص مصلحت پر شاید وُہ لوگ چلتے ہیں جنہیں سیاست دان کہا جاتا ہے اور ہر چند کہ قومی فرائض کا تھوڑا سا احساس مجھے گھسیٹ کر نظری سیاست کے میدان میں لانا چاہتا ہے میں اب بھی عملی سیاست سے گھبراتا ہوں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ عملی سیاست سے گھبرانا صرف بُزدِل ادیبوں کا کام ہے۔ آج کل تو ہر شے سیاسی ہے۔ ہماری اُردو جس کے حروف میں اس وقت لکھ رہا ہوں اور پڑھنے والے پڑھ رہے ہیں وُہ بھی اب ایک سیاسی شے بن گئی ہے۔ ہندوستان سیاست نشان میں تو شاید وہ ہوا بھی جس میں ہم لوگ آج کل سانس لے رہے ہیں سرتاسر سیاسی ہو چکی ہے پھر سیاست اور ادب یا سیاست اند حقیقت کی حدیں کیونکر ایک دوسری سے الگ الگ رہیں۔

ہمیں نہیں معلوم حقیقت کیا شے ہے۔ زمانہ یا "تقدیر" جن حالات کو بھی ہمارے سامنے لائے اُن پر اپنی تدبیروں سے اثر ڈالنا، یہ ہے ہماری زندگی کوئی اَور یا اثر ڈالتا ہے یا ہم، حقیقت کچھ ہو ہم تو یہی سمجھتے ہیں یہ سمجھنے پر مجبور ہیں یہی سمجھنے کے حق دار ہیں کہ جب ہم کچھ کرتے ہیں تو ہمیں ہیں جو ایسے کرتے ہیں اور ہزار مجبوریوں میں رہ کر بھی جب تک زندہ ہیں کچھ نہ کچھ خود کرنے پر مجبور ہیں۔

قوم کی خدمت یا اُردو کی خدمت میرے لئے مصلحت نہیں حقیقت کا ایک رنگ ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے اور یہی بات ہے جو کبھی کبھی سوچ بچار پر مجبور کر دیتی ہے کہ اگر اِن چھوٹے چھوٹے مگر میرے لئے اہم کاموں کے کرنے میں مَیں حق پرستی یا راستی سے دُور جا پڑوں تو وُہ نہ اُس قوم و مذہب کی خدمت ہو گی جو حق کے عَلَم بردار ہیں اور نہ اُس زبان کی جو مختلف مِلّتوں اور قوموں کے میل جول سے بنی اور پھولی پھلی!

بشیر احمد

جہاں نما

یورپ کے امن کی بنیادیں

سرنارمن اینجل نے اپنے ایک مضمون میں اقوامِ عالم کے سامنے وہ مسئلہ پیش کیا ہے جسے یا تو یورپ کو حل کرنا پڑے گا یا خود تباہ ہوجانا پڑیگا
یورپی ممالک کے کروڑوں باشندے صلح و امن چاہتے ہیں پھر یہ کیا بات ہے کہ ہر وقت جنگ کا دھڑکا لگا رہتا ہے، اگر یہ کہا جائے
کہ آمر، سرمایہ دار، اور اسلحہ ساز تاجر یورپی اقوام کو اُن کی مرضی کے خلاف جنگ پر مجبور کر رہے ہیں تو یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی - ایک آمر یا چند
سرمایہ دار اور اسلحہ ساز کیونکر کروڑوں آدمیوں کو اُن کی مرضی کے خلاف جنگ پر مجبور کرسکتے ہیں - طاقت کثرت کے ہاتھوں میں ہوتی ہے، پھر وہ کیونکر
ایک، یا ایک درجن یا دس درجن آدمیوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن سکتی ہے؟ اصل سبب یہ ہے کہ خود اکثریت کے دماغ پر بعض خیالات اور قدروں
کا قبضہ ہوجاتا ہے —— دُوسرے ممالک کو فتح کرنے کا شوق اور اُس کے فواید پر یقین، قوم پرستی، حُبِّ وطن، بعض خاص نسلوں، قوموں، فرقوں
یا جماعتوں کے خلاف مذہبی، نسلی، قومی یا جماعتی تعصب - یہ وہ خیالات ہیں جن سے فایدہ اُٹھا کر ایک قلیل جماعت یا ایک فرد ایک قوم کی
قوم کو اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے - جنگ کے حامی، یا وہ چند لوگ، جو جنگ میں اپنا فایدہ سمجھتے ہیں عوام کے انہیں خیالات کے طفیل اپنا کام
نکالتے ہیں - اگر وہ لوگ ایک پوری قوم کو اپنے مقاصد کا بازیچہ بنا سکتے ہیں تو اس کا باعث یہ نہیں کہ وہ قوم سے زیادہ طاقتور ہوتے ہیں اور
اسے کسی طرح مجبور کرسکتے ہیں بلکہ قوم خود اپنے تعصبات اور توہمات کے صدقے میں انہیں یہ طاقت بہم پہنچاتی ہے -

اگر لوگوں کے دل و دماغ پر اس قسم کے خیالات کا قبضہ نہ ہوتا تو یہ ناممکن تھا کہ چند غرض مند لوگ ایک پوری قوم کو اپنا آلہ کار بنا سکتے
مثال کے طور پر عمارات کی تعمیر کا کاروبار کرنے والوں کو لیجئے - اگر یہ ممکن ہوتا کہ یہ لوگ عوام کو بڑے بڑے شہروں مثلاً لنڈن، برمنگھم یا بمبئی
وغیرہ کو جلا کر راکھ کر دینے پر آمادہ کرسکتے تو اینٹ چُونے لوہے، سیمنٹ، شیشے اور لکڑی وغیرہ کی تجارت کو بے انتہا نفع ہوتا - لیکن اینٹ
چُونے، لکڑی، لوہے وغیرہ کے تاجر یا سرمایہ دار لنڈن برمنگھم یا بمبئی کے لوگوں کو یہ آتشیں کھیل کھیلنے پر آمادہ نہیں کرسکتے - سرمایہ دار یہاں
ناکام رہتے ہیں - لیکن جب بموں اور توپوں کے ذریعہ سے یہ کام کرنے کو کہا جائے تو اسلحہ ساز سرمایہ دار کامیاب ہوجاتے ہیں - آخر دونوں
صُورتوں میں اس تفاوت کی وجہ کیا ہے حالانکہ سرمایہ دار کا مالی فائدہ دونوں ہی حالتوں میں یکساں ہوتا ہے -

حقیقت یہ ہے کہ اقلیت اکثریت کے دِلی عقاید اور خیالات کی تہ تک پہنچ کر اُن سے کام لیتی ہے - اکثریت کے خیالات ہی سے
اُس کی تباہی کا سامان پیدا کیا جاتا ہے -

جب ہٹلر میدانِ سیاسیات میں آیا اس وقت اس کے صرف دس چیلے تھے اور اگر اسے عوام کے بعض خاص جذبات کو اُبھار کر اُن سے

فائدہ حاصل کرنے کا ملکہ حاصل نہ ہوتا تو اس کے عقیدت مندوں کی اس تعداد میں کوئی بھی اضافہ نہ ہوتا۔ عوام کے یہ جذبات جن سے ناجائز فائدہ اُٹھایا جاتا ہے، کیا ہیں — فساد پسندی، دشمنی، نفرت، قوم پرستی سے متعلق خودغرضانہ مقاصد۔ جو لوگ ان جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں، انہیں یہ ہوش بھی نہیں رہتا کہ انہیں کوئی کدھر ہانکے لئے جا رہا ہے اور وہ کیسی کیسی اور کس کس چیز کی قربانی کر رہے ہیں۔

تمام محرکات اور جذبات سے گہرا جذبہ حفاظتِ نفس کا ہے کیونکہ اس کے بغیر زندہ چیزیں عالمِ وجود میں باقی نہیں رہ سکتیں۔ اگر غایر نظر سے دیکھا جائے تو یورپ کی قومیں ہلاکت کے جس راستے پر چل نکلی ہیں اس کے اختیار کرنے کی علّتِ اصلی بھی یہی حفاظتِ نفس کا جذبہ ہے، اگرچہ بظاہر یہ قول خود اپنی تردید کرتا ہُوا معلوم ہوتا ہے۔

اگر بدلے ہوئے بیرونی حالات کے عقلی مشاہدے کے بغیر ہم حفاظتِ نفس کے جذبے کی اطاعت کرنے لگیں تو بعض اوقات ہم سیدھے ہلاکت کے غار میں جا سکتے ہیں۔ اگر کسی جہاز کے ٹکرا کر ناکارہ ہو جانے پر لوگ اندھا دھند کشتیوں میں کودنا شروع کر دیں اور کسی ضبط اور نظام کی پیروی نہ کریں تو اگرچہ اس اندھا دھند دوڑ کا محرک حفاظتِ نفس ہی کا جذبہ ہوگا لیکن ہلاکت مُنہ کھولے ہماری منتظر کھڑی ہوگی۔ یہی حال قوموں کا ہے۔

دُنیا کی سب قومیں حفاظتِ نفس کے طریقے اختیار کر رہی ہیں لیکن جب تمام قومیں یہ طریقے اختیار کر لیں گی تو کوئی قوم بھی محفوظ نہ رہے گی۔ حفاظتِ نفس کے یہ طریقے کیا ہیں؛ ہر بڑی طاقت دِل میں کہتی ہے۔ اگر مجھے محفوظ رہنا ہے تو مجھے ہر دُوسری حریف طاقت سے زیادہ قوی بننا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ اس صُورت میں کمزور کو کبھی پناہ نہیں مِل سکتی۔ اگر طاقت کی زیادتی حفاظت کی شرط قرار دی جائے تو کمزور کا محفوظ رہنا ناممکن ہوگا۔

اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ یہ طریقہ حقوق اور اصُولِ اخلاق کی ہر حد کو توڑنے والا ہے کیونکہ طاقت ور کمزور کو محض اپنی قوت کے بل پر زندہ رہنے کے حق سے محروم قرار دیتا ہے۔

طاقت کی اس مسابقت کی کوئی حد نہیں قرار پا سکتی۔ اگر یہ حالت قائم رہی تو رفتہ رفتہ یورپ تہذیب و تمدن کی تمام دُوسری ضروریات کو پسِ پُشت ڈال کر سامانِ جنگ کے جمع کرنے کی ہوس میں یا تو خودکشی کر لے گا یا پھر دَورِ بربریت کو پیچھے کی طرف لوٹا لے گا۔

یورپ و امریکا کے مصارفِ جنگ

جنگِ عظیم کے بعد یورپ اور امریکا کے مصارفِ جنگ میں بے انتہا اضافہ ہو گیا ہے۔ کروڑوں اور اربوں روپے ہر سال آلاتِ تباہی کے خریدنے پر صرف ہو رہے ہیں۔ یہ غور کرنے کی بات ہے کہ اس اسراف کے بعد تعلیم، صنعت و حرفت، غریبوں کی امداد، اور فلاحِ بنی نوعِ انسان کے دیگر ذرائع کے لئے کس قدر رقم بچتی ہوگی۔ اس کے علاوہ جب ہر قوم جنگ کے عجیب ساز و سامان کے ساتھ

ہر دوسری قوم کے سر کے لئے ایک تیغِ کشیدہ بنی ہوئی ہے تو اِس عالم میں انسانی تہذیب کس قدر ترقی کر سکتی ہے۔ کیا درندگی کا یہ سامان انسان کے اعلےٰ اخلاق کی تہذیب میں کسی قسم کی مدد دے سکتا ہے۔ ذیل کے نقشے کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کی تہذیب بقولِ اقبال اپنے ہی خنجر سے خودکشی کرنے والی ہے۔

ملک	۱۹۱۳ء کے جنگی مصارف	موجودہ مالی سال کے جنگی مصارف
برطانیہ	۳۸۵,۰۰۰,۰۰۰ ڈالر	۸۷۰,۰۰۰,۰۰۰ ڈالر
فرانس	۳۰۷,۰۰۰,۰۰۰ "	۶۵۳,۰۰۰,۰۰۰ "
جرمنی	۲۸۱,۰۰۰,۰۰۰ "	۱,۵۶۰,۰۰۰,۰۰۰ "
اٹلی	۱۹۵,۰۰۰,۰۰۰ "	۲۹۱,۰۰۰,۰۰۰ "
ریاستہائے متحدہ امریکا	۲۴۵,۰۰۰,۰۰۰ "	۹۶۲,۰۰۰,۰۰۰ "

دُنیا میں یہودیوں کی تقسیم

ہٹلر نے جرمنی میں یہودیوں کے خلاف جو مہم شروع کر رکھی ہے اُس کے جوش و خروش کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید جرمنی کا چپہ چپہ یہودیوں سے پٹا پڑا ہوگا لیکن "ورلڈ یوتھ" کے ایک مضمون سے معلوم ہُوا ہے کہ جرمنی کے موجودہ حدود میں کل ۷۵۰۰۰۰ یہودی ہیں جو آبادی کے ایک فیصدی حصے سے کچھ ہی زیادہ ہوں گے۔

وارسا کی مجلسِ یہود کے بیان کے مطابق دُنیا میں یہودیوں کی کُل تعداد ۱۶۲۵۰۰۰۰ ہے۔ اس میں سے ۲/۳ حصہ ایسے ملکوں میں آباد ہے جہاں اس سے مساوات کا سلوک کیا جاتا ہے۔ باقی ایک ثلث میں سے کچھ تو پہلے ہی دوسروں کے زیرِ عتاب ہیں اور کچھ عنقریب اس عتاب کا شکار ہونے والے ہیں۔

مساوات کا سلوک کرنے والوں میں سے سب سے پہلا درجہ امریکا کا ہے۔ یہاں یہودیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ امریکا میں تقریباً ۴۵۰۰۰۰۰ یہودی آباد ہیں۔

اس کے بعد سوویٹ رُوس کا درجہ ہے یہاں ۳۰۸۰۰۰۰ یہودی رہتے ہیں۔ اِن کو بھی دوسرے سوویٹ شہریوں ہی کی طرح حقوق حاصل ہیں۔ البتہ دوسرے تمام مذاہب کی طرح یہودیوں کا مذہب بھی روسیوں کے منظم نیم سرکاری "مذہب شکن" پروپیگنڈے سے بچا ہُوا نہیں۔

چیکوسلوویکیا میں جو اب جرمنوں کے قبضے میں آگیا ہے ۳۵۷,۰۰۰ یہودی بستے ہیں۔ جرمنوں کے قبضے سے پہلے یہاں انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ تھی لیکن اب صُورتِ حالات بدل گئی ہے۔

ریاست ہائے بلقان میں یہودیوں کی مجموعی تعداد ۱۸۶۰۰۰ ہے لیکن یہاں بھی ان پر کم و بیش سختی ہی روا رکھی جاتی ہے۔

پولینڈ میں یہودی کُل آبادی میں دس فیصدی ہیں اور ہنگری اور رومانیا میں پانچ پانچ فیصدی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آبادی کے اتنے بڑے حصّے کو تباہ کرنا اقتصادی خودکشی کے مرادف ہے۔

اٹلی بھی یہودیوں کی مخالفت میں دُوسروں سے پیچھے نہیں حالانکہ یہاں اُن کی تعداد برائے نام ہے۔ ۴۵۰۰۰۰۰۰ کی کُل آبادی میں صرف ۴۰۰۰۰ یہودی ہیں۔ مسولینی کی مخالفتِ یہود اقتصادی یا نسلی اساس پر مبنی نہیں معلوم ہوتی۔ اس میں غالباً جرمنی کی سیاسی خوشنودی حاصل کرنے کا خیال پنہاں ہے۔

جاپان کی حالت اَور زیادہ عجیب ہے۔ جاپان کی کُل آبادی ۷۰۰۰۰۰۰۰ ہے اَور اس میں یہودیوں کی کل تعداد ۱۰۰۰ سے زیادہ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود جاپان میں یہود کے خلاف پروپیگنڈا جاری ہے۔

"ورلڈ ریویو" کے مضمون نگار نے یہودیوں کی مخالفت کے اسباب کی عِلّت کی تشریح یوں کی ہے:۔

"جب لوگ بھُوکے ہوں اَور وُہ ہر طرف سے قانون اَور قواعد کی زنجیروں میں بھی جکڑے ہُوئے ہوں۔ جب حرکت اَور گفتگو پر بیزاری پابندیاں عاید ہوں اَور جب مستقبل میں امن اَور خوش حالی کی کوئی صُورت نظر نہ آتی ہو تو انسان کے دِل میں نفرت، ناخوشی اور تعدّی کے زبردست جذبات کو تحریک ہوتی ہے۔

اِن حالات میں نزلہ عموماً کسی عضوِ ضعیف پر گرتا ہے۔ کوئی کمزور اقلیت قربانی کا بکرا بنالی جاتی ہے۔ جرمنی میں آجکل یہودی دوہرا کام دے رہے ہیں۔ قربانی کے بکرے کے طور پر وہ نفرت سے بھرے ہوئے بھوکے عوام کو اپنے جذباتِ غیظ و غضب کے فرو کرنے کا موقع دے رہے ہیں اَور ایک خاص مذہب کا نمائندہ ہونے کے اعتبار سے وُہ یہ موقع بھی بہم پہنچاتے ہیں کہ مذہبی فرض کے پردے میں ہر قسم کی ضمیر کشی جائز قرار دے دی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ وائنا اَور جرمنی میں پُرجوش عوام جب یہودیوں پر حملہ کرتے ہیں تو عموماً رومن کیتھولک پادری بھی اس جوش کا شکار ہوجاتے ہیں۔

فلسطین میں انگریزی حکمتِ عملی نے یہودیوں کے ساتھ نادان دوستوں کا سا سلوک کیا ہے۔ وُہ عربوں کے وطن میں سرمایہ دار اور سُود خوار یہود کو جبراً آباد کرکے نہ صرف عربوں کو یہودیوں کا دشمن بنارہے ہیں بلکہ اپنے خلاف بھی نفرت کے جذبات پیدا کررہے ہیں۔ یہودیوں کو عربوں کا ناخواندہ مہمان بنانا کسی طرح قرینِ انصاف یا قرینِ عقل و دانش نہیں۔

حامد علی خاں

حلقۂ جنوں

جسے دیکھوں، اُسے اپنی طرح دیوانہ کرتا ہوں
خرد کا نام سُن کر ہاتھ مَیں کانوں پہ دھرتا ہوں

جنوں پنہاں، جنوں ظاہر، جنوں اوّل، جنوں آخر
اِسی اِک حرف سے پیدا میں سو افسانہ کرتا ہوں

ہلاتی ہے زمین و آسماں کو خودسری میری
گراں، خود فطرتِ خلّاق کے دِل پر گزرتا ہوں

نہ پروا ہے سفینوں کی، نہ منّت ناخداؤں کی
نہنگ آسا ہر اِک طوفاں کی موجوں میں اُترتا ہوں

مرا نقش اَے اجل! کیا لوحِ ہستی سے مٹاتی ہے
کہیں ہر بار رُوحِ "کُن فکاں" بن کر اُبھرتا ہوں

عدم کا کلبۂ تاریک بھی مجھ سے فروزاں ہے
فنا کے ہاتھ سے شمعِ بقا کا گُل کترتا ہوں

بنایا تُو نے یارب ایک کُن سے پیکرِ خاکی
میں اس خاکے میں لیکن جانے کیا کیا رنگ بھرتا ہوں

نگار آرائے فطرت ہے مری خاکِ پریشاں بھی
رُخِ ہستی پہ، بن کر غازہ، مَیں ہر سُو نکھرتا ہوں

سیہ روزی سی اور مجھ سی ہے نسبت زلف و عارض کا
کہ بگڑے جس قدر تقدیر، اُتنا ہی سنورتا ہوں

مجھے کیا ساقیانِ بزمِ عشرت کی ہواداری؛
ابھی مَیں خونِ دل سے پے بہ پے پیمانہ بھرتا ہوں

حامد علی خان

خواب اور واقعات

خواہشوں کا یقینات پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ ہمارے بہت سے یقینات جن سے ہمیں روزمرہ کی زندگی میں مدد ملتی ہے حقیقت میں خواہش کی مختلف شکلیں ہیں۔ فرق اگر کچھ ہے تو صرف یہ کہ واقعے سے ٹکرانے کی وجہ سے کہیں کہیں ان کا جھول دُور کر دیا گیا ہے۔ انسان اصل میں ایک خواب دیکھنے والی مخلوق ہے، وُہ کبھی کبھار دُنیائے خارجی کی مداخلت سے ذرا کی ذرا جاگ جاتا ہے لیکن بہت جلد پھر سے اُونگھنے لگتا ہے فرائڈ نے کہا ہے کہ رات کے خواب ہماری خواہشوں کی زندہ تکمیل ہیں اور ہم یہی بات بیداری کے خوابوں یعنی یقینات وغیرہ کے متعلق کہہ سکتے ہیں یوں ہمارے یقینات اصلاً غیر عقلی ہیں۔ اور اس بات کو ہم تین طریقوں پر ثابت کر سکتے ہیں۔ (۱) پہلا طریقہ تحلیل نفسی کا ہے اس میں مجنونوں اور ہسٹیریا کے مریضوں کا غائر نظر سے مطالعہ کیا جاتا ہے اور یہ واضح کیا جاتا ہے کہ ان میں اور صحت مند انسانوں میں فی الاصل اختلاف کس قدر کم ہے۔ (۲) دُوسرا طریقہ فلسفۂ تشکیک کا ہے، اس میں ثابت یہ کیا جاتا ہے کہ ہمارے یقینات کی عقلی شہادتیں کس قدر کمزور اور کس قدر بودی ہیں۔ (۳) تیسرا اور آخری طریقہ عام انسانی مشاہدہ کا ہے اور میں یہاں اسی آخری طریقہ کو اختیار کرتا ہوں۔

غیر متمدن انسان ہر چند بیشتر مظاہر کو سمجھتا نہیں ہے سمجھ سکتا نہیں ہے تاہم ان کے متعلق یقینات رکھنا ضرور ہے اور اس کے یہ یقینات اتنے محکم اتنے قوی ہوتے ہیں کہ اس کے جملہ اہم افعال انہی کے زیرِ اثر صادر ہوتے ہیں۔ وُہ یہ باور کرتا ہے کہ اگر ریچھ یا شیر کا گوشت کھا لیا جائے تو جوانمردی اور شجاعت پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر سردار کا نام زبان پر لایا جائے تو موت فوراً واقع ہوتی ہے (اپنے اس آخری یقین کے تحت وُہ ان تمام الفاظ کو بدل دیتا ہے جن میں اس کے سردار کا نام ایک جزو کی حیثیت سے واقع ہوتا ہے) پھر جب وہ شکار اور ماہی گیری سے گزر کر کاشتکاری کا پیشہ اختیار کرتا ہے اور غذا کی فراہمی میں موسم کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے تو وُہ یہ یقین کرنے لگتا ہے کہ منتروں کے جپنے سے یا ٹونے ٹوٹکوں سے بارش ہوتی ہے اور آگ جلانے سے سُورج چمکتا ہے۔ مزید بریں وُہ یہ بھی مانتا ہے کہ جب کسی کو مار ڈالا جاتا ہے تو اس کا خون یا بھوت انتقام کے لئے قاتل کا پیچھا کرتا ہے لیکن اس بھوت کو دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ اگر قاتل اپنے میں تھوڑی سی تبدیلی پیدا کر لے مثلاً اپنے مُنہ کو سُرخ رنگ لے یا ماتمی لباس پہن لے[1]۔ اس یقین کا پہلا جزو واضح طور پر ان اشخاص کی دماغی پیداوار ہے جو قتل سے ڈرتے ہیں اور دوسرا جزو ان کی جنہوں نے قتل کیا۔

لیکن غیر عقلی یقینات صرف غیر متمدن انسانوں سے مخصوص نہیں، نوعِ انسان کی بڑی اکثریت ایسی مذہبی رائیں رکھتی ہے جو ہمارے

---

[1] فریزر کی کتاب "عہد نامہ عتیق میں متداول روایات" اس خصوص میں لائق مطالعہ ہے۔

مذہبی رایوں سے قطعاً مختلف ہیں اور بنا بریں بے بنیاد ہیں ۔ مدبّروں کے علاوہ جنہیں سیاسیات سے گہرا شغف ہوتا ہے وہ بیشتر مسائل کے متعلق جذباتی یقینیات رکھتے ہیں ۔ اور ایسے یقینیات ایک غیر جانب دار شخص کی نظر میں یکسر غیر عقلی ہیں ۔ کسی الیکشن میں رضا کارانہ حصّہ لینے والے ہمیشہ یہ باور کرتے اور کراتے ہیں کہ جیت انہی کو نصیب ہو گی حالانکہ دو میں سے ایک نہ ایک فریق کا آخر میں ہار جانا بالکل ضروری ہے ۔ سنہ ۱۹۱۴ء کے نصفِ آخر میں پوری جرمن قوم یہ سمجھتی تھی کہ فتح ان کی ہے لیکن یہ خواب واقعہ کی مداخلت سے ٹوٹ گیا ۔ پھر بھی کسی طرح اگر یہ ہو سکے کہ جملہ غیر جرمن مؤرخ آئندہ سو سال میں جنگِ عظیم کے متعلق کچھ نہ لکھیں تو خواب پھر سے شروع ہو جائے گا ۔ ابتدائی فتوحات کی یاد تازہ ہو گی اور آخری حادثہ بھلا دیا جائے گا ۔

شائستگی یا خوش خلقی عبارت ہے اس رویہ سے کہ ہم اپنے مخاطب کے ان یقینیات کا احترام کریں جو وہ اپنی ذات یا جماعت کے اوصاف کے متعلق اپنے قلب و دماغ میں رکھتا ہے ۔ یوں ہم میں سے ہر شخص کے ساتھ دل پسند یقینیات کا ایک جھنڈ ہر وقت متحرک رہتا ہے جیسے بعض جانوروں کے ساتھ ان کی مکھیاں لگی پھرتی ہیں ان یقینیات میں سے بعض شخصی ہوتے ہیں بعض خاندانی بعض جماعتی بعض قومی یا نسلی اور بعض نوعی یا جنسی ۔ شخصی یقینیات جیسا کہ نام سے ظاہر ہے فرد کے ذاتی کردار سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً یہ بتلاتے ہیں کہ وہ کن محاسن اور اوصاف کا مالک ہے اس کے احباب اس سے کتنی محبت رکھتے ہیں اور اس کے شناسا اس کی کس قدر عزت کرتے ہیں خاندانی یقینیات فرد کے خاندان سے نسبت رکھتے ہیں مثلاً یہ بیان کرتے ہیں کہ اس کا باپ کس قدر بلند شخصیت کا انسان تھا کتنا راست باز اور آن بان کا تھا اور اپنے بچوں کی تربیت اس نے کتنی جانفشانی سے کی ۔ علیٰ ہذا یہ کہ اس کی اپنی اولاد کتنی ذہین، ہوشیار اور اطاعت شعار ہے حالانکہ دنیا جہان کے بچے انتہائی غبی، کھلاڑی اور شوخ ہیں ۔ جماعتی یقینیات فرد کی سوسائٹی سے متعلق ہوتے ہیں مثلاً یہ واضح کرتے ہیں کہ اس کی سوسائٹی بمقابلہ اور اشخاص کی سوسائیٹیوں کے کس قدر ذہین یا متین یا خلیق ہے ۔ قومی یا نسلی یقینیات فرد کی قوم یا نسل سے علاقہ رکھتے ہیں، ہر شخص اپنی قوم کے بارے میں بہت سے خوش آئند خیالات رکھتا ہے، آخر میں نوعی یقینیات کا درجہ ہے جو پوری نوعِ انسان سے تعلق رکھتے ہیں وہ عام طور پر انسان کو موجوداتِ کائنات سے بلند و برتر ٹھہراتے ہیں مثلاً یہ کہتے ہیں کہ انسان حیوانِ ناطق ہے، خدا کا نائب یا مثنیٰ[1] ہے، مسجودِ ملائک اور مقصودِ خلائق ہے ۔ حیوانات میں ذی روح صرف وہی ہے اور کائنات کی غایت الغایات اسی کی صلاح و فلاح ہے اور ہم انہی نوعی یقینیات کی وجہ سے ہر ظالمانہ یا غیر فطری حرکت کو حیوانی حرکت کہتے ہیں حالانکہ وہ واضح طور پر انسانی ہوتی ہے ۔

اس طرح مرغوب یقینیات کا ایک مکمل نظام مرتب ہے اور اگر ہمیں کسی کے ساتھ اپنے خوشگوار تعلقات برقرار رکھنے منظور ہیں تو ضروری ہے کہ ہم اس کے ان تمام یقینیات کا احترام کریں لہٰذا ہم کسی کے منہ پر وہ نہیں کہہ سکتے جو اس کی پیٹھ پیچھے کہہ سکتے ہیں یعنی یہ کہ شائستگی ایک ناگوار دو روئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بھائیوں میں والدین کے متعلق اور دوستوں میں سوسائٹی کے متعلق شعوری شائستگی ضروری

---

[1] تکوین ۱ : ۲۷ (مترجم)

ہیں سمجھی جاتی ۔

لیکن دُنیا ناشائستگی کو مذموم خیال کرتی ہے ۔ حالانکہ اساطیر شکنی کے لئے اس سے بہتر اور کوئی شے نہیں ہمارے جبلّی یقینیات کی
ستی دو طرح ممکن ہے ۔ (۱) یہ کہ معروضی واقعہ سے ربط پیدا کیا جائے مثلاً اگر ہمیں بام مچھلی پر سانپ کا شبہ ہو تو وُہ اس کے کھانے پر
ور ہو جائے گا، یا اگر کسی کڑوی ککڑی کو ہم میٹھا سمجھتے ہیں تو اس کے چکھنے پر حقیقت واضح ہو جائے گی ۔ اور (۲) یہ کہ اپنے اور دوسرے
سانوں کے مخالف یقینیات کا موازنہ کیا جائے مثلاً اگر ایک جماعت گائے کے گوشت کو حلال اور سوّر کے گوشت کو حرام جانتی ہے اور
دسری اس ترتیب کو بالکل اُلٹ دیتی ہے تو سمجھنا چاہیئے کہ اصل میں دونوں حرام نہیں ۔ خاکساری شائستگی کی چھوٹی بہن ہے اور
ہ نام ہے اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو مخاطب اور اس کے متعلقین سے کمتر سمجھنے یا ظاہر کرنے کا ۔ آپ کے ملنے والوں میں سے اگر کوئی
پ کے "مزاج گرامی" کے متعلق دریافت کرے تو آپ یقیناً اسے "بندہ" اور "حضور" اور "دعا" کی اصطلاحوں میں جواب دیں گے یہی فرق متعلقین
ں بھی پیدا ہو جاتا ہے مخاطب کا لڑکا ہمیشہ "صاحبزادہ" ہوتا ہے او رمتکلّم کا ہمیشہ "خادم زادہ" ۔ لیکن یہ چیز شان اور اطمینان کی زندگی چاہتی
ہے اور تجارت و سیاست کا موجُودہ تیز رَو زمانہ اس کے لئے قطعاً سازگار نہیں کیونکہ انسانی تعلقات بڑی سُرعت کے ساتھ وسیع ہوتے چلے
یں اور یہ چیز اساطیر کے حق میں ازبس مہلک ہے شخصی خوابوں کو بھائی بند توڑ دیتے ہیں خاندانی خوابوں کو مدرسہ کے ساتھی جماعتی
والوں کو سیاسی توڑ جوڑ اور قومی خوابوں کو جنگ اور تجارت ۔ انسانی خوابوں کو البتہ کوئی شے نہیں توڑ سکتی کیونکہ ہم انسانیت کے دائرہ سے
ہر نہیں نکل سکتے ۔ یوں نوعی اساطیر کو بننے، بڑھنے اور پھیلنے کی پوری آزادی حاصل ہے ۔ تاہم اس قسم کے مغالطوں کی جزوی تصحیح سائنس
سے ممکن ہے لیکن یہ تصحیح بہرحال جزئی ہے نہ کم نہ زیادہ ۔ اور ہمیں اس کے بارے میں مبالغہ سے کام نہیں لینا چاہیئے کیونکہ سائنس خود یقین خوردہ
ہے اور بغیر کسی اعتقاد کے ممکن نہیں ۔

فلکیات کہتی ہے کہ کائنات بے حد و بے انتہا وسیع ہے ماؤنٹ وِلسن سے لے کر رصد گاہِ نظامیہ تک کی دُور بینیں جو کچھ ہمیں بتلاتی ہیں
وہ ایک بڑی حقیقت[1] کا ایک حقیر جزو ہے ۔ پھر یہ حقیر جزو خود اس قدر بے پایاں ہے کہ ہمارا تخیّل اس کے احاطہ سے عاجز ہے مرئی کائنات میں

---

[1] قطعی طور پر تو ہم یہ نہیں جانتے کہ یہ "بڑی حقیقت" ہے آخر کتنی بڑی تاہم چند تخمینے یہاں ناظرین کی دلچسپی کے لئے پیش کیے جاتے ہیں ۔ ماؤنٹ ولسن کی دُوربین بحالت
موجودہ دُنیا کی سب سے بڑی دُوربین ہے اس سے اکابر راصدین نے تقریباً ۲۰ لاکھ سُدام (Nebulae) کا مشاہدہ کیا ہے اور خیال ہے کہ پوری فضا ان سے ایک
ارب گُنا زیادہ سُدام کو محیط ہے اب یہ جاننا چاہیئے کہ ہر مرغولہ دار سدیم میں ہمارے سُورج جیسے کم و بیش ایک ارب ستارے ہیں یوں اگر آپ پہلے ۲۰ لاکھ کو ایک ارب سے
ضرب دیں اور پھر حاصل ضرب کو ایک ارب سے اور ضرب دیں تو حاصل جو کچھ ہوگا وُہ پوری کائنات کے ستاروں کا ایک خام اندازہ ہوگا ان اعداد و شمار کو قریب الفہم
بنانے کے لئے سر جیمز جینز نے اپنی مشہور تصنیف "پُراسرار کائنات" میں ایک اچھی تشبیہ استعمال کی ہے وہ کہتے ہیں کہ دُنیا بھر کے سمندروں اور دریاؤں کے کنارے
جتنی ریت ہے اتنے ستارے کائنات میں ہیں اور ہمارا سُورج انہی میں کا ایک ذرہ ہے اب یہ بتلانے کی تو غالباً کوئی ضرورت نہیں کہ (دیکھو حاشیہ صفحہ آئندہ)

کہکشاں کی حیثیت ایک بغایت ننھے سے ریزہ کی ہے اور ہمارا نظام شمسی اس ننھے سے ریزہ کے اندر ایک لاانتہا چھوٹا سا ذرہ ہے۔ اب نظامِ شمسی کے مقابلہ میں ہمارے سیارہ کی چونکہ خاص وقعت یا اہمیت نہیں لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک لاانتہا چھوٹے سے ذرہ کا ایک خردبینی نقطہ ہے۔ اس خردبینی نقطہ کے اُوپر طِواں کاربن اور پانی کی ننھی ننھی سی گانٹھیں جو پیچیدہ ساخت اور کسی قدر غیر معمولی طبیعی اور کیمیائی خواص اپنے میں رکھتی ہیں، چند سال تک اِدھر اُدھر رینگتی پھرتی ہیں۔ اور پھر ان عناصر میں تحلیل ہو جاتی ہیں جن سے وُہ مرکب ہیں۔ جتنے عرصہ تک یہ گانٹھیں زندہ رہتی ہیں مسلسل اس کوشش میں لگی رہتی ہیں کہ خود توفساد اور تحلیل سے زیادہ سے زیادہ محفوظ رہیں لیکن اپنی ہی نوع کے اور افراد کے لئے ان کی رفتار تیز تر کردیں۔ طبیعی حوادث اور امراض سے جو اموات ہوتی ہیں ان پر دلی افسوس کا اظہار کیا جاتا ہے لیکن جب انسان خود اس قسم کی تباہیاں اپنی نوع پر نازل کرتا ہے تو بہت خوش ہوتا ہے اور مقدس عمارتوں میں جاکر خدا کے شکریے ادا کرتا ہے۔ نظامِ شمسی کی زندگی کے مقابلہ میں انسان کی زندگی کا طبیعی امتداد ہرچند نہایت مختصر اور قلیل ہے لیکن توقع ہے کہ اس کی شمعِ حیات اس سے بہت پہلے گُل ہو جائے گی کیونکہ وہ اس پر مستقل رفتار سے پھونکیں مارے جا رہا ہے۔

لیکن کہا جاتا ہے کہ زندگی کا یہ خارجی زاویۂ نظر انتہائی خطرناک ہے کیونکہ وُہ ہم سے ہماری فطری توانائی سلب کرلیتا ہے اور بقائے انسانی کا انحصار تمام تر اسی پر ہے لہٰذا ہمارے غمخوار ہم سے براہِ ہمدردی یہ فرماتے ہیں کہ اگر ہمیں اس خوفناک انجام سے بچنا منظور ہے تو ضرور ہے کہ ہم اپنی آنکھیں حقیقت کی طرف سے بند کرلیں اور دو خوابوں کے دامن میں پناہ لیں۔ (۱) مذہب، اور (۲) فلسفہ۔ وجہ یہ کہ یہ دُنیا جو حقیقت کی تیز روشنی میں از بس مکروہ، غیر اہم اور متناقض معلوم ہوتی ہے اِن خوابوں میں نہایت حسین، پُرمعنی اور متوافق بن جاتی ہے، پھر ابتدائی سدیم کا ارتقا بھی انسان پر منتہی ٹھہرتا ہے، مطلب یہ کہ انسان کوئی ذلیل یا ردّی مخلوق نہیں۔ بلکہ بہ سبب ارتقا، کی معراج ہونے کے یدۂ فطرت کا نقطۂ ارتکاز ہے یعنی اشرف المخلوقات لیکن یہ ایک جھوٹا نسلی غرور ہے۔ ہیملٹ شیکسپیئر کا ایک نہایت مشہور ڈراما ہے اور اس سے آپ کو ناآشنا سمجھنے کی میرے پاس کوئی دلیل نہیں تاہم مجھے یقین ہے کہ "پہلے ملاّح" کا پارٹ شاید ہی آپ کے ذہن میں ہو کیونکہ وہ مشتمل صرف چند الفاظ پر ہے "خدا آپ کو سمجھے جناب!" اب انسانوں کی ایک جماعت اگر زندگی بھر یہی پارٹ ادا کرتی رہے تو کیا وُہ ادبی تنقید کے ایسے اسالیب ایجاد نہیں کرلے گی جن کی رو سے گنتی کے یہی چند الفاظ پورے ڈرامے کی جان ہوں گے؟ کیا وُہ اپنے میں سے ہر اس شخص کو جو یہ کہے کہ ممکن ہے دُوسرے کردار بھی مساوی طور پر اہم ہوں سخت سے سخت سزا نہیں دے گی؟ یقیناً! اور ٹھیک یہی حالت ہماری

(بسلسلہ صفحۂ گذشتہ) سُورج ہماری زمین سے دس لاکھ گُنا بڑا ہے۔

لیکن یہ نہ سمجھا جائے کہ اتنے ستارے گنجان طور پر آباد ہیں برعکس اس کے قوی قرینہ اس بات کا ہے کہ فضا کے بڑے بڑے رقبے قریب قریب خالی پڑے ہیں اسی لئے قیاس کیا گیا ہے کہ روشنی جو فی ثانیہ (سکنڈ) ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کی رفتار سے چلتی ہے اور کرۂ ارض کا احاطہ ایک ثانیہ کے ساتویں حصہ میں کرتی ہے فضا کی پوری وسعتوں کو ایک کھرب یعنی ایک لاکھ ملین سال میں طے کرے گی۔ "مترجم"

ہے، کائنات کے ذرّے میں ہمارا پارٹ "پہلے ملاح" کے پارٹ سے کہیں کم ہے لیکن چونکہ ہم ڈرامے کے اختتام تک زندہ نہیں رہ سکتے لہٰذا اس کے کرداروں یا پلاٹ کے متعلق بہت کم علم رکھتے ہیں۔

جب کبھی ہم نوعِ انسان کے متعلق غور کرتے ہیں تو پہلے اپنے آپ کو اس کا نمائندہ مقرر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہماری رائے اس کے متعلق کتنی عمدہ نہ ہوگی۔ چنانچہ ہم اس کی بقا کے بدل و جان متمنی ہوتے ہیں۔ عبدالوہاب ایک غیر مقلد پنساری ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ چونکہ صراطِ مستقیم پر گامزن چلا جا رہا ہے لہٰذا مرنے کے بعد بے پوچھے جنّت میں جائے گا جہاں حور و غلمان کوثر و تسنیم اس کے منتظر ہیں۔ لیکن اپنے مقلد حریف غلام احمد کے متعلق جو عموماً گھی میں تیل ملا دیا کرتا ہے، کم تولتا ہے، حیات النبی کا قائل ہے اور کبھی نماز نہیں پڑھتا اس کی رائے ہے کہ وہ ایک منٹ زندہ رہنے کے قابل نہیں لیکن چونکہ وہ ہے اور یہ کائنات کی اچھائی کی دلیل ہے لہٰذا ایک دوزخ اس نے اس کے لئے تراشا جس میں آتشیں اژدہے، زقوم، اور اسی قسم کی دیگر نادر و نایاب چیزیں مہیا ہیں۔ غلام احمد سے پوچھئے تو وہ اس نظام میں ذرہ بھر تبدیلی نہیں پیدا کرتا سوائے اپنی جگہ عبدالوہاب کو دینے اور اس کی جگہ خود لینے کے۔ یوں عمومی مسرت بھی منتج ہوتی ہے۔ انسان کی کائناتی اہمیت بھی برقرار رہتی ہے اور اس کی درندگی بھی جاری رہتی ہے۔

کوپرنیکس سے پہلے کائنات واضح طور پر انسی مرکزی (Anthropo-Centric) تھی، افلاک زمین کے گرد حرکت کرتے تھے اور زمین پر انسان کی حکومت تھی لیکن جب زمین خود سیّار بن گئی تو انسان بھی اپنے رتبۂ بلند سے معزول ہُوا لہٰذا ضرورت لاحق ہوئی ایک ایسی مابعد الطبیعیات کی جو سائنس کے نقصانات کا ازالہ کرے اس بارِ امانت کو تصوریئین نے اُٹھایا جو کہتے ہیں کہ مادہ نمودِ بے بود ہے اور حقیقتِ عظمیٰ ذہن یا رُوح ہے۔ یوں فرد اور کائنات جب متحد الاصل قرار پائے تو ہیگل نے یہ کہا کہ کائنات اس کے زمانہ کی پروشیئن مملکت کے نمونہ پر ہے اور بریڈلے وغیرہ نے یہ کہ وہ دوالیانی سرمایہ دار عمومیت کے مماثل ہے، ان نظریوں کی تائید میں یہ لوگ جو دلائل پیش کرتے ہیں وہ اتنے پُر فریب ہیں کہ نظر عموماً تہ کی انسانی خواہشوں تک نفوذ نہیں کر سکتی تاہم مبصر نگاہیں ان مغالطوں پرے جو ان دلیلوں میں مضمر ہیں اصل حقیقت کو جان جاتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب انسان کوئی توجیہہ پیش کرتا ہے تو اپنی موافقت میں زیادہ غلطیاں کرتا ہے اور یہی غلطیاں اس کی شخصیت کے سمجھنے میں مدد دیتی ہیں کیونکہ ان سے ان کی خواہشوں کا اظہار ہوتا ہے۔

یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہب اور فلسفہ اگر غلط بھی ہوں تو ان سے فائدہ ہی ہے نقصان تو نہیں لہٰذا کیوں نہ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے لیکن گزارش ہے کہ ان سے فائدہ ہی کیا ہے جو تسکین وہ ہمیں جہدِ زندگی میں عطا کرتے ہیں کبھی آپ نے یہ بھی غور کیا ہے کہ ہم اس کی کیا قیمت ادا کرتے ہیں، یہ فلاکت، یہ مصیبت، یہ نکبت جو نوعِ انسان پر طاری ہے لا علاج نہیں لیکن مذہب اور فلسفہ دونوں یہ کہتے ہیں کہ ہمیں انہیں مطیعانہ انگیز کرنا چاہئے کیونکہ شر بے حقیقت ہے اور عدم مقاومت کی یہ غلامانہ ذہنیت ہی ان کا سب سے بڑا کھوٹ ہے۔ زندگی کی مصیبتیں کچھ تو طبیعی اسباب کا نتیجہ ہیں اور کچھ انسانوں کی باہمی عداوت کا۔ گذشتہ زمانہ میں جنگیں اور مسابقتیں ناگزیر

اس لئے تھیں کہ انسان کو فطرت پر قابو نہ تھا اور غذا کی فراہمی ضروری تھی۔ لیکن آج حالت اور ہے، سائنس نے ہمیں قوائے فطرت پر غلبہ عطا کرنا شروع کیا ہے اور اگر جملہ انسان باہمی تسخیر کے جنون سے باز آ کر بالکل فطرت کی تسخیر کے درپے ہو جائیں تو یہ دُنیا جو زندوں کا دوزخ بنی ہوئی ہے واقعی بہشتِ بریں ہو جائے یاد رکھیئے کہ انسان کا حقیقی مجد و شرف صرف اس میں ہے کہ وُہ اپنی تمام توانائیوں کو سائنٹیفک قوت کے حصُول کے لئے وقف کر دے ورنہ فطرت کی مدد سے ہم جنسوں کے خون سے ہولی کھیلنا تو اسے پھر وہیں پہنچا دے گا جہاں سے وُہ اُبھرا ہے — نری حیوانیت!

اس کے ماسوا جو مسرت کہ بے بنیاد یقینیات سے حاصل ہو وہ نہ زیادہ شریفانہ ہے اور نہ زیادہ شاندار۔ دُنیا میں ہماری جو حیثیت ہے وہ ہمارے غلط یقینیات سے بدلتی نہیں ایک شخص اگر خود کو قیصرِ ہند باور کرے تو اس سے اس کی حیثیت پر کیا اثر پڑتا ہے لہٰذا اپنی اصلیت کے بے جھجک ادراک و اظہار میں کوئی ذلت نہیں برعکس اس کے اس میں ایک بے پایاں عظمت ایک قوی مسرت ہے۔ ایک ایسی عظمت اور مسرت جو جھوٹے شیخی بازوں کو میسّر نہیں اور پھر وہ شخص جو اپنی چھٹائی کو چھُپاتا ہے خوف کے پنجۂ آہنیں سے آزاد نہیں اور خوف انسان کو ذلیل اور ظالم بنا دیتا ہے۔

(ترجمہ) — **مرزا محبوب بیگ**

اگر ہر آدمی ایک اَور آدمی کی اصلاح کرے

اگر ہر آدمی ایک اَور آدمی کی اصلاح کرے
تو تمام بنی آدم کی اصلاح ہو جائے۔

بقائے حق

"ذکر و فکر" کا ایک ورق

تو حق پرست اگر ہے تو کیا خطر ہے تجھے
بغیر حق کے ہر اک چیز نقش فانی ہے

ہے ایک خواب پریشاں زمانِ رنج و الم
اور ایک خوابِ دل افروز شادمانی ہے

نہیں ثبات کسی شے کو دارِ فانی میں،
گریز پا ہے بہار اور خزاں بھی فانی ہے

ہے ایک لمحے کا آزار آرزو کی شکست
برنگِ موجِ صبا لطفِ کامرانی ہے

حیات و موت پہ بھی کوئی اختیار نہیں
اِک اتفاقی ہے اور ایک ناگہانی ہے

یہ زندگی کہ ہے مجموعۂ نشاط و الم
قرار اِسے بھی نہیں، یہ بھی آنی جانی ہے

مگر جو روح رہے حق سے ہمکنار اثرؔ
وہ سربلند ہے، زندہ ہے، جاودانی ہے

آثر صہبائی

وُہ دونوں

اٹھارہ سال کی ملازمت ہوئی تھی، اولاد نہ ہونے کے سبب دونوں میاں بیوی بڑے ملُول رہتے تھے۔ لیکن اس سے پہلے وہ کبھی مایوس نہیں ہوئے تھے۔ سادھو، فقیر، جوگی اور طبیب، عامل اور مُلّا جب کبھی انہیں یقین دلادیتے کہ ان کے عمل یا ٹوٹکے یا دوا سے یقیناً اولاد ہوگی تو اُمید کی دھیمی سی شعاع ان کے دل کی گہرائیوں میں اپنی دُھندلی چمک پیدا کردیتی تھی، مگر جب کوئی اثر نہ ہوتا تو گہرے اور ٹھنڈے سانس ہی ان کی رفاقت کرتے تھے۔

پولیس کے سب انسپکٹر کا کوارٹر ہوتا ہی کتنا بڑا ہے، تاہم رات کے سناٹے میں اور دن کی دوپہر میں وہ گویا انہیں ڈراؤنا معلوم ہوتا تھا، مکان کی حیثیت سے زیادہ فرنیچر تھا، اور سب انسپکٹر سلیم نے اس کی فراہمی میں بڑی جدوجہد کی تھی، چنانچہ جس پولیس تھانے میں وہ تعینات رہے، لکڑی کے ٹھیکیداروں اور فرنیچر سازوں سے ان کے روابط بہت گہرے ہی رہے، اور اسی لئے دو کے بجائے چار صوفے، چھ کی جگہ دس کرسیاں، بہترین ساخت کے پلنگ، شیشے دار الماریاں، عمدہ قسم اور جدید وضع کی متعدد میزیں، کتابیں رکھنے کے شلف موجود تھے۔ جنہیں ان کی بیگم صفیہ جہان نے اپنی خوش سلیقگی کی بدولت نہایت اچھی حالت میں رکھا تھا۔ ان کے مقابلے میں اگر تمام ملک کے سب انسپکٹروں کے کوارٹروں کا مشاہدہ کیا جاتا، تو بالیقین کسی دُوسرے سب انسپکٹر کا کوارٹر بہمہ وجوہ اس شان کا نہ قرار دیا جاتا۔ قرینہ اور نفاست صفیہ جہان پر ختم تھے، ان کے پاس ہارمونیم بھی تھا جسے صفیہ جہان نہایت عمدگی سے بجالیتی تھیں، اور ان کا ترنم بدرجۂ غایت پُرسوز، پُرکیف، اور پُراثر ہوتا تھا۔ صفیہ نے گانا کسی سے نہیں سیکھا تھا، بلکہ وُہ جو گراموفون ان کے پاس تھا اور اس کے جو چار پانچ پسندیدہ ریکارڈ ماہ بماہ خریدے جاتے تھے، انہیں بار بار بجا کر صفیہ ان کی موسیقی اور گانے کی اصل کے مطابق نقل کرلیتی تھی۔

کوارٹر کے علاوہ جسمانی آرائش کا بھی ان دونوں کو بڑا شوق تھا۔ سنگھار میز کے قریب پہنچ کر نہ جانے کیوں ان دونوں کے مُنہ پر الگ الگ ہوائیاں اُڑنے لگتی تھیں، لیکن وہ بالوں کو یورپ کے اعلےٰ سے اعلےٰ تیلوں سے تر کرکے برش اور کنگھا ضرور کرتے تھے۔ کریم، اسنو اور غازہ ضرور استعمال ہوتا تھا۔ خضاب چونکہ نزلہ پیدا کرتا ہے لہٰذا اس سے دونوں پرہیز کرتے تھے۔ البتہ جب کبھی سیاہ بالوں میں کہیں وہ نقرئی تار جو زمانہ اپنی کہنگی کی یادگار کے طور پر عطا کرتا ہے انہیں نظر آجاتے تو وہ خاصی کوشش سے انہیں اُکھاڑ لیتے اور بار بار دیکھتے، منٹوں ہاتھ میں لئے رہتے، مگر ایک دُوسرے کو نہ بتاتے، اور نہ کسی اَور کو بتاتے تھے، البتہ جس طرح خار کی چبھن سی محسوس ہوتی رہتی ہے، ان نقرئی تاروں کا نمایاں ہونا انہیں بہت متاثر کرتا تھا۔

تمام دُنیا جانتی تھی کہ ان کی زندگی بڑی مطمئن ہے، نہ ان کے ساتھ لڑکے بالوں کا جنجال ہے، نہ کسی بچے کے بلکنے کی دردانگیز صدائیں ان کے گھر سے آتی تھیں، نہ کسی بچے کے پالنے پوسنے، پہنانے اُڑھانے، پڑھانے لکھانے کی دردِ سری اور ذمّہ داری ان پر عائد ہوتی ہے۔ وہ دو نفر ہیں۔ تنخواہ معقول ہے، نہ انہیں کوئی اندیشہ ہے نہ غم ہے۔ وہ بھی اپنا دل سمجھانے کے لئے یہی کہتے تھے کہ ہمیں کوئی غم اور کوئی فکر نہیں ہے۔ مگر اُن کا دل سمجھتا تھا یا نہیں، یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔

ہر سال جب دو ماہ کی رخصت لے کر وہ دونوں وطن جاتے تو صدہا قسم کی سوغاتیں لے جاتے تھے کیونکہ اپنے اپنے عزیز و اقارب کو تحفتہً کچھ نہ کچھ دینا پڑتا تھا۔ اس وقت البتہ صفیہ جہان کی صُورت پر تاریکی چھا جاتی تھی۔ کیونکہ وہ دیکھتی اس کی سہیلی فرحت کے چار لڑکے ہیں۔ اس کے سامنے کی لڑکیاں جوان ہو کر بیاہی گئی ہیں، اور ان کی گود میں بچے کھیل رہے ہیں۔ ان بچوں کو پیار کرتے وقت اس کا کلیجہ بھر نے لگتا تھا۔ دِل تڑپتا تھا، اور آنکھیں بند کر کے اکثر وُہ عالمِ تصور میں کھو جاتی تھی۔ اسے یہی خواب نظر آتے تھے کہ اس کی گود میں بڑی بڑی چمکدار آنکھوں والا خوبصورت بچہ ہے، یا اس کے پہلو میں سنہری بالوں والی حسین لڑکی سو رہی ہے۔ مگر جب اُٹھ کر دیکھتی تو وہاں کوئی نہ سویا ہوتا۔ وُہ دائیوں کو اپنا پیٹ بہت دکھایا کرتی تھی۔ مگر جب لیڈی ڈاکٹر مس فیلن نے اس کا معائنہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ صادر کر دیا تھا کہ اب تمہیں اولاد ہونے کی آس نہ رکھنی چاہئے، تو اس دن وہ ہمیشہ سے زیادہ اُداس ہوئی، اور کسی طرح اس کا جی نہ بہلا، وہی زمانہ تھا جب اس کے شوہر کی ملازمت کے اٹھارہ سال روبہ اختتام تھے۔

اگر سلیم کی بجائے کوئی دوسرا اسسٹنٹ انسپکٹر ہوتا جسے اولاد کی آرزو بھی ہوتی تو وہ فی الفور دوسری شادی کر لیتا، اور احباب و رفقا کے مشورے کو نہ ٹھکراتا۔ لیکن سلیم نے ہمیشہ صفیہ کے نازک دِل کا پاس کیا، اسے صفیہ سے بہت اُنس تھا، اور وُہ کبھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کے دل کو صدمہ پہنچائے۔ خود صفیہ نے اکثر تذکرۃً سلیم کو ترغیب دی تھی کہ اولاد کی خاطر ایک شادی اَور کر لے۔ مگر سلیم نے اسے مذاق پر محمول کیا اور اگر سنجیدگی کی روشنی میں دیکھا بھی تو انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ "صفیہ! میں اولاد نہیں چاہتا۔ میں تو بس تمہیں چاہتا ہوں" سلیم کے یہ فقرے نہ جانے کونسے اثر میں ڈوبے ہوئے رہتے تھے جو صفیہ کی آنکھیں ڈبڈبا آتی تھیں۔ وہ سنتے ہی اپنا سر اس کی آغوش میں دے دیتی اور سسکیاں بھرنے لگتی تھی۔

جس دن سے مس فیلن نے اپنا طبی فیصلہ صادر کیا ہے، صفیہ کی اور خود سلیم کی طبیعت میں زبردست انقلاب پیدا ہو گیا ہے گو اپنے فرائضِ منصبی میں وہ کوتاہی نہیں کرتا، لیکن ایک خاص جذبۂ رحم اور انسانیت اس کی ہر کارروائی میں شامل رہنے لگی ہے۔ جن سزایابوں کی جانچ کے لئے وہ دَورے پر جاتا تھا، جنہیں سخت سست کہتا تھا، سخت سلوک روا رکھتا تھا، انہیں اب کچھ نہیں کہتا۔ قلب ماہیت کی انتہا ہو گئی تھی چنانچہ چوراَمن کی اندھی ماں کے ہاں سے کسی نے دس سیر اناج جو چکی پیس کر اس نے جمع کر رکھا تھا چوری کر لیا تھا۔ اس کی رپورٹ درج کرنے کے بعد دس سیر اناج کی قیمت سلیم نے اپنی جیب سے ادا کر دی۔

اُمید النقب زن کی بیوی کو بلا کر پوچھا کہ آخر کیوں تیرا شوہر دس مرتبہ سزا پانے کے باوجود نقب زنی سے تائب نہیں ہوتا؟ اور جب اس نے بتایا کہ "سرکار! چھ لڑکے لڑکیاں ہیں، گزر نہیں ہوتا۔ نقب نہ لگائے تو کیا کرے" سلیم نے اسی وقت اپنی تنخواہ سے پانچ روپے ماہانہ اس کا وظیفہ مقرر کر دیا اور اُمید اکو بلا کر عہد لے لیا کہ اب نقب زنی نہیں کرے گا۔ پولیس لائن کے سپاہی اور ہیڈ کانسٹبل کے گھر جا کر خود سلیم ان کی تکالیف کی نسبت استفسار کیا کرتا اور ہفتے کے بازار کے دن کسی کے ہاں سبزی کسی کے ہاں گڑ، کسی کے ہاں اناج بھجوا دیتا۔ کیونکہ قلیل تنخواہیں ہونے کے باعث ان بیچاروں کو اکثر چیزیں بہم نہیں پہنچتی تھیں، اور اسی لئے وہ دیہات میں جا کر رعایا کو تنگ کرتے تھے۔

جس سلیم نے ہزاروں جرم کرنے والوں کو ذرا ذرا سی خلاف ورزیٔ قانون کے عوض مجسٹریٹ کی روبکاری میں پیش کئے بغیر دم نہ لیا تھا وُہی سلیم اب اتنا بدل چکا تھا کہ عزت داروں کی عزت کا پاس رکھنے لگا اور حتی المقدور ان کے خفیف جرائم کو روزنامچے تک میں درج کرنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ قتل کے مقدمات میں اب اسے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ پیارے نائی کے قتل میں جتنے آدمی ماخوذ تھے، انہیں محض شک کا فائدہ بہم پہنچانے کے لئے سلیم نے جھوٹی شہادت نہیں بنائی اور سشن جج نے تمام ملزموں کو بری کر دیا۔

صفیہ جہاں کی حالت بھی بدل گئی تھی۔ اسے غریبوں کے بچوں سے بڑی محبت تھی، بالخصوص خوبصورت بچے اسے بہت بھاتے تھے چنانچہ مٹھائی، کھلونے، اور خوبصورت اور دلفریب کپڑوں کے تھان اس کے پاس ہمیشہ موجود رہتے تھے، وہ بچوں کو کھلونے مٹھائیاں تقسیم کرتی رہتی۔ اور انہیں کپڑے بنوا دیتی تھی۔

اکثر غریب عورتیں اس کے پاس اپنے بچوں کو گود میں لئے ہوئے آتیں تو صفیہ کو ان کے میلے پھٹے چیتھڑوں سے کوئی گھن نہیں آتی تھی۔ وُہ خود صابون سے بچے کا مُنہ دُھلاتی، ناک صاف کرتی، تیل لگاتی، کنگھی کرتی، اور نئے فراک اور نئی شلواریں پہنا کر انہیں گود میں لئے پھرتی اور خوش ہوتی تھی۔

صفیہ نے اپنے دالان میں رسی کا ایک جھولا بھی ڈال لیا تھا جس میں کسی ننھے بچے کو لے کر بیٹھتی اور "سو جا بھیا بالے بیر۔ تیری بلائیں لوں جمنا کے تیر" ایسی پُرسوز لے سے گاتی کہ سُننے والوں سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جاتا تھا۔ مٹھن حلوائی کی عورت اکثر کہا کرتی تھی کہ جب تھانیدارن صاحبہ میرے بچے کو گود میں لے کر جھولا جھلاتی ہوئی یہ لوری سُناتی ہیں تو بھگوان کی قسم میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

منڈاور اور جبل پور کے درمیان جو بیجا ڈانڈی پولیس اسٹیشن ہاؤس ہے، وہاں آج کل انسپکٹر سلیم تعینات ہیں۔ دو مرتبہ حلقہ انسپکٹری کا موقع دیا گیا لیکن سلیم نے اپنی بیوی کے مشورے سے افسران بالا کو لکھ دیا کہ وُہ حلقہ انسپکٹر بننے کا تمنائی نہیں ہے۔ اسے انسپکٹر ہی رہنا منظور ہے بیس سال ہو چکے ہیں اور پانچ سال ملازمت کر کے وہ پنشن لے لے گا۔ اور پنشن بھی بیجا ڈانڈی ہی سے لے گا۔ اسی لئے یہاں سے وہ اپنا تبادلہ بھی نہیں چاہتا۔ ریلوے اسٹیشن نہیں ہے۔ البتہ موٹر لاریاں ملتی ہیں۔ بسیں آتی ہیں اور اتنی ہی جاتی ہیں۔ بیجا ڈانڈی ان سے

بم لینے کی جگہ ہے۔

برسات کے دن تھے، مینہ کی جھڑی لگی ہوئی تھی، بائیس گھنٹے گزر چکے تھے لیکن پانی نے آنکھ نہیں کھولی تھی۔ گاؤں کے کنارے جو پہاڑی ندی بہتی ہے، اس کے شور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ تھانے سے چند فرلانگ آگے اسی ندی پر متوسط درجے کا پل بنا ہوا تھا۔ طغیانی کے باعث وہ پل غرقاب تھا، اور اس پر تقریباً دس فٹ پانی بہہ رہا تھا۔ تھانہ اور سب انسپکٹر کا کوارٹر اور پولیس لائن ٹیکری پر واقع ہیں۔ صفیہ جہاں اپنے کوارٹر میں سے بیٹھ کر دور تک کا نظارہ کر سکتی تھی۔ پہلی موٹر لاری جو جبل پور جانے والی تھی، بیجاؤ ڈانڈ میں ذرا ٹھہر کر جب آگے بڑھی تو پل تہ آب دیکھا اس لئے واپس لوٹ کر تھانے کے سامنے کھڑا ہونا پڑا۔ پہاڑی ندی کے خیال سے لاری والوں کا اندازہ تھا کہ پانی ایک دو گھنٹے میں اتر جائے گی۔ اسی لئے وہ منتظر رہے۔

شام ہوتے ہوتے بائیس لاریاں آکر رک گئیں۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں، مسافر ٹھٹھر رہے تھے۔ اندھیرا ہو رہا تھا۔ صفیہ جہاں اپنے کوارٹر میں سے سڑک کا منظر دیکھ رہی تھی۔ اس سے نہ رہا گیا۔ سلیم کو بلا بھیجا۔ پھر دونوں کے مشورے سے پولیس کا سپاہی تمام ڈرائیوروں کو بلانے کے لئے گیا۔ کل چار سو سواریاں تھیں۔ ان میں ہندو بھی تھے، مسلمان بھی تھے، عورتیں بھی تھیں، مرد بھی تھے، بچے بھی تھے۔ تھوڑی دیر میں تمام پولیس تھانہ، اور جب وہاں جگہ نہ رہی تو اسکول مسافروں سے بھر گیا۔ موٹروں کے ڈرائیور، کلینر اور کنڈکٹر تک صفیہ جہاں اور انسپکٹر سلیم کے مہمان بنے، دو بوری چاول، ایک بوری گیہوں کا آٹا، ایک ٹین گھی، بکرے، دالیں اور دیگر لوازم دو گھنٹے میں تمام مسافروں کے لئے مہیا کر دیئے گئے۔ مسلمان مسافر خود سلیم اور صفیہ جہاں کے زیر اہتمام مہمانی کر رہے تھے۔ تمام نقاب پوش خواتین صفیہ جہاں کے کوارٹر میں تھیں۔ دودھ، چائے سے بھی تواضع کی گئی، اور اس طرح چار سو مسافر رات کی سردی اور بارش سے محفوظ رہے۔

عورتیں جس وقت صفیہ جہاں سے دوسرے دن جدا ہو رہی تھیں تو ایسی اشکبار ہو رہی تھیں گویا وہ ان کی بڑی عزیز و قریب ہو۔

دوسرے دن آٹھ بجے تمام لاریاں جبل پور روانہ ہو گئیں۔ ہر شخص کی زبان پر اپنے معزز میزبان انسپکٹر سلیم اور صفیہ جہاں کے لئے عقیدت اور خلوص سے بھرے ہوئے کلمات تھے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

اس واقعے کے بعد سلیم کو جتنی مرتبہ جبل پور جانے کا اتفاق ہوتا رہا انہیں بڑی حیرت ہوتی، کیونکہ لوگ زبردستی آکر ملتے، مصافحہ کرتے، خیریت پوچھتے، جبراً اپنے گھر لے جاتے، ہوٹل میں لے جاتے، حلوائی کی دکان پر لے جا کر پان کھلاتے، اور سگریٹ پلاتے تھے۔ اکثر سلیم ان سے کہتے کہ میں نے آپ کو نہیں پہچانا تو وہ لوگ معذرت کر کے کہتے تھے کہ ہم تو آپ کو پہچانتے ہیں۔ آپ نے فلاں فلاں وقت ہمیں بڑی مدد دی تھی، آپ نے ہمیں آسرا دیا تھا، آپ نے ہمیں کھلایا پلایا تھا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

گورنجن سنگھ حوالدار متذکرہ واقعے سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ اس نے اپنی بیوی کے زیور فروخت کرکے آنے جانے والوں کے لئے بیجاڈانڈی میں بانس کی دیوار اور گھاس کے چھپر کا ایک مسافر خانہ بنوایا جواب تک اس کی حوصلہ مندی اور خدمتِ خلق کے جذبات کی یاد دلا رہا ہے۔

ملازمت سے سبکدوش ہوکر وطن جانے کی بجائے وہ دونوں اسی جگہ آباد ہو گئے۔ ہرچند عزیزوں نے ترغیب دلائی کہ وُہ پٹنہ میں آجائیں شہری زندگی بسر کریں، اپنوں میں رہیں، لیکن صفیہ جہاں کی مرضی کے خلاف سلیم کہاں جاسکتے تھے۔ ناگا پہاڑ کے دامن میں، بالٹی ندی کے کنارے چھوٹا گاؤں میں ان دونوں نے اپنا کچا گھر بنوایا، اور گونڈوں کے بیچ میں اپنی زندگی کے دن گزارنے لگے۔

اطراف کی تمام آبادیوں کے لئے وہ مایۂ صد ہزار پرستش تھے۔ کیونکہ ہومیو پیتھک دواؤں کا بڑا بکس ان کے پاس تھا۔ وُہ دونوں ڈاکٹر اور ڈاکٹرنی کہلاتے تھے۔ ڈاکٹر بوڑھے مریضوں کی ہانپی (دم کشی) کھانسی، امراضِ چشم کا علاج کرتے تھے اور ڈاکٹرنی عورتوں اور بچوں کو دوا دیتی تھیں۔ دو بیلوں کے مختصر چھکڑے میں بیٹھ کر وہ دونوں گاؤں گاؤں کا گشت لگاتے۔ کسی سے ایک حبہ نہ لیتے بلکہ اکثر اوقات اپنے پاس سے غربا کو کھانے پینے کے واسطے دام دیتے تھے۔ برسات کی اندھیری رات میں جب سارا عالم سائیں سائیں کر رہا ہو کسی مصیبت زدہ کی خفیف آواز سنتے ہی وُہ دونوں بسترِ استراحت کو خیرباد کہہ کر چھکڑا جوت کر، دواؤں کا بکس اپنے ہمراہ لے کر فوراً روانہ ہو جاتے تھے۔

اس دُنیا میں اُن کے لئے بس ایک کام باقی رہ گیا تھا، اور وُہ تھا غریبوں کی دستگیری۔ اور اسی کام، اسی مشن اسی نصب العین کو پیشِ نظر رکھ کر وہ اپنے بڑھاپے کے ایام پورے کر رہے تھے۔ ان کے اکثر رشتہ دار ملنے آئے، سہیلیاں آئیں، بھائی بند آئے اور وہ کسی کی تحریک سے متاثر نہ ہوئے۔ جب وہ دونوں اکیلے رہتے تو ضرور بحث کرتے تھے کہ تمام رشتہ داروں کی غایت سوا اس کے کچھ نہیں ہے کہ وُہ جب مر جائیں ان کا مال اسباب اپنے قبضے میں کر لیں۔ چنانچہ یہی وجہ تھی جو وُہ دونوں عزمِ صمیم کر چکے تھے کہ ہم دیس نہیں جائیں گے۔ برادری میں نہیں رہیں گے بلکہ اسی سرزمین میں دفن ہوں گے۔

یہ سب کچھ تھا۔ لیکن جب کبھی تاریک اور بھیانک رات کے سناٹے میں صفیہ جہان کو خوش آئند خواب نظر آجاتا کہ کوئی نہایت خوشرو بچہ اس کی گود میں کھیل رہا ہے، اور وُہ چونک کر اُٹھ بیٹھتی، تو اس کی رُوح پلنگ پر اِدھر اُدھر کسی حسین، سنہری بالوں والے بچے کو ٹٹولنے لگتی تھی۔ اور لاریب اس وقت صفیہ کا معصوم دل، بچوں کا سا معصوم دل، کیسا تھوڑا تھوڑا ہوتا ہوگا، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ شاید اس کی آنکھوں کا تجسس، رُوح کی فریاد، قلب کا حزن، اور ذہن کی مایوسی کا سچا تجربہ انہی بیچاریوں کو ہوگا جن کی گود اولاد کی نعمتِ عظمےٰ سے خالی ہوگی۔

حسن عزیز جاوید

غزل

بیمارِ شبِ غم کی اللہ رے ! توانائی
اِک ہُوک اُٹھی دِل سے، اور عرش کو چھُو آئی

کچھ تجھ کو خبر بھی ہے او محوِ خود آرائی
آنکھیں ہی نہیں تنہا، دِل بھی ہے تماشائی

ہر چیز محبت میں بے تاب نظر آئی
تتلی بھی ہے آوارہ شبنم بھی ہے ہرجائی

جب اُٹھ نہ سکا اُس سے جورِ غمِ تنہائی
بُو پھول کے سینہ سے گھبرا کے نکل آئی

ساقی کی نگاہوں کا انداز ارے توبہ!
مَے جام میں لیتی ہے انگڑائی پہ انگڑائی

اس عشق و محبت کے دستور کو کیا کہیئے!
جینا بھی ہے رُسوائی، مرنا بھی ہے رُسوائی

ڈوبی ہوئی نظریں کیوں اُبھری چلی آتی ہیں
اِک بھولنے والے کو شاید مری یاد آئی

کیا ظلم ہے یہ دُنیا، قاتل اُسے کہتی ہے
جو موت کے پردے میں کرتا ہے مسیحائی

ماہرؔ مجھے مطلب کیا احساسِ مسرت سے
آنے کو مرے لب پر سو بار ہنسی آئی

ماہرالقادری

پردے

(لندن سے ایک خط)

حمید نے ٹیلیفون کیا۔ پلیڈیم (Palladium) میں ویرائٹی شو (Variety Show) نہایت عمدہ ہے اور میں نے دو نشستیں ساڑھے سات سات شلنگ کی آج کی رات کے لئے محفوظ کرالی ہیں۔ آٹھ بجے سے پہلے ریجنٹ پیلس ہوٹل میں میرے کمرے میں پہنچ جانا۔ وہاں سے اکٹھے شو پر چلیں گے۔ میں نے کہنے کو تو ہاں کہہ دی لیکن بعد میں کچھ متذبذب ہوگیا۔ لندن کے اوپیرا، بیلے (Ballet) اور تھیئٹر سے ڈیڑھ سال میں مجھے اتنا ہی اُنس پیدا ہوا ہے جتنا انگریزی طرز پر پکے ہوئے گوشت سے۔ بہرحال وعدہ کرنے کے بعد نبھانا ایک فرض سا ہوجاتا ہے ورنہ حمید جیسے مغرب پسند دوست فوراً آوازہ کس دیتے ہیں "آخر ہندوستانی ہی ہونا!"

پٹنی سے پکیڈلی (Piccadilly) پہنچنے تک زمین دوز گاڑی پر بھی (جو بالعموم ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہے تقریباً ایک گھنٹہ صرف ہوجاتا ہے۔ اس لئے میں ذرا جلدی ہی پٹنی سے چل دیا تاکہ حمید کو انتظار نہ کرنا پڑے۔ لیکن میرے پہنچنے سے قبل آپ ریجنٹ پیلس کے لاؤنج میں چکر لگا رہے تھے۔ میں نے کہا "ابھی ساڑھے سات ہوئے ہیں اور تم کمرے سے بھاگ آئے ہو۔" کہنے لگا "یہاں ذرا دل بہلانے کا سامان زیادہ ہے۔ ایک ہنگامہ ہے، مُلک مُلک کے لوگ ہوٹل کے قہوہ خانے میں آرہے ہیں۔ طرح طرح کی زبانیں بولتے ہیں۔ نوعمر، جوان، بوڑھی عورتیں سب طرح طرح کے لباس پہنے آرہی ہیں۔ وہاں کمرے میں بیٹھ کر کیا کرتا۔ اب تم آگئے ہو چلو دونوں مل کر چائے کا ایک ایک پیالہ پئیں۔" میں نے کہا "بھئی میں اِس قہوہ خانے کے آرکسٹروں (Orchestra) کے شور سے بہت گھبراتا ہوں۔ جب تک قہوہ خانے میں بیٹھے رہو یہ بے ہنگم آوازوں سے مغز چاٹتے رہتے ہیں۔ نہ کسی کی سُنتے ہیں نہ کسی کو کسی کی سُننے دیتے ہیں۔ چلو پکیڈلی میں چند منٹ سیر کریں۔ پھر شو کا وقت ہوجائے گا۔" حمید نے حسبِ معمول خندۂ زیرِ لب سے کہا "باقر تم بہت اَن میوزیکل (Unmusical) ہو۔ خیر چلو باہر ہی چلتے ہیں۔"

حمید ایک جست لگا کر شیشے کے گھومتے ہوئے دروازے کے ایک رخنے میں داخل ہوگیا، معاً میں بھی اُسی خانے میں داخل ہوگیا اور بولا "حمید یہ گھومنے والا دروازہ پُرلطف چیز ہے۔" حمید نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولا "ارے تم بھی یہیں گھس آئے، یہ تو صرف ایک آدمی کے لئے ہے، دُوسرے میں آئے ہوتے، لوگ کیا کہیں گے۔" اتنے میں ہم دونوں ہنستے ہوئے دروازے سے باہر پہنچ گئے اور میں نے کہا "حمید تم لوگوں کی پروا مت کرو، یہاں کے لوگ اس قدر شقی القلب ہیں کہ سڑک پر سر کے بل سارا

دن چلتے رہو تو ایک متنفس لندن بھر میں تم سے نہیں پوچھے گا کہ تم پر کیا آفت پڑی ہے جو اس مصیبت میں گرفتار ہو۔ اس پر حسب معمول حمید صاحب کی افرنج پرست رگِ حمیت جوش میں آ گئی۔ کہنے لگے "اس سے شقاوت کو کیا تعلق ہے۔ تم تو یُوں ہی اِن لوگوں کو کوستے رہتے ہو اور نہایت illogical (غیر منطقی) ہو۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تم یہ حماقت کیوں کرو گے کہ سر کے بل چلنا شروع کر دو گے پھر اگر تم سے یہ لوگ تعرض نہیں کریں گے تو اچھی بات ہے نا۔ یہاں ہر ایک کو اپنے کام سے کام ہے۔ یہ انڈینز کی طرح ایک دوسرے کے کام میں خواہ مخواہ دخل نہیں دیتے تو اچھا کرتے ہیں۔ اور یہ جو تم ان پر شقاوت کا الزام لگاتے ہو یہ بالکل غلط ہے۔ تم دیکھتے نہیں اس قوم نے ملکی اور قومی مفاد کے لئے کتنے عظیم الشان اِدارے قائم کر رکھے ہیں۔ بیکاری کو رفع کرنے کی کامل سعی کرتے ہیں۔ یہاں کوئی بھک منگا نہیں۔ غربا کی مدد کرتے ہیں۔ جس آدمی کی ملازمت چھُوٹ جائے اُس کو قومی ادارہ ملازمت ملنے تک کم از کم سترہ شلنگ ہفتے کے حساب سے بغیر کسی احسان کے دیتا ہے۔ بُوڑھوں کو ممنون کرنے کے بغیر اور بغیر کسی ملازمت کے پنشن ملتی رہتی ہے۔ یہ ابھی تم نے بھی پڑھا ہو گا کہ صرف ایک اخبار ڈیلی ٹیلیگراف نے لاوارث بچوں کو لوگوں سے روپیہ جمع کر کے بیس ہزار پونڈ کے تحفے کرسمس پر بھیجے ہیں۔ ڈاکٹر برنارڈو کے مکان میں سالانہ کم از کم ۵/۴ ہزار لاوارث بچوں کی پرورش کی جاتی ہے۔ یہاں کے سب شفا خانے حکومت سے مدد لینے کے بغیر صرف لوگوں کی خیرات پر چل رہے ہیں۔ لارڈ نفیلڈ کو دیکھو لاکھوں پونڈ خیرات میں دے چکا ہے اور ابھی اُس نے کئی ہزار آئرن لنگز (لوہے کے پھیپھڑے)، انفنٹائیل گنٹھیئے (Infantile paralysis) کے مریضوں کو بچانے کے لئے مفت دینے کا وعدہ کیا ہے اور تمہیں یہ بھی علم ہے کہ ایک آلے پر ہزار پونڈ کی لاگت اس صُورت میں آئے گی جبکہ وُہ خود اپنی فیکٹری میں اِسے تیار کرے گا۔ اپنے ملک کو چھوڑ کر چیکوسلوویکیا کی آفت میں لندن کے لارڈ میئر نے لوگوں سے چالیس ہزار پونڈ جمع کر کے وہاں کے لوگوں کو دے دیئے۔ ابھی کل کی بات ہے پھر بنک آو انگلینڈ نے دس ملین پونڈ کا قرضہ اُس مُلک کو دیا ہے۔"

سست رفتار موٹروں، ٹیکسیوں اور بسوں کے انجنوں کے شور اور سڑک پر چلنے والے تیز رفتار مرد و زن کے ہنگامے کے درمیان حمید کی آواز مجھے سُنائی دے رہی تھی۔ وُہ کئی دفعہ باہوں میں باہیں ڈال کر چلنے والے جوڑوں سے ٹکرایا بھی لیکن ان سے "I am sorry" کہہ کر پھر اپنی تقریر میں محو ہو جاتا۔ دفعتہً میں نے اُس کے بازو کو ایک جھٹکا دیا اور کہا "یہ دیکھو"۔

پکیڈلی کے بازار بلکہ چوک میں یُوں تو سارا دِن اس قدر ہجوم ہوتا ہے کہ پَیدل چلنے والوں کا کھوے سے کھوا چھلتا ہے لیکن شام کے بعد رات کے بارہ بجے تک یہ اپنی عشرت گاہوں اور دلچسپیوں سے متمتع ہونے والے انسانوں سے چیونٹیوں کے بل کی طرح پُر ہوتا ہے۔ ہر چہار طرف طویل و عریض دیواروں پر تماشا گاہوں اور مصنوعات کے بجلی سے منور حروف میں اشتہارات سے زمین کا چپہ چپہ روشن ہوتا ہے۔ اس وقت اس علاقے میں بیشتر مرد دُمدار کوٹوں (Tail-coats) اور بیشتر عورتیں زمین بوس سایوں میں جلدی جلدی حرکت کرتی نظر آتی ہیں۔ یعنی یہ مرد و زن رقص گاہوں کو جا رہے ہوتے ہیں۔ نوّے فیصدی موٹروں کے "مکین" اِسی طرح

ملبوس ہوتے ہیں۔ الغرض تموّل، عشرت اور جوانی کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا ہے اور مجھ جیسے ہندوستانی کو بھی سطوتِ برطانوی سے مرعوب ہونے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔

حمید نے جھنجھلا کر کہا "کیا ہے؟"

میں نے ایک گلی کی طرف اشارہ کیا [آپ کا مغالطہ دُور کرنے کے لئے گلی کا عرض درج کرنا ضروری ہے۔ یہاں تیس فٹ چوڑی گزرگاہ کو بھی گلی (Lane) کہتے ہیں] گلی کے ناکے پر ایک سپاہی کھڑا ہُوا تھا جو وقتاً فوقتاً اُس گلی میں داخل ہونے والی موٹر کے لئے اس ہجوم کو چند ثانیوں کے لئے منتشر کر دیتا جو وہاں تماشائیوں کی حیثیت سے جمع تھا۔ اِن تماشائیوں کے درمیان چھ یا سات آدمیوں کا ایک گروہ بے سُری حرکتوں سے راہروؤں کو محظوظ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کبھی کوئی آدمی اپنی پتلون گلے میں ڈال لیتا۔ کبھی اُن میں سے ایک ہاتھوں پر چلنا شروع کر دیتا اور کبھی ایک ٹوٹی ہوئی بانسری اور ڈگڈگی بجانے لگتا اور باقی گانے یا ناچنے لگتے۔ دو آدمی بوسیدہ سوراخ دار ٹوپیوں کو اُلٹا کر تماشائیوں کے سامنے خاموشی سے بار بار گزر رہے تھے اور ان ٹوپیوں میں لوگ تانبے کے سکّے یعنی پنس ڈال رہے تھے۔

میں نے کہا "حمید اِن لوگوں کو تمہاری منطقی اصطلاح میں کس لفظ سے پُکارا جاتا ہے؟"

"تو تم یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ یہاں بھی فقیر ہیں؟"

"مَیں یہ ثابت نہیں کرنا چاہتا بلکہ حقیقت ہے کہ یہاں بھی غریب اور فقیر ہیں، اور جیسے یہاں کے لوگ اپنے دیگر عیوب پر پردہ ڈالنے میں کامیاب ہیں وَیسے ہی اُنھوں نے اپنے سماج کے اس گھناؤنے رُخ کو ڈھانپ رکھا ہے۔ لندن کے slums (غربا کے مکان) کا چرچا سارے جہان میں ہے لیکن یہاں کی امارت نے خندۂ استہزا سے زیادہ اُس طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ کیا تم نے جا بجا پھٹے پُرانے کپڑوں میں لوگوں کو دیا سلائیاں بیچتے، ٹوٹے ہوئے ساز اور عجیب الخلقت ارگن بجاتے نہیں دیکھا؟ ان کے پاس جو پھٹی ہوئی ٹوپی فرش پر رکھی رہتی ہے کیا اُس کا "چہرہ" دستِ گدا سے زیادہ کشادہ نہیں ہوتا۔ یہ دو دو لاکھ پونڈ کی موٹروں میں سواری کرنے والے امیر اور جیکو سلوویکیا کو چالیس ہزار پونڈ خیرات دینے والے ہمدردی نوعِ انسان اِن ٹوپیوں کو کبھی نہیں دیکھتے۔ ہندوستان کی ہر ایک تدبیرِ ترقی پر اُس کی فلاکت کا عذر پیش کرنے والے خداوندانِ سیاست کی ہمدردانہ نگاہیں اپنی مملکت کے ایک اہم جزو کی طرف کبھی نہیں اُٹھتیں....."

حمید نے بیتابانہ مجھے روک دیا "لو اب خاموش ہو جاؤ۔ مجھے معلوم ہے کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ یہی کہ جہاں برطانوی شہنشاہیت کو صرفِ زر سے فائدہ پہنچنے کی اُمید ہوتی ہے وہیں برطانوی روپیہ صرف کرتے ہیں اور کہیں نہیں۔ لیکن تمہاری منطق ذرا ٹیڑھی ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ تم مجھے کبھی قایل نہیں کر سکے۔ پھر اس بحث سے فائدہ۔ لو چلو اندر چلیں۔ اب شو میں پانچ منٹ باقی ہیں۔"

تماشا گاہ میں اوّلیں منظر اندھیری رات میں ایک رقص تھا۔ چند رقاص لڑکے اور لڑکیاں نہایت چُست بلکہ جسم سے پیوست ریشمیں لباس پہنے ہوئے پردے کے سامنے آکر رقص کرنے لگے۔ ناچنے والوں اور والیوں کو تماشائی منظر پر روشنی نہ ہونے کی وجہ سے صرف مبہم

طور پر دیکھ سکتے تھے لیکن اُن کے قدموں کی طرف سے جب روشنی اُن کے جسم پر پڑتی تو اُن کے سیاہ سیاہ سائے اصلی جسم سے بڑے ہو کر سفید پردے پر پڑتے اور رقص کی تمام حرکات کے علاوہ اعضا کے باریک ترین خم اور اُبھار نمایاں طور پر نظر آتے۔ رقص ختم ہونے پر لوگوں نے تالیوں سے ہال سر پر اُٹھا لیا اور رقاص اندھیرے ہی میں آداب عرض کر کے رُخصت ہو گئے۔

میں نے کہا "حمید دوست اِن ناچنے والوں کو ہمیں ایک نظر روشنی میں دیکھنے تو دیا ہوتا"

حمید مجھ سے بہت بیباکی سے پیش آتا ہے "تم بھی عجیب گدھے ہو۔ دیکھتے نہیں اُن کے جسم پر لباس چپکا ہوا تھا۔ اگر روشنی ہوتو وہ بالکل برہنہ نظر آئیں۔ اِسی لئے تو تاریکی کا پردہ استعمال کیا گیا ہے"

میں خاموش ہو گیا کیونکہ حمید سے بحث کرنا تحصیلِ حاصل ہے۔ لیکن خود یہ سوچ رہا تھا کہ اِس مُلک میں ہر سُو لطیف پردے کی مدد سے کیسے کیسے کام لئے جاتے ہیں۔ سیاست، علم، تمدن، معاشرت اور زندگی کے ہر شعبے میں حقیقت پر لطیف پردے چڑھا کر حقیر سے حقیر چیز کو اعلےٰ ترین شکل دے کر دُنیا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ ہندوستان اِس لئے آزاد نہیں کیا جا سکتا کہ وُہ ابھی تک اپنے آپ پر حکومت کرنے کے قابل نہیں۔ فلسطین کو ابھی تک ایک *Mandatory* کی ضرورت ہے کیونکہ وہاں کے عرب اپنا بار اُٹھانے کے اہل نہیں۔ فلسطین میں یہودیوں کی آبادی کو اس لئے زیادہ کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ عربوں کی بہ نسبت یہودی زیادہ جفاکش ہے اور وہاں کی زمین کو بہتر بنا سکتا ہے۔ ہٹلر ظالم ہے کیونکہ وُہ اپنے مُلک کو بہتر بنانے کے لئے وہاں سے یہودیوں کو نکال رہا ہے۔ سولینی . . . .

"جانتے ہو یہ لڑکا سویڈش (*Swedish*) ہے جو اس ڈرامے میں حرامزادے کا پارٹ کر رہا ہے۔ حمید نے میرا شیرازۂ خیال بکھیر کر رکھ دیا۔

اب ہمارے سامنے ایک مختصر سا ڈراما پیش کیا گیا جس میں ایک عورت کئی سال کے بعد جنگِ عظیم کے اپنے اُن شیدائیوں کے گلے پڑ جاتی ہے جو جنگ کے دَوران میں بموں سے بچنے کے لئے ایک گاؤں میں اُس کے ہاں مقیم ہوئے تھے اور نہ جانے کس کی عنایت سے اُس کے ایک لڑکا پیدا ہو گیا تھا۔ اِس لڑکے کو ملازمت کی ضرورت ہے اور یہ عورت اپنے قدیم شیدائیوں کو ڈھونڈ نکالتی ہے جن کی تعداد تین ہے۔ اور جو حُسنِ اتفاق سے ایک ہی کاروبار میں شریک ہیں۔ اِن میں سے ایک لندن میں اشیائے برآمد کی تجارت کرتا ہے، دُوسرا اُس کا مہتمم ہے اور تیسرا ہندوستانی شاخ کا مہتمم ہے۔ جس وقت یہ عورت لڑکے کو اپنے ساتھ لے کر اِن تینوں سے بیک وقت ملاقات کرتی ہے تو تینوں دوست گھبرا جاتے ہیں اور پہلی دفعہ اُنہیں پتہ چلتا ہے کہ گو ایامِ جوانی میں لڑکے کی ماں ہر ایک سے اظہارِ تعشق کرتی تھی لیکن حقیقت میں اُسے کسی سے بھی عشق نہ تھا۔ تینوں اپنی شکل آئینے میں دیکھ کر اور لڑکے سے مشابہت نہ پا کر اُس کا باپ بننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ تینوں شادی شدہ ہیں۔ عورت اُن کی بیویوں کو راز بتا دینے کی دھمکی دیتی ہے۔ لیکن ایک اَور لکھ پتی کی بدولت تینوں کی گلو خلاصی ہو جاتی ہے۔ جو خود بھی ایک رات اس عورت کے ہاں ٹھہرا تھا۔ اور لڑکے کا باپ بننے پر رضامند ہے۔

میں نے کہا "حمید، یہ قصّہ ہندوستان میں کیسے سٹیج پر لایا جائے؟"

کہنے لگا "بس تمہارا تو ہندوستان کسی وقت بھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔ یہ تو ایک لطیفہ ہے۔ اِس کو اخلاقی معیار پر جانچنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ جو کہنا چاہتے تھے پردے سے کہہ بھی گئے لیکن کیا مجال جو ایک لفظ بھی بیہودہ زبان سے نکلا ہو یا ایک لغو حرکت بھی کی ہو۔ اس سے زیادہ تم اَور کیا چاہتے ہو؟"

مَیں پھر خاموش ہوگیا۔ سیاسی حقایق پر جو پردے ڈالے جاتے ہیں اُن سے میرا ذہن معاشرتی پردوں کی طرف منتقل ہوگیا۔ سفید اِن فرنگی نے اپنے مُلک میں اُس قباحت کا مکمل انسداد کردیا ہے جسے ہندوستان میں عشوہ فروشوں کا بازار کہا جاتا ہے اور اِس پیشہ کی ترویج دینے والے یا والی کو شدید سے شدید سزا دی جاتی ہے لیکن اِس کے ساتھ ہی ہر سال دارالعوام میں اُن ہزاروں بچّوں کی تعداد بھی سُنی جاتی ہے جو بغیر باپ کے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک واقفکار سے پُوچھا یہ دو متضاد حقیقتیں کس طرح صحیح ہیں۔ کہنے لگے اُن مظلوم عورتوں کو نہیں دیکھا جو جسم و جان کا ربط قائم کرنے کے لئے ہر شام مختلف کونوں پر کھڑی ہوئی اجنبیوں کی منتظر رہتی ہیں۔ اِس سے اور تعجب ہُوا اور پُوچھا تو کیا قانون کی گرفت اُن پر نہیں ہوتی۔ کہنے لگے ہوتی ہے لیکن وُہ اپنے تعلقات پر دوستی کا پردہ ڈال لیتی ہیں اور مرد و زن کی رفاقت پر اِس سرزمین میں کوئی گرفت نہیں . . . . . .

حمید نے جھنجھوڑ کر پوچھا "اُونگھ رہے ہو؟"

"نہیں تو"

"تو پھر تالی کیوں نہیں بجاتے۔ اِس جنوبی امریکی عورت نے کتنا اچھا رمبا (Rumba) ڈانس کیا ہے اور تم خدا جانے کہاں تھے۔

مَیں نے بھی تالی بجائی اَور پردہ گرنے پر ہم دونوں باہر نکل آئے۔

راستے میں حمید تماشے پر تبصرہ کرتا رہا۔ میرے خاموشی سے سننے پر کچھ جھنجلا گیا اور بولا "پھر اُسی طرف کو لَوٹ گئے ہو جہاں سے ابھی واپس آئے تھے۔ تُم سے کتنی دفعہ کہا ہے کہ یہ باتیں زیادہ قابلِ غور نہیں۔ جب اپنی قسمت نہیں بدلتی تو دوسروں کی باتوں پر کیوں غور کیا جائے۔ چین اور جاپان میں جنگ جاری ہے ہوتی رہے۔ ہسپانیہ کی جنگ کبھی تھم ہی جائے گی۔ اٹلی نے حبشہ لے لیا۔ جرمنی نے چیکوسلوو کیا سے ٹکڑا کاٹ لیا۔ آسٹریا کو ہڑپ کرگیا۔ اپنی بلا سے۔ اب اِٹلی فرانس سے ٹیونس اور کارسیکا لے لے گا تو ہمارا کیا بگڑے گا۔ انگریزوں سے جنوبی افریقہ چھن گیا تو ہمارا کیا نقصان ہوگا۔ ہمیں اصلاحات سے قبل بھی چھ سَو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ اب بھی اُس میں معمولی سالانہ ترقی کے سوا اَور کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر وزیروں کی تنخواہ کم ہوگئی ہے تو ہماری تنخواہ تو زیادہ نہیں ہوئی۔ پھر ہم اصلاحات کو کیا جانیں۔ تم یہ سیاسی جھگڑے تہ کر رکھو۔ لو السلام علیکم۔ پھر ہفتے کو ملیں گے۔"

مَیں سرزمین یورپ کی امارت و فلاکت اور عشرت و بیچینی کے متضاد مناظر پر غور کرتا ہُوا کھویا کھویا گھر واپس آگیا +

محمد باقر ملک

بہار

لمبے سائے سمٹ گئے گلشن میں
بیدار ہوئی ہے رُوح سُوکھے تن میں
کونپل نے نکل کے یہ سُنایا پیغام
جاگو جاگو بہار آئی بن میں

پتّوں کے سُبک دباؤ سے نیم جھُکے
سب اہلِ چمن برائے تعظیم جھُکے
یوں آمدِ گُل پہ جھُک گئی ہیں شاخیں
جیسے کوئی شوخ بہرِ تسلیم جھُکے

پھُولوں کا ہے ہر طرف زمیں پر سایا
خالی جو جگہ تھی اُس پہ سبزہ چھایا
کیا حال کہوں چمن کی آبادی کا
ہر شاخ پہ اِن دنوں نشیمن پایا

کلیوں نے چٹک چٹک کے آنکھیں کھولیں
شاخوں میں لٹک لٹک کے چڑیاں بولیں
خاموش ہوئیں قریب کھڑکا سُن کر
جب ایک اُڑی تو اَور پیچھے ہولیں

دو چار بہم بگڑ کے اُچھلے پھُولے
دو چار نے ٹہنیوں پہ کھائے جھُولے
کوّے بھی مِلے جُلے ہیں کوئل کے ساتھ
سب جوشِ بہار میں ہیں سُدھ بُدھ بھُولے

سیفی نوگانوی

زندگی

مئی کی تپتی دوپہر میں تینوں شہر کے باہر بہت دُور، مال کو پار کر کے لارنس روڈ پر چپ چاپ چلے جا رہے تھے ــــ شیلا کی ماں، شیلا اور اُس کا خاوند!

شیلا کی ماں سوچ رہی تھی ــــ سنسار میں کس کے دن ایک جیسے رہے جو ہمارے رہتے، چڑھنا گرنا یہ تو اِنسان کے ساتھ ہی لگا ہے۔ اور پھر انسان چڑھنے گرنے والا کون؟ یہ تو وہ خالقِ دوعالم، وہی آسمان کی نامعلوم بلندیوں میں بسنے والا زبردست کھلاڑی ہے جو چاہتا ہے تو اپنے کھلونوں کو کمال کی چوٹی پر پہنچا دیتا ہے، چاہتا ہے تو زوال کی گہرائیوں میں پھینک دیتا ہے۔ پھر دُکھ کیسا؟

اور یہ سوچ سوچ کر گویا وُہ اپنے من کو تسلّی دیتی چلی جا رہی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا۔ اکثر وہ اپنے دُکھی دِل میں اُٹھتے ہوئے جذبات کو دبانے کی کوشش کیا کرتی تھی، پر دِل نہ مانتا تھا۔ اور اب بھی جب اس چلچلاتی دُھوپ میں سر کا پسینہ پاؤں کے راستے بہہ رہا تھا، اور سامنے کٹھن منزل باقی تھی ــــ اس کے دِل میں کئی طرح کے خیالات اُمڈ رہے تھے۔ کھلاڑی کو سُکھ دُکھ کا کھیل دیکھنا ہے تو شوق سے دیکھے، پر دُکھ کے بعد سُکھ دے کر بھی تو وُہ یہ کھیل دیکھ سکتا ہے، پہلے سُکھ دینے کے بعد پھر دُکھ کے کولہو میں پیس ڈالنا، کتنی بڑی سزا ہے، کتنی عبرتناک سزا! ــــ ایسا کرنے کے بجائے وُہ انسان کو اُٹھا ہی کیوں نہیں لیتا؟ لیکن۔ نہیں، جیسے اُسے اپنے سوال کا جواب مِل جاتا۔ اگر وُہ انسان کو سنسار کی سٹیج سے اُٹھا لے تو گذشتہ زندگی میں اُس نے جو گناہ کئے ہیں ان کی سزا کون پائے؟ کئی بار انتہائے غم سے تنگ آ کر اُس نے موت کو بُلایا تھا۔ لیکن جب تک پچھلے جنم کے گناہوں کا بیسواں حِصّہ بھی باقی ہے۔ کوئی نہیں مر سکتا۔ تو پھر اسی کو کیسے موت آجاتی . . . . . . پانچ بچوں کو جنم دے کر اس نے شمشان کی ٹھنڈی گود میں جا سُلایا۔ بڑھا چڑھا کاروبار اپنے سامنے برباد ہوتے دیکھا۔ جن رِشتے داروں کو خون پلا کر پالا تھا اِن کے ڈنک سہے اور بے گھر بے در ہونے کے بعد خاوند کی بیاندوہناک حالت! شیلا کی ماں نے ایک سرد آہ کھینچی ــ جانے قسمت میں ابھی کِتنا دُکھ لکھا ہے؟ کون کون سے گناہوں کا پھل بھوگنا باقی ہے؟

× × × × × × × × × ×

ایک بنگلے کی دیوار کے سائے میں شیلا کی ماں رُکی۔ مَیلے دوپٹے کے دامن سے گردن پر بچڑتے ہوئے پسینے کو ہوا کرتے ہوئے اُس نے ایک سرد آہ کھینچی۔ شیلا اور اُس کا خاوند بھی اس کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ کچھ لمحوں تک تینوں چُپ چاپ اپنے خیالات میں محو کھڑے رہے۔ اور پھر کچھ دیر بعد چُپ چاپ چل پڑے۔

شیلا کو ماں پر غصہ تھا۔ بہت غصہ تھا۔ باپ کی ایسی بُری حالت ہو اور لڑکی کو خبر تک نہ دی جائے! بچپن کے مسرّت انگیز دن اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گئے اور اس کے ساتھ ہی اسے اپنے والد کی شفقت بھری گود اور میٹھی باتوں کی یاد آئی۔ بھوگیپور میں اس کے پتا کا بنیوں کا بھٹہ تھا۔ خوب چلتا تھا۔ اور اُسی کی بدولت گاؤں میں اُن کی خاصی عزّت تھی۔ اِن دنوں وُہ بہت چھوٹی تھی ——— اتنے بچّوں کے بعد ترس ترس کر حاصل کی ہوئی اکلوتی لڑکی ——— اس کے پتا اسے گود میں اُٹھائے پھرتے تھے۔ تب بھوگیپور کے برساتی نالے پر ریلوے کا پُل ابھی نہیں بنا تھا۔ برسات کے دِنوں میں جب پہاڑوں پر بارش ہوتی تو گویا اپنی کھوئی جوانی پا کر یہ برساتی نالہ اپنی مست البیلی چال سے بہنے لگتا اور جب جوش میں آتا تو ریلوے لائن کو بہا لے جاتا۔ تب اس کے جنون انگیز رقص کو دیکھ کر شیلا مسرّت کے پروں پر جھولنے لگتی۔ جب بھی لائن بہہ جاتی وُہ اپنے پتا کو وہاں لے چلنے پر مجبور کر دیتی اور بڑے اشتیاق سے دیکھتی کہ کس طرح مسافر اس پار کھڑی ہوئی گاڑی سے اتر کر سر پر گٹھڑیاں اُٹھائے، دھوتیاں یا پاجامے سنبھالتے ہوئے گروہ در گروہ اس طرف کھڑی گاڑی پر سوار ہوتے ہیں۔

دوپہر کو برگد کے بوڑھے گھنے پیڑ کے سائے میں وُہ حساب کتاب دیکھ رہے ہوتے۔ وُہ کھیلتی کھیلتی آ جاتی۔ ان کے رجسٹر اُٹھا کر پھینک دیتی۔ ان کی گود میں آ بیٹھتی۔ اور مچل جاتی کہ ٹھنڈی ہوا میں شیشم کے گھنے درختوں کے نیچے اس کے ساتھ کھیلا جائے۔ اس کے پتا چپ چاپ لمبی سڑک پر درختوں کے ٹھنڈے سائے میں اس کے ساتھ کھیلنے لگتے۔ ایسے موقعوں پر ہمیشہ اُن کے مُنہ پر ایک سنجیدہ مسکراہٹ کھیلا کرتی اور وُہ ہنس کر کہا کرتے۔ صرف یہی فقرہ ——— تم بہت تنگ کرتی ہو شیلو!

اِس کے بعد اگرچہ حالات آہستہ آہستہ بگڑتے گئے۔ بڑے بھائی اور ماموں کے لڑکوں کی خودغرضی اور بیوفائی سے اگرچہ کئی بار اُنہیں اپنا کام بند کر کے دیس بدیس کی ٹھوکریں کھانی پڑیں، پر شیلا کے پاس اُنہوں نے غم کا سایہ تک نہ آنے دیا۔ اسے یاد تھا جب وُہ مدرسے جاتی تھی تو اس کے پاس اتنے گہنے ہوتے تھے جتنے نئی بیاہی دُلہنوں کے پاس بھی نہیں ہوتے۔ اِسے وہ دِن بھی یاد تھا جب اس کی شادی کے وقت کافی روپیہ نہ ہونے پر اس کے والد نے اپنا چلتا چلاتا بھٹہ اپنے بھائی کے پاس فروخت کر دیا۔ اور اس بڑھاپے کی حالت میں بھی بیکاری کے بھیانک اژدہا کا شکار ہونا منظور کیا۔

وُہی اس کے پتا جب اتنے بیمار ہوئے کہ ہوش و حواس تک کھو بیٹھے تو اسے خبر تک نہ دی گئی۔ وُہ اپنے خاوند کے ساتھ لاہور کی رنگینیوں کا لُطف اُٹھاتی رہی، اور اس کے پتا ——— سوچتے سوچتے اُس کا گلا گھٹنے لگا۔ اس نے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ ہڈیوں کا پنجر جسم، تقریباً اندھی آنکھیں، میلے کپڑے اور گھِسی ہوئی ایڑی کا جُوتا لئے گویا مصیبتوں کے بوجھ سے جُھکی ہوئی، اپنے آپ میں کھوئی چلی جا رہی تھی۔

شیلا نے پوچھا ——— ماں اب اُنہیں ہوش ہے کیا؟

ماں جیسے خواب سے بیدار ہوئی ——— ہاں، پہلی بار جب میں آئی تھی تو اُنہیں آدمیوں کی پہچان تھی!

شیلا نے پھر پُوچھا ——— اور ماں ان سے کام تو نہیں لیا جاتا؟

—— نہیں بچی۔ وہ کام کرتے ہی نہیں۔ چوکیدار ہی اس دن کہہ رہا تھا کہ اور تو سب کام کرتے ہیں لیکن پنڈت کچھ نہیں کرتے سارا سارا دن پُوجا پاٹھ میں محو رہتے ہیں۔

"اور ماں ان کی صحت کیسی ہے؟"

"پہلے سے تو اچھی ہی معلوم ہوئی بیٹی!"

× × × × × × × × × ×

ایک بنگلے کے پھاٹک کے پاس ایک درخت پر خوبصورت بیل چڑھی ہوئی تھی۔ اور اس میں چھوٹے چھوٹے سُرخ پھول لگے تھے۔ شیلا کی ماں نے کہا —— مجھ سے نہیں چلا جاتا۔ اب میں تو کچھ دیر یہیں بیٹھوں گی، یہ کہتے ہوئے اپنے داماد اور لڑکی کا جواب سُنے بغیر وُہ اُس طرف بڑھی۔ شیلا کا خاوند جگت رام سُوٹ اور ہیٹ میں ملبوس تھا۔ شیلا بھی خوبصورت ریشمی ساری پہنے تھی۔ اس لئے وُہ تو کھڑے رہے۔ پر ماں کو تو کوئی ایسی جھجک نہ تھی۔ ہاتھ کا برتن زمین پر رکھ کر وہیں گرم دُھول پر وُہ بیٹھ گئی۔

جگت رام نے ایک دبی نگاہ سے اپنی ساس کی طرف دیکھا۔ گرد سے اٹے ہُوئے رُوکھے خشک بال اُڈھیلے لٹکتے ہوئے پپوٹے جھُریاں اور کثرتِ غم سے مُرجھایا ہُوا چہرہ۔ ایک سرد آہ کو اس نے زبردستی روک لیا اور اس کے تصوّر کی آنکھوں کے سامنے سے گزشتہ کئی برس لمحوں کی طرح گزر گئے۔

شادی سے پہلے سُسرال کے متعلق وہاں کے محبّت بھرے ماحول کے متعلق اس نے تصوّر کے کتنے محل بنائے تھے —— ساس کا ماں سے بھی زیادہ گہرا کھُلا پریم، اپنے داماد کی تعریف کرتے وقت غرور سے کھِلا ہُوا چہرہ، کھاتے کھِلاتے وقت کے اصرار، میٹھی جھڑکیاں اور طعنے، تصوّر کے کس مسرّت انگیز ماحول میں وُہ بسا کرتا تھا۔ لیکن کتنی جلدی وہ محل منہدم ہو گئے۔ شادی کے دن ہی اس نے محسوس کیا تھا جیسے ماحول کچھ ناسازگار سا ہے۔ گویا کہیں نہ کہیں کوئی کمی ضرور ہے۔ شادی میں برات کو خوب کھِلایا پلایا گیا تھا۔ جہیز بھی کم نہ دیا گیا تھا۔ دوسرے سلوک میں بھی کسی طرح کی کمی نہ آنے دی گئی تھی۔ پھر بھی اُس نے محسوس کیا تھا جیسے یہ سب خوشی تکلّف کے پردے میں ڈھکی ہوئی ہے۔ ساس کو اُس نے دیکھا۔ دبی دبی، گھُٹی گھُٹی، ڈری ڈری۔ اور خُسر کو اس نے پایا گُپ چُپ متین، کھویا کھویا سا۔ بس ایک بار جب لڑکی کے وِداع ہونے کا وقت آیا اور شیلا رو کر اپنے والد کے گلے سے چمٹ گئی۔ اس وقت اس سنجیدہ متین شخص کے چہرے پر بھی اس نے ایک مایوس ہنسی دیکھی تھی اور سُنا تھا —— اَیں بچپن نہ کرو۔ بس بس۔ چلو اب بیٹھو تانگے میں!

سوچتے سوچتے جگت رام کے دل کی گہرائیوں سے ایک لمبا سانس نکل گیا۔ اس کی ساس اُٹھ کھڑی ہوئی اور تینوں چلنے لگے۔ لارنس روڈ ختم ہو گئی اور جیل روڈ آ گئی۔ تینوں خاموشی سے اس پر ہولئے۔ جگت رام پھر ماضی کے اوراق میں کھو گیا۔

شادی کے بعد وُہ ایک دوبار سُسرال گیا تھا۔ تو اگرچہ اس کی بہت خاطر تواضع کی گئی، لیکن خلوص کی اس نے کمی ہی محسوس کی۔

اور آخر ایک دن اسے اس کی وجہ بھی معلوم ہوگئی۔ شیلا نے ہاتھ جوڑ کر بھرے ہوئے دِل سے اسے سب کچھ بتادیا۔ اور درخواست کی کہ میرے ماں باپ کو معاف کردو۔ اپنے باپ کے اچھے دِنوں کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس نے اُنہیں بتایا کہ اُن کے پاس جو کچھ تھا اُنہوں نے شادی میں لگادیا۔ اور اب ان کے پاس نہ مکان اپنا ہے نہ دُکان اور بھٹہ پر بھی اب اُن کا کوئی حق نہیں۔ اس لئے وُہ اب اس سے بات کرتے ہوئے شرماتے ہیں۔

جانے کیوں؛ جگت رام کو اپنے سُسر سے کچھ ہمدردی سی رہی تھی۔ ان کے چہرے پر کچھ ایسا درد۔ کچھ ایسا سوز، کچھ ایسا غم تھا کہ جب اُس نے محسوس کیا کہ اس کے جانے سے اُنہیں کچھ تکلیف ہوتی ہے تو اُس نے سُسرال آنا جانا کم کردیا۔ بلکہ شیلا کو بھی اس نے زیادہ تر لاہور ہی میں رکھا۔ پہلے تو وہ کبھی کبھی سُسرال جاتا بھی۔ لیکن اب ایک سال سے وُہ اُدھر گیا ہی نہ تھا۔ آخر ایک دِن اچانک اُس نے شیلا سے سُنا کہ اُس کا سُسر پاگل ہوگیا ہے اور لاہور کے پاگل خانے میں داخل کرادیا گیا ہے۔ اور اس کی ساس ایک سیٹھ کے گھر رسوئی کا کام کرکے زندگی کے دِن گزار رہی ہے۔

اسے یاد ہے۔ وہ حیران سا کھڑا رہ گیا تھا۔ اس کی اُمیدوں کے محل مسمار ہوگئے تھے۔ لیکن ان کے کھنڈر تک مٹ جائیں گے۔ یہ اس نے کبھی نہ سوچا تھا۔

شیلا کی ایک بچپن کی سہیلی لاہور ہی میں رہتی تھی۔ وُہ اپنے میکے ہوکر آئی تو شیلا بھی اپنے ماں باپ کی خبر لینے اس کے پاس پہنچی تبھی اسے یہ سب کچھ معلوم ہوا۔ ناک بھوں سکیڑتے ہوئے اس کی سہیلی نے کہا —"تم بھی شیلو خوب ہو۔ وہاں تمہارا باپ پاگل ہوگیا ہے پاگل خانے میں داخل کرادیا گیا اور تم خبر تک لینے نہیں گئیں۔ سلطانپور میں تو کائیں کائیں ہو رہی ہے۔"

اسی دن شیلا نے جگت رام سے منّت کہا تھا — "مجھے میری ماں سے ملادو۔ میں اس سے سب حال پوچھنا چاہتی ہوں۔" اور اسی شام ذرا اندھیرا ہوتے ہی جگت رام اسے لے کر سیٹھ کے یہاں پہنچا تھا۔ شیلا کی ماں سے ملاقات ہونے پر دونوں نے اس سے اصرار کیا تھا کہ وُہ نوکری چھوڑ کر ان کے ساتھ رہے۔ آخر داماد اور بیٹے میں فرق ہی کیا ہے۔ لیکن وُہ نہ مانی اور جب اس نے بتایا کہ بھائی کے ہاتھوں بے عزت ہونے پر اُنھوں نے کچھ یونہی بکنا شروع کردیا تھا۔ شاید ہاتھ بھی اُٹھایا تھا۔ جس پر ظالم بھائی نے اُنہیں پاگل مشہور کردیا اور پاگل خانے میں داخل کرادیا۔ نہیں تو کوئی ایسے پاگل تو وہ نہیں ہیں، تو دونوں کے دِل کو کچھ تشفی ہوئی تھی۔

گلی کی مدھم روشنی میں دیوار کے سائے میں وُہ تینوں کھڑے تھے، تب یہ فیصلہ کیا گیا کہ اگر اُنہیں ہوش ہُوا تو ڈاکٹر سے مل کر اُنہیں پاگل خانے سے نکلوالیا جائے۔ اور ایک علیحدہ مکان لے کر اُنہیں وہاں رکھا جائے اور شیلا کی ماں بھی وہاں رہے۔ یہ بات وہ مان بھی گئی یہی وجہ تھی کہ آج اس تپتی دوپہر میں وہ پاگل خانے کو جا رہے تھے۔

جگت رام نے ایک لمبا سانس لیا۔ اپنی ساس کے خلاف، ساس کے خلاف کیا پُرانے رسم و رواج کے خلاف اِس کے دِل میں نفرت

کا سمندر موجزن ہو گیا ۔ اس کی ساس تانگے پر چلنے کے لئے تیار نہ ہوئی تھی ۔ شاید اُس کے پاس کرایہ دینے کے لئے پیسے نہ تھے ۔ اور یا تھے تو وہ سب اس نے اپنے خاوند کے لئے باداموں کی گریاں اور دودھ لینے میں صرف کر دیئے تھے اور چونکہ لڑکی کا پیسہ لینا ٹھہرا پاپ، اس لئے اِس قیامت کی دُھوپ میں وُہ تین میل چل کر آئے تھے ۔

\+ \+ \+ \+ \+ \+ \+ \+ \+ \+ \+ \+

پاگل خانے سے باہر چھوٹے سے باغیچے میں وُہ تینوں بیٹھ گئے ۔

ابھی پھاٹک کھُلنے میں دیر تھی اور ڈاکٹر ۔ جس سے جگت رام ملنا چاہتا تھا ابھی نہیں آیا تھا ۔ اس لئے تینوں کے لئے کچھ دیر تک انتظار کرنا ناگزیر ہو گیا تھا ۔

یہاں گھنے درختوں کے نیچے کچھ ٹھنڈک تھی ۔ اور ہوا بھی کچھ میٹھی میٹھی سی چلنے لگی تھی ۔ ماں نے باداموں کی پوٹلی ایک طرف اور دودھ کا برتن دوسری طرف رکھ دیا اور گھاس پر لیٹ گئی ۔ چُپ چاپ آم کے درختوں پر آئے ہوئے بُور کو دیکھتے دیکھتے اس کا تصوّر پر لگا کر اُڑ چلا ۔ سُکھ کے بعد دُکھ اور دُکھ کے بعد سُکھ ہے تو اتنا دُکھ سہنے کے بعد سُکھ کے دِن ضرور آئیں گے ۔ ہفتہ میں دو بار اُسے اپنے خاوند سے ملنے کی اجازت ہوتی اور اس اثنا میں نوکری کر کے جو بچا سکتی، اس کے بادام لے، گریاں نکال، دُودھ اور مصری لے کر کڑی دُھوپ میں پیدل اتنی لمبی اسپاٹ، تپتی سڑکیں پار کر کے پاگل خانہ آتی اور بڑی محبت اور عقیدت سے بادام کھلا کر دُودھ پلاتی تھی ۔ غذا کی کمی اور رشتہ داروں کے مظالم ہی سے اس کے خاوند کا دماغ کچھ خراب ہو گیا ہے ۔ اس بات کا اسے یقین تھا جسے ہمیشہ دُودھ، بالائی، دہی اور لسّی ملے ۔ اسے اِتنے دن فاقوں سے رہنا پڑے ۔ اور پھر بے عزّتی ! وُہ اُنہیں پاؤ پاؤ بھر باداموں کی گریاں کھلا جاتی، پھر مصری ملا کر دُودھ پلاتی اور پھر وہ تصوّر ہی میں خیال کرتی کہ آخر میرا خاوند اچھا ہو جائے گا ۔ اور اس اثنا میں کچھ روپیہ جمع کر کے میں ایک چھوٹی موٹی دُکان کھول چکی ہوں گی ۔ اور زندگی کے جو کچھ دن باقی ہیں آرام سے گزر جائیں گے ۔

گھاس پر لیٹی ہوئی شیلا ۔ سامنے لوہے کے اُونچے مہیب پھاٹک کی طرف دیکھ رہی تھی ۔ باہر ایک سکھ سنتری پہرہ دے رہا تھا ۔ نہ جانے اِس کے اندر کتنی اَن گنت کوٹھڑیاں ہیں اور نہ جانے اُن میں سے کس کوٹھڑی میں اُس کا باپ پاگل بنا کر بند کر دیا گیا ہے ۔ نہ جانے کس طرح اس گرمی میں اپنی کوٹھڑی میں لیٹا ہُوا وُہ بیتے دِنوں کی یاد کر رہا ہے ۔ اسے ضرور ہی اپنی لڑکی کی یاد آتی ہو گی، اور وُہ ضرور اسے خود غرض اور سنگدل سمجھتا ہو گا ـــــ اِدھر اسے ان سب باتوں کا کچھ پتہ ہی نہیں تھا ۔ شیلا کا جی بھر آیا اور وُہ آنچل سے اپنا مُنہ ڈھانپ کر رونے لگی ۔

دونوں ہاتھ گھاس پر ٹکائے پیچھے کی طرف جُھکا ہُوا جگت رام دِل ہی دِل میں اس مکالمہ کو دُہرا رہا تھا ۔ جو ابھی کچھ دیر بعد اسے پاگل خانے کے ڈاکٹر سے کرنا تھا ۔ اگرچہ اس کے پاس سفارشی چٹھی تھی ۔ لیکن پھر بھی اسے معلوم تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو وجہ بتانی ہو گی کہ کیوں پنڈت کو پاگل خانے سے نکال کر گھر لے جانا ضروری ہے ۔ کئی طرح کے دلائل اس نے اپنے دِل میں سوچ لئے تھے ۔ اور انگریزی کے کچھ چُست فقرے وُہ

ے من میں دوہرا رہا تھا۔

چار بجے بڑا پھاٹک کھلا۔ اور پاگلوں کی ایک ٹولی، موٹے کھُردرے، کپڑے کی لمبی ڈھیلی قمیصیں اور ٹخنوں سے اُونچے تنگ پاجامے پہنے ہوئے نکلی، کوئی اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ کوئی ہوا ہی میں قتلِ عام مچا رہا تھا۔ کوئی یوں ہی ہنستا جا رہا تھا۔ ان کے ساتھ جو سنتری تھا ں نے اُن سے ایک جگہ سے پھُولوں کے گملے اُٹھانے کو کہا۔

سب نے گملے اُٹھا لئے۔ اور وُہ سنتری اُنہیں لے کر شاید کہیں دُوسری جگہ رکھوانے کے لئے چلا گیا۔ اسی طرح دُوسری ٹولی نکلی اور گملو ں کو پانی دینے لگی۔ سب پاگل تھے۔ عجیب عجیب حرکتیں کرتے تھے۔ لیکن پھر بھی سدھے ہوئے جانور کی طرح سب کام کئے جاتے تھے۔ دیکھتے دیکھتے شیلا بے چین ہو گئی۔ اس کا دِل جیسے اُچھل کر اس کے حلق میں آ گیا۔ میرے باپ کو بھی ضرور کام کرنا پڑتا ہوگا۔ اور یہ ظالم سنتری نہ جانے کس طرح مار کر ان پاگلوں کو کام میں لگاتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے وحشی جانوروں کو، جو دماغ سے کام نہیں لے سکتے لیکن پھر بھی ڈنڈے کی مار سے سب کام سیکھ لیتے ہیں۔ میں اپنے باپ کو ایک لمحے کے لئے بھی یہاں نہ رہنے دُوں گی۔ یہ سوچ کر اس نے کسی گہرے سوچ میں منہمک آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے خاوند سے کہا ـــ سنتری سے کہو ہمیں اُن سے مِلا دے۔

× × × × × × × × × ×

اس کا خاوند کچھ چونک کر اُٹھا۔ اپنا کالر اور ٹائی درست کرتا ہُوا وُہ پھاٹک پر گیا۔ سنتری سے اپنا تعارف کرایا۔ درخواست کی کہ ہمیں پنڈت جمنا داس سے ملاقات کرنی ہے، اور یہ کہتے ہوئے الگ لے جا کر ایک روپیہ بھی اس نے سنتری کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

چار جمنا داس اُس وقت پاگل خانے میں تھے۔ سنتری نے فہرست دیکھ کر چوکیدار سے کہا کہ سلطانپور والے جمنا داس کو بُلا لائے۔ اس اثنا میں کئی دوسرے پاگلوں کے رشتہ دار بھی آ گئے تھے۔ اور سنتری ان کی درخواست کے مطابق فہرست دیکھ دیکھ کر پاگلوں کو بُلا رہا تھا۔ بڑے پھاٹک کے باہر سے ملاقات کرنے کی اجازت تھی لیکن اِن کو اس نے پھاٹک کے اندر داخل کر لیا۔ جگت رام اور شیلا ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ ماں زمین پر ہی بیٹھی دفعتہً ایک چوکیدار کے ساتھ اُنہوں نے پنڈت کو آتے ہوئے دیکھا۔

شیلا کا دِل دھک دھک کرنے لگا۔

نزدیک آ جانے پر شیلا نے دیکھا کہ دُوسرے پاگلوں کی طرح اس کے پتا کے گلے میں بھی موٹی کھُردری قمیص اور کمر میں پاجامہ ہے اس کا جی بھر آیا اور آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔

چوکیدار نے کہا ـــ بیٹھ جاؤ۔ اور ایک سِدھے ہوئے مسکین جانور کی طرح پنڈت دیوار کے ساتھ پشت لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد چوکیدار کی طرف اور پھر ان تینوں کی طرف دیکھ کر ہنس دیا۔

جگت رام نے دیکھا کہ اس کا سُسر پہلے سے آدھا بھی نہیں رہا ہے۔ اس کے دانتوں پر پیلے رنگ کا مَیل جما ہے۔ اس کے چہرے

پر زردی چھا رہی ہے اور جب شیلا کی ماں نے پوٹلی کھول کر بادام کی گریوں کی پڑیا اسے دی تو جگت رام نے دیکھا کہ اُس کا ہاتھ کانپ رہا ہے۔
سب گریاں ایک دو پھنکوں ہی میں پنڈت نے چبا ڈالیں۔ اب شیلا کی ماں دودھ میں مصری گھولنے لگی۔
لیکن شیلا کو اتنی تاب کہاں۔ اس نے ماں سے پوچھا — ماں یہ ہمیں پہچانتے نہیں ؟
اپنی کمزور نیم اندھی آنکھوں سے اپنے خاوند کو دیکھ کر شیلا کی ماں نے کہا — کیوں نہیں ! اور پھر سر کا دوپٹہ ذرا نیچا کرتے ہوئے شیلا کی طرف اشارہ کر کے اس نے خاوند سے پوچھا — کیوں اِس کو پہچانتے نہیں ؟
پنڈت نے ہنستے ہوئے کہا "پہچانتا کیوں نہیں ؟"
"بھلا کون ہے یہ ؟"
"میری بیوی اور کون ؟"
شیلا نے ساری کے آنچل سے مُنہ ڈھانپ لیا اور جگت رام نے اُس کی سسکیاں سُنیں۔
شیلا کی ماں نے اپنے داماد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "بھلا یہ کون ہیں ؟"
"ہمارے بھائی ہی تو ہیں" یہ کہہ کر پنڈت نے سب کی طرف اس طرح دیکھا گویا کہہ رہا ہو — کیا تم لوگوں نے مجھے پاگل سمجھ لیا ہے۔
رُوہانسی سی ہو کر شیلا کی ماں نے پوچھا — "کیا مجھے بھی نہیں پہچانتے" ؟
"واہ !" شیلا کے پتا نے ایک قہقہہ لگایا — "اپنی ماں کو بھی نہ پہچانوں گا" اور یہ کہہ کر اور پھر زور سے ہنس کر اُس نے دُودھ کا برتن شیلا کی ماں کے ہاتھ سے چھین لیا اور غٹ غٹ پینے لگا۔

اوپندر ناتھ اشک

کیا بنانا تھا مصوّر کو بنا کیا آخر
اپنی بگڑی ہوئی تصویر پہ خنداں ہوں میں

"عالمِ صغیر"

سحر کا نور، دن کی روشنی، راتوں کی تاریکی
مہک پھولوں کی، شاخوں کی لچک، گلشن کی رنگینی

نزاکت کاہ کی، تنگی دہن کی، آنکھ کا جادو
دلِ صحرا کی وسعت، عزمِ کوہ، افلاک کی دُوری

مسافر کی غریبی، جوشِ طوفاں، سختیِ منزل
تلاطم موج کا، ساحل کا استقلال۔ یکرنگی

محبّت کی کشاکش، شرمِ دُنیا، خوفِ عقبیٰ کا
درازی زلف کی، شانہ کی اُلجھن، دل کی بیتابی

لڑکپن، نوجوانی، عہدِ پیری، موت کی گھڑیاں
دلِ بیدردِ گلچیں، لحنِ بلبل، رقصِ طاؤسی

مزے تخییل کے، لطفِ تصوّر، خواب کی لذّت
نباتِ حُسن کی شیرینی، زہرِ عشق کی تلخی

تفوّق رنگ کا، فخرِ وطن، احساس قومیّت
برہنہ پائیِ مزدور، تاجِ فرقِ سلطانی

قدامت ہند کی، تہذیبِ مصر، ایجادِ امریکہ
عرب کا دین، تخئیلِ عجم، یورپ کی پالیسی

ہوا کا زور، پانی کی روانی، آگ کی تابش،
عقیل انساں بنا کر، ایک "مُشتِ خاک" میں بھر دی

سیّد عقیل احمد جعفری

بہادر شاہ اور کرزن

"ہمایوں" کے سالگرہ نمبر ۱۹۳۹ء میں "اوراقِ پارینہ" کے عنوان سے ایک فرضی خط شائع ہوا ہے جس میں مصنف (مولوی عبدالسلام صاحب رفیقی) نے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ مرحوم کے مزار کی خستہ حالت سے متاسف ہو کر بادشاہِ مرحوم کی طرف سے لارڈ کرزن سے درخواست کی ہے کہ وہ ان کی قبر پر کوئی چھوٹی سی عمارت یا کم از کم ایک جنگلہ بنوا دیں تاکہ مرورِ زمانہ سے اس کا نشان بالکل نہ مٹ جائے۔

ہر حساس فرد کی یہ خواہش کہ اس کی قوم کے نشانات باقی رہیں بالکل بجا ہے اور اس لحاظ سے مولوی صاحب کی درخواست نہایت معقول تھی لیکن میرے خیال میں اس کا لہجہ قابلِ اعتراض ہے۔ اگر ہم یہ امر مدِنظر رکھیں کہ مولوی صاحب نے درخواست اپنی طرف سے نہیں بلکہ ایک بادشاہ کی طرف سے کی ہے تو ہمیں لازماً یہ پوچھنا پڑے گا کہ اس بادشاہ میں احساسِ خودداری کس قدر تھا تاکہ ہم یہ اندازہ کر سکیں کہ وہ ایک نائب بادشاہ (وائسرائے) کو خطاب کرتے وقت کیا لہجہ اختیار کرتا۔

بہادر شاہ مرحوم گو نام کا بادشاہ تھا، اور دُنیاوی طاقت اس کے پاس بہت کم تھی لیکن تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ اسے اپنی خاندانی وجاہت شاہانہ حیثیت اور ذاتی مرتبہ کا پورا احساس تھا۔ اس دعوے کے ثبوت میں دو واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں جن سے بادشاہِ مرحوم کی سیرت پر روشنی پڑتی ہے۔ پہلا واقعہ تو یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے، جو اُس وقت تقریباً دو تہائی ہندوستان کی مالک تھی، بےحد کوشش کی کہ بادشاہ بطیبِ خاطر لال قلعے کو چھوڑ کر دہلی شہر سے باہر کہیں سکونت اختیار کر لے۔ لیکن غیور بادشاہ اپنی بےبسی اور تنگ دستی کے باوجود اپنی بات پر قائم رہا اور جب تک ۱۸۵۷ء کے واقعات نے اُسے مجبور نہیں کیا، اُس نے اپنی آبائی و موروثی اقامت گاہ کو نہیں چھوڑا۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جب لارڈ ڈلہوزی نے (جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے پُرعظمت اور طاقتور وائسرائیوں میں تھا) پنجاب کی طرف سفر کرتے ہوئے بادشاہ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو بادشاہ نے بخوشی اس درخواست کو قبول کیا لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ پہلے کے دستور کے موافق دربار میں وائسرائے کی کرسی بادشاہ کے تخت سے نیچی رکھی جائے گی۔ اس وقت تک چونکہ بادشاہ کی طاقت بتدریج کم اور کمپنی کا دبدبہ بہت بڑھ چکا تھا اس لئے ڈلہوزی نے اس شرط کو منظور نہ کیا، اور دونوں کی ملاقات نہ ہو سکی۔ ان واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس غیور بادشاہ نے اپنی قیدِ حیات میں دوسرے کے سامنے گردن خم نہ کی وہ اب جب کہ وہ قیدِ حیات و قیدِ فرنگ دونوں سے چھوٹ چکا ہے کس طرح کسی غیر کے آگے اس عاجزانہ طور پر منت اور خوشامد کرے گا اور اپنی خودداری اور غیرت کو خاک میں ملاتے ہوئے اپنے سے کم تر شخص کے سامنے گڑگڑائے گا۔

نذیر احمد

وُہ دُور اِک خستہ جھونپڑے میں دِیے کی لَو تھرتھرا رہی ہے
کِسی کے دِھیمے سُروں میں گانے کی مست آواز آ رہی ہے
وُہ دیکھو اِک الگنی پہ دو چار مَیلے کپڑے لٹک رہے ہیں
وُہ ایک ننھّی سی مُورتی کرشن کی کھڑی مُسکرا رہی ہے
الاؤ کے پاس ایک جوگن ستار کو گود میں اُٹھائے
بڑی نزاکت سے اپنی آنکھوں سے بکھری زُلفیں ہٹا رہی ہے
کمال کی بے خودی ہے رُخ پر، غضب کی تیزی ہے اُنگلیوں میں
وُہ گا رہی ہے کہ آسماں پر کوئی پری اُڑتی جا رہی ہے
وُہ مدھ بھرے گیت گا کے اپنے سیاہی سوامی کی بے رُخی کے
ہوا کو بدمست کر رہی ہے، فضا کو جھولا جھلا رہی ہے
کبھی بھنوؤں کو سکیڑتی ہے، شکایتیں کر رہی ہے گویا
کبھی تصوّر میں اپنے پیتم سے اپنا چہرہ چھُپا رہی ہے
غرض یونہی رس بھرے ترانوں سے دم بخود ہو رہی ہے جوگن
گذشتہ لمحوں کی دُکھ بھری یاد اپنے دل سے بھُلا رہی ہے
وُہ اُس کی آنکھیں اُفق سے اُس پار گڑ گئیں ایک نوجواں پر
وُہ فرطِ حیرت سے کانپ کر اپنی اُنگلیوں کو چبا رہی ہے
مگر اُسے کیا خیال آیا کہ کرشن کی مُورتی پہ جھُک کر
وُہ ایک اندازِ بے خودی میں وطن کا نعرہ لگا رہی ہے

احمد ندیم قاسمی

اگر میں بادشاہ ہوتا

اُس نے کہا: "اگر میں بادشاہ ہوتا،

اُور تم ایک غریب بھکارن،

تو میں تمہیں اپنے قوی ہاتھوں سے اُٹھا کر اپنے پاس بٹھا لیتا اُور تمہارے

سر پر تاج رکھ کر تمہیں ملکہ بناتا؛

لوگوں کو ایک عظیم الشّان بادشاہ کی دُلہن کے متعلق گمان بھی نہ ہو سکتا،

یا وُہ بھُول جاتے،

کہ یہ کبھی محض ایک غریب بھکارن تھی۔"

اُس نے جواب دیا: "اگر میں ملکہ ہوتی،

اُور تم ایک بے پروا رَمتے جوگی،

جو پھرتے پھراتے میرے خوبصورت دربار میں آ نِکلتے،

تو میں تمہیں تخت پر بٹھا دیتی،

اُور تُم کو وہاں کا سب سے بڑا بادشاہ سمجھ کر،

فرطِ عقیدت سے تمہارے سامنے گھُٹنوں کے بل جھُک جاتی،

اُور ایک کنیز بن کر عمر بھر تمہاری خدمت گزار رہتی۔"

الزبیث برلینڈ

[illegible]

اُردو ہندی اور ہندو مسلمان

ہندوستان میں فرقہ وارانہ مسئلہ کے دو بڑے علمبردار ہندو مسلمان ہیں اور چھوٹے چھوٹے تو بہت ہیں۔ آج جب کہ تمام دُنیا ایک بڑی اقتصادی جنگ میں مصروف ہے۔ قدرتی طور پر ہندوستان میں بھی یہ کشمکش جاری ہے لیکن یہاں محض جرمنی اور اٹلی کی طرح نسلی اور روس کی طرح جماعتی کشمکش نہیں بلکہ اس مُلک میں اِس جنگ کے دو پہلو ہیں :۔

(۱) ہندوستان اور برطانوی ملوکیت کے درمیان ۔

(۲) آپس میں یعنی مذہبی جدوجہد یا فرقہ وارانہ کشمکش کے پردے میں۔

اب تک لوگ صرف "مذہب خطرہ میں ہے" سُنتے تھے اور اس کے عادی ہو چُکے تھے کہ اب نیا شگوفہ "تمدن و تہذیب خطرہ میں ہے" اس چمن میں کھِلا ہے اور اس کے لئے جنگ کا محاذ زبان کو بنایا گیا ہے۔

متحدہ قومیت کا تقاضا ہے کہ تمام ہندوستانیوں کی ایک زبان، ایک معاشرت اور ایک تہذیب ہو تاکہ آپس میں اظہارِ خیال و کاروبار میں آسانی ہو لیکن سب سے پیشتر ہماری ترقی کے لئے ایک عام زبان کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ ضرورت کوئی نئی نہیں۔ ہندوستان کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ یہاں یہ ضرورت ہمیشہ سے محسوس کی جاتی تھی۔ اسی احساس کا نتیجہ یہ زبان ہے جو میں آپ سے مخاطب ہونے کے لئے استعمال کر رہا ہوں۔ اس کا ادبی ذخیرہ بھی محتاج بیان نہیں۔

اُردو یا ہندوستانی ہمارے یعنی ہندوستانیوں کے لئے کوئی نئی چیز نہیں۔ اس کی تاریخ سو پچاس سال نہیں، بلکہ صدہا سال پُرانی ہے البتہ اس نے مختلف زمانوں میں اپنا حلیہ، جُون یا نام ضرور بدلا ہے۔

ہندوستان کے اصلی باشندے کول، دراوڑ اور بھیل تھے۔ ان کی زبان سنسکرت سے مختلف تھی۔ آریہ جب ہندوستان میں آئے تو سنسکرت کو اپنے ساتھ لائے۔ وہ اس زبان کو عوام کے اثر سے پاک رکھنا چاہتے تھے۔ لہٰذا اس کا استعمال خواص کے لئے مخصوص رکھا گیا، اور اس کو دیوبانی کہنے لگے۔ عوام کے لئے پراکرت یعنی (غیر مصنوعی) وجود میں آئی۔ اس امر کی تصدیق کالی داس کی شکنتلا سے ہوتی ہے۔ اس میں بادشاہ امراء، وزراء اور پنڈت سنسکرت بولتے ہیں اور دیگر لوگ پراکرت، اس پراکرت کی ملک کے مختلف حصّوں میں گیارہ مختلف شکلیں ہو گئیں۔ مثلاً مگدھی جس کی موجودہ شکلیں بہاری، بنگالی، اڑیا اور آسامی ہیں (۲) آدنتی جس کی موجودہ شکلیں راجستھانی اور پہاڑی ہیں۔ (۳) اردھ مگدھی جو اب مشرقی ہندی کہلاتی ہیں، ان کے علاوہ پراکرت کی مختلف شکلیں جو اس وقت ہمارے مُلک میں رائج ہیں مندرجہ ذیل ہیں۔ کشمیری، کوہستانی،

مغربی پنجابی، سندھی، گجراتی اور مرہٹی۔

ساتویں صدی عیسوی سے پہلے مسلمانوں کے تجارتی تعلقات ساحلِ ملیبار سے ہوئے۔ ان کی زبان عربی و فارسی تھی۔ فارسی کی اصل وُہی تھی جو سنسکرت کی ہے۔ مگر وقت کے گزرنے سے ان میں مشابہت بہت کم رہ گئی۔ جب فارسی ہندوستان میں آئی تو وہ سنسکرت پر تو اپنا اثر نہ ڈال سکی کیونکہ اُسے دیوبانی ہونے کی حیثیت سے بڑی حفاظت کے ساتھ پاک وصاف رکھا جاتا تھا۔ البتہ پراکرت فارسی کے اثر سے نہ بچ سکی اور عربی و فارسی کے الفاظ رفتہ رفتہ اس میں جذب ہوتے رہے۔

باقاعدہ ہندی ادب کی جو شروع میں محض مدحیہ شاعری پر مشتمل تھا، بنیاد اس زمانہ میں پڑی جب پرتھوی راج اور دُوسرے راجپوت سردار مسلمانوں سے برسرِ پیکار تھے۔ ہندی شاعری کا سب سے قدیم سرمایہ وہ قصائد ہیں جو ان راجپوت سرداروں کے درباری شعراء نے ان کی مدح میں لکھے مسلمانوں نے نہ صرف ہندی کی نشوونما اور ترقی میں نمایاں حصہ لیا، بلکہ ہندی ادب کے سب سے ابتدائی زمانہ میں بھی مسلمان شعراء کی تعداد ہندوؤں سے کچھ کم نہ تھی۔ چنانچہ ۷۰۰ء سے لے کر ۱۱۵۰ء تک ہندی شعراء میں صرف ۹ نام ممتاز ہیں: پشیہ یا پنڈا، کدار، انانیداس، قطب علی، اکرم فیض اور مسعود۔ ان میں سے آدھے مسلمان ہیں۔

اس کے بعد پراکرت کچھ بدلنی شروع ہوئی اور ۱۱۵۰ء سے ۱۴۰۰ء تک (اڑھائی سو سال میں) اس زبان میں کافی تغیر واقع ہوگیا۔ اس زمانہ کے مشہور شعراء چاند باردی، سارنگ دھر، امیر خسرو، بھوپتی اور مُلا داؤد ہیں۔

پندرھویں صدی میں مسلمانوں کے اثر سے ہندوؤں میں ایک نئی مذہبی تحریک پیدا ہوئی جس کے علمبردار رامانند، کبیر اور نانک ہیں۔ اس تحریک نے ہندی ادب پر گہرا اثر ڈالا ہے کیونکہ "بھگتی مارگ" کے اکثر رہنماؤں نے شاعری کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا اور شاعری کے ذریعہ ہی اپنا پیغام عوام تک پہنچایا۔ اِن مذہبی شعراء میں رامانند کے سب سے مشہور چیلے کبیر کا نام جو ایک مسلمان جُلاہا تھا نہایت ممتاز ہے۔ ۱۴۰۰ء سے ۱۵۵۰ء تک (ڈیڑھ سو سال) کے عرصہ میں کبیر اور نانک کے علاوہ ان شعراء کے نام سننے میں آتے ہیں، ولبھ اچاریہ، میرابائی، ودیاپتی، اور ملک محمد جائسی۔ ملک محمد جائسی کی نظم "پدماوتی" میں (جس پر کہ علاؤالدین اور پدمنی کے مشہور قصہ کی بنیاد رکھی گئی ہے) فارسی کے کافی الفاظ اور محاورے شامل ہیں۔ یہ نظم دراصل فارسی رسم الخط میں لکھی گئی تھی۔ اِس لحاظ سے اسے فارسی رسم الخط میں لکھی ہوئی سب سے قدیم اُردو نظم ہونے کا شرف حاصل ہے۔

مغلوں سے پہلے ہندی شاعری کی تمام کائنات بھاٹوں کے چند گیت درباری شعراء کی کچھ مدحیہ نظمیں اور کبیر اور اس کے ہم عصر شعراء کا مذہبی کلام تھا۔ ہندی شاعری کے عروج کا زمانہ مغلوں کے عروج کا زمانہ ہے اگرچہ مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی تھی لیکن تمدنی اور درباری زبان فارسی تھی۔ اکثر ہندوؤں کو جو دربار سے وابستہ تھے یہ زبان سیکھنی پڑی۔ ان لوگوں کی وجہ سے ہندی شاعری پر بالواسطہ بہت اثر پڑا۔ ہندی شاعری میں رعنائی آگئی۔ اور اس کا معیار بھی قدرے بلند ہوگیا، عروض پر بھی اس کا تھوڑا بہت اثر ہوا۔

مغلوں کی سرپرستی میں ہندی کو جو فروغ حاصل ہوا، خود ہندو بادشاہوں کے عہد میں اس کا عشر عشیر بھی حاصل نہ ہوا تھا۔ اکبر خود ہندی کا شاعر تھا اور اس نے ہندی شعراء کی نہایت فیاضی کے ساتھ حوصلہ افزائی کی۔ فیضی نہ صرف فارسی کا شاعر تھا بلکہ اس نے ہندی میں بھی شعر کہے ہیں۔ اکبر کے وزراء میں سے بہترین ہندی شاعر بیرم خاں کا بیٹا عبدالرحیم خاں خاناں تھا۔ وہ سنسکرت کا عالم تھا اور نہ صرف خود شاعر تھا بلکہ بہت سے ہندی شعراء خصوصاً گنگ کوی کا سرپرست تھا۔ "نیتی" یعنی اخلاق پر اس نے ہندی میں جو نظمیں کہی ہیں۔ وہ نہایت بلند پایہ ہیں اور آج بھی انہیں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ "رحیم ستسا" اس کی مشہور کتاب ہے جو نظم میں لکھی گئی ہے۔

جہانگیر بھی ہندی شعراء کا بڑا سرپرست تھا۔

شاہجہان کے عہد میں ہندی نے بہت ترقی کی اور اس زمانے کے مشہور شعراء سندر، بھوشن ترپاٹھی، مانی رام ترپاٹھی اور بہاری لال چوبے ہیں۔

داراشکوہ کو ہندو مذہب، ہندو فلسفہ اور ہندی و سنسکرت سے بہت محبت تھی۔ چنانچہ وہ بہت سے ہندی شعراء کا سرپرست تھا۔ مسلمانوں کا ہندی سے یہ تعلق اورنگ زیب کے عہد میں بھی نہ صرف جاری رہا بلکہ زیادہ مضبوط ہوتا گیا۔ ۱۵۵۰ء سے ۱۸۰۰ء تک ہندی میں بے شمار شاعر پیدا ہوئے۔ تلسی داس اور سور داس اس زمانے کے چوٹی کے شاعر ہیں۔ لیکن مسلمان اس دور میں ہندو بھائیوں سے کسی طرح پیچھے نہیں رہے۔ چنانچہ عالم، مبارک علی، نظیر، نور محمد اور صوفی شعراء مثلاً دریا صاحب بہاری، دریا صاحب میواڑی، بلھے شاہ اور یاری صاحب کا نام اس امر کی ضمانت ہے کہ ہندی پر مسلمانوں کا حق اگر ہندوؤں سے زیادہ نہیں تو کچھ کم بھی نہیں۔

مسلمانوں کے زوال کے بعد انگریز ہندوستان میں آئے یہ وہ زمانہ تھا جب اس ملک میں خود مسلمانوں کی بقا خطرہ میں تھی۔ اس لئے مسلمان ہندی ادب کی طرف زیادہ توجہ نہ کر سکے۔ البتہ انفرادی طور پر مسلمان شعراء آج تک ہندی میں طبع آزمائی کرتے رہے، ہمارے زمانے میں مقبول احمد پوری کا نام قابلِ ذکر ہے جو علامہ اقبالؒ کی پیامِ مشرق کا ہندی میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ اس دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی سرپرستی میں یورپین افسروں کے لئے ہندی نثر میں کتابیں لکھوائیں، لیکن اس دوران میں اردو بتدریج ترقی کرتے ہوئے عوام کی زبان بن چکی تھی، اور لوگ بلا قید مذہب و ملت اردو کو اپنی زبان سمجھنے لگے تھے۔ اگرچہ اردو نے اپنا بیشتر سرمایہ ہندی سے لیا۔ مگر ہندی کی حیثیت بطور ایک علیحدہ زبان کے عوام کی زبان کے بجائے ایک محدود طبقہ کی ادبی زبان کی رہ گئی تھی۔ جس طرح آریوں کے زمانے میں امراء، عمائد اور پنڈتوں کی زبان سنسکرت اور عوام کی زبان پراکرت تھی۔ اسی طرح مسلمان امراء وغیرہ کی زبان تو فارسی ہی تھی۔ لیکن ہندو مسلمان عوام کی زبان اُردو تھی۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُردو کو باقاعدہ طور پر اُردو کا نام کب دیا گیا۔ اس سوال کا جواب آسانی سے نہیں دیا جا سکتا، کافی عرصہ تک یہ زبان ہندی ہی کہلاتی رہی۔ اس کی تاریخ شاہد ہے کہ پہلی بار اُردو کا لفظ بطور زبانِ اُردو مصحفی (۱۷۵۰ء، ۱۸۲۴ء) نے اپنی نظموں میں استعمال کیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اُنیسویں صدی کی ابتدا تک یہ زبان ہندی ہی کے نام سے موسوم رہی کیونکہ ۱۷۹۰ء میں حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے اپنے اُردو ترجمۂ قرآن کے دیباچہ میں یہ نہیں لکھا کہ میں قرآن مجید کا ترجمہ اُردو یا ریختہ میں کر رہا ہوں، بلکہ اُردو یا ریختہ کے بجائے ہندی کا لفظ

استعمال کیا ہے۔ بہرحال انیسویں صدی کے اوائل میں اُردو کے لفظ کو قبول عام حاصل ہو گیا تھا۔

مسلمانوں نے ہندی کی تعمیر و ترقی میں جو نمایاں حصّہ لیا۔ وہ تو ہم بتا ہی چکے ہیں اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہندوؤں نے بھی اُردو کے لئے کچھ کم کام نہیں کیا۔ اُردو کے سب سے ابتدائی دَور میں ہندو شعراء نے اس زبان میں جو آئندہ چل کر ملک کی مشترکہ زبان ہونے والی تھی، طبع آزمائی کی، اُردو سے ہندوؤں کا یہ تعلق آج تک برابر قائم ہے۔ اس سلسلہ میں چند ہندو شعراء اور اُدباء کے نام لینا کچھ ناموزوں نہ ہوگا۔ چندو لال شاداں (۱۷۶۶ء ۔ ۱۸۴۵ء) نہ صرف اُردو شعراء کے سرپرست تھے بلکہ خود اُنہوں نے اُردو میں دو دیوان اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ اُردو اور ہندوؤں کا یہ تعلق کچھ اس زبان کے ابتدائی زمانہ تک ہی محدود نہیں، بلکہ ہندو شعراء ہمیشہ اس کو اپنی زبان سمجھتے رہے اور اس کو استعمال کرتے رہے۔ منشی شنکر دیال فرحت، منشی رام سہائے تمنّا اور کئی دُوسرے ہندو شعراء نے مہابھارت، رامائن، گیتا، مہاتم وغیرہ مذہبی کتابیں اُردو میں تصنیف اور ترجمہ کیں۔ بہت سے اُپنشد سارے کے سارے شاستر اور سمرتیاں اُردو میں منتقل ہو چکے ہیں۔ یہ تو مذہبی کتابوں کا حال ہوا۔ اب عام لٹریچر کا قصّہ سنئے لالو جی لال جی اور منشی نہالچند لاہوری اُردو کے پُرانے محسنوں میں سے ہیں۔ پروفیسر رام چندر دہلوی نے اُردو میں ریاضی پر کافی کتابیں لکھی ہیں۔ راجہ گردھاری پرشاد باقی، داغ کے سرپرست اور اُردو کے شاعر تھے۔ اسی طرح دیا شنکر نسیم، رتن ناتھ سرشار، پیارے لال، درگا سہائے سرور، سری رام، چکبست اور پریم چند کی ادبی خدمات بھی فراموش نہیں کی جا سکتیں۔ اس زمانہ میں بھی جب کہ اُردو ہندی کے مسئلہ کو خواہ مخواہ ایک فرقہ وارانہ مسئلہ بنا لیا گیا ہے، ہندو قوم میں سرسرود، دیا نرائن نگم، کیفی اور محروم ایسے واجب الاحترام بزرگ موجود ہیں جن پر اُردو زبان بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔

اُردو ہندو مسلمانوں کی باہمی اور صدیوں کی اَن تھک کوششوں کا نتیجہ ہے اور یہی ایک زبان ہے جو ہندوستان میں بلا تمیزِ مذہب و ملت ہر شخص کی زبان کہلانے کی مستحق ہے۔ اگر قانونِ قدرت *survival of the fittest* بقائے اصلح صحیح ہے تو اُردو ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ ہندوستان میں ہر انقلاب کے بعد زندہ نکل آئی ہے۔ اس نے بہت سے خزاں و بہار دیکھے ہیں، اس کو کسی خاص مذہب یا فرقے سے منسوب کرنا صریحاً ناانصافی ہے۔

ہمارے سامنے آج یہ سوال پیش ہے کہ آیا اُردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے یا تمام ہندوستانیوں کی؟ اور کیا اسے واقعی یہ درجۂ امتیاز حاصل ہو سکتا ہے کہ اسے ہندوستانیوں کی مشترکہ زبان قرار دے دیا جائے؟ اس مسئلہ پر غور کرنے والے حضرات تین قسموں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔

(۱) ہندو فرقہ پرست

(۲) مسلمان فرقہ پرست

(۳) ہندوستانی

اِن تینوں کو سمجھنے کے لئے آپ کو انہی کی طرح سوچنا پڑے گا۔

فرقہ پرست ہندو یہ سمجھتا ہے کہ ہندوستان آریہ ورت ہے جہاں صرف ہندوؤں ہی کو رہنے کا حق حاصل ہے، اس لئے تمام ہندوستانیوں کو ہمارا مذہب ہماری تہذیب اور ہماری زبان اختیار کر لینی چاہئے۔ ہم سے اختلاف رکھنے والے اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دیں ورنہ ان کی ایک ایک چیز فنا کر دی جائے گی۔ جرمنی سے یہودیوں کے اخراج نے اُسے ایک بڑی خوش فہمی میں مبتلا کر دیا ہے۔ وہ اپنی بھولی ہوئی کہانیاں پھر یاد کر رہا ہے، جو سبق فراموش کئے جا چکے تھے پھر دُہرائے جا رہے ہیں، ان میں شاید ہندی کا پرچار بھی شامل ہے، ہندی بھی وہ ہندی نہیں جو اُردو سے صرف رسم الخط کے اعتبار سے مختلف ہے۔ بلکہ وُہ پراکرت جو مسلمانوں کے اثر سے ملیچھ نہ ہو یعنی اس میں عربی و فارسی کے عام فہم اور رائج الوقت الفاظ بھی نہ ہوں، اور یہ ناگری حروف میں لکھی جاتی ہو۔ مثلاً صوبہ متحدہ کی بجائے جُٹ پرانت، اعلان کی بجائے گھوشن، مدعی کی بجائے جھگڑا اپیڑو کی قسم کے الفاظ استعمال کئے جائیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس قسم کی کوئی زبان ہندوستان میں کبھی نہ تھی۔ اسے اب بنایا جا رہا ہے اُردو پر سب سے بڑا الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کی پروردہ ہے۔ اور فارسی رسم الخط میں کیوں لکھی جاتی ہے۔ وہ لوگ یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ یہ زبان جتنی مسلمانوں کی مرہونِ منت ہے اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ خود اُن کی۔ کیونکہ اگر اس میں سے ہندی (یعنی وہ زبان جو مغلوں سے پہلے ہندوستان میں بولتے تھے) کا ڈھانچہ نکال دیا جائے تو یہ ساری عمارت زمین پر ڈھیر ہو جائے گی۔ اس کی نہ کوئی صُورت ہوگی نہ ترتیب، صرف عربی، فارسی، ترکی انگریزی زبانوں کے الفاظ ہوں گے جن کو آپس میں مِلانے کا کوئی ذریعہ نہ ہوگا۔

فرقہ پرست ہندو کے ان دعاوی اور تنگ نظرانہ خیالات کے باوجود *survival of the fittest* بقائے اصلح کے قانونِ فطرت کے مطابق عام ہندو اُردو ہی کو اپنی زبان سمجھتے اور بطور ایک مشترکہ زبان کے استعمال کرتے ہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ خود ہندو فرقہ پرست کا طرزِ عمل اپنے عام بھائیوں سے کچھ مختلف نہیں پنجاب سے بڑھ کر فرقہ پرستی کا گڑھ اور کہاں ہوگا پنجاب کے اخبارات سے زیادہ فرقہ پرستی کا حامی اور کون ہوگا لیکن ذرا یہ اعداد و شمار ملاحظہ فرمایئے، پنجاب میں ان اخبارات کی اشاعت جو ہندی میں چھپتے ہیں اُردو کے مقابلہ پر ۱۰ فیصدی سے بھی کم ہے:۔

پرتاپ	۲۲ ہزار
ملاپ	۲۰ ہزار
ویر بھارت	۵ ہزار
اِحسان	۵ ہزار
زمیندار	۶ ہزار[1]
انقلاب	۳ ہزار
	کُل ۶۱ ہزار

اس کے مقابلہ پر پنجاب سے صرف ایک اخبار "ہندی ملاپ" نکلتا ہے جس کی اشاعت ۶ ہزار ہے۔ ہندی میں ایک اور روزانہ اخبار "شکتی"

---

[1] ہم جانتے ہیں کہ ان اخبارات کی اصل تعدادِ اشاعت اس نقشہ سے مختلف ہے، لیکن ہم نے وہی تعداد درج کرنا مناسب سمجھا ہے جس کا دعویٰ یہ اخبارات خود کرتے ہیں۔ راقم

بھی نکالا گیا تھا۔ لیکن وہ ہندو پبلک کی "ہندی نوازی" کے ہاتھوں چند ماہ سسک سسک کر ختم ہو گیا، اور لطف یہ ہے کہ پنجاب کے اخبار بین پبلک میں مسلمانوں کی تعداد صرف بیس فیصدی ہے۔

پنجاب کے فرقہ پرست ہندو اخبار نویس اگر دیانت داری کے ساتھ اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ ہندی ہی ہندوستان کی قومی زبان ہو سکتی ہے تو وہ ایک ہفتہ کے لئے اپنے اخبار ہندی بحروفِ ناگری میں نکال دیکھیں، پبلک کا رجحان انہیں خود بخود بتا دے گا کہ ہندی و اُردو دونوں زبانوں میں سے کونسی زبان میں ہندوستان کی قومی زبان ہونے کی صلاحیت ہے۔

دوسری طرف مسلمان فرقہ پرست ہے، اس کی مذہبی زبان عربی اور تمدنی زبان فارسی ہے۔ اس کو اُردو سے کوئی بیر نہیں کیونکہ موجودہ حالات میں وُہ یہ سمجھتا ہے کہ ہندوستان میں رہنے کے لئے یہاں کی زبان استعمال کرنی ہو گی۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ اقتصادی کشمکش کی وجہ سے رواداری کو فراموش کر کے بلا ضرورت اس میں عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ ٹھونستا ہے تا کہ جتنا بھی اس کی مذہبی و تمدنی زبانوں کا اثر پڑ سکے پڑے۔ اگر اس سوال پر تعصب کی عینک اُتار کر ایک فرقہ پرست ہندو یا مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک محبِ وطن ہندوستانی کی طرح غور کریں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ اُردو میں ہندی سے کہیں زیادہ ہندوستان کی مشترکہ زبان بننے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ بنگال، بہار، بمبئی، وسطِ ہند بلکہ برما تک میں اُردو سمجھی جاتی ہے۔ اگرچہ ان صوبوں کی اپنی اپنی مقامی زبانیں ہیں اور ان میں تھوڑا یا بہت ادبی ذخیرہ بھی موجود ہے لیکن ایک مشترکہ زبان کا کام اُردو ہی سے لیا جاتا ہے۔ نئی نسل کا رجحان واضح اور غیر مبہم طور پر اُردو کے حق میں ہے۔ اس کا ثبوت گورنمنٹ کالج لاہور اور الیف سی کالج لاہور میں اُردو اور ہندی پڑھنے والے طلبہ کی تعداد کے موازنہ سے لگایا جا سکتا ہے:۔

الیف سی کالج لاہور	اُردو	ہندی	پنجابی
سالِ اوّل	۱۸۷	۸۰	۱۴
سالِ دوم	۱۸۰	۴۸	۱۵
سالِ سوم	۱۴۱	۶۰	۲۳
سالِ چہارم	۱۲۵	۴۲	۲۱
	۶۳۳	۲۳۰	۷۳
	۶۷٪	۲۴٫۵٪	۸٪

اِس کالج میں مسلمان طلبہ کی تعداد صرف ۲۱ فیصدی ہے حالانکہ ۶۰ فیصدی طلبہ اُردو پڑھتے ہیں۔

گورنمنٹ کالج لاہور	اُردو	ہندی	پنجابی
سالِ اوّل	۱۴۱	۴۱	۱۸
سالِ دوم	۱۱۰	۴۲	۲۱

	اُردو	ہندی	پنجابی
سالِ سوم	۹۰	۲۱	۷
سالِ چہارم	۶۹	۲۵	۹
	۴۱۰	۱۲۹	۵۵
	۶۹%	۲۱٫۷%	۹٫۳%

اس کالج میں مسلمان لڑکوں کی تعداد صرف ۴۰ فیصدی ہے۔ اسی طرح آئی سی ایس اور پی سی ایس اور دوسرے تمام مقابلہ کے امتحانوں میں جہاں ملکی زبانوں کو بطور لازمی یا اختیاری زبان کے لینا پڑتا ہے۔ تقریباً ۷۰ فیصدی طلبہ اُردو لیتے ہیں۔

یہ اعداد و شمار زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اُردو ہندی کا مسئلہ قطعاً ایک فرقہ وارانہ مسئلہ نہیں اور اُردو کو مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کی سرپرستی حاصل ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے واجب الاحترام سیاسی رہنما گاندھی جی جنہیں اس گتھی کو سلجھانا چاہئے تھا فرقہ پرستی کی اس آگ کو اپنے دامن سے نادانستہ طور پر ہوا دے رہے ہیں۔ اس کی وجہ بقول ایک نہایت ذمہ دار کانگرسی رہنما کے یہ ہے کہ گاندھی جی نہ اُردو کے ادیب ہیں نہ ہندی کے۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہندی اتھوا ہندوستانی بحروفِ ناگری بھی کوئی زبان ہے اور وہ ہندوستان کی قومی زبان ہو سکتی ہے حالانکہ ہندوستان میں اس قسم کی کبھی زبان کا وجود نہیں پایا جاتا۔ گاندھی جی کی شہ سے فرقہ پرست ہندوؤں نے یہ موقع غنیمت سمجھا کہ اپنا یہ دعویٰ کہ ہندی ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے زیادہ شد و مد کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اس پر قدرتی سوال یہ ہوا کہ رسم الخط کیا ہو؟ جواب ملا کہ ناگری۔ شاید اس وقت وہ یہ بھول گیا کہ اُردو ہندو مسلمانوں کے درمیان زبان کے مسئلہ کا ایک قدرتی اور ناطق فیصلہ ہے۔ اگر ہندو اس سے پیچھے ہٹیں گے تو شاید مسلمانوں کو یہ کہنے میں عار نہ ہو کہ اُردو و ہندی یا ہندوستانی کوئی بھی ہماری زبان نہیں ہے۔ ہماری زبان فارسی یا عربی ہے۔ ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے فارسی ابھی مردہ نہیں ہوئی۔ اب تک پرانے خاندانوں میں خط و کتابت فارسی میں ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ فارسی کرۂ ارض کی زندہ زبانوں میں سے ہے۔ ہندوستان کے ہمسایہ مسلمان ممالک افغانستان ایران عراق میں فارسی کا استعمال ہے۔

ذرا غور کیجئے کہ اگر مسلمان فارسی اور ہندو مسلمانوں سے بیشتر کی ہندی یعنی پراکرت کا استعمال کرنے لگیں تو ہندوستان کی ترقی کو کتنا بڑا دھکا پہنچے گا۔ گھڑی کی سوئیاں پیچھے کرنا عقلمندی نہیں، فارسی اور پراکرت کے امتزاج کا نتیجہ پھر اُردو ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ سوال ہندو مسلمان کا نہیں کیونکہ اس کے لئے دو دعویدار ہونے ضروری ہیں، ایک اُردو کو محض اپنا بتائے اور دوسرا اس دعوے کو غلط کہے مگر یہاں فرقہ پرست ہندو کہتا ہے کہ اُردو ہماری نہیں، اور مسلمان یہ نہیں کہتے کہ اُردو صرف ہماری زبان ہے کیونکہ ان کی تمدنی زبان فارسی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ جھگڑا ان خودغرض اور فرقہ پرست لوگوں کا پیدا کردہ ہے جو یہ جان گئے ہیں کہ "مذہب خطرہ میں ہے" کا نعرہ بلند کر کے عوام کو زیادہ دیر تک دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے انہوں نے ابھی سے "تہذیب و تمدن خطرہ میں" کا شور مچانا شروع کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے ہندو سرمایہ دار اس تحریک کی نہایت دریا دلی سے امداد کر رہے ہیں۔ رجعت پسند سرمایہ دار یہ چاہتا ہے کہ ہندوستان کی ترقی کچھ دن اور رک جائے۔ گرے ہوئے دانے چگ لوں چچوڑی ہوئی ہڈی کو حکومتِ برطانیہ کے سایہ میں کچھ دن اور چچوڑتا رہوں۔

اگر ان خودغرض لوگوں کی یہ چال کامیاب ہو گئی۔ تو یہ ہندو مسلم اتحاد کے کفن کا آخری ٹانکا ہو گا۔

خواجہ شمس حسن،

رباعیات

خدا

ہر ذرے میں ہے جلوہ نما حسن کا جمال
ممکن نہیں جس ہستی اکمل کو زوال
ہر رنگ میں ہر شان میں پیدا جو یکتا ہے
اے قیس میں کس چیز سے دوں اس کی مثال

رسول کریمؐ

کونین کا سردار ہوا مکے کا یتیم
اک ساربان صحرا ہوا عرش مقیم
کیا شان ہے کیا شان ہے اللہ اللہ
یا رب تو کریمی و رسول تو کریم

محبوب خدا

کامل نہیں ترا ایمان مرا مطلوب ہے تو
ہاں خوب ہے تیری قسمت تو محبوب ہے تو
صورت تیری اجمل تیری سیرت اکمل
ہر شان میں اللہ کا محبوب ہے تو

قرآن کریم

فطرت کا ہر اک راز نہاں اس سے عیاں
سن کر اسے حیرت میں ہیں فصیحان جہاں
محبوب زباں کیوں نہ ہو قرآن کریم
اللہ کا کلام اور محمدؐ کی زباں

کعبہ

معمار تھے کعبے کی عمارت کے خلیل
کعبے کا مہیں نظارہ تھا خود رب جلیل
دنیا میں ہے اسلام کا مرکز کعبہ
یکتہ ہے کعبے کی فضیلت پہ دلیل

پیغامِ عمل

کیوں مجھ کو نہ پیغامِ عمل خوش آئے
کیوں دل کو نہ یہ نغمہ تیرا بھائے
کیوں یاد رکھے جیسے یہ پیغامِ عمل سن رکھے
وہ لے کر جب دنیا میں پیمبر آئے

مسلم

جو رب سے لگا رکھتا ہے وہی مسلم ہے
اللہ سے جو ڈرتا ہے وہی مسلم ہے
باطل کو جو ٹھکراتا ہے مسلم ہے
جو دین پہ مرتا ہے وہی مسلم ہے

تعلیمِ نسواں

دولت کو نہ تقسیم میں کم دیکھو
ملت کو نہ تنظیم میں کم دیکھو
گر چاہتے ہو مرد و زن یکساں دیکھو
عورت کو نہ تعلیم میں کم دیکھو

امرچند قیس جالندھری

تاش کا کھیل

"بعض لوگوں میں یہ مرض ہوتا ہے کہ موقع و محل دیکھے بغیر وہ ہر جگہ تاش کے شعبدے دکھانے شروع کر دیتے ہیں۔
اس مکالمہ میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ایسے حضرات سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔"

کھیل کے ختم ہوتے ہی "شعبدہ باز" دوست تاش ہاتھ میں لے کر فرماتے ہیں "آپ نے کبھی تاش کا کوئی کھیل دیکھا ہے؟ میں آپ کو ایک دلچسپ کھیل دکھاتا ہوں۔ ایک پتہ کھینچ لیجئے گا"

"شکریہ! مجھے معاف رکھیئے۔"

"کیا حرج ہے۔ کھینچئے تو کوئی سا پتہ۔ اور میں بتا دوں گا کہ آپ نے کونسا پتہ کھینچا ہے۔"

"کیسے بتا دیں گے آپ؟"

"مذاق نہ کیجئے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ جو پتہ کھینچیں گے میں بتا دوں گا کہ آپ نے یہ پتہ کھینچا ہے۔"

"جونسا میں چاہوں؟"

"ہاں"

"کسی رنگ کا؟"

"ہاں کسی رنگ کا"

"چھوٹے بڑے کی تو کوئی تمیز نہیں؟"

"بالکل نہیں"

"بہت اچھا۔ میں چڑیا کا اِکا کھینچتا ہوں"

"لاحول ولا۔ میں نے کہا تاش میں سے کوئی سا پتہ کھینچیئے۔"

"اوہو! میں تاش میں سے نکال لوں یہ مطلب ہے نا آپ کا۔ اب سمجھا میں"

"تاش مجھے دے دیجئے گا ـــــ بہت اچھا میں نے ایک پتہ نکال لیا ہے۔"

"کھینچ لیا ہے آپ نے؟"

"جی ہاں - یہ پان کا غلام ہے - کیا آپ جانتے تھے ؟"

" آپ نے مجھے کیوں بتا دیا ؛ اس طرح تو سب لطف غارت ہو جاتا ہے - اب پھر کوشش کیجئے - کھینچئے کا ایک پتہ ؛"

" بہت خوب، مَیں نے نکال لیا ہے ۔"

" بہتر - اسے دوبارہ تاش میں رکھ دیجئے ــــ شکریہ ۔" (پتوں کو ملایا جاتا ہے ۔)

" لیجئے (ذرا فاتحانہ انداز سے) یہی ہے نا آپ کا پتہ ؛"

" معلوم نہیں - مَیں نے تو اچھی طرح دیکھا ہی نہ تھا ۔"

" اچھی طرح دیکھا ہی نہ تھا - عجیب آدمی ہیں آپ بھی - پتے کو اچھی طرح دیکھئے اور یہ بات یاد رکھیئے کہ کون سا پتہ آپ نے کھینچا تھا ۔"

" اب سمجھا - آپ کا مطلب ہے کہ میں اسے پشت کے بجائے دوسری طرف سے دیکھوں ۔"

"جی ہاں - اب کھینچئے پھر"

" بہت خوب - مَیں نے نکال لیا ہے ۔"

(پتوں کو ملایا جاتا ہے)

" مگر یہ تو بتائیے کہ آپ نے اپنا پتہ دوبارہ تاش میں رکھ تو دیا تھا ؛"

" نہیں تو - یہ دیکھئے - میرے پاس ہے ۔"

" خدا کے لئے میری بات غور سے سنئے ــــ ایک پتہ نکال لئے ــــ کوئی سا ــــ اُسے غور سے دیکھئے ــــ یاد رکھئے کہ کون سا پتہ ہے ــــ پھر اسے دوبارہ تاش میں رکھ دیجئے ــــ سمجھے آپ ؛"

"جی ہاں - اب میں سب کچھ جان گیا ہوں - مجھے صرف اس بات پر تعجب آتا ہے کہ آپ یہ کیسے بتا دیں گے ــــ جادوگر ہیں آپ شاید ؛"

(تاش کو ملایا جا رہا ہے)

" یہ رہا آپ کا پتہ ــــ یہی ہے نا ؛"

(صاف انکار کر دیجئے)

" نہیں یہ میرا پتہ نہیں ہے ۔"

(اگرچہ یہ سفید جھوٹ ہے - لیکن خدا آپ کو معاف کر دے گا ۔)

"یہ آپ کا پتہ نہیں، کیا کہا آپ نے — غضب خدا کا — یہ کھیل میں کوئی سو دفعہ کامیابی کے ساتھ دکھا چکا ہوں۔ میں نے ابا کو دکھایا۔ اماں کو دکھایا — میں ہر مہمان کو یہ کھیل دکھایا کرتا ہوں۔ دوبارہ کھینچیے ایک پتہ"

(پتوں کو ملایا جا رہا ہے)

"لیجئے یہ ہے آپ کا پتہ"

"ہرگز نہیں۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ میرا پتہ نہیں۔ لیکن ایک دفعہ اور قسمت آزمائیے۔ شاید اب آپ بتا سکیں"

"—— معلوم ہوتا ہے کہ آپ کچھ جوش میں آ گئے ہیں —— دراصل یہ میری حماقت ہے —— اب ذرا آرام کرسی پر آدھ گھنٹے تک خاموشی سے بیٹھیے۔ ذرا حواس درست ہو جائیں تو پھر دوبارہ کوشش کیجئے گا"

× × × × × × ×

× × × × ×

"رات بہت گزر گئی ہے اور آپ کو گھر پہنچنا ہے۔ ورنہ کھیل واقعی بڑا عجیب تھا۔ اچھا خدا حافظ"

حمید نظامی (لی کاک)

ہم نے آج کیا کیا ہے؟

آئندہ ہم بہت کچھ کریں گے

لیکن ہم نے آج کیا کیا ہے!

آئندہ ہم خزانے بخش دیں گے۔

لیکن ہم نے آج کیا دیا ہے؟

حامد علی خاں (نکسن واٹرمین)

اور مَیں تو سمجھتی تھی کہ رشید بھائی میں جو محبت اور شفقت موجود ہے وُہ دُنیا کے کسی اَور انسان میں نہ ہوگی۔ لاہور سے وہ میرے لئے نئے نئے تحفے لاتے، اُن کی فیاضی کی بدولت میری الماری میں مختلف قسم کی کتابیں، تصویروں کے کارڈ اور بہت سی دُوسری چیزیں جمع ہوگئی تھیں۔ میں جب اِن چیزوں سے کھیلتی یا کتابیں پڑھتی تو اُن کا خیال خود بخود میرے دماغ میں آموجود ہوتا۔ اُن کے آنے کی خبر میرے لئے عید کی خوشی سے زیادہ ہوتی اَور عید کا انتظار بھی مَیں اِس لئے شوق سے کیا کرتی کہ اُس دِن اُن سے ملنا اور تحفے حاصل کرنے کی اُمید ہوتی تھی۔ لاہور سے تحفے لاتے وقت رشید بھائی آپا کو نظر انداز نہیں کیا کرتے تھے۔ وہ اُس کے لئے کتابیں، لکھنے کے سُنہری ورق، خوبصورت قلم، بال باندھنے کے ریشمی فیتے اور اَیسی ہی کئی چیزیں لایا کرتے تھے۔ لیکن یہ تحفے اُنہوں نے امی یا اباجان کی موجودگی میں آپا کو کبھی نہیں دیئے۔ وُہ یہ چیزیں گھر کے لوگوں سے اس طرح چھپا چھپا کر دیتے گویا چوری کر کے لائے ہوں۔ مجھ سے ایسی باتوں کے اخفا کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی بلکہ کئی بار ایسا ہُوا کہ میں رشید بھائی کے ہاں گئی، اَور اُنہوں نے چُپکے سے کوئی چیز مجھے آپا کے لئے دی اور ساتھ ہی تاکید کردی کہ اماں جان کو معلوم نہ ہو۔ مَیں اس کام کو کسی طرح ایک مہم سے کم نہ سمجھتی اَور یہ محسوس کر کے بے حد مسرُور ہوتی کہ مَیں ایسے اہم اُمور سرانجام دینے کے قابل سمجھی جارہی ہوں۔ مَیں نہیں جانتی کہ آپا کی سہیلیاں رشید بھائی کو کیسے جانتی تھیں۔ وُہ جب کبھی ہمارے ہاں آتیں تو بات بات میں اُن کا نام لینے کی کوشش کرتیں۔ آپا کبھی ایک کھسیانی ہنسی ہنستی اور کبھی چڑنے لگتی۔ پہلے پہل تو مَیں آپا کے اس طرزِ عمل پر حیران تھی۔ آخر رشید بھائی کے نام سے چڑنے کی کیا وجہ تھی؛ لیکن بعد میں مجھے اِس چھیڑ میں خود ایک لُطف آنے لگا۔ کبھی کبھی آپا کی کوئی سہیلی اس سے زبردستی چابی چھین کر اُس کی الماری کھولتی اور کوئی چیز اُٹھا کر کہتی:

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خاص لاہور کے انارکلی بازار سے خریدی گئی ہے۔"

اس پر تمام سہیلیاں قہقہہ لگاتیں۔ مَیں بھی ایک رازدارانہ ہنسی ہنستی ہوئے کچھ کہنا چاہتی لیکن آپا کی گھُرکی مجھے خاموش کرا دیتی۔

رشید بھائی بھی تعطیل کے دِنوں میں ہمارے گھر آتے تو تھے ہی لیکن ان دنوں آپا بھی اُن کی بڑی بہن عابدہ باجی کے لئے بہت اُداس ہو جاتی اور اُس کی ملاقات کے لئے ہفتہ میں دو تین بار ضرور جاتی۔ مَیں وقت کے اِن تعینات سے بے نیاز تھی۔ میرا تو وہاں تقریبًا روز کا پھیرا تھا۔ رشید بھائی مجھ سے بہت محبت کا اظہار کرتے اور مَیں اپنے کھیلوں میں اُن کی شرکت کو اس طرح قبول کرتی جیسے وُہ میرے ہم عمر ہوں۔ جب مَیں اُن کے گھر جاتی تو وُہ مجھ سے آپا کے متعلق بہت سی باتیں پُوچھتے "تمہاری آپا کیا کر رہی ہیں؟ ہمارے گھر کب آئیں گی۔ تمہاری اُمی مجھ سے اِس بات پر ناراض تو نہیں کہ میں تمہاری آپا سے بہت باتیں کرتا ہوں؟ آپا سے کہنا ہمارے گھر کیوں نہیں آتیں؟ کیا امی نے منع کیا ہے؟ یا وہ خود ناراض ہیں؟" اِس قسم کی باتیں مَیں روز سُنتی اور سوتے وقت سرگوشیوں میں آپا کے کانوں میں اُگل دیتی۔ یہ ساری باتیں سُننے اور دُہرانے میں مجھے ایک لطف آتا۔ یہ پیغام رسانی رشید بھائی کے دورانِ قیام میں میری روز کی عادت سی ہوگئی تھی۔ جس دن وہ آپا کے متعلق سوالات نہ کرتے اور مجھ سے اس قسم کی باتیں نہ پوچھتے تو میں سمجھتی کہ وُہ مجھ سے ناراض ہیں۔

کالج کی چھٹیوں کے دَوران میں رشید بھائی کے ہاں بڑی پُرلطف محفلیں قائم ہوتیں۔ عابدہ باجی، رشید بھائی، آپا اَور مَیں مِل کر بیت بازی

کیا کرتے تھے۔ مَیں تو خیر اُس وقت "وُہ جھاڑیاں چمن کی وہ میرا آشیانہ" کی قسم کے شعروں سے زیادہ نہ جانتی تھی لیکن عابدہ باجی، رشید بھائی اور آپا دُنیا کے تمام شعروں کا ذخیرہ ختم کر ڈالتے۔ کبھی کبھی رشید بھائی کوئی شعر پڑھ کر آپا کی طرف اشارہ کر دیتے۔ اس پر آپا جھینپ سی جاتی اور عابدہ باجی بناوٹی غصّہ کے انداز میں اُن کی طرف دیکھ کر کہتی "بے شرم"۔ وُہ ایسی جھڑکیوں کا جواب ہنسی سے دیتے۔

ہمارے ملنے جلنے والوں اور اکثر رشتہ داروں میں یہ خیال عام تھا کہ رشید بھائی کی شادی آپا سے ہوگی۔ میں اس رائے کو ایک مسلّمہ امر کی طرح قبول کرتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ جوشِ مسرّت میں ایک دفعہ میں نے اس خیال کا اظہار رشید بھائی اور آپا کے سامنے بھی کر دیا تھا اور اس جرم کی پاداش میں آپا نے ایک چانٹا لگایا تھا۔ لیکن میں حیران تھی کہ خود امی یا خالہ (رشید بھائی کی اماں) نے اس بات کا تذکرہ کبھی نہیں کیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ خالہ اپنی ہونے والی بہو کے متعلّق ایسے خواب دیکھ رہی ہوں جن کے دھندلکے میں آپا نسرین کی جیتی جاگتی شخصیت گم ہوگئی ہو اور اِدھر امی نے اِس معاملے میں سبقت کرنا مناسب نہ سمجھا ہو۔

کچھ عرصہ کے بعد آپا کی شادی میرے ماموں کے لڑکے نصیر سے قرار پائی۔ مَیں اُس وقت عُمر کی چودہ بہاریں دیکھ چکی تھی۔ آزادی کے دن جا چکے تھے۔ رشید بھائی کے ہاں روز کا آنا جانا چھوٹ چکا تھا اور اب میرے لئے ضروری تھا کہ باہر نکلنے سے پہلے اپنے آپ کو برقع کے غلاف میں لپیٹ لُوں۔ شادی کے دن رشید بھائی چپکے سے میرے پاس آئے۔ اُنہوں نے جیب سے گلاب کا ایک پھُول نکال کر اُس کی تمام پتیوں کو زمین پر پھینک دیا اور پھُول کی عریاں شاخ جس پر کانٹوں کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا تھا میرے ہاتھ میں دے کر کہا:

"یہ نسرین کے لئے میری طرف سے شادی کا تحفہ ہے"

مَیں نے اُن کی طرف حیرت سے دیکھا لیکن اُن کے چہرے پر کچھ ایسی سنجیدگی تھی کہ مَیں کچھ نہ کہہ سکی۔

آپا کی رخصتی کے بعد ایک بے پناہ اُداسی مجھ پر طاری ہوگئی۔ مَیں محسوس کرنے لگی کہ میری زندگی گلاب کے اُس بے برگ ڈنٹھل کی طرح رہ گئی ہے جو بھائی رشید نے آپا کو دیا تھا۔ رشید بھائی نے میرے بچپن سے جو جگہ میرے دل و دماغ میں حاصل کرلی تھی اُسے دُنیا کی کوئی اور شخصیت پُر نہیں کرسکتی تھی۔ مَیں اب سِنِ شعور کو پہنچ چکی تھی اور ماضی کی پُرلطف صحبتیں، بے ضرر سازشیں اور دبے دبے مذاق مجھے ایک نئے رنگ میں نظر آنے لگے۔ یہ خیال کر کے میرے دِل میں ایک گدگدی سی ہوتی کہ پچھلے چند سالوں میں ہم محبت کا کھیل کھیل رہے تھے۔ رشید بھائی، آپا اور مَیں۔ اگرچہ مَیں بے جانے بُوجھے اُن کی ہمجولی بن گئی تھی۔ اب مَیں اس بات کا اندازہ کرنے کے قابل تھی کہ آپا کی شادی سے رشید بھائی پر کیا بیتی ہوگی۔ مجھے اُن سے سخت ہمدردی تھی اور ہمدردی کا یہ احساس میرے دِل کی گہرائیوں میں ایک خاموش آہ بن کر رہ گیا تھا۔ مَیں سوچتی تھی ایک کھلاڑی چلا جائے تو کھیل بند نہیں ہو جاتا۔ آپا چلی گئی۔ مَیں اور رشید بھائی باقی تھے۔ کیا یہ کھیل پھر جاری نہیں ہوسکتا۔ لیکن پہل کون کرے؟

رشید بھائی اب طالب علم سے پروفیسر بن چکے تھے۔ اگرچہ اب ہمارے ہاں اُن کا آنا جانا اِتنا عام نہیں تھا تاہم چھٹیوں میں جب وہ

گھر آتے تو کبھی کبھار ہمارے ہاں بھی آ نکلتے ساب میں اُنہیں بچپن کی سی شوخی کے ساتھ نہیں مل سکتی تھی۔ خدا جانے مجھے کیا ہو گیا تھا کہ اُن کی آواز سُن کر میرا دِل زور زور سے دھڑکنے لگتا اور مجھے یوں محسوس ہوتا کہ میری پیشانی پر پسینہ آ گیا ہے۔ اُنہیں سلام کہنے سے پہلے اب مجھے اپنی ہچکچاہٹ اور بزدلی پر اپنے آپ کو بہت مُلامت کرنا پڑتی۔ جب وہ کہتے "جمیلہ اچھی تو ہو؟" تو جواب میرے گلے میں مچھلی کے کانٹے کی طرح اٹک جاتا۔ اُنہوں نے میرے متعلق اپنا پُرانا مربیانہ انداز نہیں بدلا تھا۔ اُن کے نزدیک مَیں ابھی تک بچی ہی تھی۔ "کیا پڑھتی ہو؟ کون اخبار منگواتی ہو؟ کشیدہ کاری نے تمہاری نظر کو خراب تو نہیں کر دیا؟" "تمہاری ہیڈ مسٹرس مس جانسن ہیں۔ مَیں اُنہیں جانتا ہوں" وغیرہ وغیرہ مَیں جو بچپن میں اُن سے تڑاق پڑاق باتیں کرتی تھی اب اِن باتوں کو سُن سُن کر خواہ مخواہ زمین میں گڑی جاتی تھی اور ایسے شرماتی تھی گویا اماں مجھ سے دولہا کے انتخاب میں رائے لے رہی ہوں۔ کئی بار تو مجھے ایسا معلوم ہُوا کہ میرے ہونٹ تو ملے ہیں لیکن ان تک آواز نہیں پہنچ سکی۔ مَیں تو جیسے اُنہیں دیکھ کر ہوش کھو بیٹھتی تھی۔ جب وہ سامنے کے کمرے میں کُرسی پر بیٹھ جاتے تو نجانے مجھے کیوں یہ خیال ہونے لگتا کہ وہ میری طرف ہی تک رہے ہیں اور اِس خیال سے سراسیمہ ہو کر مَیں صحن میں جا بجا ٹھوکریں کھاتی پھرتی۔

اپنی انتہائی خواہش کے باوجود مَیں محبت کے کھیل میں ابتدا نہ کر سکی، اور بھائی رشید تو تھک کر مایوس ہو چکے تھے۔ اُن کا شادی سے انکار اِس بات کا بیّن ثبوت ہے۔ اور مجھے تو اُنہوں نے شاید کبھی کھلاڑی سمجھا ہی نہیں۔ آپا اب بھی اُن کے شادی سے انکار پر لمبی بحثیں کر سکتی ہے لیکن میری زبان میں تو تالا لگ گیا ہے۔ مَیں اِس وقت دو بچوں کی ماں ہُوں۔ جب کبھی میکے آتی ہوں تو رشید بھائی کے ہاں ضرور جاتی ہوں لیکن اب بھی جب اُن سے سامنا ہوتا ہے تو میرے الفاظ حلق میں اٹک جاتے ہیں اور میرے دِل کی دھڑکنیں بیدار ہو جاتی ہیں۔

عطاء اللہ سجّاد

ایک رومن کے آخری الفاظ

لیویا اپنی اور میری ہنسی خوشی گزری ہوئی بیاہی زندگی کو یاد رکھنا۔

(آگسٹس سیزر مرتے ہوئے)

حامد علی خان

غزل

کیا عشق کو ترک ہم کریں گے
ایسا نہ تری قسم کریں گے

برباد دلِ خراب غم کو
تُو نے نہ کیا تو ہم کریں گے

وابستہ جنوں کے سلسلے کو
اُس زلف سے خم بہ خم کریں گے

افسردہ فضائے زندگی کو
اک عالمِ کیف و کم کریں گے

جاتا ہے نگاہِ یاس پر کیوں
تیغ اُٹھنے دے سر بھی خم کریں گے

ہر دل میں تری جھلک دکھا کر
ہر جام کو جامِ جم کریں گے

اک شام فراقؔ صبح کرلیں
ہستی کو تو کیا عدم کریں گے

فراقؔ گورکھپوری

یوکی۔ اونا

(یعنی "حسینۂ برف" کی ایک جاپانی کہانی)

جاپان کے ایک گاؤں میں دو لکڑہارے رہتے تھے ـــــ موساکو اور مینوکیچی۔ موساکو بوڑھا ہو چکا تھا لیکن اس کے شاگرد مینوکیچی کی عمر ابھی اٹھارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ روزانہ وہ دونوں اکٹھے گاؤں سے پانچ میل کے فاصلے پر ایک جنگل کو جایا کرتے تھے۔ جنگل کے راستے میں ایک بڑا دریا پڑتا تھا اور پار جانے والوں کے لئے گھاٹ پر ایک کشتی موجود رہتی تھی۔ جہاں گھاٹ تھا وہاں کئی دفعہ پُل بھی بنایا جا چکا تھا لیکن ہر بار اسے طُوفان بہا لے گیا۔ دراصل جب دریا چڑھتا تو اس جگہ پانی کا بہاؤ اتنا تیز ہوتا کہ کوئی چھوٹا موٹا پُل اس کا مقابلہ کر ہی نہ سکتا تھا۔

ایک بڑی کڑکڑاتی سرد شام کا ذکر ہے کہ موساکو اور مینوکیچی جب گھر کو پلٹے تو راستے میں اُنہیں برف کے ایک سخت خوفناک طوفان نے آلیا۔ گھاٹ پر پہنچ کر اُنہیں معلوم ہوا کہ ملّاح کشتی کو دوسرے کنارے چھوڑ کر جا چکا ہے۔ یہ تیر کر پار اُترنے کا دِن نہ تھا۔ اِس لئے لکڑہاروں نے ملّاح کی جھونپڑی کو غنیمت سمجھ کر اُسی میں پناہ لی۔ جھونپڑی میں کوئی آتش دان نہ تھا۔ نہ کوئی اور ایسی جگہ تھی جہاں آگ جل سکتی۔ یہ پھُوس کی ایک بہت تنگ جھونپڑی تھی جس میں صرف ایک ہی دروازہ تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی کھڑکی بھی نہ تھی۔ موساکو اور مینوکیچی نے دروازہ بند کیا اور اپنی پیال کی برساتیاں اوڑھ کر لیٹ گئے۔ پہلے پہلے تو اُنہیں زیادہ سردی بھی محسوس نہ ہوئی اور اُنہوں نے خیال کیا کہ طوفان جلد تھم جائے گا۔

بوڑھے لکڑہارے کی آنکھ فوراً ہی لگ گئی۔ لیکن نوعمر مینوکیچی کو کسی طرح نیند نہ آتی تھی۔ وُہ دیر تک ہوا کی ہولناک سائیں سائیں اور دروازے پر برف کے تڑاق پڑاق پڑنے کی آواز سُنتا رہا۔ دریا ایک عفریت کی طرح ڈکرا رہا تھا۔ اور جھونپڑی کسی طوفان میں گھری ہوئی کشتی کی طرح چرچراتی اور جھکولے کھاتی تھی۔ طُوفان کا زور دم بدم بڑھتا جاتا تھا اور ہوا سرد سے سرد تر ہوئی جاتی تھی۔ مینوکیچی جاڑے کی شدت سے پیال کی برساتی میں گھاس کی پتّی کی طرح تھرتھرا رہا تھا۔ لیکن آخر نیند غالب آ ہی گئی اور وُہ بھی سو گیا۔

چہرے پر برف کی بوچھاڑ پڑنے سے اُس کی آنکھ کھُلی تو اس نے دیکھا کہ جھونپڑی کا دروازہ کھُلا ہے۔ "برف کے اُجالے" (یوکی اکاری) میں اُسے جھونپڑی کے اندر ایک عورت نظر آئی۔ وہ موساکو پر جھُکی ہوئی اُس کے چہرے پر پھُونکیں مار رہی تھی ـــــ یہ پھُونکیں چمکتے ہوئے سفید دھوئیں کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔ اسی وقت دفعتہً وُہ مینوکیچی کی طرف متوجّہ ہوئی اور آ کر اس پر بھی جُھک گئی۔ مینوکیچی نے

شور مچانا چاہا لیکن اُس کے گلے سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔ اب سفید عورت اور زیادہ جُھک کر اس کے جسم سے قریب تر ہوگئی۔ یہاں تک کہ اس کا چہرہ مینوکیچی کو تقریباً چُھو گیا اور اسے معلوم ہُوا کہ وُہ بہت خوبصورت ہے لیکن اُس کی آنکھیں دیکھ کر لڑکے پر خوف طاری ہوگیا۔ کچھ دیر تک وُہ اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اِس کے بعد اُس نے مسکرا کر دھیمی آواز میں کہا "اِرادہ تو یہی تھا کہ تم سے بھی وُہی سلوک کروں جو تمہارے ساتھی سے کیا ہے، لیکن تم اتنے نوعمر ہو کہ مجھے بے اختیار تمہاری حالت پر رحم آتا ہے۔ مینوکیچی تم بہت خوبصورت لڑکے ہو۔ مَیں تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچاؤں گی، لیکن آج رات جو کچھ تم نے دیکھا ہے اس کا ذکر کسی سے، یہاں تک کہ اپنی ماں سے بھی، نہ کرنا۔ اگر تم نے کسی کے سامنے میرے متعلق ایک حرف بھی مُنہ سے نکالا تو مجھے معلوم ہو جائے گا اور مَیں تمہیں جان سے مار ڈالوں گی۔ . . . . . جو کچھ میں نے کہا ہے اچھی طرح یاد رکھنا۔"

یہ کہہ کر وہ پلٹی اور دروازے میں سے باہر نکل گئی۔ اب مینوکیچی کی طاقت عود کر آئی تھی، اُس نے اُٹھ کر باہر جھانکا لیکن وُہ عورت کہیں نظر نہ آئی۔ البتہ برف نہایت تندی کے ساتھ جھونپڑی میں داخل ہو رہی تھی۔ مینوکیچی نے دروازہ بند کر کے احتیاطاً اس کی پُشت پر بہت سے بھاری کندے جما دیئے۔ پھر اس نے اپنے متحیّر دل میں سوچا کہ دروازہ شاید ہوا سے کُھل گیا ہوگا اور مجھے اندر داخل ہوتی ہوئی برف کے اُجالے پر خواب میں ایک سفید عورت کے پیکر کا دھوکا ہُوا ہوگا۔ لیکن وہ کوئی قطعی فیصلہ نہ کر سکا۔ اس کے بعد اُس نے موساکو کو پُکارا لیکن اس کو خاموش پاکر وہ ڈر گیا۔ پھر اندھیرے میں ہاتھ سے ٹٹول کر اس نے موساکو کے چہرے کو چھُوا تو وہ یخ کی طرح سرد تھا۔ موساکو مر چکا تھا. . . . .

پَو پھٹنے کے وقت طوفان فرو ہوگیا۔ سُورج نکلا تو کچھ دیر بعد ملّاح اپنی جھونپڑی کی طرف آیا اور اس نے دیکھا کہ مینوکیچی موساکو کی اینٹھی ہوئی لاش کے پاس بے ہوش پڑا ہے۔ اس نے لڑکے کی تیمار داری بہت اچھی طرح کی اور وُہ جلد ہی ہوش میں آگیا۔ لیکن اس خوفناک رات کی سردی کے اثرات نے بعد میں اُسے ایک عرصے تک بیمار رکھا۔ بوڑھے لکڑ ہارے کی موت سے وُہ بہت خوفزدہ تھا لیکن اُس نے سفید لباس میں ملبوس عورت کا تذکرہ کسی سے نہ کیا۔

اچھا ہوتے ہی مینوکیچی دوبارہ اپنے کام میں لگ گیا۔ ہر روز صبح کے وقت وُہ اکیلا جنگل کو جاتا اور رات کے قریب لکڑی کے گٹھے لئے ہوئے واپس آتا۔ لکڑی بیچنے میں اس کی ماں اسے مدد دیتی تھی۔

دُوسرے سال موسم سرما میں ایک شام جب وہ گھر کو واپس آرہا تھا تو اسے اپنے سامنے سڑک پر جاتی ہوئی ایک لڑکی نظر آئی تھوڑی دیر میں یہ اُس کے قریب جا پہنچا۔ وُہ چھریرے بدن کی ایک بہت خوبصورت اور کشیدہ قامت لڑکی تھی۔ اس نے مینوکیچی کے سلام کا جواب ایسی آواز میں دیا جو کانوں کے لئے کسی گانے والے پرندے کی آواز کی طرح خوش آئند تھی۔ مینوکیچی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ لڑکی نے اپنا نام او۔یُوکی[1] بتایا اور کہا کہ میرے ماں باپ مر گئے ہیں اور اب میں ییڈو جا رہی ہوں

---

[1] جاپان میں بہت سے ناموں کی نسبت برف سے ہوتی ہے۔

جہاں میرے کچھ غریب رشتہ دار ہیں۔ اُن کی مدد سے میں کوئی ملازمت تلاش کروں گی۔ مینوکیچی اس عجیب لڑکی کے حُسن سے مسحور ہو گیا اور جتنا وُہ اس کو دیکھتا وُہ اُسے اَور زیادہ حسین معلوم ہوتی۔ اُس نے لڑکی سے پوچھا کیا تمہاری منگنی ہو چکی ہے تو اُس نے ہنستے ہوئے جواب دیا "نہیں مَیں ابھی آزاد ہوں"۔ پھر لڑکی نے بھی مینوکیچی سے پوچھا کہ کیا تم بیاہے جا چکے ہو یا کہیں تمہاری نسبت ٹھہر چکی ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ "اگرچہ ایک بیوہ ماں کے علاوہ مجھ پر کسی اَور کے مصارف کی ذمہ داری نہیں لیکن چونکہ مَیں اب تک نوعمر سمجھا جاتا ہوں اِس لئے ابھی ایک "بہورانی" کے انتخاب کا سوال چھڑا ہی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" ان معلومات کے بعد دونوں دیر تک خاموش چلتے رہے لیکن وُہ جو مثل مشہور ہے کہ محبت میں آنکھیں بھی زبان بن جاتی ہیں، گاؤں پہنچنے سے پہلے پہلے وُہ ایک دُوسرے کو بہت چاہنے لگے اَور مینوکیچی نے او۔یوکی کو کچھ دیر کے لئے اپنے گھر میں ٹھہرنے اور ستانے کی دعوت دی۔ تھوڑی سی حجاب آمیز ہچکچاہٹ کے بعد وُہ اس کے ساتھ ہولی۔ مینوکیچی کی ماں نے بھی بڑے تپاک سے اُس کی آؤبھگت کی اَور اُسے گرم گرم کھانا کھلایا۔ لڑکی کے اطوار اس قدر شائستہ تھے کہ اُس نے مینوکیچی کی ماں کو یک بیک رجھا لیا اور اُس نے اِس سے ییڈو کا سفر کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر دینے کو کہا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہؤا کہ یوکی ییڈو قطعاً گئی ہی نہیں اَور آخر "بہورانی" بن کر وہیں رہنے سہنے لگی۔

او۔یوکی بہت اچھی بہو ثابت ہوئی۔ پانچ سال بعد جب مینوکیچی کی ماں کی موت واقع ہوئی تو اس کے آخری الفاظ اپنے بیٹے کی بی بی کی تعریف اَور محبت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ او۔یوکی کے بطن سے مینوکیچی کے دس بچے پیدا ہوئے۔ لڑکے اَور لڑکیاں —— یہ سب کے سب بہت خوبصورت اَور گورے چِٹے تھے۔

گاؤں کے لوگ او۔یوکی کو بڑے تعجب کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ وُہ اُن سے بالکل مختلف تھی۔ اکثر کسان عورتیں بہت جلد بوڑھی ہو جاتی ہیں، لیکن او۔یوکی دس بچوں کی ماں بن جانے کے بعد بھی ویسی ہی حسین رہی جیسی اُس دن جب وہ پہلے پہل گاؤں میں آئی تھی۔

ایک رات جب بچے سو چکے تھے اَور او۔یوکی ایک کاغذی فانوس کی روشنی میں بیٹھی کچھ سی رہی تھی، مینوکیچی نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:۔

"تم سینے میں مشغول ہو اَور مجھے تمہارے چہرے پر روشنی دیکھ کر اُس زمانے کی ایک عجیب بات یاد آ رہی ہے جب میری عمر صرف اٹھارہ سال کی تھی۔ اُن دنوں مَیں نے تمہیں سی ایک خوبصورت عورت کو دیکھا تھا —— حقیقت تو یہ ہے کہ وُہ تم سے بہت ہی مشابہ تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

آنکھ اُٹھائے بغیر او۔یوکی نے جواب دیا:۔

"مجھے بتاؤ، تم نے اُسے کہاں دیکھا تھا؟"

اِس پر مینو کیچی نے اُسے ملاح کی جھونپڑی کی ہولناک رات اور اُس سفید عورت کا قصہ سنایا جو اُس پر جھک کر مسکراتی اور سرگوشیاں کرتی رہی تھی اور پھر موساکو کی خاموش موت کا تذکرہ بھی کیا۔ یہ تمام واقعہ بیان کر چکنے کے بعد اُس نے کہا:۔

"سوتے یا جاگتے وُہی ایک موقع تھا جب میں نے تم سی کوئی اور خوبصورت ہستی دیکھی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ انسان نہ تھی، اور میں اُس سے ڈر گیا تھا ـــــ بے انتہا ڈر گیا تھا ـــــ لیکن وہ نہایت سفید تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اب تک یہ فیصلہ ہی نہیں کر سکا کہ میں نے خواب دیکھا تھا یا "برف کی دیوی" کو دیکھ لیا تھا۔

او۔یوکی نے سینا چھوڑ کر کپڑا پرے پھینک دیا اور مینو کیچی کے قریب جا کر اُس پر جھک گئی۔ پھر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور چیخ چیخ کر کہنے لگی:۔

"وُہ مَیں ہی تھی ـــــ مَیں ـــــ مَیں! وُہ یوکی تھی۔ اور میں نے تمہیں اُس وقت بتایا تھا کہ اگر تم نے میرے متعلق کبھی ایک حرف بھی زبان سے نکالا تو مَیں تمہیں جان سے مار ڈالوں گی!...... اگر مجھے اِن سوتے ہوئے بچوں کا خیال نہ ہوتا، تو مَیں تمہیں اِسی وقت مار ڈالتی۔ اب اگر اپنی خیر چاہتے ہو تو ان کا ہر طرح خیال رکھنا کیونکہ اگر تم نے انہیں کبھی شکایت کا موقع دیا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا...!

ابھی اُس کی چیخیں ختم نہ ہوئی تھیں کہ اُس کی آواز بتدریج باریک ہوتے ہوتے ہوا کی سرسراہٹ کی طرح رہ گئی۔ پھر وہ ایک چمکتی ہوئی سفید دُھند میں تحلیل ہو کر چکّر کھاتی ہوئی چھت کی کڑیوں تک پہنچی اور تھرتھراتی ہوئی دُودکش کے راستے سے باہر نکل گئی...... اِس کے بعد وُہ کبھی نظر نہ آئی۔

(لیفکاڈیو ہرن) حامد علی خاں

شکست کی عظمت

کیا ہم نہ کہتے تھے کہ فتح بڑی شاندار ہوتی ہے۔

اور اِس میں کوئی شک بھی نہیں

لیکن اب مجھے یوں معلوم ہوتا ہے

کہ جب کوئی چارہ نہ رہے

تو شکست بھی شاندار ہو جاتی ہے۔

(والٹ وِٹمین) حامد علی خاں

غزلیات

(۱)

مری بے تابیٔ جاں کی تگ و دَو لامکاں تک ہے
تری پروازِ شاخِ آشیاں سے آشیاں تک ہے
مکان و لامکاں ادنیٰ نشاں ہیں اس کی منزل کے
رسائی مردِ مومن کی خدا جانے کہاں تک ہے
زمین و آسماں اِک جنبشِ مژگاں کی راہیں ہیں
تری وسعت ہی کیا ہے جو زمیں سے آسماں تک ہے

——— زینب عثمانیہ

(۲)

میں اُن کا پجاری ہوں اور عشق ہے رندانہ
سجدوں سے مجھے مطلب کعبہ ہو کہ بُت خانہ
دامن پہ لیا بڑھ کے خود شمع نے رو رو کر
گرنے لگا جب ہنس کر جلتا ہُوا پروانہ
سر پھوڑتا تھا اپنا سنگِ درِ جاناں پر
مَیں نے جو اُسے روکا، رونے لگا دیوانہ
سرمست کیا اتنا مستانہ نگاہوں نے
ہر سُو نظر آتا ہے میخانہ ہی میخانہ
جانبازوں کے مرنے سے افسردہ ہے اب محفل
کچھ جوش تو پیدا کر اے عشوۂ ترکانہ
دل میں مرے اُس بُت کی تصویرِ خیالی ہے
کعبہ کا یہ کعبہ ہے، بُت خانے کا بُت خانہ
پھر فصلِ بہار آئی مستانہ گھٹا چھائی
کر بند درِ توبہ، اے جرأتِ رندانہ

——— محمود علی خاں

(۳)

اگر قطرہ نہ دریا سے جدا ہوتا تو کیا ہوتا
وہی ہوتا جو تھا اس کے سوا ہوتا تو کیا ہوتا
نہ ہونے پر تو دُنیا کی نگاہیں کھا گئیں ہوگا
جو تیرے ماسوا کوئی خدا ہوتا تو کیا ہوتا
نہیں ہوتا ادا سجدہ مگر پھر تیرا بندہ ہوں
اگر مجھ سے ترا سجدہ ادا ہوتا تو کیا ہوتا
ہوئے بے ہوش موسیٰ پرتوِ برقِ تجلّے سے
خدا نے خیر کر دی سامنا ہوتا تو کیا ہوتا
وہ چھپ کر پردۂ دل میں قیامت ڈھا گیا محسن
نظر کے سامنے جلوہ نُما ہوتا تو کیا ہوتا

——— محسن اعظم گڑھی

(۴)

آنے کو ہے چمن میں زمانہ بہار کا ‏ ‏ ہر ریشہ منتشر ہے گریباں کے تار کا
شکوہ ہے چاندنی کا نہ شب ہائے تار کا ‏ ‏ ہم کو گلہ ہے اپنے دلِ بے قرار کا
رہ کر صنم کدہ میں انھیں بھولتا نہیں ‏ ‏ پہلو میں میرے دل ہے کسی دیندار کا
قامت پہ ہے نگاہِ قیامت لگی ہوئی
محشر کو انتظار ہے رفتارِ یار کا

عبدالعزیز خاں نعیم

مرزا غالب کا قصیدہ شمس الامراء

غالب کے فارسی مکاتیب میں ایک خط "نواب شمس الامراء نائب والیٔ حیدر آباد" کے نام ہے۔ اس میں وہ کہتے ہیں :۔

"سعادت و قوت بخشنے والے خدا کا شکر ہے کہ میں اس دُوری کے باوجود آپ سے جُدا نہیں ہوں۔ اس لحاظ سے اپنا شمار اگر آپ کے مقربین میں کروں تو بے جا نہیں۔ میرے اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ مسلمانانِ عالم کے مخدوم و مکرم مولانا عبدالرزاق نے جو مینے کے سید اور صدق و صفا کی تصویر ہیں مجھ سے بیان کیا کہ اس خاکسار کا ذکر آپ کی بزم جاوید بہار میں ہُوا۔ گویا آپ کی ہمہ دانی و فیض رسانی سے حاضر و غائب اور دُور و نزدیک سب بہرہ یاب ہوتے ہیں ... میری قسمت کا خوابِ گراں ختم ہو گیا اور دولت میری دلجوئی کے لئے میرے گھر میں داخل ہوئی ...... خاطر شریف پر واضح رہے کہ شعر و سخن کو خاکسار کی فطرت کے ساتھ ایک رشتۂ روحانی ہے .... شروع میں ریختہ کہتا اور اُردو زبان میں غزل سرا ہوتا تھا۔ جب فارسی زبان کا ذوق حاصل ہُوا تو اس میدان سے عنانِ تخیل پھیر لی۔ مختصر سا دیوانِ ریختہ جو فراہم ہُوا، اُسے گلدستۂ طاقِ نسیاں بنایا۔ اب کم و بیش تیس سال ہوتے ہیں کہ فارسی میں مشقِ سخن کرتا ہوں ..... صبح کے وقت میرے بختِ خفتہ نے چشمِ نیم باز سے مجھے دیکھا اور میری بلبلِ طبع نے نغمہ سرا ہونے کے لئے پر پھڑپھڑائے، خدا کی حمد اور خداوند کی مدح ریزے کار آئی ..... ایک قصیدہ جو ۷۶ شعروں پر مشتمل ہے قیدِ تحریر میں آیا۔"

جس قصیدے کا ذکر اُنھوں نے اس عبارت میں کیا ہے اُس کے ابتدائی دو شعر اسی خط کے آخر میں درج کر دیئے ہیں : ؎

اے مظہرِ کُل در ازل آثارِ کرم را ——— منت بہ سرِ لوح ز اسمِ تو قلم را

اے تو کہ ازل کے دن لطف و کرم کا مظہرِ کامل بنا ——— تیرا نام لکھ کر قلم کاغذ پر احسان کرتا ہے

شمس الامراء کز شرفِ نسبتِ نامش ——— خُور قبلہ بُد اورنگ نشینانِ عجم را

شمس الامراء وہ شخص ہے کہ اس کے نام کی نسبت کے صدقے ——— شاہانِ عجم سُورج کی پرستش کیا کرتے تھے

ان دو شعروں کے علاوہ اس قصیدے کے باقی چوہتّر شعر بظاہر تلف ہو گئے ہیں کیونکہ کلیاتِ نظم فارسی یا غالب کی دُوسری تصانیف میں کہیں اس کا اندراج نظر نہیں آتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ۷۶ شعر کا یہ قصیدہ آخر کیوں اور کس طرح ناپید ہو گیا؟ زیادہ تعجب اس لئے ہوتا ہے کہ شمس الامراء کے نام کا نسبتہً کم قیمت خط تو غالب نے اپنے پاس محفوظ رکھا لیکن ایک طویل قصیدہ جو بہ آثارِ ظاہر بڑے زور کا قصیدہ تھا وُہ اُس سے زیادہ نہیں تو اُسی قدر احتیاط کا مستحق بھی نہ سمجھا گیا۔ مرزا غالب اپنے مکاتیب میں بعض دفعہ تیس چالیس برس پہلے کی کہی ہوئی کسی غزل کے صرف ایک شعر کا ذکر بڑی محبت سے کرتے ہیں۔ اپنے ایک پُرشکوہ قصیدے کو خاموشی سے بغیر ایک آہ کھینچے ہمیشہ کے لئے دفن کر دینا اُنہیں کس طرح گوارا ہو سکا؟

شمس الامراء کے قصیدے کا معاملہ ایک ضمنی مسئلہ ہے اس لئے کبھی زیرِ بحث نہیں آیا۔ صرف مولانا غلام رسُول مہر نے اپنی مبسوط تصنیف "غالب" میں جہاں بیشتر جزئیات کا ذکر کیا ہے وہاں اِس مسئلے پر بھی نظر ڈالی ہے۔ فرماتے ہیں :۔

"... اُنھوں نے ۷۶ شعر کا ایک قصیدہ شمس الامراء کی مدح میں لکھا اور ایک مکتوب کے ساتھ جس کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکی حیدر آباد بھیج دیا ... اس فارسی

قصیدے کے صرف دو شعر مکتوب میں درج ہیں۔ نہ یہ غالب کے کلیاتِ نظم فارسی میں موجود ہے نہ "سبد چین" میں ہے اور نہ کسی اور جگہ شائع ہوا ہے۔ نہ یہ بتایا جا سکتا ہے کہ یہ کیسے ضائع ہوا..... ممکن ہے خاندان شمس الامراء کے پرانے کاغذات میں سے غالب کا یہ قصیدہ مل جائے۔ اگر کوئی صاحب اسے تلاش کر سکیں تو یہ بہت بڑی ادبی خدمت ہوگی"

جناب تہر کی مندرجۂ بالا عبارت کے علاوہ اور کہیں غالب کے اس گم شدہ قصیدے کا سراغ لگانے کی کوشش میری نظر سے نہیں گزری لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس قصیدے کی تلاش میں غالب کے مطبوعہ کلام سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ قصیدہ غالب کے کلیاتِ نظم میں موجود ہے۔

ایک کا قصیدہ دوسرے کے نام پر کر دینے کا دستور مرزا غالب سے بہت پہلے شاعری کی دنیا میں موجود تھا۔ قصیدۂ شمس الامراء پر بھی یہی عمل ہوا چنانچہ وہ ایک ہلکے سے پردے کے پیچھے اب بھی غالب کے باقی کلام کے ساتھ شامل ہے۔ اگر ہم غالب کے مطبوعہ فارسی قصائد پر نظر ڈالیں تو دو قصیدے (۱۱ اور ۵۶) ایسے ملتے ہیں جن کی زمین وہی ہے جس میں نواب شمس الامراء کے نام کے دو شعر لکھے گئے ہیں۔ قصیدہ ۱۱ اس مطلع سے شروع ہوتا ہے ؎

آوارۂ غربت نتواں دید صنم را ——— خواہم کہ دگر بتکدہ سازند حرم را

(بتوں کا غریب الوطنی کے عالم میں بھٹکتے پھرنا دیکھا نہیں جاتا ——— میں چاہتا ہوں کہ لوگ حرم کو پھر بتکدہ بنا دیں)

یہ قصیدہ حضرت عباس ابن علی علیہ السلام کی منقبت میں ہے۔ اس قصیدے کے مضامین کسی مدحیہ قصیدے کے مضامین سے قدرۃً مختلف ہیں۔ اس لئے اس پر قصیدۂ شمس الامراء کا گمان قطعاً نہیں ہو سکتا۔

قصیدہ ۵۶ نواب وزیر محمد خاں بہادر والیِ ٹونک کی مدح میں ہے۔ اس کا مطلع ہے ؎

اے ذات تو جامعِ صفتِ عدل و کرم را ——— وے بر شرفِ ذاتِ تو اجماعِ اُمم را

(اے تو کہ تیری ذات میں عدل و کرم کی دو گونہ صفت جمع ہے ——— اور تیرے حسبِ عزّت و شرف ہونے پر تمام فرقوں کا اتفاق ہے)

اس قصیدے میں ستر شعر ہیں اور معاً یہ شبہ دل میں گزرتا ہے کہ شمس الامراء کے قصیدے کا اسی زمین میں ہونا اور تعدادِ اشعار کا دونوں قصیدوں میں تقریباً برابر ہونا محض اتفاق نہیں ہو سکتا اور اگر محض اتفاق ہے تو عجیب اتفاق ضرور ہے۔ مرزا غالب کے بارے میں اس قسم کے اشتباہ کی صورت اس لئے بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ فارسی شاعری کی عام روایت کے مطابق مدح سے اُن کو ممدوح کے متعلق کسی اصلیت کا اظہار مقصود نہیں ہوتا۔ قصیدہ گوئی اُن کے لئے اظہارِ کمال کا ذریعہ اور صلہ یابی کا جائز وسیلہ تھی بلکہ اسی نقطۂ نظر کے مطابق وہ سمجھتے تھے کہ اگر ایک تیر سے دو شکار مل جائیں تو مضائقہ نہیں۔ امجد علی شاہ کا ایک قصیدہ اُنہوں نے نام کے تغیّر کے ساتھ بلا تامل واجد علی شاہ سے منسوب کر دیا۔ اپنے اس طرزِ عمل کو وہ بڑی حد تک جائز قرار دیتے تھے، چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں :-

" انوری نے بارہا ایسا کیا کہ ایک کا قصیدہ دوسرے کے نام پر کر دیا۔ میں نے باپ کا قصیدہ بیٹے کے نام پر کر دیا تو کیا غضب ہوا۔ اور پھر کیسی حالت اور کیسی مصیبت میں! اس قصیدے سے مجھ کو غرض دستگاہِ سخن نہیں، گدائی منظور ہے۔"

جب قصیدوں میں ممدوحین کا رد و بدل یوں جائز قرار دے دیا گیا تو ذاتی سہولت کے پیشِ نظر شمس الامراء کا قصیدہ وزیر الدولہ کی خدمت میں پیش کر دینا کون سا دشوار تھا۔ شمس الامراء کے نام غالب نے جو فارسی خط لکھا ہے اُس کے مضمون سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی غالب نے دربارِ بہادر شاہ کے

اثر سے دوبارہ اُردو میں شعر کہنا شروع نہیں کیا تھا۔ اُردو شاعری کا یہ آخری دور ۱۸۵۰ء سے شروع ہوا۔ اس لئے قیاس یہ چاہتا ہے کہ شمس الامرا
۱ کے نام کا خط اور قصیدہ غالب نے ۱۸۵۰ء سے پہلے لکھا ہوگا۔ شمس الامرا ۱۸۴۹ء میں چند مہینوں کے لئے نواب ناصر الدولہ کے مدار المہام تھے
اس لحاظ سے عجب نہیں کہ اس خط اور قصیدے کا سالِ تحریر ۱۸۴۹ء ہو۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ شمس الامرا کے بہت جلد معزول ہو جانے کی وجہ سے
غالب کو اپنے قصیدے کا کوئی صلہ نہ مِل سکا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ غالب کا قصیدہ حیدر آباد پہنچنے سے پہلے ہی شمس الامرا کی جگہ اُن کے جانشین سالار جنگ
کا تقرر عمل میں آچکا ہو۔ بہر حال اس واقعے کے بارہ برس بعد ۱۸۶۱ء میں جب نواب وزیر الدولہ کو قصیدہ بھیجنے کی ضرورت پیش آئی تو حالت یہ
تھی کہ طبیعت کی جولانی سرد پڑ چکی تھی۔ ۵۷ء کے ہنگامے نے قوائے ذہنی کو شل کر رکھا تھا۔ اُس وقت شمس الامرا کا یہی رکھا ہُوا قصیدہ کام آیا۔
۱ پہلے دو شعر کاٹ کر پانچ نئے شعر لکھے اور باقی پینسٹھ[65] شعر بجنسہٖ قائم رکھ کر ستّر شعر کا قصیدہ ٹونک بھیج دیا۔

لیکن محض تعدادِ اشعار ہی سے ٹونک کے قصیدے پر قصیدۂ شمس الامرا کا گمان نہیں ہوتا۔ تعدادِ اشعار سے قطع نظر مطبوعہ قصیدے کے بعض اشعار خود اپنی غمازی کر رہے ہیں۔ مثلاً ایک شعر ہے ؎

در بزمِ تو گویند سخن می رود از من ــــــــ از بلبلِ شیدا کہ خبر کرد ارم را؟

(کہتے ہیں کہ تیری بزم میں میرا ذکر ہوتا ہے ــــ باغ ارم کو بلبلِ شیدا کی خبر کس نے پہنچا دی؟)

۲ اس شعر کا اشارہ شمس الامرا کے خط کے جس حصّے کی طرف جاتا ہے وُہ خود بخود ظاہر ہے۔

سب سے دلچسپ اور پُر لطف بات یہ ہے کہ قصیدے کی بحر شمس الامرا کے نام کو تو قبول کرتی ہے لیکن وزیر الدولہ کا نام اس میں نہیں کھپ سکتا۔ حالانکہ غالب کے دُوسرے قصائد میں ممدوح کا نام بہ آسانی قیدِ نظم میں آجاتا ہے۔ بظاہر یہ ایک ایسی دقّت تھی کہ اس کا حل کئے بغیر شاعر کو نواب وزیر الدولہ کے لئے ایک نیا قصیدہ لکھنا لازم آتا۔ لیکن مرزا غالب نے یہ پہلو بڑی خوش اسلوبی سے بچایا ہے ؎

معذورم اگر نامِ تو در بحر نہ گنجد ــــــــ در کوزہ چساں جائے دہم دجلہ و یم را؟

(اگر تیرا نام بحر میں نہیں سما سکتا تو مَیں معذور ہوں ــــ آخر میں دریا کو کوزے میں کس طرح بند کر دوں؟)

یہ نواب وزیر الدولہ کے قصیدے کا پانچواں شعر ہے۔ اِن پہلے پانچ شعروں کو کاٹ دیجئے اور ان کے بجائے وُہ دو شعر رکھ دیجئے، جو شمس الامرا کے نام غالب کے خط میں درج ہیں۔ شمس الامرا کا ۶۷ شعر کا وُہی قصیدہ ہاتھ آجائے گا جو بظاہر کسی پُر اسرار وجہ سے ناپید ہو گیا تھا +

احمد حمید خاں

محفل ادب

ترکستان کی مشکبو حسینہ

چین کی تاریخ میں شہنشاہ چن لنگ اور ترکستان کی مسلمان حسینہ سیانگ فی کی داستانِ عاشقی بہت مشہور ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں تک رومانیت اور اثر انگیزی کا تعلق ہے دُنیا کی تاریخوں میں ایسے واقعات کم دستیاب ہوں گے۔

سیانگ فی کا اصلی نام سلیمہ تھا اور وُہ مشرقی ترکستان میں علاقہ زنگاریہ کے سردار خواجہ خاں کی بیوی تھی۔ سلیمہ غیر معمولی طور پر حسین تھی، اور اس کے پسینے سے کچھ ایسی خاص قسم کی بھینی بھینی مہک آتی تھی کہ لوگ اسے "سیانگ فی" یعنی مشکبو کہتے تھے۔ اس کا یہ لقب اس قدر مشہور ہُوا کہ لوگ اس کا اصلی نام ہی بھول گئے۔

چن لنگ شہنشاہِ چین نے پکین میں تین ہزار میل کے فاصلہ پر بیٹھ کر متعدد سیاحوں اور سوداگروں سے سیانگ فی کے حسن خداداد کی اس قدر شہرت سنی تھی کہ وُہ اس پر نادیدہ عاشق تھا۔ اس نے سیانگ فی کو حاصل کرنے کی دو ایک مرتبہ کوشش بھی کی لیکن ناکام رہا۔ ۱۷۵۵ء میں سیانگ فی کے شوہر خواجہ خاں نے حکومتِ چین کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور اپنے بھائی برہان الدین خاں کی مدد سے چینی فوجوں کو مار مار کر زنگاریہ سے نکال دیا۔ بغاوت نے جب زیادہ طول کھینچا اور اس کے شعلے ترکستان کے دوسرے حصّوں میں بھی بھڑکنے لگے تو شہنشاہِ چین نے اپنے بچپن کے دوست اور معتمد خاص چاؤ ہوئی کو زنگاریہ پر پوری قوت کے ساتھ فوج کشی کا حکم دیا۔ اور اس سے یہ کہہ دیا کہ وہ سیانگ فی کو حاصل کرنے کے لئے کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھے۔

چاؤ ہوئی نے چار لاکھ سے زیادہ فوج لے کر کاشغر، یارقند اور ختن پر بیک وقت حملہ کیا۔ خواجہ خاں نے پامردی سے تقریباً دو سال تک مقابلہ کیا لیکن انجام میں اسے شکست ہوئی اور وُہ اپنے بھائی اور بیوی کے ساتھ بدخشاں کی طرف بھاگا۔

سلطانِ بدخشاں نے جو خود سیانگ فی کے عاشقوں میں تھا خواجہ خاں سے شرمناک بدعہدی کی۔ جب وہ برہان الدین خاں اور سیانگ فی کے ساتھ سلطان کے پایۂ تخت میں داخل ہُوا تو سلطان نے دھوکا دے کر سیانگ فی کو اپنی حرم سرا میں قید کر دیا اور فاتح حکومت چین کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے دونوں پناہ گزین بھائیوں کے سر قلم کر کے چاؤ ہوئی کے پاس بھیج دیئے۔

چاؤ ہوئی نے شہنشاہِ چین کے حکم کے مطابق سلطانِ بدخشاں سے سیانگ فی کو طلب کیا اور بصورتِ دیگر فوج کشی کی دھمکی دی۔ سلطان نے ڈر کر سیانگ فی کو چار مسلمان کنیزوں کے ساتھ چاؤ ہوئی کی خدمت میں روانہ کر دیا۔

فروری سنہ ۱۷۶۰ء میں چاؤ ہوئی اپنی خوبصورت قیدی کو لے کر پیکن روانہ ہوا۔ راستہ میں اس نے سیانگ فی کے آرام و آسائش کا غیرمعمولی طور پر خیال رکھا۔ اس کے سفر کے لئے پانچ بڑی بڑی گاڑیاں مہیا کی گئی تھیں جن کے پہیوں پر مندہ چڑھایا گیا تھا۔ گاڑیبانوں کو گاڑیاں آہستہ چلانے کا حکم تھا اور زنگاریہ کی جنگ میں جو مسلمان گرفتار ہوئے تھے ان کی جان بخشی کر کے انہیں مصاحبوں کی حیثیت سے سیانگ فی کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔

اس آرام و آسائش کے باوجود ترکستان کی مشکبو حسینہ نے راستہ میں فرطِ غم سے تین دن تک کچھ کھایا پیا نہیں۔ روتے روتے اس کی آنکھوں کے آنسو بھی خشک ہو گئے تھے اور اس نے کئی مرتبہ خودکشی کی کوشش کی۔ چاؤ ہوئی نے اسے بہت کچھ سمجھایا اور یقین دلایا کہ سلطانِ بدخشاں نے اس کے شوہر کو قتل نہیں کیا بلکہ وہ زندہ اور چینی فوجوں کی حراست میں ہے۔ اور شہنشاہِ چین اس کی خطا معاف کر کے اسے پایۂ تخت عکسو واپس آنے کی اجازت دے دیگا۔ علاوہ بریں چاؤ ہوئی نے سیانگ فی کی کنیزوں سے بیش قرار انعامات کا وعدہ کیا کہ وہ اس کا دِل بہلانے کی کوشش کریں۔ سیانگ فی اسی طرح مختلف حیلہ طرازیوں کا نشانہ بنتی ہوئی چھ ماہ بعد پیکن (موجودہ پیپنگ) پہنچی جہاں لوکاؤ چاؤ کے مشہور پُل پر (جس کا موجودہ نام مارکو پولو کا پُل ہے) چن لنگ شہنشاہِ چین اُس کے استقبال کے لئے موجود تھا۔

چن لنگ شہنشاہِ چین نے چاؤ ہوئی کی شاندار خدمات سے خوش ہو کر جاگیر و نقد انعامات کے علاوہ پیکن میں گھوڑے پر سوار ہو کر گزرنے کا وہ شرف عطا کر دیا جو اب تک شہزادوں کے لئے مخصوص تھا اور "سوکو رنگ کو" کے شاہی میوزیم میں اس کی روغنی تصویر آویزاں کی گئی۔ سیانگ فی نہایت عزت کے ساتھ "یوان منگ یوان" کے شاہی محل میں ٹھہرائی گئی۔ اس کے کھانے پینے کا انتظام چند معزز ترین مسلمان امیروں کے سپرد کیا گیا تھا۔ دُوسرے دِن ترکستان کی وُہ مشکبو حسینہ جس کے عشق کی چنگاریاں کئی سال سے شہنشاہِ چین کے دِل میں بھڑک رہی تھیں خدمت شاہی میں پیش کی گئی اور چن لنگ اس کے حُسنِ خداداد کو دیکھ کر بالکل مسحور ہو گیا۔ سیانگ اس کے سامنے نیچی نظریں کر کے خاموش کھڑی ہو گئی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کے دو قطرے ضرور تھے لیکن چہرے سے جلال ٹپک رہا تھا۔ خواجہ سراؤں نے جو اسے لے کر خدمت شاہی میں حاضر ہوئے تھے اس سے آداب بجالانے کے لئے کہا۔ لیکن سیانگ فی ان کی طرف قہر آلود نگاہوں سے گھور کر بدستور خاموش کھڑی رہی۔ شہنشاہ نے خواجہ سراؤں سے روک کر کہا "یہ خاتون غیر ملک سے آئی ہے، آدابِ دربار سے واقف نہیں۔ لہٰذا اس سے تعرض نہ کرنا۔"

اس کے بعد شہنشاہ نے اسے دلاسا دے کر چند بیش قیمت زیورات اور جواہرات دینا چاہے لیکن سیانگ فی نے بادشاہ کی ایک بات کا بھی جواب نہ دیا اور شاہی عطیہ کی طرف حقارت آمیز نظروں سے دیکھ کر مُنہ پھیر لیا۔ شہنشاہ نے خواجہ سراؤں کو اسے واپس لے جانے کا حکم دیا۔ اور سیانگ فی بادشاہ کو سلام کئے بغیر ان کے ساتھ چلی گئی۔ شہنشاہِ چین ترکستان کی مظلوم حسینہ کے اس جلال و تمکنت سے بھی بہت متاثر ہوا اور اس نے سمجھ لیا کہ یہ زخم خوردہ شیرنی بآسانی رام ہونے والی نہیں۔ دو تین دن بعد اس نے پھر سیانگ فی کو اپنے حضور میں طلب کیا۔ لیکن سیانگ فی کے اندازِ خودداری میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔

آخر میں بادشاہ نے اپنے ایک معتمد خاص ہوشین پر جو عقل و ذہانت کے لئے مشہور تھا اپنا راز ظاہر کرکے مشورہ طلب کیا۔ ہوشین نے بہت غور و فکر کے بعد جواب دیا۔ "جہاں پناہ! ترکستان کی شہزادی مغرور اور ضدی عورت ہے۔ اس مزاج کے لوگوں کو کبھی ڈرا دھمکا کر قبضہ میں نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی ہار تو محبت اور صرف محبت ہے۔ آپ سیانگ فی کی دلجوئی و دلنوازی کیجئے اور اس کے لئے ایسا پُرمحبت ماحول پیدا کر دیجئے کہ اسے اجنبیت بالکل محسوس نہ ہو۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ "یہ کس طرح ممکن ہے؟"

ہوشین نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا۔ "آپ اس کے وطن عکسو کے طرز پر ایک چھوٹا سا شہر تعمیر کرا دیجئے۔ جاؤ ہوئی اور بعض دوسرے چینی سردار کئی سال تک زنگاریہ میں رہے ہیں، ان سے نقشہ تیار کرا لیجئے۔ یہاں ترکستان کے مسلمان قیدی کافی تعداد میں موجود ہیں ان سے معماری کا کام لیجئے۔ علاوہ بریں شہزادی کا سارا عملہ مسلمان ہو اور اس میں زیادہ تر اسی کی قوم کے آدمی تُرک ہوں۔ بس سیانگ فی کو یہ معلوم ہو کہ گویا وہ اپنے وطن ہی میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اس طرح وُہ رفتہ رفتہ آپ سے مانوس ہو جائے گی۔"

شہنشاہ چن لنگ نے اس تجویز کو پسند کرکے پکن کے قریب ہی عکسو کے طرز پر ایک چھوٹے سے نئے اسلامی شہر کی تعمیر کا حکم دیا۔ جس میں مسجدوں کے گنبد تھے۔ منارے تھے۔ مخصوص ترکستانی انداز کے بازار اور باغات تھے۔

اس دَوران میں شہنشاہِ چین نے سیانگ فی سے ملاقات کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ اس نے ترکستانی حسینہ کے لئے یوان منگ یوان کے مشہور تاریخی محل میں جسے یورپ کے کاریگروں نے بنایا تھا ایک نیا حصّہ بصرف کثیر تعمیر کرایا جس کے اُوپر ایک بڑا مدوّر شیشہ لگایا گیا تھا جو چینی کاریگری کا حیرت انگیز شاہکار تھا۔ یہ شیشہ دُور سے بالکل چاند کی طرح نظر آتا تھا اور اس کی ہلکی روشنی گرد و نواح میں ایک میل تک پہنچتی تھی۔ اس کی خوابگاہ کی چھت میں ہزاروں جواہرات نصب کئے گئے تھے جو رات میں ستاروں کی طرح چمکتے تھے۔ شہنشاہ چین کی خدمت میں جو نادر اور بیش قیمت تحفہ آتا تھا وُہ سیانگ فی کے پاس بھیج دیتا تھا۔ اس کا دِل بہلانے کے لئے تین سو بہت خوبصورت اور بہترین گانے والی لڑکیاں جمع کی گئی تھیں جن میں سو لڑکیاں چین کی تھیں۔ سو لڑکیاں ترکستان اور کوہ قاف کے اسلامی علاقوں کی اور سو لڑکیاں یورپین ممالک کی۔ غرض سیانگ فی کی دلجوئی و دل نوازی پر بیدریغ روپیہ صرف ہو رہا تھا لیکن سیانگ فی اس کے قبضہ میں نہ آتی تھی۔

شہنشاہِ چین کے دِل پر اب تمام و کمال سیانگ فی کی حکومت تھی۔ اسے اپنی ملکہ کی ذرا بھی پروا باقی نہ رہی تھی۔ جنوبی چین کی ایک بہت ہی حسین عورت کئی سال سے اس کے دِل پر راج کر رہی تھی اور شہنشاہ نے اسے "ین فی" (محبوبہ سیمیں بدن) کا خطاب عطا کیا تھا۔ لیکن اب اس کی محبّت بھی شہنشاہ کے دِل سے زائل ہو گئی تھی۔ وُہ تھا اور دن رات سیانگ فی کے رُخِ زیبا کا تصوّر۔ نازنینانِ حرم سے اس کی اِن بے اعتنائیوں اور سیانگ فی پر بیدریغ زرپاشیوں پر محل میں ہلچل برپا ہو گئی۔ بیگمات اور کنیزوں نے شہنشاہ کی والدہ ملکہ نیوہو لو کی خدمت میں حاضر ہو کر اسے ساری داستان سُنائی اور اس سے امداد طلب کی۔ شہنشاہِ چین اپنی ماں کی غیر معمولی عزت کرتا تھا۔ اس کی ماں کو سُن کر

صدمہ تو بہت ہُوا اور یہ بات اس کے لئے ناقابلِ برداشت تھی کہ اس کا بیٹا جو مذہبی اعتبار سے دیوتاؤں کا فرزند تھا ایک مسلمان عورت کے دامِ محبت میں اس طرح گرفتار رہو، لیکن وُہ کر کیا سکتی تھی۔ جانتی تھی کہ چن لنگ ضدی بہت ہے۔ اگر اسے زیادہ مجبور کیا گیا تو وُہ اس کی بات نہ مانے گا اور اس طرح اس کے وقار پر ضرب شدید پہنچے گی۔ تاہم عاقلمند ملکہ نیوہولو نے محل کی عورتوں کو تسلی دے کر ان سے وعدۂ امداد کیا اور یہ سوچنے لگی کہ کس طریقہ سے شہنشاہِ چین کو سیانگ فی کے دامِ محبت سے نجات دلائی جائے۔

اِس دوران میں پیکن کے قریب عکسو کے طرز پر جدید اسلامی شہر بن کر تیار ہو گیا۔ شہنشاہ چن لنگ نے سیانگ فی کو یہ جگہ دکھانے کے لئے شہر پناہ کے قریب ایک بہت بلند منارہ تعمیر کرایا اور سیانگ فی کو نمازِ فجر کے وقت وہاں لے گیا۔ سیانگ فی نے دمکتے ہوئے سپیدۂ سحری کی ملکی ملکی روشنی میں ایک نیا حیرت انگیز نظارہ دیکھا۔ ترکی طرز کے مکانات جن میں رنگین فانوسوں کی تیز روشنی ہو رہی تھی۔ مسجدوں کے شاندار گنبد اور منارے ——— یہ خواب ہے یا عالمِ بیداری۔ دفعتہً مؤذن نے چین کی طویل تاریخ میں پہلی مرتبہ پیکن کے مقدس شہر سے اس قدر قریب اذان دی۔ سیانگ فی متحیر ہو کر شہنشاہ کی طرف دیکھنے لگی۔ چن لنگ کے ہونٹوں پر تبسم تھا اور سیانگ فی کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ مؤذن خالص حجازی لہجہ میں اذان دیتا رہا۔ سیانگ فی کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری ہو گئے۔ جس وقت مؤذن کی زبان سے نکلا ——— "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا الرَّسُوْلُ اللّٰهِ ———" سیانگ فی ضبط نہ کر سکی اور چیخ مار کر بیہوش ہو گئی۔

دو دن تک سیانگ فی کی حالت بہت خراب رہی اور شہنشاہِ چین کسی وقت بھی اس کے پاس سے نہ ہٹتا تھا۔ اس کے بعد سے سیانگ فی کا معمول ہو گیا کہ وُہ تصویرِ حیرت بنی ہوئی اس نئے اسلامی شہر کو دیکھتی رہتی تھی اور ہر وقت اسلامی ماحول میں گھرے رہنے اور شہنشاہ چین کی مذہبی رواداری کے حیرت انگیز مظاہرے سے اس کی وحشت بہت کچھ کم ہو گئی تھی۔

اس موقع پر عام چینی روایت یہ ہے کہ سیانگ فی شہنشاہِ چین کی تمام نوازشوں کے باوجود اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک اس کی جانب ذرا بھی متوجہ نہیں ہوئی۔ لیکن بعض مؤرخوں کا بیان ہے کہ خود اپنے ہم مذہب سلطان بدخشاں کا یہ شرمناک اور وحشیانہ طرزِ عمل دیکھنے کے بعد کہ اس نے سیانگ فی کو اپنے محل میں قید کر کے اس کی عصمت پر ڈاکہ ڈالنا چاہا اور اس کے شوہر کو پناہ دے کر موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ جب چین کے عظیم الاقتدار شہنشاہ کی یہ حیرت انگیز اولوالعزمی اور رواداری دیکھی کہ وہ سیانگ فی کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرنا نہیں چاہتا، ہر طرح کی قدرت رکھنے کے باوجود ہر وقت اس کی دلجوئی کرتا رہتا ہے، وہ صرف ایشیا کا سب سے بڑا حکمران ہی نہیں بلکہ اپنی رعایا کا مذہبی پیشوا بھی ہے۔ لیکن ایک مسلمان عورت کی مذہبی آزادی اسے اس قدر عزیز ہے کہ اس نے اس کے لئے ایک اسلامی شہر تعمیر کرا دیا ہے، جہاں ترکستان کے ہزاروں باشندوں کو بسا کر چینیوں کے برابر حقوق عطا کئے گئے ہیں اور وہ سیانگ فی کے قدموں پر اپنی سلطنت بھی قربان کر دینا چاہتا ہے تو وہ بہت متاثر ہو کر چن لنگ کے ساتھ شادی کرنے پر آمادہ ہو گئی اور کئی مؤرخوں کا بیان ہے کہ شہنشاہِ چن لنگ نے پوشیدہ طریق پر مذہبِ اسلام بھی قبول کر لیا تھا۔

شہنشاہِ چین لنگ کو اب ایک منٹ کے لئے بھی سیانگ فی کی مفارقت ناگوار تھی۔ امورِ سلطنت سے وُہ بالکل غافل ہوگیا تھا۔ پہلے تو پیکن کے باہر اسلامی شہر کی تعمیر ہوئی تھی۔ اب اس نے بصرفِ کثیر قسطنطنیہ سے انجنیئر بُلا کر خاص اپنے پایۂ تخت میں سیانگ فی کے لئے خالص ترکی طرز پر ایک بہت بڑا حمام خانہ بنوایا جس کے گنبد اور کھنڈر وغیرہ آج بھی موجود ہیں۔ ممکن تھا کہ رعایا امورِ سلطنت سے شہنشاہ کی بے توجہی گوارا کر لیتی لیکن ان کے مذہبی جذبات خاص پایۂ تخت کے اندر اسلامی اثرات کی روز افزوں ترقی برداشت نہ کر سکے۔ رعایا میں بے چینی بڑھنے لگی اور خود خاندانِ شاہی کے افراد کسی طرح بھی یہ گوارا نہ کر سکتے تھے کہ قدیم مقدس روایات کے بالکل خلاف شہنشاہِ چین کی دل کی ملکہ کوئی غیر ماینچو عورت بن سکے اور پھر وُہ بھی مسلمان!

چن لنگ کو معلوم تھا کہ رعایا اور خاندانِ شاہی کے افراد سیانگ فی کے تشنۂ خون ہو رہے ہیں لہٰذا اس نے مشکبو حسینہ کی حفاظت کا زبردست انتظام کر دیا تھا اور اس کے محل کے گرد تین ہزار ترک سپاہیوں کا دستہ متعین کیا گیا تھا۔ علاوہ بریں وہ جہاں کہیں بھی جاتا تھا سیانگ کو اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔

اس طرح چھ سال گزر گئے۔ شہنشاہ کی والدہ ملکہ نیو ہولو عرصہ سے موقع کے انتظار میں تھی۔ اتفاق سے کئی سال بعد چین کا وُہ عظیم الشان تیوہار آ گیا جس میں شہنشاہ کو پیکن سے باہر جا کر شاہی مندر میں تین دن تک پُوجا پاٹ کے مراسم انجام دینا تھے۔ سارے ملک میں یہ تقریب بہت دھوم دھام سے منائی جاتی تھی۔ شہنشاہ قوم کے روحانی پیشوا اور دیوتاؤں کے فرزند ہونے کی حیثیت سے شاہی مندر کے ایک حجرہ میں دو دن تک معتکف رہتا تھا۔ اور تیسرے دن تمام عمائدِ سلطنت کی موجودگی میں قربانی کر کے ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے لئے دعا مانگتا تھا۔ بادشاہ اس رسم کو انجام دینے کے لئے مجبور تھا اور اس موقع پر سیانگ فی ایک راسخ الاعتقاد مسلمان عورت کبھی بھی اس کے ساتھ نہیں جا سکتی تھی۔ شہنشاہ چن لنگ اپنی تُرک محبوبہ کی حفاظت کا پُورا انتظام کر کے شاہی مندر چلا گیا۔ ملکہ نیو ہولو کو یہ موقع اچھا مل گیا۔ شہنشاہ کے جاتے ہی اس نے سیانگ فی اور اس کے ساتھ کی تیس چالیس مسلمان عورتوں کو اپنے محل میں طلب کیا۔ چینی روایات کے مطابق ماں کے حکم کی خلاف ورزی غیر ممکن تھی۔ سیانگ فی حاضر ہوئی لیکن اس کے محافظ دستہ کے دِل میں فوراً شبہ پیدا ہو گیا اور کئی تُرک سپاہی شہنشاہ کو اطلاع کرنے کے لئے بھاگے۔

شہنشاہِ چن لنگ کی والدہ نے سیانگ فی کی صُورت دیکھتے ہی حقارت سے پُوچھا "کیا تو مُسلمان ہے؟"

سیانگ فی نے جواب دیا "خدا کا شکر ہے کہ مَیں مسلمان ہوں"

"پھر تُو نے شہنشاہِ چین کے مقدس دیویانی محل میں قدم رکھنے کی جرأت کس طرح کی؟"

"مَیں خود نہیں آئی بلکہ گرفتار کر کے لائی گئی ہوں"۔

والدۂ شہنشاہ نے مشتعل ہو کر کہا "گستاخ مجھ سے زبان لڑاتی ہے۔ تیرا صرف یہی گناہ نہیں کہ تُو نے اپنے ناپاک قدموں سے

صدمہ تو بہت ہوا اور یہ بات اس کے لئے ناقابلِ برداشت تھی کہ اس کا بیٹا جو مذہبی اعتبار سے دیوتاؤں کا فرزند تھا ایک مسلمان عورت کے دامِ محبت میں اس طرح گرفتار ہو، لیکن وہ کر کیا سکتی تھی۔ جانتی تھی کہ چن لنگ ضدی بہت ہے۔ اگر اسے زیادہ مجبور کیا گیا تو وہ اس کی بات نہ مانے گا اور اس طرح اس کے وقار پر ضرب شدید پہنچے گی۔ تاہم عقلمند ملکہ نیوہولو نے محل کی عورتوں کو تسلی دے کر ان سے وعدۂ امداد کیا اور یہ سوچنے لگی کہ کس طریقہ سے شہنشاہِ چین کو سیانگ فی کے دامِ محبت سے نجات دلائی جائے۔

اس دوران میں پیکن کے قریب عکسو کے طرز پر جدید اسلامی شہر بن کر تیار ہو گیا۔ شہنشاہ چن لنگ نے سیانگ فی کو یہ جگہ دکھانے کے لئے شہر پناہ کے قریب ایک بہت بلند منارہ تعمیر کرایا اور سیانگ فی کو نمازِ فجر کے وقت وہاں لے گیا۔ سیانگ فی نے دمکتے ہوئے سپیدۂ سحری کی ہلکی ہلکی روشنی میں ایک نیا حیرت انگیز نظارہ دیکھا۔ ترکی طرز کے مکانات جن میں رنگین فانوسوں کی تیز روشنی ہو رہی تھی۔ مسجدوں کے شاندار گنبد اور منارے ——— یہ خواب ہے یا عالمِ بیداری۔ دفعتہً مؤذن نے چین کی طویل تاریخ میں پہلی مرتبہ پیکن کے مقدس شہر سے اس قدر قریب اذان دی۔ سیانگ فی متحیر ہو کر شہنشاہ کی طرف دیکھنے لگی۔ چن لنگ کے ہونٹوں پر تبسم تھا اور سیانگ فی کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ مؤذن خالص حجازی لہجہ میں اذان دیتا رہا۔ سیانگ فی کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری ہو گئے۔ جس وقت مؤذن کی زبان سے نکلا ——— "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا الرَّسُوْلُ اللہِ ——— "، سیانگ فی ضبط نہ کر سکی اور چیخ مار کر بیہوش ہو گئی۔

دو دن تک سیانگ فی کی حالت بہت خراب رہی اور شہنشاہِ چین کسی وقت بھی اس کے پاس سے نہ ہٹتا تھا۔ اس کے بعد سے سیانگ فی کا معمول ہو گیا کہ وہ تصویرِ حیرت بنی ہوئی اس نئے اسلامی شہر کو دیکھتی رہتی تھی اور ہر وقت اسلامی ماحول میں گھرے رہنے اور شہنشاہِ چین کی مذہبی رواداری کے حیرت انگیز مظاہرے سے اس کی وحشت بہت کچھ کم ہو گئی تھی۔

اس موقع پر عام چینی روایت یہ ہے کہ سیانگ فی شہنشاہِ چین کی تمام نوازشوں کے باوجود اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک اس کی جانب ذرا بھی متوجہ نہیں ہوئی۔ لیکن بعض مؤرخوں کا بیان ہے کہ خود اپنے ہم مذہب سلطان بدخشاں کا یہ شرمناک اور وحشیانہ طرزِ عمل دیکھنے کے بعد کہ اس نے سیانگ فی کو اپنے محل میں قید کر کے اس کی عصمت پر ڈاکہ ڈالنا چاہا اور اس کے شوہر کو پناہ دے کر موت کے گھاٹ اُتار دیا، جب چین کے عظیم الاقتدار شہنشاہ کی یہ حیرت انگیز اولوالعزمی اور رواداری دیکھی کہ وہ سیانگ فی کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرنا نہیں چاہتا، ہر طرح کی قدرت رکھنے کے باوجود ہر وقت اس کی دلجوئی کرتا رہتا ہے، وہ صرف ایشیا کا سب سے بڑا حکمران ہی نہیں بلکہ اپنی رعایا کا مذہبی پیشوا بھی ہے۔ لیکن ایک مسلمان عورت کی مذہبی آزادی اسے اس قدر عزیز ہے کہ اس نے اس کے لئے ایک اسلامی شہر تعمیر کرا دیا ہے، جہاں ترکستان کے ہزاروں باشندوں کو بسا کر چینیوں کے برابر حقوق عطا کئے گئے ہیں اور وہ سیانگ فی کے قدموں پر اپنی سلطنت بھی قربان کر دینا چاہتا ہے تو وہ بہت متاثر ہو کر چن لنگ کے ساتھ شادی کرنے پر آمادہ ہو گئی اور کئی مؤرخوں کا بیان ہے کہ شہنشاہ چن لنگ نے پوشیدہ طریق پر مذہبِ اسلام بھی قبول کر لیا تھا۔

شہنشاہ چن لنگ کو اب ایک منٹ کے لئے بھی سیانگ فی کی مفارقت ناگوار تھی۔ امورِ سلطنت سے وہ بالکل غافل ہو گیا تھا۔ پہلے تو چین کے ماہر اسلامی شہر کی تعمیر ہوئی تھی۔ اب اس نے بصرفِ کثیر قسطنطنیہ سے انجینئر بلا کر خاص اپنے پایۂ تخت میں سیانگ فی کے لئے خاص ترکی طرز پر ایک بہت بڑا حمام خانہ بنوایا جس کے گنبد اور کھنڈر وغیرہ آج بھی موجود ہیں۔ ممکن تھا کہ رعایا امورِ سلطنت سے شہنشاہ کی بے توجہی گوارا کر لیتی لیکن ان کے مذہبی جذبات خاص پایۂ تخت کے اندر اسلامی اثرات کی روز افزوں ترقی برداشت نہ کر سکے۔ رعایا میں بے چینی بڑھنے لگی اور خود خاندانِ شاہی کے افراد کسی طرح بھی یہ گوارا نہ کر سکتے تھے کہ قدیم مقدس روایات کے بالکل خلاف شہنشاہِ چین کی دل کی ملکہ کوئی غیر مانچو عورت بن سکے اور پھر وہ بھی مسلمان!

چن لنگ کو معلوم تھا کہ رعایا اور خاندانِ شاہی کے افراد سیانگ فی کے تشنۂ خون ہو رہے ہیں لہٰذا اس نے مشکبو حسینہ کی حفاظت کا زبردست انتظام کر دیا تھا اور اس کے محل کے گرد تین ہزار ترک سپاہیوں کا دستہ متعین کیا گیا تھا۔ علاوہ بریں وہ جہاں کہیں بھی جاتا تھا سیانگ کو اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔

اس طرح چھ سال گزر گئے۔ شہنشاہ کی والدہ ملکہ نیو ہولو عرصہ سے موقع کے انتظار میں تھی۔ اتفاق سے کئی سال بعد چین کا وہ عظیم الشان تیوہار آ گیا جس میں شہنشاہ کو پیکن سے باہر جا کر شاہی مندر میں تین دن تک پوجا پاٹ کے مراسم انجام دینا تھے۔ سارے ملک میں یہ تقریب بہت دھوم دھام سے منائی جاتی تھی۔ شہنشاہ قوم کے روحانی پیشوا اور دیوتاؤں کے فرزند ہونے کی حیثیت سے شاہی مندر کے ایک حجرہ میں دو دن تک معتکف رہتا تھا۔ اور تیسرے دن تمام عمائدِ سلطنت کی موجودگی میں قربانی کر کے ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے لئے دعا مانگتا تھا۔ بادشاہ اس رسم کو انجام دینے کے لئے مجبور تھا اور اس موقع پر سیانگ فی ایک راسخ الاعتقاد مسلمان عورت کبھی بھی اس کے ساتھ نہیں جا سکتی تھی۔ شہنشاہ چن لنگ اپنی ترک محبوبہ کی حفاظت کا پورا انتظام کر کے شاہی مندر چلا گیا۔ ملکہ نیو ہولو کو یہ موقع اچھا مل گیا۔ شہنشاہ کے جاتے ہی اس نے سیانگ فی اور اس کے ساتھ کی تیس چالیس مسلمان عورتوں کو اپنے محل میں طلب کیا۔ چینی روایات کے مطابق ماں کے حکم کی خلاف ورزی غیر ممکن تھی۔ سیانگ فی حاضر ہوئی لیکن اس کے محافظ دستہ کے دل میں فوراً شبہ پیدا ہو گیا اور کئی ترک سپاہی شہنشاہ کو اطلاع کرنے کے لئے بھاگے۔

شہنشاہ چن لنگ کی والدہ نے سیانگ فی کی صورت دیکھتے ہی حقارت سے پوچھا "کیا تو مسلمان ہے؟"

سیانگ فی نے جواب دیا "خدا کا شکر ہے کہ میں مسلمان ہوں"

"پھر تو نے شہنشاہِ چین کے مقدس دیوپانی محل میں قدم رکھنے کی جرأت کس طرح کی؟"

"میں خود نہیں آئی بلکہ گرفتار کر کے لائی گئی ہوں"۔

والدۂ شہنشاہ نے مشتعل ہو کر کہا "گستاخ مجھ سے زبان لڑاتی ہے۔ تیرا صرف یہی گناہ نہیں کہ تو نے اپنے ناپاک قدموں سے

چین کے مقدس اژدہے کے محل کو نجس کیا بلکہ تُو نے میرے بیٹے پر جادُو کر دیا ہے اور تُو چین کی عظیم الشان سلطنت کو تباہ کرنا چاہتی ہے۔ بتا تیرے پاس ان الزامات کا کیا جواب ہے ؟"

سیانگ فی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر جواب دیا " ملکۂ عالم! میری کوئی خطا نہیں ہے۔ اگر مجھے اجازت دی جائے تو میں آج اپنے وطن جانے کے لئے تیار ہوں "۔

" ہاں تجھے وطن جانے دوں۔ تُو وہاں بیٹھ کر میرے بیٹے پر جادُو کرے گی۔ تو ساحرہ ہے "۔

" میں ساحرہ نہیں ہوں۔ جادُو میرے مذہب میں کفر ہے "۔

" تیری یہ جرأت کہ تُو میری بات کی تردید کرے ——— ؟"

ملکہ نیوہولو نے اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ سیانگ فی کے ساتھ کی مسلمان عورتوں کو برہنہ کر کے پچاس پچاس تازیانے مارے جائیں، اور پھر سیانگ فی سے یہ کہہ کر ——" خبردار اپنے باطل مذہب کا نام میرے سامنے مت لینا ——" اس نے حضرت پیغمبر صاحب کی شان میں گستاخیاں شروع کر دیں۔

سیانگ فی اب ضبط نہ کر سکی، اسلامی غیرت جوش میں آئی۔ ترکی خون رگوں میں کھولنے لگا۔ عشقِ رسول میں سر کٹا دینے کا بے پناہ جذبہ چند روزہ زندگی کی خواہش پر غالب آ گیا۔ سیانگ فی یا تو ملکہ کے سامنے دست بستہ ادب سے سر جھکائے کھڑی تھی یا اس نے ایک مرتبہ بے تاب ہو کر کمر پر ہاتھ ڈالا۔ مگر اس کا خنجر تو پہلے ہی محلسرا کی کنیزوں نے لے لیا تھا —— زخم خوردہ شیرنی کی طرح بپھر کر بولی " چُپ! ملعون کافرہ! اگر میں بانِ خنجر سے تیرے گستاخانہ کلموں کا جواب نہیں دے سکتی تو میرے ہاتھوں میں تیرا گلا گھونٹ دینے کی طاقت ضرور ہے "۔ ملکہ نے خواجہ سراؤں کو حکم دیا کہ دوسرے کمرے میں سیانگ فی کا گلا گھونٹ کر اسی وقت ہلاک کر دیا جائے۔

سیانگ فی کے محافظ دستہ کے سپاہیوں نے جب شہنشاہ کو خبر دی کہ وہ ملکہ نیوہولو کے محل میں طلب کی گئی ہے تو شہنشاہ کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ صدیوں کے رواج کے خلاف وہ اسی طرح مذہبی پوشاک پہنے ہوئے مندر سے باہر نکل آیا۔ اور گھوڑے کو سرپٹ محل کی طرف دوڑایا۔ ادھر ملکہ نیوہولو نے سیانگ فی کے لئے فرمانِ مرگ صادر کیا ادھر ملازموں نے خبر دی کہ شہنشاہ شہر میں داخل ہو گیا —— دیوتاؤں کا فرزند قربانی کئے بغیر مندر سے باہر نکل آیا —— ملکہ نیوہولو نے حکم دیا کہ محل کا پھاٹک بند کر دیا جائے۔ شہنشاہ دیر تک دیوانہ وار چلاتا رہا۔ اس کے بعد پھاٹک کھلا۔ شہنشاہ بحالِ پریشاں اپنی ماں کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا " سیانگ فی کہاں ہے ؟" ملکہ مُنہ سے کچھ نہ بولی۔ ایک کمرہ کی جانب اشارہ کر دیا۔ شہنشاہ دوڑ کر اس کمرہ میں داخل ہوا۔ وہاں سیانگ فی کی لاش پڑی تھی اور اس کے گلے میں اب بھی وہ سفید ریشمی رومال تھا جس کے ذریعہ اس کا گلا گھونٹا گیا تھا۔ شہنشاہ چین اس کی لاش پر بیہوش ہو کر گر پڑا۔ سیانگ فی کا جنازہ اس شان و شوکت کے ساتھ اُٹھایا گیا کہ چین کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اسلامی مراسم کا بہت زیادہ خیال رکھا گیا تھا۔ چین کے مشہور مقدس عالم اور سیانگ فی کے مرشد ماچن سوئی نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور اسے تنگ لنگ کے عالیشان مقبرہ میں دفن کیا گیا جو شہنشاہ نے خود اپنے لئے تعمیر کیا تھا۔ ماں کی عزت چین کی مذہبی روایات میں شامل ہے۔ شہنشاہ ملکہ نیوہولو سے انتقام نہیں لے سکتا تھا لیکن اس غم میں وہ گھُل کر کانٹا ہو گیا۔ چن لنگ، سیانگ فی کے بعد کئی سال تک زندہ رہا لیکن اس نے تمام عمر اپنی ماں کی صُورت نہ دیکھی اور سلطنت کو ٹھکرا کر فقیرانہ زندگی اختیار کر لی۔ اس کا بیشتر وقت یا تو سیانگ فی کے مقبرہ میں گزرتا تھا یا پیکن کے باہر اس اسلامی شہر میں جو اس نے سیانگ فی کے لئے تعمیر کیا تھا۔

" ریاست "

مطبوعات

حقیقتِ جاپان۔ یہ شیخ بدرالاسلام صاحب فضلی بی۔ اے۔ بی ٹی (علیگ) کا سفرنامۂ جاپان ہے جو دو حصّوں میں منقسم ہے۔ حصّۂ اوّل عام سیاحت سے متعلق ہے اور حصّۂ دوم جاپان کے تمدّن و معاشرت وغیرہ کے حالات پر مشتمل ہے۔ پہلے حصّے کا حجم ۶۶ صفحے ہے اور دوسرے حصّے میں سوا دو سَو صفحات ہیں۔ دونوں حصّے نہایت دلچسپ اور مفید معلومات پر مشتمل ہیں۔ کتاب میں بہت سی تصویریں بھی ہیں جنہوں نے اس کو اَور دلچسپ بنا دیا ہے۔ اُردو میں بہت کم سفرنامے اس خوبی سے لکھے گئے ہیں۔ یہ کتاب انجمن ترقّیِ اُردو (ہند) دہلی نے شائع کی ہے (انجمن اب اورنگ آباد دکن سے دہلی آگئی ہے) اور کتاب دہلی ہی کے پتے سے مِل سکتی ہے قیمت مجلّد ؎، غیر مجلّد ؎۔

ریاست۔ یہ افلاطون کی مشہور کتاب کا سلیس اور دلآویز ترجمہ ہے جو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی نے نہایت قابلیت سے کیا ہے۔ اُردو پڑھنے والوں کو انجمن ترقّیِ اُردو (ہند) دہلی کا ممنون ہونا چاہئے کہ اُس نے یہ کتاب شائع کرکے اُردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ کتاب کا حجم ۷۴۰ صفحات ہے اور قیمت مجلّد پانچ روپے ہے۔ کاغذ اور کتابت نہایت نفیس اور جلد خوش وضع اور مضبوط ہے۔ اصل کتاب اس قدر گراں پایہ اور مشہور ہے کہ اس کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

چند ہم عصر۔ اس کتاب میں اپنے معاصرین کے متعلق مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقّیِ اُردو کے ۱۴ مضامین جمع کیے گئے ہیں۔ امیر مینائی، مرزا حیرت، سیّد محمود، مولوی چراغ علی، مولوی محمد عزیز مرزا، سیّد علی بلگرامی، خواجہ غلام الثقلین، حکیم امتیاز الدین، مولانا وحید الدین سلیم، نور خاں، محسن الملک، مولانا محمد علی، گرامی اور حالی اِن مضامین کا موضوع ہیں۔ اس کتاب کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب کتابوں ہی کے نقّاد نہیں انسانوں کے بھی بہترین نقّاد ہیں۔ ان اکابر کے حالات کے سلسلے میں بہت سی دلچسپ اور مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں اور کتاب ختم کیے بغیر چھوڑی نہیں جاتی۔ پتہ: انجمن ترقّیِ اُردو (ہند) دہلی۔

تذکرۂ گلزارِ ابراہیم۔ یہ اُردو شعراء کا ایک نایاب تذکرہ ہے جس کے مؤلّف مرزا علی لطف ہیں۔ قلمی نسخہ اتّفاق سے مہتمم کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن کے ہاتھ لگ گیا جنہوں نے پہلے پہل اس کو شائع کیا۔ یہ کتاب بہت مستند اور قابلِ قدر ہے۔ اصل فارسی کے ساتھ اُردو ترجمہ کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔ یہ تذکرہ اُردو کے ۳۲۰ مشہور اور غیر مشہور شعراء کے حالات اور نمونۂ کلام پر مشتمل ہے اور بہ اعتبارِ حروفِ تہجّی مرتّب کیا گیا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب اور ڈاکٹر محی الدین صاحب زور کے پُر از معلومات دیباچے بھی شامل ہیں۔ حجم ۲۹۶ صفحات۔ قیمت ؎۔ جلد، کاغذ، کتابت اور طباعت بہت اچھی ہے۔ پتہ:

انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) دہلی ؂

ترانۂ وطن ۔حضرتِ صدق جائسی نے سترہ بیت پر مشتمل حیدرآباد کا ایک قومی ترانہ لکھا ہے۔ زبان سادہ اور سلیس ہے جس میں دکنیوں کو بہت خوبی سے اتحاد، حبِّ وطن اور وفاداری کی تعلیم دی گئی ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

ہم ایک دیس والے ہم ایک بھیس والے ۔ ایک آبرو ہماری ایک آسرا ہمارا

اصل ایک ہی ہے، شاخیں دَیر و حرم ہیں اس کی ۔ دونوں سے آشنا ہے ذوقِ دُعا ہمارا

راہِ وفا ہے ٹیڑھی ثابت قدم رہیں ہم ۔ مالک سے سُرخرو ہو جوشِ وفا ہمارا

قیمت ا/ ۔ پتہ:۔ مسعود دکن پریس۔ کالی کمان۔ گلزار حوض۔ حیدرآباد (دکن)۔

کارنامۂ غم ۔ مولانا احسن مارہروی نے ۵۶ صفحے کا یہ ماتمی رسالہ شہادتِ سیّد الشہداء کی یاد میں شائع فرمایا ہے۔ اس میں رُباعیاں، خمسے اور سلام جمع کیے گئے ہیں۔ مولانا احسن مارہروی کی قابلیت تعارف کی محتاج نہیں۔ جو کچھ لکھا ہے، خوب لکھا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:۔

وُہ ذات جو ہر ذات سے بالذّات سوا ہے ۔ افسوس وہی مورِدِ صد کرب و بلا ہے

تھے راکبِ دوشِ نبویؐ شبّر و شبّیر ۔ یہ رتبۂ معراج نما کس کو مِلا ہے

شہیدِ معرکۂ کربلا سلام علیک ۔ امام و پیشرو اتقیا سلام علیک

تو بیست کعبۂ مقصود ما سلام علیک ۔ مقربِ حرمِ کبریا سلام علیک

سوارِ دوشِ رسُولِ خدا سلام علیک

آنکھیں غمِ شبّیر میں تر ہیں دونوں ۔ ہم پہلو ہے درد، دل جگر ہیں دونوں

عاشورہ و چہلم کی عزاداری سے ۔ یک رنگ محرم و صفر ہیں دونوں

قیمت فی جلد ۸/ ۔ پتہ: حضرتِ احسن مارہروی۔ مارہرہ، ضلع ایٹہ (یو پی)

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

یادگارِ علامہ فضیلت آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہ اپریل ۱۹۲۹ء

تصویر:- قیدی

شمار	مضمون	صاحبِ مضمون	صفحہ
۱	بزمِ "ہمایوں"	حامد علی خاں	۲۵۲
۲	جہاں نما	" "	۲۵۳
۳	فروغِ جادہ (نظم)	" "	۲۵۸
۴	اقبال کے چند بنیادی تصورات	جناب خواجہ عبد السمیع صاحب پال اختر صبائی ایم اے ایل ایل بی	۲۵۹
۵	تہذیب (نظم)	سید مقبول حسین احمد پوری بی اے ایل ایل بی	۲۶۸
۶	خونی ناچ (افسانہ)	مسٹر کرشن چندر ایم اے ایل ایل بی	۲۶۹
۷	تتلیاں	حامد علی خاں	۲۷۲
۸	ہندوستان کی قومی زبان	جناب محمد فاضل صاحب	۲۷۷
۹	اُردو (نظم)	حضرتِ کشفی ملتانی	۲۸۵
۱۰	جوار بھاٹا (ڈراما)	جنابِ شیر محمد صاحب اختر	۲۸۶
۱۱	غزل	حضرتِ فانی بدایونی	۲۹۳
۱۲	فردوسی کا شاہنامہ	مولانا مہر محمد خاں شہاب	۲۹۶
۱۳	غزل	جنابِ معین احسن جذبی	۳۰۱
۱۴	سٹریٹ فورڈ کا غنڈہ (ڈراما)	حضرتِ افضل	۳۰۲
۱۵	بہار (نظم)	حامد علی خاں	۳۰۵
۱۶	مصر کا ایک ٹھگ (افسانہ)	پروفیسر نند کشور صاحب جھنگن ایم اے	۳۱۰
۱۷	سوال (نظم)	"میرا جی"	۳۱۵
۱۸	محفلِ ادب		۳۱۶
۱۹	مطبوعات		۳۲۳

چندہ سالانہ ۵ر ششماہی ۳ر (مع محصول) قیمت فی پرچہ ۸ر

بزمِ ہمایوں

مدیرِ "ہمایوں" کی توجہ دلی مصروفیتوں نے آج پھر مجھے اس صفحے کی طرف لوٹا دیا ہے۔ مدتیں گذریں اس صفحہ سے میری کچھ کاروباری انداز کی شناسائی تھی لیکن اب ایک طویل جدائی کے بعد اتنی اجنبیت پیدا ہوگئی ہے کہ یہاں آکر کوشش کے باوجود بھی قلم میں جنبش پیدا نہیں ہوتی، اور پھر کوئی آپ سے باتیں بھی کیا کرے آپ سنتے تھوڑا ہی ہیں!

بزمِ ہمایوں" میں اب عموماً اُردو کا تذکرہ رہتا ہے۔ میں اردو کے متعلق آپ کو کیا نئی خبر سناؤں۔ اتحاد پسند ہندوؤں اور مسلمانوں کی متفقہ چیخ پکار اور نالہ و فریاد کے باوجود اُردو کا "حقہ پانی بند" کرنے کی مہم برابر جاری ہے۔ فرقہ پرستوں اور مذہبی تعصب کے علمبرداروں کا تو ذکر ہی کیا ہے، خود کانگریسی عمائد کی مدد سے بڑھی ہوئی سنسکرت نوازی میں بھی ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ چنانچہ تریپوری کانگریس کی تقریروں میں جو "ہندوستانی" استعمال کی گئی وہ بھی "اتھوا" قسم ہی کی تھی۔

مغربی اقتدار نے ہندوستان میں ابتدا سے "پھوٹ ڈال اور حکومت کر" کے جس سنہرے اُصول پر عمل شروع کیا تھا، در اصل اب وہ رنگ لا رہا ہے۔ صدیوں کے اتحاد اور اشتراکِ عمل سے ہندوؤں اور مسلمانوں نے جو متحدہ تہذیب و تمدن پیدا کیا تھا غیر ملکی حاکموں کے مصالح نے اُسے ہمارے ہی ہاتھوں ملیامیٹ کرا دینا ضروری سمجھا۔ اسی سلسلے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ قومی زبان (اُردو یا ہندوستانی) پر ہاتھ صاف کرنے کا تیر بہدف نسخہ بھی تجویز ہوا۔ ہندوؤں کو اطلاع دی گئی کہ تمہاری قومی زبان سنسکرت ہے۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو اس کا گڑا مُردہ اکھاڑو اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر صدیوں کے زمانے کی طرف ایک اُلٹی زقند لگاؤ، خدا تمہارا بیڑا پار لگائے گا۔

پھوٹ کا یہ بیج خوب پھلا پھولا۔ فرقہ پرست یا دھرم سیوک ہندوؤں نے اُردو زبان سے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد سے پیدا ہوئی تھی اور اُن کو روز بروز ایک دوسرے کے قریب تر لا رہی تھی، بے اعتنائی برتنی شروع کردی۔ سنسکرت کی مدد سے ایک نئی زبان ہندی کے نام سے وضع کی گئی اور ہندوؤں سے کہا گیا کہ تم اور ہو، مسلمان اور ہیں اور تمہاری زبان یہ ہے۔ اب سر تیج بہادر سپرو، پنڈت جواہر لعل نہرو، علامہ کیفی دتاتریا اور ڈاکٹر بھگوان داس جیسے مقتدر اکابر کی توبرتو فہمائشوں کے باوجود بھی ہمارے اتھوائی بھائی کسی طرح بدیشی جادوگر کا پڑھایا ہوا سبق نہیں بھولتے اور قومی اتحاد کی جڑ پر اندھا دھند بھن بھن کلہاڑے چلائے جا رہے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ بعض مہارشی یہ بھول کر کہ مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی ہے اس فریب میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ قرآن اُردو زبان میں نازل ہوا تھا اور اُردو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ لہٰذا اُردو کو دور ہی سے سلام!

اُردو کی حالت بڑی قابلِ رحم ہے۔ اُردو والے اخوت اور اتحاد کا ہاتھ آگے بڑھاتے ہیں لیکن اُن کے بھائی حقارت سے اتھوا اتھوا کرتے ہوئے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیتے ہیں۔ خون کے یوں سفید ہو جانے میں اگرچہ "حکمراں کی ساحری" کا دخل بھی ہے لیکن اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ اُردو والے عموماً مفلس، غیر منظم اور کمزور ہیں۔ کنگال کی بات کون پوچھتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ عام ہندوستانیوں کے مقابلے میں اب بھی اتھوا ہندوستانیوں کی تعداد کچھ بہت زیادہ نہیں لیکن اوّل تو وہ بڑے مالدار اور منظم ہیں۔ دوسرے انہیں عام ہندو بھائیوں میں غلط قسم کے مذہبی تعصبات پیدا کرنے کا فن بھی حاصل ہے اور یوں وہ اہلِ ملک کی کثرت پر ڈورے ڈال کر اپنا اُلّو سیدھا کر سکتے ہیں۔

لیکن آخر یہ اتھوائی ہوئی ذہنیت کیونکر بدلی جا سکتی ہے؟

اُردو والے ہندو اور مسلمان اگر اُردو کو زندہ رکھنا اپنے ملک کے لئے مفید سمجھتے ہیں اور انہیں یہ اندازہ ہے کہ ایک متحدہ قومیت کی تشکیل کے لئے یہ زبان کتنی ناگزیر ہے تو محض باتوں سے یا رونے جھینکنے سے کچھ نہ ہوگا۔ کامیابی کے لئے ایثار کی ضرورت ہے، تنظیم کی ضرورت ہے اور قوت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر ہم بالکل نہتے ہو چکے ہیں اور ہیچ رہیں گے۔ طاقتور کو کیا ضرورت ہے کہ ناتواں سے بات کرنے کے ذریعہ کو برقرار رکھنے کی کوشش کرے یا اُسے بلا ضرورت برقرار رہنے دے۔

قوت پیدا کرو۔ تمہاری زبان خود بخود قومی ہو جائے گی۔

حامد علی خاں

جہاں نما

پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو

حال ہی میں لندن سے ایک انگریزی کتاب "ہندوستان کی موجودہ حالت"[1] کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے صفحہ ۱۲۶ پر حسب ذیل عبارت نظر آتی ہے:۔

"انگریزی حکومت کے ابتدائی زمانے میں جیسی ایک مفتوح حاکم قوم سے توقع ہو سکتی ہے، مسلمانوں کو انگریزوں سے خاص عناد تھا۔ ۱۸۲۱ء کے "ایشیاٹک جرنل" میں "کرناٹکس" کے نام سے ایک مضمون نگار نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہندوستان میں ہماری حکومت کا عمل (Divide et impera) "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے نعرے پر ہونا چاہیے۔ یہی خیال لفٹننٹ کرنل جان کوک نے جو مراد آباد کا کمانڈر تھا ظاہر کیا ہے۔ کوک کا قول ہے کہ ہمیں لازم ہے کہ مختلف قوموں اور مذاہب کے درمیان جو علیحدگی ہے اسے پوری طرح قائم رکھیں اور انہیں ایک دوسرے میں ضم کرنے کی کوشش نہ کریں۔ وہ اور لفٹننٹ دونوں ۲ مئی ۱۸۵۸ء کی ایک یادداشت میں "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے مقولے پر اتفاق کرتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز ہندوؤں کی پیٹھ ٹھونکنے میں اپنا فائدہ دیکھتا تھا۔ ۱۸۴۳ء میں لارڈ ایلن برا لکھتا ہے: "میں اس حقیقت کی طرف سے اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتا کہ یہ قوم (مسلمان) فطری طور پر ہماری مخالف ہے۔ اس لئے ہماری صحیح حکمتِ عملی یہ ہونی چاہیے کہ ہم ہندوؤں کو خوش کریں۔" اس کے بعد سومنات کے مندر کے دروازے کھولنے کے سلسلہ میں وہ پھر کہتا ہے: "بخلاف اس کے ہندو خوش ہیں۔ مجھے یہ سخت نادانی معلوم ہوتی ہے کہ جب ہمیں آبادی کے ۱/۱۰ حصے کی دشمنی کا پورا یقین ہے تو ہم آبادی کی ۹/۱۰[2] اکثریت کو خوش کر کے اس کی امداد و حمایت حاصل نہ کریں۔"

اس موقع پر میجر بی۔ ڈی۔ باسو کی کتاب "ہندوستان میں عیسائی حکومت کا استحکام"[3] سے ذیل کے اقتباس کا اندراج بے محل نہ ہوگا۔

"کابل اور غزنین کی تسخیر کے بعد ۴ر اکتوبر ۱۸۴۲ء کو لارڈ ایلن برا شملہ سے ڈیوک آف ویلنگٹن کو لکھتا ہے: "مسلمان کابل کی مہم میں ہماری ناکامی کا جتنا خواہشمند تھا اس کا اندازہ مجھے اس وقت تک نہ ہوا جب تک کہ مجھے یہاں بعض ایسے حالات معلوم نہ ہوئے جن سے واضح ہوتا ہے کہ یہ جذبات اُن لوگوں کے دلوں میں بھی موجزن تھے جن کا مفاد قطعی طور پر ہمیں سے وابستہ ہے۔ اس کے برعکس ہندو خوش ہیں"

---

[1] The Present Condition of India by Leonard M. Schiff

[2] ہندوستان کے جن حصّوں پر اُن دنوں انگریز قابض تھے اُن میں آبادی کا یہی تناسب تھا۔

[3] The Consolidation of Christian Power in India by B.D. Basu (1927) P.P. 35-36

باسو کی اسی کتاب کے ۴۷-۵ صفحات پر ذیل کی عبارت نظر آتی ہے :-

" اگرچہ اُن دنوں انگریزی حکومت کی حکمتِ عملی اسی قسم کی تھی لیکن وُہ علانیہ طور پر اس کا اظہار نہ کرتی تھی۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے یہ پردہ بھی اُٹھا دیا اور متعدد انگریز افسروں نے ایسے خیالات کا اظہار علانیہ طور پر کیا۔ اُن دنوں صرف غیر ذمہ دار انگریز اخبار نویس ہی ایک قوم کو دوسری قوم کے خلاف، ایک مذہب کو دُوسرے مذہب کے خلاف اور ایک فرقے کو دوسرے فرقے کے خلاف اُبھارنے کی تبلیغ نہیں کر رہے تھے بلکہ لیفٹننٹ کرنل کوک جیسے ذمہ دار افسر بھی ایسے ہی خیالات کی اشاعت میں مصروف تھے۔"

کوک کے جن خیالات کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے اُن کے متعلق ایک اقتباس ہم اُوپر درج کر چکے ہیں۔

انگلستان کے لئے یہ حکمتِ عملی اب تک مفید ثابت ہوتی رہی ہے۔ ہندوستان اور انگلستان کے آئندہ تعلقات پر اس حکمتِ عملی کا کیا اثر پڑے گا؟ اس کا جواب مستقبل دے گا۔ البتہ اہلِ ہندوستان کو ضرور یہ غور کرنا چاہئے کہ اُن کے لئے اس باب میں انگریزی حکومت کا آلۂ کار بنا رہنا کب تک اور کہاں تک مفید ہے؟

جھگڑے کے دیس میں رولز رائس طرزِ حکومت

ہندوستان کا افلاس ضرب المثل کی طرح مشہور ہے لیکن یہاں کی حکومت کے عہدہ داروں کی تنخواہیں اتنی بیش قرار ہیں کہ دُنیا میں کہیں اُن کی مثال نہیں مِل سکتی۔ ہندوستانی افسروں کی تنخواہوں کے مقابلے کے لئے پہلے ایک ایشیائی ملک جاپان کو لیجئے :-

جاپان کے وزیرِ اعظم کی تنخواہ ۶۲۲ روپے ماہوار ہے۔ لیکن ہندوستان کے غیر کانگریسی صوبوں کے وزرائے اعظم کی تنخواہیں تین ہزار سے چار ہزار روپے ماہوار تک ہیں۔ کانگریسی وزرا نے اپنے لئے رضاکارانہ طور پر کچھ کم تنخواہیں مقرر کی ہیں۔

وزیرِ اعظم کے علاوہ دوسرے جاپانی وزرا کی تنخواہ کا معیار ۴۴۰ روپے اور سکرٹریوں کا ۳۷۵ روپے ماہانہ ہے۔ ہندوستان میں اوڑیسہ کا چیف سکرٹری ۲۱۵۰ روپے اور بنگال کا چیف سکرٹری ۳۳۳۵ روپے ماہوار لیتا ہے۔

کوریا (جاپان) کے گورنر جنرل کو ۴۴۰ روپے ماہوار ملتے ہیں، اور پنجاب کے گورنر کی تنخواہ ۸۳۳۳ روپے ماہوار ہے۔ ایک جاپانی اعلےٰ عہدہ دار کی تنخواہ ۳۴۴ روپے تک ہو سکتی ہے لیکن بمبئی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ۱۱۵۰ روپے ماہوار ملتے ہیں۔۔۔ جاپان کی شہنشاہانہ اقتدار پسندی کے خلاف بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن جہاں تک تحقیق ہوئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں رشوت اور بدعملی کا بازار کسی دوسری جگہ سے زیادہ گرم نہیں۔

اب یورپی ممالک کی مثالیں لیجئے۔ پولینڈ ہندوستان کے صوبۂ بہار سے بہت زیادہ مال دار ہے اور اس کی آبادی نسبتہً کم ہے۔

لیکن پولینڈ کے صدر جمہوریہ کی ماہوار تنخواہ ۱۵۶۰ روپے مقرر ہے اور بہار کا گورنر ۵۳۳۳ روپے ماہوار تنخواہ وصول کرتا ہے۔ ہندوستان میں تو بعض ڈپٹی کمشنر بھی صدر جمہوریہ پولینڈ سے زیادہ تنخواہیں لیتے ہیں۔ پولینڈ میں کُل تیرہ افسر ایسے ہیں جنہیں ایک ہزار روپے ماہوار سے زیادہ تنخواہ ملتی ہے لیکن بہار میں ایسے افسروں کی تعداد جنہیں ایک ہزار سے زیادہ تنخواہ ملتی ہے ۱۵۶ ہے۔

اب امریکا کو لیجئے۔ دولت مندی میں امریکا سے ہندوستان کی کوئی نسبت ہی نہیں۔ ہندوستان کے مقابلہ میں امریکا کی آمدنی فی کس ۲۲ گُنا سے بھی زیادہ ہے اور معیارِ زیست بے انتہا بلند ہے۔ اگر افسروں کی تنخواہیں عوام کی آمدنی کے تناسب سے مقرر کی جائیں تو ہندوستانی افسروں کی تنخواہیں امریکائی افسروں کی تنخواہوں کا تقریباً ۱/۲۲ واں حصہ مقرر ہونی چاہئیں۔ حالت یہ ہے کہ امریکا کے تربیت یافتہ مزدور ۳۶-۱۹۳۵ء کے اعداد و شمار کے مطابق تین سو سے چار سو پچاس روپے ماہوار تک تنخواہ طلب کر سکتے ہیں۔ ممالکِ متحدہ امریکا کی آبادی ہندوستان سے کم ہے لیکن آمدنی دس گُنا زیادہ ہے۔ صدر جمہوریہ امریکا جیسی عظیم الشان شخصیت کا مقابلہ وائسرائے ہند سے بے جا ہوگا۔ صدر امریکا کا مشاہرہ ۱۷۰۶۲ روپے ہے لیکن ہندوستان کے وائسرائے کا درماہہ ۲۱۳۳۳ روپے ہے۔ امریکا کے ایک وزیر کابینہ کا ماہانہ ۳۴۱۲ روپے ہوتا ہے لیکن وائسرائے کی کونسل کے ممبر ۶۶۶۷ روپے ماہوار لیتے ہیں۔

نیویارک کی ریاست کے گورنر کی تنخواہ ۵۶۸۷ روپے کے برابر ہے۔ لیکن صوبہ متوسط (سندھ) کا گورنر ۱۰۰۰۰ روپے لیتا ہے۔ جنوبی ڈاکوٹا کے گورنر کو ۶۲۲ روپے ملتے ہیں لیکن دہلی کا چیف کمشنر ۳۰۰۰ روپے ماہوار لیتا ہے۔ امریکا میں چیف جسٹس کی تنخواہ ۴۵۵۰ روپے ہوتی ہے لیکن بنگال کے چیف جسٹس کے ۶۰۰۰ روپے ماہوار مقرر ہیں۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی مدِنظر رکھنی چاہئے کہ ہندوستان کے وائسرائے کو تنخواہ کے علاوہ اور بھی بہت سے وظائف اور الاؤنس ملتے ہیں۔

اب انگلستان کو لیجئے۔ ہندوستان اور انگلستان کی آبادی میں علی الترتیب ۱۰۰ اور ۱۲ کی نسبت ہے لیکن ہندوستان کی ۳۷-۱۹۳۶ء کی آمدنی کے مقابلے میں انگلستان کی آمدنی، ۱۳ فیصدی زیادہ ہے۔ اب یہ طرفہ تماشا دیکھئے کہ وزیرِ اعظم انگلستان کی تنخواہ وائسرائے سے آدھی ہے۔ وائسرائے ہندوستان کی آمدنی کے ہر ہزار روپے میں سے ایک روپیہ لیتا ہے۔ لیکن انگلستان کا وزیرِ اعظم ہر سو ہزار (یعنی لاکھ) روپے میں سے ایک روپیہ لیتا ہے۔ گویا ملک کی آمدنی کے لحاظ سے وائسرائے کی تنخواہ وزیرِ اعظم انگلستان سے دس گُنا زیادہ ہے۔

ایک برطانی سول افسر کی زیادہ سے زیادہ تنخواہ ۳۳۳۳ روپے ہوتی ہے (لیکن اتنی تنخواہ بہت کم لوگوں کو ملتی ہے) اکثر افسر ۷۷۷ سے ۱۰۰۰ روپے ماہوار تک پر مطمئن ہوتے ہیں۔ وزرائے کابینہ کی ماہانہ تنخواہ ۵۵۵۵ روپے ہوتی ہے۔ اس کا مقابلہ ہندوستان کی تنخواہوں سے کیجئے جن میں سے بعض کے متعلق اُوپر اعداد و شمار فراہم کئے گئے ہیں۔

دراصل انگریزوں نے ابتدا میں ہندوستان کے انگریز افسروں کو زیادہ سے زیادہ جلبِ زر کا موقع دینے کے لئے تنخواہوں کے

یہ معیار مقرر کئے تھے۔ اب ان عہدوں پر پچاس فیصدی ہندوستانی آئی۔سی۔ایس والے قابض ہو گئے ہیں۔ لیکن جب تک ہندوستان میں برطانی شہنشاہیت کا اقتدار ہے، غالباً عوام کے روپے کے اس مُسرفانہ استعمال پر کوئی پابندی عائد نہ کی جائے گی۔

ہندوستان میں کتابوں پر ڈاک کا محصُول

آزاد اَور مہذب ممالک میں یہ دستور ہے کہ عوام پر تعلیم حاصل کرنے کے ذرائع آسان سے آسان تر کئے جاتے ہیں۔ ہندوستان کی حالت قدرتًا اس کے برعکس ہے۔ یہاں کتابوں کا محصُول اب پہلے سے بھی زیادہ ہوگیا ہے۔ آج سے پچیس سال پہلے کتابوں کا قیمت طلب پارسل رجسٹری کئے بغیر بھیجا جاسکتا تھا اور ڈاک کا عام محصُول بھی کم تھا۔ اب یہ قاعدہ بن چکا ہے کہ کوئی وی۔پی پارسل رجسٹرڈ ہوئے بغیر نہیں جاسکتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اب ایک آنے کی کتاب بھی وی۔پی کے ذریعہ سے منگائے تو اسے رجسٹری اور ڈاک کا خرچ تقریبًا ساڑھے تین آنے اور اس کے علاوہ دو آنے منی آرڈر کی فیس ادا کرنی پڑتی ہے۔ گویا ایک آنے کی کتاب قیمت طلب پارسل کے ذریعہ سے ساڑھے چھ آنے میں پڑتی ہے۔ یہ طریقہ علم وفضل کی اشاعت میں جس قدر ممد ومعاون ہے ظاہر ہے۔ لیکن ہندوستان کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ یہاں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے، کوئی کس کس بات کی شکایت کرے۔

حال ہی میں پریزیڈنٹ رُوزولٹ نے اپنے ایک اعلان سے امریکا میں کتابوں کا محصُول بہت گھٹا دیا ہے۔ یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ امریکا ہندوستان کے مقابلے میں بے انتہا دولت مند ہے۔ لیکن اس کے باوجود کتابوں پر ڈیڑھ سینٹ فی پاؤنڈ (۴۰ تولہ) کے حساب سے محصُول عاید کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ۴۰ تولے وزنی کتاب یا کتابوں پر صرف تین پیسے محصُول لگتا ہے۔ یہ محصول اس لئے کم کیا گیا ہے کہ لوگوں کو علم کے ذرائع تک پہنچنے میں سہولت حاصل ہو۔ امریکا میں سو فیصدی آدمی تعلیم یافتہ ہیں۔ اس کی دولتمندی کا کوئی اندازہ نہیں۔ لیکن وہاں عوام کی تعلیمی سہولت کا اس قدر خیال رکھا گیا ہے کہ یہ محصُول وہاں کے حالات کے مطابق محض برائے نام ہے۔ بلکہ ہندوستان میں اگرچہ ۹۰ فیصدی لوگ اَن پڑھ ہیں، لیکن یہاں کتابوں کے محصُول کی شرح یہ ہے کہ پہلے پانچ تولوں یا اس سے کم پر تین پیسے اَور اس کے بعد ہر دُوسرے پانچ تولوں (یا اُن کے کسی حصّے پر) دو پیسے کے حساب سے ٹکٹ لگتے ہیں۔ رجسٹری اور منی آرڈر کے خرچ کے علاوہ ہندوستان میں ایک پاؤنڈ (۴۰ تولہ) وزنی کتابوں پر سوا چار آنے محصُول ادا کرنا پڑتا ہے حالانکہ متموّل امریکا میں اسی وزن کی کتابوں کا محصُول تین پیسے ہوگا۔

یہ ہیں ایک غریب ملک میں "امیر" حکومت کی برکتیں!

ہندوستانی مال برطانیہ میں اور برطانی مال ہندوستان میں

گزشتہ دنوں مسٹر ہربرٹ ولیمز نے پارلیمنٹ کو اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ چند سال سے انگلستان میں ہندوستان کے بنے ہوئے مال کی درآمد بڑھ رہی ہے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر مسٹر ولیمز نے پارلیمنٹ سے درخواست کی کہ وُہ اس بات کا یقین دلائے کہ قوانینِ تجارت میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کردی جائے گی کہ انگلستان میں ایسی ہندوستانی مصنوعات کی درآمد پر مناسب پابندیاں عاید ہوجائیں جن میں ہندوستان اور انگلستان کے تجارتی مقابلے کا امکان ہو۔

بورڈ آف ٹریڈ کے پارلیمنٹری سکرٹری مسٹر رونالڈ کراس نے اس درخواست کے جواب میں مسٹر ولیمز کو یقین دلایا کہ کوئی فیصلہ کرتے وقت اس مسئلہ کو زیرِ نظر رکھا جائے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کیا ہندوستان میں برطانیہ کے کسی قسم کے مال کی درآمد پر بھی کوئی پابندی عائد ہے یا ہوسکتی ہے یا اس کے متعلق کوئی دُور کا امکان بھی موجود ہے؟ اس کے علاوہ کیا کوئی ایسا قانون بھی بن سکتا ہے کہ برطانی اور غیر ملکی باشندے ہندوستان میں کارخانے قائم نہ کرسکیں؟ کیا ہندوستان کی مقابلۃً نوآموز اور کم سرمائے والی تجارت بیرونی مہارت، تجربہ اور عظیم الشان سرمائے کا مقابلہ کرسکے گی؟

علمِ کیمیا اور تہذیب کا مستقبل

پروفیسر ہیرلڈسی اُرے نے جو نوبل پرائز حاصل کرچکے ہیں، اوماوا میں تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ کیمسٹری تہذیب کو فنا کردینے پر بھی قادر ہوسکتی ہے اور بنی نوعِ انسان کو ایسے بیش بہا فوائد بھی پہنچا سکتی ہے جن کا انسان کو اب تک وہم و گمان بھی نہیں۔ اس کے بعد اُنہوں نے اہلِ جلس کو اس بات کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی کہ علمِ کیمیا کا استعمال اس طریق سے ہونا چاہئے کہ اس کا نتیجہ انسان کی فلاح و بہبود ہو۔ اُنھوں نے سائنس دانوں کو اِنتباہ کرتے ہوئے کہا کہ "کیمسٹری ہماری یورپین تہذیب کو تباہ کرسکتی ہے اور شاید تباہ کردے گی میرے خیال میں یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہیں کہ اس کے ذریعہ سے ہماری تہذیب قطعاً نیست و نابود بھی ہوسکتی ہے۔

پان

انڈین میڈیکل جرنل میں پان کھانے کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں پان کھانے کی عادت کو غذائی نقطۂ نظر سے سراہاگیا ہے اور لکھا ہے کہ پان کے پتوں میں کیروٹین اور کیلسیم کے اجزا کی کثرت ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ پان میں کیلسیم کے اجزا دُودھ سے بھی ذیادہ بتائے گئے ہیں۔ پان میں چونا لگانے کی رسم بھی مفید بتائی گئی ہے اور لکھا ہے کہ چونا کیلسیم کو جزوِ بدن بننے میں مدد دیتا ہے کیونکہ یہ پان کے معدے میں جانے سے پہلے اس کے تمام آگزیلک ایسڈ کا رسُوب بنادیتا ہے۔

فروغِ جادہ

جہاں تیری طرف صبحِ ازل سے جادہ پیما ہے
کہ ہر ذرّہ تری طلعت کے پرتو کو ترستا ہے

مری حیرت کا ساماں کرنے والے یہ غضب کیا ہے
نظر پڑتی ہے جس شئے پر طلسمِ حیرت افزا ہے

تصوّر تک نہیں ہے نیستی کا قلبِ ہستی میں
عدم بھی اِس کا خاکا اک جہانِ منتظر کا ہے

بحسبِ ظرف ہے ذوقِ نظر گلزارِ ہستی میں
یہاں بلبل نے گُل کو اور ہم نے تجھ کو دیکھا ہے

ہے پیدائی تری آئینہ تیرے دِل کی حالت کا
کہ ہر ذرّے کے دل میں اِک جہانِ ناشکیبا ہے

مری سُوکھی ہوئی کھیتی پہ نیسانِ کرم تیرا
برستا ہے تو ابرِ گوہریں بن کر برستا ہے

عدم کے اس طرف کیا کام دردِ نا اُمیدی کا
قنُوطا اے نکتہ چیں اک غمزۂ اُمید پیجا ہے

نہیں ہے راہ رو کو شکوۂ دُشواریٔ منزل
یہاں ہر ہر قدم پر صاف نقشِ جادہ پیدا ہے

فسونِ قُم بِاِذنی پھونکتا ہے ہر نفس تجھ پر
حیاتِ خود نگر بیگانۂ نازِ مسیحا ہے

حامد علی خاں

اقبال کے چند بنیادی تصوّرات

(اس مضمون میں تقریباً تمام اقتباسات علامۂ مرحوم کی ہنگامہ خیز تصنیف "جاوید نامہ" سے لئے گئے ہیں۔ اس لئے جاوید نامہ کے متعلق چند تصریحی الفاظ ضروری ہیں۔ "جاوید نامہ" میں اقبال حضرت پیرِ رومی کی رہنمائی میں تمام افلاک کی سیر کرتا ہے۔ اور مختلف افلاک پر مختلف ارواح جلیلہ سے ملاقات کرتا ہے۔ انہیں ملاقاتوں میں اقبال زندگی اور کائنات کے متعلق اِن ارواح جلیلہ سے سوالات پوچھتا ہے اور ان سے اپنے سوالات کا حل چاہتا ہے۔)

آثر صہبائی

اقبال کی شاعری ایک بحرِ زخار ہے اور اس کی چھوٹی بڑی موجیں بے شمار ہیں۔ اقبال کہیں تو ایک مناظر پرست شاعر ہے کہیں سیاسیات میں زندگی کی رُوح پھُونک رہا ہے۔ کہیں مادرِ وطن کی بے بسی پر خُون کے آنسو رو رہا ہے۔ کہیں اسلامی دُنیا اس کے تمام تخیلات اور جذبات کا مرکز بنی ہوئی ہے اور لوگ اسے "شاعرِ اسلام" کے لقب سے پکار اٹھتے ہیں۔ لیکن ان تمام مقامات اور منازل سے آگے اور ان سے کہیں زیادہ عالمگیر اور بلند وہ مقام اور منزل ہے جہاں وُہ ایک خالص شاعر اور مفکر کی طرح خدا اور انسان کے تعلقات پر غور کرتا ہے۔ اس زندگی کے ارتقا کا مطالعہ کرتا ہے جو کائنات کے پیکر میں ایک بے قرار موج کی طرح تڑپ رہی ہے۔ انسانیت کے بلند ترین مدارج اور مقامات کی جستجو میں سرگرداں رہتا ہے۔ اور انسان اور دُنیا کو ایک نہایت ہی ولولہ انگیز اور حیات بخش پیغام سُناتا ہے۔ ذیل کی سطور میں اقبال کی شاعری کے اسی پہلو کے چند بنیادی تصورات پیش کیے جاتے ہیں:-

برہما اور مایا، خدا اور دُنیا اور حقیقت اور مجاز کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ ابتدائے آفرینش سے یہ سوال انسانی غور و فکر کا مرکز بنا ہوا ہے لیکن آج تک اس کا خاطر خواہ حل نہیں ہو سکا۔ وحدت سے کثرت کیونکر نمودار ہوئی؟ خدا یعنی خالص حق اور نیکی سے آدم اور شیطان کیونکر وجود میں آ گئے؟ کسی نے کہا کہ خدا عین اسی طرح جذبۂ تخلیق سے مغلوب ہُوا جس طرح خود انسان مغلوب ہو جاتا ہے اور یہ دُنیا معرضِ ظہور میں آئی، کسی نے کہا کہ خدا تنہا تھا، تنہائی سے گھبرا کر اپنا دِل بہلانے کے لئے مخلوقات کا تماشا کھڑا کر دیا، کسی نے کہا کہ خدا نے انسان کو اپنی صُورت پر پیدا کیا اور دوسرے نے کہا کہ شاید انسان نے خدا کو اپنی صُورت پر پیدا کیا ہے۔ غرض جتنے مُنہ اتنی باتیں اور جتنے دماغ اتنے نظریے، بات جہاں تھی وہیں رہی۔ اقبال نے بھی اس مسئلہ پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ خدا سے وُہ یہی سوال پوچھتا ہے اور خدا کی زبانی اس کا جواب یوں پیش کرتا ہے:-

کلکِ حق از نقشہائے خوب و زشت ہرچہ ما را ساز گار آمد نوشت

آفریدن؛ جستجوئے دلبرے وانمودن خویش را بر دیگرے

یہ بھی کوئی تسلی بخش جواب نہیں اور چونکہ اس کا تسلی بخش جواب آج تک کسی سے بن نہیں آیا اس لئے اگر اقبال بھی اس کا قطعی اور مسکت جواب دینے سے قاصر رہا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

برہما اور مایا، خدا اور مخلوقات کی گتھی کو جہاں ہے وہیں رہنے دیجئے، اور صرف اس دُنیا کا مطالعہ فرمائیے جو ہمارے پیشِ نظر ہے۔ عالمِ جمادات بے حس وحرکت اور بے صوت ونغمہ نظر آتا ہے۔ پتھر کو کسی نے جہاں رکھا وہیں پڑا رہا، کسی نے لڑھکا دیا تو لڑھک گیا۔ خاموش اور بے حس ہے۔ لیکن یہ بھی زندگی کا ایک مقام ہے۔ طبیعی (Physicists) کہتے ہیں کہ جس کو تم بے حس وحرکت اور بے صوت ونغمہ پتھر کا ٹکڑا سمجھتے ہو اس میں لاتعداد الیکٹران Electrons اور پروٹان Protons ہیں جو ایک ازلی اور ابدی رقص وسرود میں مصروف ہیں۔ عالمِ نباتات میں حسیات اور نشوونما کا ظہور ہے۔ چھوٹا سا بیج پھوٹتا ہے اور ایک درخت کی عظیم الشان صورت اختیار کرتا ہے لیکن اس ذوقِ نمو کے باوجود درخت زمین میں گڑا ہوا ہے اور اپنی جگہ سے اِدھر اُدھر چل پھر نہیں سکتا۔ عالمِ حیوانات میں یہ ذوقِ نمو ذوقِ رفتار اور لذتِ آواز میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لیکن حیوان ان سب چیزوں کے باوجود اس غور وفکر اور تدبیرِ مستقبل سے محروم ہے جو عالمِ مخلوقات میں صرف انسان کے حصہ میں آئی ہے۔ لیکن عام انسان ان تمام صفات کے ہوتے ہوئے اس ذوق وسرور، اس عرفانِ حقیقت اور اس روحانی زندگی سے ناآشنا ہے جن کو صرف مردانِ خدا حاصل کرتے ہیں۔ اقبال کی شاعری کا ایک نمایاں پہلو یہی سلسلۂ ارتقاء ہے۔

آغازِ تخلیق کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے:-

زندگی از لذتِ غیب وحضور بست نقشِ ایں جہانِ نزد و دُور
آنچناں تارِ نفس از ہم گسیخت رنگِ حیرت خانۂ ایام ریخت
ہر کجا از ذوق وشوقِ خودگری نعرۂ "من دیگرم تُو دیگری"
ماہ واختر را خرام آموختند صد چراغ اندر فضا افروختند
از اُفق صبحِ نخستیں سر کشید عالمِ نوزادہ را در بر کشید
مُلکِ آدم خاکدانے بود وبس دشتِ اُو بے کاروانے بود وبس
نے سرودِ طائراں در شاخسار نے رمِ آہو میانِ مرغزار
بے تجلی ہائے جاں بحر وبرش دُودِ پیچاں طیلسانِ پیکرش

یہ تو ہے دُنیا کا آغاز، اس کے بعد "زندگی" نمودار ہوتی ہے۔ اقبال کے ہاں اس کی تصویر بھی ملاحظہ فرمائیے:-

روزہا روشن زغوغائے حیات نے ازاں نُورے کہ بینی در جہات

نورِ صبح از آفتابِ داغدار | نورِ جاں پاک از غبارِ روزگار
نورِ جاں بے جادہ ہا اندر سفر | از شعاعِ مہر و مہ سیارتر
عقلِ آدم بر جہاں شبخوں زند | عشقِ اُو بر لامکاں شبخوں زند

حیاتیین Biologists کا سلسلۂ ارتقاء تو تخلیقِ آدم پر آکر رک جاتا ہے۔ لیکن دیگر روحانیتین Spiritualists کی طرح اقبال اس سے آگے جاتا ہے۔ ہر ایک انسان کا سینہ عرفانِ حقیقی سے منور نہیں۔ ہر ایک دِل تجلیاتِ رُوحانی کا مرکز نہیں۔ ہر ایک وجود کو حسنِ ازل کے وصال کی لذت کا احساس نہیں۔ چنانچہ انسان میں جب یہ رُوح کی بیداری یا حیاتِ نَو پیدا ہوتی ہے تو اس کا مقام عام انسان سے بہت بلند ہو جاتا ہے۔ یہی ہے وہ مقام جو صرف مردانِ حق کو حاصل ہوتا ہے۔

اقبال کے ہاں اس رُوحانی بیداری کا ذکر یوں آیا ہے :۔

از طریقِ زادن اے مردِ نکو! | آمدی اندر جہانِ چار سُو
ہم بروں جستن بزادن می تواں | بندہا از خود گشادن می تواں
لیکن ایں زادن نہ از آب و گِل است | داند آں مردے کہ اُو صاحب دِل است
آں زمجبوری ست ایں از اختیار | آں نہاں در پردہا ایں آشکار
آں سکون و سَیر اندر کائنات | ایں سراپا سَیر بیروں از حیات
زادنِ طفل از شکستِ اشکم است | زادنِ مرد از شکستِ عالم است
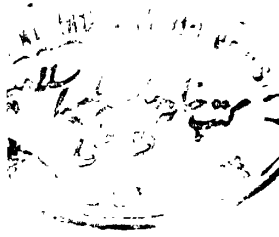
جانِ بیدارے چو زاید در بدن
لرزہا افتد دریں دَیرِ کہن

ہر ایک پیکرِ خاک میں یہ" زادنِ رُوح" عمل میں نہیں آتا۔ اس سے قبل" زندگی" نے صرف اس قدر ترقی کی تھی کہ زندہ چیزیں کائنات کے اندر اندر دَوڑ پھر سکتی تھیں۔ لیکن اس" زادنِ رُوح" یا" حیاتِ نَو" کے بعد یہی" زندگی"،" وقت" اور" جہت" کی قیود کو توڑ کر ان سے بہت آگے اور بہت بلند پرواز کرتی ہے۔

مہاتما گوتم بدھ نے اس روحانی پرواز کا آخری مقام" نروان" قرار دیا ہے۔ "نرواں" سے مُراد خدا اور انسان کا باہمی انجذاب یا وصال ہے۔ اقبال کی منزلِ مقصود اس کا پیہم سفر ہے۔ وہ کہیں بھی ٹھہرنا یا رُکنا نہیں چاہتا۔ چنانچہ اس ابدی جستجو ہی کو وہ اپنی منزل قرار دیتا ہے۔ اور اس کی وجہ بھی خود ہی بتاتا ہے:۔

زانکہ آیاتِ خدا لا انتہا است | اے مسافر! جادہ را پایاں کجا است!

اس کا ذوقِ پرواز غیر محدود پہنائیاں اور غیر مختتم بلندیاں چاہتا ہے :۔

در بیابانِ طلب دیوانہ شو — یعنی ابراہیمؑ ایں بُت خانہ شو
چوں زمین و آسماں را طے کُنی — ایں جہان و آں جہاں را طے کُنی
از خدا ہفت آسماں دیگر طلب — صد زماں و صد مکاں دیگر طلب
گر نجاتِ ما فراغ از جستجو است — گور خوشتر از بہشتِ رنگ و بُو است

اے مسافر! جاں بمیرد از مقام
زندہ تر گردد ز پروازِ مدام

اسی مضمون کو غزل کے ایک شعر میں یُوں بیان کیا ہے : ؎

زجوئے کہکشاں بگذر، ز نیلِ آسماں بگذر — بمنزل دل بمیرد گرچہ باشد منزلِ ماہے

یہ تو آپ نے دیکھ لیا کہ زندگی جمُود کی زنجیروں کو توڑنے کے لئے کس قدر بے تاب ہے۔ سلسلۂ ارتقا پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ موجِ حیات کی روانی میں بے شمار رُکاوٹیں ہیں لیکن وُہ ان تمام رُکاوٹوں پر غالب آنے کے لئے ہر لمحہ بے قرار اور کوشاں ہے۔ عالمِ جمادات سے لے کر عالمِ حیوانات تک انہیں رُکاوٹوں کا نام "مادہ" (Matter) ہے۔ لیکن انسان میں یہی 'مادہ' باطل اور شر کی صُورت اختیار کر لیتا ہے۔ وُہی مَوجِ حیات یعنی 'حرکت' انسانی وجُود میں آ کر 'حق' اور 'نیکی' سے موسوم ہوتی ہے۔ چنانچہ اس رُوحانی ارتقا میں ہمیں خیر و شر، حق و باطل، عدل و ظلم، محبت و عداوت، عقل و عشق اور اہرمن و یزداں کے درمیان ایک پیہم کشمکش نظر آتی ہے۔ مردِ حق ان طاغوتی قوتوں سے ہمیشہ برسرِ پیکار رہتا ہے : ؎

مردِ مومن زندہ و با خود بجنگ — بر خود افتد ہمچو بر آہو پلنگ

اور آخر کار ان سب پر غالب آتا ہے۔ اس رُوحانی جنگ کا فلسفہ اقبال نے یُوں بیان کیا ہے ۔

حضرت شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ سے اقبال پُوچھتا ہے : ؎

از تو خواہم سرِ یزداں را کلید — طاعت از ما جُست و شیطاں آفرید
زشت و ناخوش را چناں آراستن — در عمل از ما نکوئی خواستن
از تو پُرسم ایں فسوں سازی کہ چہ! — با قمارِ بد نشیں بازی کہ چہ!
مشتِ خاک و ایں سپہرِ گرد گرد — خود بگو می زیبدش کارے کہ کرد!

یہی سوال بہت سے اور شعراء اور مفکرین نے بھی اُٹھایا ہے۔ حضرت خواجہ حافظؒ شیرازی کا اندازِ بیان غالباً سب سے زیادہ بلیغ ہے:

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ‌ای — باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش!

حضرت شاہ ہمدان رح اس نکتہ کا حل یوں پیش فرماتے ہیں :۔

بزم با دیو است آدم را وبال — رزم با دیو است آدم را جمال
خویش را با اہرمن باید زدن — تو ہمہ تیغ، آں ہمہ سنگِ فسن!
تیز تر شو تا فتد ضربِ تو سخت — ورنہ باشی در دو گیتی تیرہ بخت

گویا شیطان کا وجود محض ایک سنگِ راہ ہے جو آدم اور یزداں کے درمیان حائل ہے۔ لیکن اگر 'موجِ حیات' یا 'حسنِ عمل' میں کافی طاقت ہے تو اس پتھر یعنی جمود و تعطّل کو توڑ سکتی ہے۔ وہی سنگ جو ہماری راہ میں حائل ہے شمشیرِ عمل کے لئے محض سنگِ فساں ہے یعنی طاغوتی قوتوں کے ساتھ نبرد آزما ہونے سے ہماری ملکوتی قوتیں اور بھی تیز ہو جاتی ہیں۔ اس حق و باطل کی جنگ میں کامیاب ہونے کے لئے ہمیں رہنمائی کی حاجت ہے اور اقبال "عشق" کو بہترین رہنما قرار دیتا ہے: "عشق" سے مُراد وُہ جذبۂ ملکوتی ہے جو ہمیں حق اور نیکی کی حمایت کے لئے اُبھارتا ہے اور اس کے مقابل میں 'عقلِ حیلہ گر' یا 'علمِ کتابی' ایک رُکاوٹ بن کر حائل ہو جاتے ہیں۔ "منطقی عقل" تاویلوں سے کام لیتی ہے۔ مادّی منفعت اور مضرت دکھا دکھا کر ہمیں 'کارِ حق' سے باز رکھنا چاہتی ہے۔ اس قسم کا 'علم' اور اس قسم کی 'عقل' گویا اسی جمود و تعطّل کی دُوسری صُورت ہے جو ہمیں سلسلۂ ارتقار کی ابتدا میں ٹھوس مادّے (Matter) کی صُورت میں نظر آتا ہے۔

'عقل' و 'عشق' کا موازنہ ملاحظہ فرمائیے :۔

علم در اندیشہ می گیرد مقام — عشق را کاشانہ قلبِ لاینام
علم تا از عشق برخوردار نیست — جز تماشا خانۂ افکار نیست
ایں تماشا خانہ سحرِ سامری است — علم بے رُوح القدس افسوں گری است

علم غور و فکر ہے اور عشق جذبۂ عمل جو شام و سحر بیدار رہتا ہے، زندگی کی حقیقت عمل ہے اس لئے جوہرِ زندگی عشق یعنی حُسنِ عمل ہے نہ کہ علم ؎

بے خطر کُود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

ایک اور مقام پر یہی موازنہ یوں پیش کیا گیا ہے : ؎

عقل اُو را سوئے جلوت می کشد — عشق اُو را سوئے خلوت می کشد
چشمش از ذوقِ نگہ بیگانہ نیست — لیکن اُو را جرأتِ رندانہ نیست
عقل در کوہے شگافے می کند — یا بگردِ اُو طوافے می کند

کوہ پیش عشق چوں کاہے بود　　دل سریع السیر چوں ماہے بود
عشق شبخونے زدن بر لامکاں　　گور را نادیدہ رفستن از جہاں

گویا انسانی فطرت یا ضمیر کے اندر جو جنگ برپا ہے وہ حقیقت میں حق و باطل اور خیر و شر کی جنگ ہے اور اس جنگ میں 'عشق' یعنی حُسنِ عمل ہی مردِ حق کی تیغ و سپر ہے۔

یہیں سے 'مردِ حق' کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ مردِ حق وُہ انسان ہوگا جو باطل اور شر پر غالب رہے گا جس کی ملکوتی قوتیں طاغوتی قوتوں کو سرنگوں کر دیں گی، جس کے وجود میں حق اور نیکی کا ابدی نور درخشاں ہوگا اور باطل کی تاریکیاں اس نور کے اندر گم ہو جائیں گی۔ ظاہر ہے کہ اس انسان کو 'مردِ کامل'، پیغمبر، اُوتار یا نائب خدا کہا جائے تو بجا ہے۔ چنانچہ اقبال نے جہاں جہاں مردِ حق کے اوصاف بیان کئے ہیں وہاں اس نے ان اوصاف کو کسی نہ کسی پیغمبر بالخصوص پیغمبرِ عرب کی ذات میں متشکل پایا ہے۔

"وقت" اپنی عالمگیری بیان کرنے کے بعد کہتا ہے کہ صرف مردِ حق میرے طلسم سے آزاد ہے :-

در طلسم من اسیر است ایں جہاں　　از دمم ہر لحظہ پیر است ایں جہاں
لی مع اللہ ہر کرا در دل نشست　　آں جواں مردے طلسم من شکست
گر تو خواہی من نباشم در میاں　　لی مع اللہ باز خواں از عینِ جاں

یہ ایک حدیثِ پاک (لِی مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ) کی طرف اشارہ ہے۔ گویا مردِ حق "وقت" کے طلسم سے آزاد ہے اور اس کے ثبوت میں پیغمبرِ عربؐ کی ذاتِ گرامی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ایک اَور مقام پر 'مردِ حق' اور 'آمرِ قاہر' Dictator میں فرق بیان کرتے ہوئے حضرت کلیم اللہ کی طرف اشارہ کیا ہے :-

دبدبۂ قلندری، طنطنۂ سکندری　　آں ہمہ جذبۂ کلیمؑ، ایں ہمہ سحرِ سامری
آں بنگاہ می کشد، ایں بہ سپاہ می کشد　　آں ہمہ صلح و آشتی ایں ہمہ جنگ و داوری
ہر دو جہاں کشا ستند، ہر دو دوام خواستند　　ایں بہ دلیلِ قاہری، آں بہ دلیلِ دلبری

ضربِ قلندری بیار، سدِ سکندری شکن
رسمِ کلیمؑ تازہ کُن رونقِ ساحری شکن

'مردِ حق' کے اَوصاف کیا ہیں :-

طبع روشن مردِ حق را آبروست　　خدمتِ خلقِ خدا مقصودِ اُوست
خدمت از رسم و رہِ پیغمبری است　　مُزدِ خدمت خواستن سوداگری است

دیگر

مردِ حق از آسماں اُفتد چو برق — ہیزمِ اُو شہر و دشت و غرب و شرق

ما ہنوز اندر ظلامِ کائنات — اُو شریکِ اہتمامِ کائنات

اُو کلیم، اُو مسیح و اُو خلیل — اُو محمدؐ اُو کتاب و جبرئیل

آفتابِ کائناتِ اہلِ دل — از شعاعِ اُو حیاتِ اہلِ دل

اوّل اندر نارِ خود سوزد ترا — باز سلطانی بیاموزد ترا

ما ہمہ با سوزِ اُو زندہ دلیم — ورنہ نقشِ باطلِ آب و گِلیم

مردانِ حق کے متعلق اقبال نے بہت سے مقامات پر لکھا ہے لیکن ہم اس مضمون کو ذیل کے اقتباس پر ختم کر دیں گے ۔ اس اقتباس سے معلوم ہوگا کہ 'حق' جو کائنات کے اندر ایک جوہر کی طرح ہے وُہ مختلف انسانی صُورتوں میں جلوہ گر ہوتا ہے ۔ اُور یہی وہ انسان ہیں جو مردانِ حق کہلاتے ہیں ۔

اقبال (زندہ رود) اُور منصُورؒ حلاج کی گفتگو ملاحظہ فرمائیے :-

حلاج :-

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو — آنکہ از خاکش بروید آرزُو

یا ز نُورِ مصطفیٰ اُو را بہاست — یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

زندہ رود :-

از تو پرسم گرچہ پُرسیدن خطاست — سِرِّ آں جوہر کہ نامش مصطفیٰ است

آدمے یا جوہرے اندر وجُود! — آنکہ آید گاہے گاہے در وجُود

حلاج :-

پیشِ اُو گیتی جبیں فرسودہ است — خویش را خود "عبدہٗ" فرمودہ است

"عبدہٗ" از فہمِ تو بالاتر است — زانکہ اُو ہم آدم و ہم جوہر است

جوہرِ اُو نے عرب، نے اعجم است — آدم است و ہم ز آدم اقدم است

"عبدہٗ" صُورت گرِ تقدیر ہا — اندرو ویرانہ ہا تعمیر ہا

عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر — ما سراپا انتظار اُو منتظر

عبدۂ دہر است و دہر از عبدۂ است | ما ہمہ رنگیم، اُو بے رنگ و بُو است
عبدۂ با ابتدا بے انتہا است | عبدۂ را صبح و شام ما کجا است!
کس ز سرِّ عبدۂ آگاہ نیست | عبدۂ جُز سرِّ اِلاَّ اللہ نیست
لَا اِلٰہَ تیغ و دمِ اُو عَبدُہٗ | فاش تر خواہی بگو "ھُو" عَبدُہٗ

اس اقتباس سے مردِ حق کا مفہوم بالکل روشن ہوگیا۔ وُہ آدم بھی ہے اور جوہر بھی، انسان بھی ہے اور خُدا بھی، وُہ کائنات کے اندر بھی ہے اور اس سے بالا بھی، بلکہ وہ رُوحِ کائنات ہے ع 'فاش تر خواہی، بگو "ھُو" عبدہٗ'۔ یہی وہ مقام ہے جہاں صوفی عالمِ مستی میں اَنَا الحق پکار اُٹھتا ہے اور یوگی اہم برہم اُسمہ (میں ہی برہما ہوں) کا نعرہ لگاتا ہے۔ یہ تمام اشعار سرورِ کائنات محمدؐ عربی کی شان میں ہیں۔ اقبال جب مردِ حق کا مکمل ترین تصور کسی انسانی صُورت میں جلوہ گر دیکھنا چاہتا ہے تو اس کو پیغمبرِ عرب فداہ امّی وابی کے سوا اور کہیں نظر نہیں آتا۔

'حق' جب فرد میں ظاہر ہوتا ہے تو مردِ حق کا وجُود ظہور میں آتا ہے، یہی 'حق' جب اجتماعی رنگ میں ظاہر ہوگا تو "حکومتِ الٰہی" قائم ہوگی، جو جنگ فرد کے اندر خیر و شر کی صُورت میں برپا ہے وُہی جنگ عالمگیر پیمانہ پر دُنیا میں جاری ہے۔ مردِ حق کے وجود میں باطل مغلوب ہو جاتا ہے اور حق ہی حق کارفرما ہوتا ہے۔ اسی طرح جب عالمگیر پیمانہ پر باطل کو سرنگوں کر دیا جائے گا تو تمام عالم میں حق ہی حق کارفرما ہو جائے گا۔ یہی ہے "حکومتِ الٰہی" یا "خدا کی بادشاہت"۔

حق کے انفرادی اور اجتماعی حُسن کی تصویر ملاحظہ فرمایئے:۔

عشق در خلوت کلیم اللّٰہی است | چوں بجلوت می خرامد شاہی است
گرچہ اندر خلوت و جلوت خدا است | خلوت آغاز است و جلوت انتہا است

راہِ حق با کارواں رفتن خوش است
ہمچو جاں اندر جہاں رفتن خوش است

"حکومتِ الٰہی" کی بُنیادی خصوصیتوں کا ذکر اقبال نے یوں کیا ہے:۔

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام | نے غلام اُو را نہ اُو کس را غلام
بندۂ حق مردِ آزاد است و بس | ملک و آئینش خداداد است و بس
رسم و راہ و دین و آئینش ز حق | زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق
عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر | سُودِ خود بیند نہ بیند سُودِ غیر

وحیِ حق بینندۂ سود ہمہ — در نگاہش سود و بہبود ہمہ

غیرِ حق چوں ناہی و آمر شود — زور ور بر ناتواں قاہر شود

زیرِ گردوں آمری از قاہری است

آمری از ماسوی اللہ کافری است

سطورِ بالا سے اقبال کے بنیادی فلسفیانہ تصورات کی کچھ جھلک نظر آگئی ہوگی۔ وہ شاعرِ زندگی ہے، زندگی ایک پیہم کشمکش ہے یہ جنگ ہر لمحہ اور ہر لحظہ برپا ہے۔ ابتدا میں یہ کشمکش جمود اور حرکت کے درمیان ہے۔ انسان میں یہی جنگ نئی اصطلاحات اختیار کرتی ہے اور معرکۂ حق وباطل کہلاتی ہے۔ حق کی انفرادی فتح کی صورت میں مردِ حق ظاہر ہوتا ہے اور حق کی عالمگیر فتح سے حکومتِ الٰہی ظہور میں آتی ہے۔ حکومتِ الٰہی کا تصور یقیناً ایک شاندار اور زریں تصور ہے۔ اور شاید اس بغض وعداوت ظلم وستم اور جبر وقہر کی دُنیا میں اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔ ابتدائے آفرینش سے اربابِ حق یہ خواب دیکھتے چلے آرہے ہیں، اس کی تعبیر معلوم نہیں کوئی ہے بھی یا نہیں، اور اگر ہے تو ابھی اس کے پُورا ہونے کے لئے کتنی صدیاں درکار ہیں۔ بہرحال ایسے خواب دیکھنے والے انسانوں کی ابھی اس دُنیا کو ضرورت ہے اور اس خواب کی کوئی تعبیر ہو یا نہ ہو یہ خواب فی نفسہٖ نہایت ہمّت افزا اور رُوح پرور ہے۔ اس اہرمنی دُنیا کی گھناؤنی تاریکیوں میں اسی خواب سے کچھ رنگ اور نور ہے۔ اقبال دُنیا کے شکریے کا مستحق ہے کہ اس نے اپنی جادو نوائی سے اس خواب کو تازہ کیا اور ہماری بے کیف، باطل اور افسردہ زندگیوں میں پھر ایک بار حق وصداقت کی روح پھونکی۔ انسانی رُوح کو اس نے بلندترین مقامات پر پہنچانے کی کوشش کی اور ہماری رائے میں تمام انسانی علوم وفنون کا بہترین مقصد بھی یہی ہے کہ انسان کو اس کی حقیقی عظمت سے آگاہ کیا جائے اور اس کی ملکوتی قوتوں کو بیدار کرکے بروئے کار لایا جائے ؎

شعر را مقصود اگر آدم گری است

شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

اثر صہبائی

قطعہ

ناشنیدہ فغاں ہے اب ہستی — فرصتِ رائیگاں ہے اب ہستی

کس کو انور پڑی ہے جینے کی — تہمتِ ناکساں ہے اب ہستی

(لطیف انور گورداسپوری)

تہذیب

(علامۂ اقبال کی نظر میں)

انساں کہ رُخ ز غازۂ تہذیب برفروخت — خاکِ سیاہِ خویش چو آئینہ وانمود

پوشید پنجہ را تہِ دستانۂ حریر — افسونِ قلم شُد و تیغ از کمر کشود

ایں بوالہوس صنم کدۂ صلحِ عام ساخت — رقصید گرد او بنواہائے چنگ و عود

دیدم چو جنگ پردۂ ناموس او درید — جز "یَسْفِكُ الدِّمَاءَ"[1] و "خَصِيمٌ مُّبِيْنٌ" نبود

ترجمہ :- (سلیس ہندی میں)

وُہ اِنساں جس نے تہذیب کے رنگ روپ سے شکل بنائی — اپنے جنم کی کالی مٹی آئینہ کر کے کھول دکھائی

چھپا لیا اپنا چنگل ریشم کے سہانے دستانے میں — منتر قلم کے جپنے لگا تلوار کمر سے کھول گرائی

اس پاپی مایا لوبھی نے جگت شانتی کا ڈھونگ رچایا[2] — اُسی کے چاروں طرف ناچ کے اس نے اپنے من کی گائی

عالم گیر لڑائی[3] نے اس پردے کو جب پھاڑ کے پھینکا، — تب یہ خاک کا خونی پتلا جانی دشمن دیا دکھائی

سید مقبول حسین
احمد پوری

[1] کلام مجید کے الفاظ ہیں یعنی "جو خونریزی کرے گا" اور "کھلا ہوا دشمن ہے"۔ فرشتوں نے پیدائشِ عالم کے وقت خدا کی بارگاہ میں معذرت پیش کی تھی کہ کیا تُو دُنیا میں انسان کو خلیفہ بنائے گا جو وہاں فساد اور خونریزی برپا کرے گا؟"

[2] محاورہ ہے۔ یعنی خود غرضی کرنے لگا ۔ [3] جنگ عظیم ۔

خونی ناچ

دوسرے دن عید تھی اور میں پانچ دن کی رخصت لے کر گھر آ رہا تھا، ایک ٹرنک اور ایک گٹھڑی جس میں گوجرانوالے کے سُرخ مالٹے اور کچھ بچوں کے لئے کھلونے بندھے تھے بس یہ مختصر سا سامان تھا جسے میں نے لاہور اُترتے ہی کرایہ کے سالم تانگے پر لدوالیا اور خوشی خوشی گھر چلا۔ کل عید بھی تھی اور پھر خالہ زاد خالہ کی لڑکی رفعت بھی آئی ہوگی۔ رفعت کی بڑی بڑی آنکھوں کی ملامت اور اس کے محجوب سے لبوں کی مسکراہٹ بار بار گویا آنکھوں کے آگے آ کر کہہ رہی تھی "اوہ، بھائی جان، اور آپ بھی آگئے، اب شودھنا کا خونی ناچ دیکھنے میں خوب لُطف آئے گا" جب سے میں نے گوجرانوالہ میں شودھنا کے رقص کے متعلق اخبار میں مضامین پڑھے تھے۔ پس میں سوچ رہا تھا کہ عید ہوگی اور رفعت اور میں اور شودھنا کا خونی ناچ، رفعت، رفعت، کتنا خوبصورت نام ہے۔ میں نے کبھی اس پر غور ہی نہیں کیا، اس نام کو سن کر طبیعت چاہتی ہے، کہ آدمی اپنا نام یکسر بدل ڈالے بھلا صابر بھی کوئی نام ہے، نام ہو عارف، عتیق، محبوب، کچھ ہو لیکن صابر، صابر — یہ نام تو ایسا ہے جیسا کسی چمڑا بیچنے والے دکاندار کا، یکایک میونسپلٹی کی سڑک کے ایک گڑھے نے تانگے کو وہ ہچکولا دیا، کہ گھوڑا گرتے گرتے بچا۔ اور مجھے تو گویا دن کو تارے نظر آگئے، اب تانگے والے کے منہ سے ایسی نئی "بطرزِ جدید" قسم کی گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہوئی کہ میں رشک و حیرت سے اس کے منہ کی طرف تکتا رہ گیا، میں نے سوچا کیا روانی ہے، زبان میں کس قدر لوچ ہے، کیسی اچھی تشبیہیں، کاش یہ تانگے والا ادیب ہوتا۔ شاہ عالمی سے کر لوہاری دروازے تک میونسپل باغ کے لکڑی کے جنگلے پر پرانے گرم کوٹ لٹکے ہوئے تھے اور ہر دس قدم کے فاصلے پر دو تین کابلی پٹھان فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے نظر آرہے تھے لیکن وہ اس وقت گرم کوٹ نہیں بیچ رہے تھے بلکہ تانگے والے کے منہ سے لاہور میونسپلٹی کے متعلق تعریفی کلمات اور شاعرانہ مبالغہ آرائیاں سن سن کر حیران ہو رہے تھے۔ سینلا کے مندر کے قریب تانگے والے کو ذرا رک جانا پڑا، یہاں بہت بھیڑ تھی، بہت سے لوگ جمع تھے اور دو چار پولیس کے آدمی بھی، ایک حادثہ ہوگیا تھا، شرط بد کر بھاگنے والے دو تانگے آپس میں ٹکرا گئے تھے اور ایک مزدور جو بستر اٹھائے ہوئے آگے دوڑا جا رہا تھا، ان دو تانگوں کے بیچ میں آ کر گھن کی طرح پس گیا تھا، اس کی خون میں لتھڑی لتھڑی لاش سڑک پر پڑی تھی اور بستر کا مالک اپنی دھوتی سنبھالتے ہوئے تانگے والوں کی بدمعاشی کا، گاڑی سے لیٹ ہو جانے کا اور بستر کے لہو سے لت پت ہو جانے کا بلند اور کرخت آواز میں ذکر کر رہا تھا لمبی لمبی مونچھوں کو سائیکل کے ہینڈل کی طرح موڑ کر رکھنے کا شوقین سپاہی ہنٹر ہلا ہلا کر کہہ رہا تھا "یہ سب ان تانگے والوں کی بدمعاشی ہے"۔

دوسرا سپاہی بولا "اپنا نام لکھاؤ، لالہ جی"۔

مجمع میں مختلف آوازیں اٹھ رہی تھیں، "اوہو، اوہو، چ، چچ، چچ، مر گیا بیچارہ" "گھوڑے بھی زخمی ہو گئے ہیں"، "کمبخت تانگے والوں کو کوئی چوٹ نہیں آئی!" "مگر دیکھئے اس تانگے والے کا تو کم سے کم سو روپیہ کا نقصان ہوگیا" "اُف! . . . ."

تانگے اور موٹریں، لاریاں اور چھکڑے جمع ہو گئے، دیکھتے دیکھتے شاہ عالمی تک راستہ بند ہوگیا، آخر مشکل سے میرے تانگے والے نے بڑ کے درخت کے قریب "ہٹو مہربان، لالہ جی ایک طرف، خان صاحب، سنتری جی، سائیں جی، او مائی، بچ جا" کہہ کر راستہ نکالا، اور پھر گھوڑے کو جو چابک کھایا تو لوہاری کے چوک میں پہنچ گیا، خوانچے والوں کی صدائیں، انارکلی کے اندر گزرتے ہوئے تانگوں میں دلفریب ساریوں کی جھلک، "یہ لاہور ہے" اور سینما والوں کی اشتہاری

گاڑیاں، عید کی خوشی میں خاص پروگرام، ریجنٹ میں "نورِ اسلام"، میٹرو میں "بانکی اُلفت"، الفنسٹن میں "شاہی لٹیرے"، رکسی میں "شانِ قلندر"، پربھات میں "شوردھنا کا ناچ"، شوردھنا کا ناچ اور رفعت!

بھاٹی دروازہ پہنچ کر میں نے تانگے والے سے کہا "مجھے یہیں اُترنا ہے" ایک مزدور نے دوڑ کر میرا اسباب اُٹھایا اور فٹ پاتھ پر رکھ دیا، تانگے والے نے چار آنے لے کر گھوڑے کا رُخ لوہاری دروازے کی طرف موڑ دیا، اور قریب کی ایک دکان سے پان لینے چلا گیا۔ مزدور بولا "اسباب اُٹھاؤں، جی؟"

"اُٹھاؤ، ذیلدار روڈ پر لے چلو، یہاں سے قریب تو ہے، ایک آنہ دیں گے۔"

کچھ جواب دیے بغیر ہی نوجوان مزدور نے بستر اور گٹھڑی اُٹھالی اور ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں نے یونہی پوچھا "ذیلدار روڈ کا راستہ جانتے ہو؟"

"جی، نہیں، نیا نیا آیا ہوں" اس کا لہجہ نہایت خوشگوار اور دیہاتی تھا، شہری تصنع سے بالکل پاک۔

"کہاں سے آئے ہو؟"

"ملتان سے"

"خاص ملتان سے؟"

"جی نہیں، ملتان کے نزدیک پاروّوال گاؤں ہے، وہاں سے آیا ہوں، پہلے لائل پور گیا تھا، پھر ادھر لاہور آگیا ہوں"

"کیا لائل پور میں اچھی مزدوری نہیں ملتی؟"

"مزدوری تو ——— ملتی تھی، مگر ..... بات یہ ہوئی کہ میں اور میرا بڑا بھائی ..... ہم چار بھائی ہیں، میرے تین بڑے بھائی بیاہے ہوئے ہیں، مگر میں کنوارا ہوں، دو بڑے بھائی تو پاروّوال میں کاشت کرتے ہیں، زمین تھوڑی ہے، گزارا نہیں ہوتا۔ مجھ سے بڑے بھائی کا پچھلے سال بیاہ ہوا ہے۔ ہم دونوں بھائی مزدوری کے لئے ملتان سے لائلپور منڈی آئے تھے، اور ایک دن جب ہم گھنٹہ گھر کے قریب بستا رہے تھے، ہمیں ایک بابو ملا، اس نے کلاہ پر پگڑی باندھ رکھی تھی، ہم سے پوچھنے لگا "مزدوری کروگے؟" ہم نے کہا "کریں گے"، بولا "یہاں کیا لیتے ہو"، ہم نے کہا "آٹھ آنے روزانہ"، کہنے لگا "میں بارہ آنے روزانہ دوں گا لیکن تمہیں ملکوال میرے ساتھ چلنا پڑے گا!" ہم نے سوچا، چلو مزدوری تو اچھی ملتی ہے، ہم ملکوال چلے گئے۔ وہاں سے وہ بابو ہمیں سدھووال لے گیا، راستے میں ہمیں تسلی دیتا گیا کہ بڑا آسان کام ہے، بس یہی دیواروں پر سفیدی وغیرہ کرنا، ہم نے اس سے پہلے سفیدی تو نہ کی تھی، لیکن سوچا، اس میں کیا ہے، کرلیں گے، سدھووال جاکر اس نے ہمارے ہاتھوں میں ایک ایک کدال تھما دی اور ریلوے لائن پر لے گیا، اور کہا کہ اس کے ساتھ ساتھ یہ زمین کھودنی ہے، اور جتنے فٹ روز زمین کھودو گے اس کے حساب تمہیں پیسے ملیں گے، اس حساب سے ہمیں بمشکل چار آنے روز ملتے تھے، اور زمین کھودتے کھودتے ہمارے ہاتھ پاؤں شل ہوگئے، ایسی سخت مٹی تھی وہ، آخر ایک دن ہم رات کو دونوں بھائی بھاگ نکلے۔ اس سے ہمیں بہت ڈر لگتا تھا، وہ ہمیں دن بھر گالیاں دیتا رہتا تھا، اور اکثر پیٹ بھی ڈالتا تھا، پھر ہم یہاں آگئے، یہاں ہم صبح کو منڈی جاتے ہیں، وہاں بارہ بجے تک چار چار آنے ہو جاتے ہیں، پھر ہم دن بھر ادھر اُدھر گھوم کر مزدوری کرتے رہتے ہیں، بہت ہوا تو کسی دن آٹھ نو آنے بن گئے، لیکن عام طور پر پانچ، چھ آنے سے زیادہ روزانہ کمائی نہیں ہوتی۔"

میں نے پوچھا "تم رات کو رہتے کہاں ہو؟"

"جی، داتا کے دربار میں"

"وہاں جگہ ہے؟"

مجاور کی مہربانی سے رات بسر ہو جاتی ہے، اور پھر ہم انہیں خوش بھی کر دیتے ہیں۔"

"اچھا!"

"جی"

اب میرا گھر سامنے آ گیا تھا، ننھا عبید سامنے مٹی میں کھیل رہا تھا، اس نے مجھے دیکھ لیا اور دیکھتے ہی اپنی توتلی آواز میں چلا اٹھا "بھائی جان! آ دئے" اور یہ کہتا ہوا دوڑ کر اندر چلا گیا۔

دالان میں پہنچ کر مزدور نے بستر لو گٹھڑی فرش پر رکھ دی اور ایک طرف کھڑا ہو کر پسینہ پونچھنے لگا، اب گھر کے سب لوگ میرے گرد جمع ہو رہے تھے، اور پُر مسرت نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ننھا عبید اور منجھلا بھائی، اماں، خالہ اور رفعت، رفعت کی نرم مسکراہٹ اور رفعت کی مہربان نگاہیں۔

منجھلے بھائی بولے "ہم تو صبح کی گاڑی سے آپ کا انتظار کر رہے تھے"

اماں بولیں "رفیع کی نانی اب تو اچھی ہیں نا؟

رفعت نے ہنستے ہنستے کہا "بھائی جان! ہم تو آج ہی شودھنا کا ناچ دیکھنے کی تیاری کر رہے ہیں!"

مزدور کونے میں سے بولا "مجھے پیسے جلد دیجئے، میرا بھائی انتظار کر رہا ہوگا، وہ ابھی ابھی شاہ عالمی تک ایک لالہ کے ساتھ بستر اٹھا کر گیا ہے اور اب واپس آ کر داتا جی کے دربار انتظار کر رہا ہوگا۔" پھر مسکرا کر کہنے لگا "کچھ انعام بھی مل جائے، کل عید ہے بابو جی!"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر یکایک میرا ہاتھ رک گیا۔ میرا سارا جسم کانپنے لگا، میری آنکھوں کے آگے زمین و آسمان گھومنے لگے۔ رفعت کی مسکراہٹ یکایک پھیلتی ہوئی ساری فضا میں خوفناک حلقے بناتی ہوئی دکھائی دی۔ شودھنا کے رقصاں پاؤں میں بندھے گھنگرو یکایک زور زور سے چیخنے لگے، ساری کائنات لرز رہی تھی، انارکلی میں گزرتے ہوئے تانگے دلفریب ساریوں کی بہار دکھاتے ہوئے یکایک فضا میں لڑھکنے لگے، اب چاروں طرف خون ہی خون تھا، اور دو پتھرائی ہوئی آنکھیں اس میں سے باہر جھانک رہی تھیں، اور کوئی لاکھوں کروڑوں مکھیوں کے بھنبھنانے کی گونج کے ساتھ کہہ رہا تھا "اے ہے! چ چ چ بے چارہ مر گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

کرشن چندر

گاڑیاں، عید کی خوشی میں خاص پروگرام، ریجنٹ میں "نورِ اسلام"، میٹرو میں "بانکی الفت"، الفنسٹن میں "شاہی لٹیرا"، راکسی میں "شانِ قلندر"، پربھات میں "شودھنا کا ناچ اور رنعت"!

بھاٹی دروازہ پہنچ کر میں نے تانگے والے سے کہا "مجھے یہیں اترنا ہے"۔ ایک مزدور نے دوڑ کر میرا اسباب اٹھایا اور فٹ پاتھ پر رکھ دیا، تانگے والے نے چار آنے لے کر گھوڑے کا رخ لوہاری دروازے کی طرف موڑ دیا، اور قریب کی ایک دکان سے پان لینے چلا گیا۔ مزدور بولا "اسباب اٹھاؤں؟ جی؟"

"اٹھاؤ، ذیلدار روڈ پر لے چلو، یہاں سے قریب تو ہے، ایک آنہ دیں گے۔"

کچھ جواب دیئے بغیر ہی نوجوان مزدور نے بستر اور گٹھڑی اٹھالی اور ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں نے یونہی پوچھا "ذیلدار روڈ کا راستہ جانتے ہو؟"

"جی نہیں، نیا نیا آیا ہوں"۔ اس کا لہجہ نہایت خوشگوار اور دیہاتی تھا، شہری تصنع سے بالکل پاک۔

"کہاں سے آئے ہو؟"

"ملتان سے"

"خاص ملتان سے؟"

"جی نہیں، ملتان کے نزدیک پاروال گاؤں ہے، وہاں سے آیا ہوں، پہلے لائل پور گیا تھا، پھر ادھر لاہور آگیا ہوں"

"کیا لائل پور میں اچھی مزدوری نہیں ملتی؟"

"مزدوری تو ---- ملتی تھی، مگر ..... بات یہ ہوئی کہ میں اور میرا بڑا بھائی ..... ہم چار بھائی ہیں، میرے تین بڑے بھائی بیاہے ہوئے ہیں، مگر میں کنوارا ہوں، دو بڑے بھائی تو پاروال میں کاشت کرتے ہیں، زمین تھوڑی ہے، گزارا نہیں ہوتا۔ مجھ سے بڑے بھائی کا پچھلے سال بیاہ ہوا ہے۔ ہم دونوں بھائی مزدوری کے لئے ملتان سے لائلپور منڈی آئے تھے، اور ایک دن جب ہم گھنٹہ گھر کے قریب سستا رہے تھے، ہمیں ایک بابو ملا، اس نے کلاہ پر لنگی باندھ رکھی تھی، ہم سے پوچھنے لگا "مزدوری کروگے؟" ہم نے کہا "کریں گے"، بولا "یہاں کیا لیتے ہو"، ہم نے کہا "آٹھ آنے روزانہ"، کہنے لگا "میں بارہ آنے روزانہ دوں گا لیکن تمہیں ملکوال میرے ساتھ چلنا پڑے گا"! ہم نے سوچا چلو مزدوری تو اچھی ملتی ہے، ہم ملکوال چلے گئے۔ وہاں سے وہ بابو ہمیں سدھووال لے گیا، راستے میں ہمیں تسلی دیتا گیا کہ بڑا آسان کام ہے بس یہی دیواروں پر سفیدی وغیرہ کرنا، ہم نے اس سے پہلے سفیدی تو نہ کی تھی، لیکن سوچا، اس میں کیا ہے، کریں گے، سدھووال جا کر اس نے ہمارے ہاتھوں میں ایک ایک کدال تھما دی اور ریلوے لائن پر لے گیا، اور کہا کہ اس کے ساتھ ساتھ زمین کھودنی ہے، اور جتنے فٹ روز زمین کھودو گے اس کے حساب تمہیں پیسے ملیں گے، اس حساب سے ہمیں بمشکل چار آنے روز ملتے تھے، اور زمین کھودتے کھودتے ہمارے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے، ایسی سخت مٹی تھی وہ، آخر ایک دن ہم رات کو دونوں بھائی بھاگ نکلے۔ اس سے ہمیں بہت ڈر لگتا تھا، وہ ہمیں دن بھر گالیاں دیتا رہتا تھا، اور اکثر پیٹ بھی ڈالتا تھا، پھر ہم یہاں آگئے، یہاں ہم صبح کو منڈی جاتے ہیں، وہاں بارہ بجے تک چار چار آنے ہو جاتے ہیں، پھر ہم دن بھر ادھر ادھر گھوم کر مزدوری کرتے رہتے ہیں، بہت ہوا تو کسی دن آٹھ نو آنے بن گئے لیکن عام طور پر پانچ، چھ آنے سے زیادہ روزانہ کمائی نہیں ہوتی۔"

میں نے پوچھا "تم رات کو رہتے کہاں ہو ؟"

"جی، داتا کے دربار میں"

"وہاں جگہ ہے ؟"

"مجاور کی مہربانی سے رات بسر ہو جاتی ہے، اور پھر ہم انہیں خوش بھی کر دیتے ہیں"۔

"اچھا؟"

"جی"

اب میرا گھر سامنے آ گیا تھا، ننھا عبید سامنے مٹی میں کھیل رہا تھا، اس نے مجھے دیکھ لیا اور دیکھتے ہی اپنی توتلی آواز میں چلا اٹھا "بھائی جان! آ دئے"
اور یہ کہتا ہوا دوڑ کر اندر چلا گیا۔

دالان میں پہنچ کر مزدور نے بستر اور گٹھڑی فرش پر رکھ دی اور ایک طرف کھڑا ہو کر پسینہ پونچھنے لگا، اب گھر کے سب لوگ میرے گرد جمع ہو رہے تھے، اور پُرمسرت نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے ننھا عبید اور منجھلا بھائی، اماں خالہ اور رفعت، رفعت کی نرم مسکراہٹ اور رفعت کی مہربان نگاہیں۔

منجھلے بھائی بولے "ہم تو صبح کی گاڑی سے آپ کا انتظار کر رہے تھے"۔

اماں بولیں "رفیع کی نانی اب تو اچھی ہیں نا ؟"

رفعت نے ہنستے ہنستے کہا "بھائی جان! ہم تو آج ہی شودھنا کا ناچ دیکھنے کی تیاری کر رہے ہیں!"

مزدور کونے میں سے بولا "مجھے پیسے جلد دیجئے، میرا بھائی انتظار کر رہا ہوگا، وہ ابھی ابھی شاہ عالمی تک ایک لالہ کے ساتھ بستر اٹھا کر گیا ہے اور اب واپس آ کر داتا جی کے دربار انتظار کر رہا ہوگا"۔ پھر مسکرا کر کہنے لگا "کچھ انعام بھی مل جائے، کل عید ہے بابو جی!"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر یکایک میرا ہاتھ رک گیا۔ میرا سارا جسم کانپنے لگا، میری آنکھوں کے آگے زمین و آسمان گھومنے لگے رفعت کی مسکراہٹ یکایک پھیلتی ہوئی ساری فضا میں خوفناک حلقے بناتی ہوئی دکھائی دی۔ شودھنا کے رقصاں پاؤں میں بندھے گھنگرو یکایک زور زور سے چیخنے لگے، ساری کائنات لرز رہی تھی، انارکلی میں گزرتے ہوئے تانگے دلفریب ساریوں کی بہار دکھاتے ہوئے یکایک فضا میں لڑھکنے لگے، اب چاروں طرف خون ہی خون تھا، اور دو پتھرائی ہوئی آنکھیں اس میں سے باہر جھانک رہی تھیں، اور کوئی لاکھوں کروڑوں مکھیوں کے بھنبھنانے کی گونج کے ساتھ کہہ رہا تھا "اے ہے ہے! چ چ چ بے چارہ مر گیا . . . . . "

کرشن چندر

گاڑیاں، عید کی خوشی میں خاص پروگرام، ریجنٹ میں "نورِ اسلام"، میٹرو میں "بانکی اُلفت"، الفنسٹن میں "شاہی لٹیرا"، راکسی میں "شان قلندر"، پربھات میں "شودھنا کا ناچ"!

شودھنا کا ناچ اور رفعت!

بھاٹی دروازہ پہنچ کر میں نے تانگے والے سے کہا: "مجھے یہیں اُترنا ہے"۔ ایک مزدور نے دوڑ کر میرا اسباب اُٹھایا اور فٹ پاتھ پر رکھ دیا، تانگے والے نے چار آنے لے کر گھوڑے کا رُخ لوہاری دروازے کی طرف موڑ دیا، اور قریب کی ایک دکان سے پان لینے چلا گیا۔ مزدور بولا "اسباب اُٹھاؤں؟ جی!"

"اُٹھاؤ، ذیلدار روڈ پر لے چلو، یہاں سے قریب تو ہے، ایک آنہ دیں گے۔"

کچھ جواب دیئے بغیر ہی نوجوان مزدور نے بستر اور گٹھڑی اُٹھالی اور ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں نے یونہی پوچھا "ذیلدار روڈ کا راستہ جانتے ہو؟"

"جی، نہیں، نیا نیا آیا ہوں"۔ اُس کا لہجہ نہایت خوشگوار اور دیہاتی تھا، شہری تصنّع سے بالکل پاک۔

"کہاں سے آئے ہو؟"

"ملتان سے"

"خاص ملتان سے؟"

"جی نہیں، ملتان کے نزدیک پاروال گاؤں ہے، وہاں سے آیا ہوں، پہلے لائل پور گیا تھا، پھر اِدھر لاہور آ گیا ہوں"

"کیا لائل پور میں اچھی مزدوری نہیں ملتی؟"

"مزدوری تو ــــ ملتی تھی، مگر ..... بات یہ ہوئی کہ میں اور میرا بڑا بھائی ..... ہم چار بھائی ہیں، میرے تین بڑے بھائی بیاہے ہوئے ہیں، مگر میں کنوارا ہوں، دو بڑے بھائی تو پاروال میں کاشت کرتے ہیں، زمین تھوڑی ہے، گزارا نہیں ہوتا۔ مجھ سے بڑے بھائی کا پچھلے سال بیاہ ہُوا ہے۔ ہم دونوں بھائی مزدوری کے لئے ملتان سے لائلپور منڈی آئے تھے، اور ایک دن جب ہم گھنٹہ گھر کے قریب سستا رہے تھے، ہمیں ایک بابو ملا، اُس نے کلاہ پر لنگی باندھ رکھی تھی، ہم سے پوچھنے لگا "مزدوری کروگے؟" ہم نے کہا "کریں گے"، بولا "یہاں کیا لیتے ہو"، ہم نے کہا "آٹھ آنے روزانہ"، کہنے لگا "میں بارہ آنے روزانہ دوں گا لیکن تمہیں ملکوال میرے ساتھ چلنا پڑے گا"۔ ہم نے سوچا چلو مزدوری تو اچھی ملتی ہے، ہم ملکوال چلے گئے۔ وہاں سے وہ بابو ہمیں سدھووال لے گیا، راستے میں ہمیں تسلّی دیتا گیا کہ بڑا آسان کام ہے، بس یہی دیواروں پر سفیدی وغیرہ کرنا، ہم نے اس سے پہلے سفیدی تو نہ کی تھی، لیکن سوچا، اس میں کیا ہے، کریں گے۔ سدھووال جا کر اُس نے ہمارے ہاتھوں میں ایک ایک کدال تھما دی اور ریلوے لائن پر لے گیا، اور کہا کہ اس کے ساتھ ساتھ زمین کھودنی ہے، اور جتنے فٹ روز زمین کھودوگے اُس کے حساب تمہیں پیسے ملیں گے، اس حساب سے ہمیں بمشکل چار آنے روز ملتے تھے، اور زمین کھودتے کھودتے ہمارے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے، ایسی سخت مٹی تھی وہ، آخر ایک دن ہم رات کو دونوں بھائی بھاگ نکلے۔ اُس سے ہمیں بہت ڈر لگتا تھا، وہ ہمیں دن بھر گالیاں دیتا رہتا تھا، اور اکثر پیٹ بھی ڈالتا تھا، پھر ہم یہاں آ گئے، یہاں ہم صبح کو منڈی جاتے ہیں، وہاں بارہ بجے تک چار چار آنے ہو جاتے ہیں، پھر ہم دن بھر اِدھر اُدھر گھوم کر مزدوری کرتے رہتے ہیں، بہت ہُوا تو کسی دن آٹھ نو آنے بن گئے، لیکن عام طور پر پانچ، چھ آنے سے زیادہ روزانہ کمائی نہیں ہوتی۔"

میں نے پوچھا" تم رات کو رہتے کہاں ہو؟"

"جی، داتا کے دربار میں"

"وہاں جگہ ہے؟"

مجاور کی مہربانی سے رات بسر ہو جاتی ہے، اور پھر ہم انہیں خوش بھی کر دیتے ہیں"۔

"اچھا!"

"جی"

اب میرا گھر سامنے آگیا تھا، ننھا عبید سامنے مٹی میں کھیل رہا تھا، اُس نے مجھے دیکھ لیا اور دیکھتے ہی اپنی توتلی آواز میں چلا اُٹھا "بھائی جان! آ دئے" یہ کہتا ہوا دوڑ کر اندر چلا گیا۔

دالان میں پہنچ کر مزدور نے بستر اور گٹھڑی فرش پر رکھ دی اور ایک طرف کھڑا ہو کر پسینہ پونچھنے لگا، اب گھر کے سب لوگ میرے گرد جمع ہو رہے تھے، اور پُر مسرت نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے ننھا عبید اور منجھلا بھائی، اماں، خالہ اور رفعت، رفعت کی نرم مسکراہٹ اور رفعت کی مہربان نگاہیں۔

منجھلے بھائی بولے" ہم تو صبح کی گاڑی سے آپ کا انتظار کر رہے تھے"

اماں بولیں" رفیع کی نانی اب تو اچھی ہیں نا؟

رفعت نے ہنستے ہنستے کہا" بھائی جان! ہم تو آج ہی شودھنا کا ناچ دیکھنے کی تیاری کر رہے ہیں!"

مزدور کونے میں سے بولا" مجھے پیسے جلد دیجئے، میرا بھائی انتظار کر رہا ہوگا، وہ ابھی ابھی شاہ عالمی تک ایک لالہ کے ساتھ بستر اُٹھا کر گیا ہے اور اب واپس آکر داتا جی کے دربار انتظار کر رہا ہوگا"۔ پھر مسکرا کر کہنے لگا" کچھ انعام بھی مل جائے، کل عید ہے بابوجی!"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر یکایک میرا ہاتھ رُک گیا۔ میرا سارا جسم کانپنے لگا، میری آنکھوں کے آگے زمین و آسمان گھومنے لگے۔ رفعت کی مسکراہٹ یکایک پھیلتی ہوئی ساری فضا میں خوفناک حلقے بناتی ہوئی دکھائی دی۔ شودھنا کے رقصاں پاؤں میں بندھے گھنگرو یکایک زور زور سے چیخنے لگے، ساری کائنات لرز رہی تھی، انارکلی میں گزرتے ہوئے تانگے دلفریب ساریوں کی بہار دکھاتے ہوئے یکایک فضا میں لڑھکنے لگے، اب چاروں طرف خون ہی خون تھا، اور دو پتھرائی ہوئی آنکھیں اس میں سے باہر جھانک رہی تھیں، اور کوئی لاکھوں کروڑوں مکھیوں کے بھنبھنانے کی گونج کے ساتھ کہہ رہا تھا" اے ہے! چ چچ چچ بے چارہ مر گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

کرشن چندر

چینی اور جاپانی زندگی اور ادب میں تتلیوں کو جو اعتقادی اور جمالیاتی اہمیت حاصل ہے اُس کا سرسری سا اندازہ لیفکاڈیو ہرن کے اس مقالہ سے ہو سکتا ہے۔

کاش میں بھی اُس چینی مصنف کا ہم قسمت ہونے کی اُمید کر سکتا جو جاپانی ادب میں روسان کے نام سے مشہور ہے کیونکہ اُس سے دو ایسی دوشیزہ روحوں، دو آسمانی سہیلیوں کو محبت تھی جو ہر دسویں دن اُس سے ملنے کے لئے آتیں اور اُسے تتلیوں کی پُر اسرار کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ کاش میں بھی ایسی کہانیاں سُن سکتا! لیکن میں کبھی چینی زبان نہ پڑھ سکوں گا بلکہ مجھے جاپانی زبان بھی اچھی طرح نہیں آتی اور وُہ چند جاپانی نظمیں جن کا ترجمہ میں نے نہایت مشکل سے کیا ہے، تتلیوں کی چینی کہانیاں کے حوالوں سے اس قدر بھری ہوئی ہیں کہ میری حالت اُس پیاسے اپاہج کی سی ہو جاتی ہے جس کے سامنے دریا موجیں مار رہا ہو لیکن وہ کنارے تک پہنچنے کے لئے ترستا رہے۔ . . . . اور یہ بات تو یقینی ہے کہ کوئی دوشیزہ رُوح کبھی مجھ سے شکّی آدمی کے پاس آنے کی جرأت ہی نہ کرے گی۔

مگر میں اُس چینی دوشیزہ کی پوری کہانی سننا چاہتا ہوں جو اس قدر حسین اور شمیم انگیز تھی کہ تتلیوں نے اُسے پھول سمجھ لیا اور اُن کے جھُنڈ کے جھُنڈ اس کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔ اسی طرح میں شہنشاہ جینسو یا منگ ہوانگ کی اُن تتلیوں کے متعلق کچھ اور سُننا چاہتا ہوں جو اُس کے لئے حسین عورتوں میں سے محبوبہ کا انتخاب کیا کرتی تھیں۔ . . . . یہ شہنشاہ اپنے جنّت نظیر باغ میں عیش و نشاط کی محفلیں برپا کیا کرتا تھا جہاں جادو نظر لڑکیاں ساقی گری کے لئے موجود ہوتی تھیں۔ اِن محفلوں میں تتلیاں پنجروں میں سے کھلی چھوڑ دی جاتیں اور وہ چھوٹتے ہی محفل کی حسین ترین دوشیزہ کی طرف لپکتیں چنانچہ یہی لڑکی شہنشاہ کی توجہ اور لطف و کرم کا مرکز بن جاتی۔ . . . . میں اُس چینی مصنف کے تجربے کے متعلق بھی کچھ اور معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں جو جاپانی ادب میں سوشو کے نام سے مشہور ہے۔ وُہ ایک دفعہ خواب میں تتلی بن گیا تھا اور اُس کی تمام حسّیات بھی ایک تتلی کی حسّیات بن گئی تھیں۔ وجہ در اصل یہ تھی کہ اثنائے خواب میں اُس کی رُوح تتلی بن کر اِدھر اُدھر چکّر لگاتی رہی تھی۔ حالت یہ ہوئی کہ بیدار ہونے پر اس کے دماغ میں تتلی کی زندگی کی یاد اور اس کی حسّیات اتنی وضاحت کے ساتھ محفوظ رہ گئیں کہ وُہ انسانی طور طریقوں سے بیگانہ ہو گیا۔ . . . . میں چین کے سرکاری کاغذات میں اُن تحریروں کے مضمون سے بھی واقف ہونا چاہتا ہوں۔ جن میں مختلف تتلیاں کسی شہنشاہ اور اُس کے ملازمین کی روحیں قرار دی گئی ہیں۔

شاعری کے کچھ حصّے کو چھوڑ کر تتلیوں کے متعلق بیشتر جاپانی ادب کا سرچشمہ چینی ہے۔ بلکہ تتلیوں کے متعلق وہ قدیم قومی جمالیاتی حس بھی جس کے خوشگوار مظاہر ہیں جاپانی مصوری، موسیقی اور رسم و رواج میں نظر آتے ہیں، شاید پہلے پہل چینی اثرات کے ماتحت ہی پیدا ہوئی ہو۔ اس کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ قدیم جاپانی شاعروں اور مصوّروں نے عموماً اس قسم کے پیشہ ورانہ نام منتخب کئے: چوموُ

(تتلی کا خواب) ایچو (اکیلی تتلی)۔ آج کل بھی بعض رقاصہ لڑکیوں کے ایسے نام موجود ہیں مثلاً چوہانا (تتلی پھول) چوکیچی (تتلی کی قسمت والی) چونوسکو (تتلی کی مدد والی)۔

پیشہ ورانہ ناموں کے علاوہ عام لوگوں کے نام بھی کوچو اور چو وغیرہ (یعنی تتلی) رکھے جاتے ہیں۔ لیکن ایسے ناموں سے عموماً عورتیں ہی موسوم کی جاتی ہیں۔ مشو کے علاقے میں اب تک یہ پرانی رسم موجود ہے کہ گھر کی سب سے چھوٹی لڑکی کو نیکونا (تتلی) کہتے ہیں۔ قدیم ادبیات میں یہ لفظ خوبصورت عورت کے لئے بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔

ممکن ہے جاپان کے بعض عجیب وغریب پرانے اعتقادات کا سرچشمہ بھی چین ہی ہو۔ لیکن یہ اعتقادات خود چین سے بھی زیادہ قدیم ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے دلچسپ ترین عقیدہ یہ ہے کہ زندہ آدمی کی روح بھی کبھی کبھی تتلی کے روپ میں اِدھر اُدھر آوارہ اُڑتے پھرنے کی عادی ہے۔ اس عقیدے سے متعدد خوشگوار توہمات پیدا کئے گئے ہیں مثلاً اگر کوئی تتلی کسی کے مہمان خانے میں داخل ہو کر چلمن کے پیچھے بیٹھ جائے تو اس سے یہ شگون لیا جاتا ہے کہ اس کی محبوبہ ملنے کے لئے آ رہی ہے۔

تتلی کا کسی شخص کی روح ہونا اُس سے ڈرنے کی دلیل نہیں لیکن بعض موقعوں پر تتلیوں نے فی الواقع خوف بھی پھیلا دیا ہے۔ جاپانی تاریخ میں اس قسم کا ایک واقعہ مذکور ہے۔ جب تیرانوماسوکاڈو خفیہ طور پر اپنی مشہور بغاوت کی تیاری میں مصروف تھا کیوتو پر تتلیوں نے اس قدر ہجوم کیا کہ لوگ اسے آئندہ عذاب کی علامت سمجھ کر خائف ہو گئے۔ شاید ان تتلیوں کے متعلق یہ خیال کیا گیا کہ یہ اُن ہزارہا لوگوں کی رُوحیں ہیں جو اس جنگ میں موت کے گھاٹ اُتر جائیں گے اور کسی پُراسرار الہام کے ذریعہ سے اپنی موت کی خبر پا کر ان میں اضطراب پیدا ہو گیا ہے۔

غرض کہ جاپانی عقیدے کے مطابق تتلی کسی زندہ یا مُردہ آدمی کی رُوح ہو سکتی ہے۔ رُوحوں کی یہ عادت بھی سمجھی جاتی ہے کہ وُہ جسم سے آخری مرتبہ رخصت ہونے سے پہلے تتلی کا روپ بھر کر اطلاع دینے کے لئے آتی ہیں۔ اس لئے جب کوئی تتلی گھر میں داخل ہو تو اُس سے مہربانی کا سلوک کرنے کی تاکید کی جاتی ہے۔ اس عقیدے اور اس کے متعلقہ توہمات کا حوالہ اکثر عام ڈراموں میں بھی ملتا ہے۔ مثال کے طور پر ٹونڈے ڈریڈ کوچو نو کانزوشی (کوچو کا اُڑتا بال پن) لیجیئے۔ کوچو ایک خوبصورت عورت ہے جو جھوٹی تہمتوں اور بدسلوکیوں سے تنگ آ کر خودکشی کر لیتی ہے۔ اس ظلم کا بدلہ لینے والا عرصے تک اِن تہمتوں کے تراشنے والے کا سُراغ لگانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے، لیکن کامیاب نہیں ہوتا۔ آخر کار مُردہ عورت کے بالوں کا پن تتلی کا روپ اختیار کر کے اُس کا رہنما بن جاتا ہے اور ظالم کی کمیں گاہ پر منڈلا کر انتقام کے کام کو آسان کر دیتا ہے۔

× × × × × × × × ×

شادی والے گھروں میں جو بڑی بڑی کاغذی تتلیاں نظر آتی ہیں۔ اُن سے کوئی پُراسرار عقیدہ وابستہ نہیں۔ وہ محض ازدواجی محبت اور اس خواہش کی علامت کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں کہ نیا بیاہا جوڑا اپنی زندگی دو ایسی تتلیوں کی طرح ہنستے کھیلتے گزارے جو کسی خوبصورت باغ میں اپنے ہلکے پھلکے پروں سے اُڑ رہی ہوں؛ کبھی اُڑتے اُڑتے دُور اوپر چلی جائیں، کبھی چکر کھاتی ہوئی نیچے اُتر آئیں، لیکن

کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں۔

جاپانی شاعروں نے تتلی کے متعلق کثرت سے طبع آزمائی کی ہے۔ ذیل میں چند منتخب اشعار کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے:۔

(۱)

سوتے ہوئے بھی
کھیل ہی کے خواب دیکھتی ہے
آہ گھاس کی تتلی[۱]!

(۲)

جاگ جاگ!
مَیں تجھے اپنی رفیقہ بنالوں گا
او سوتی ہوئی تتلی[۲]!

(۳)

آہ پنجرے میں پڑے ہوئے پرندے!
تیری پُرحسرت نگاہیں!
اور تتلیوں سے تیرا رشک!

(۴)

ہوا بند ہے

---

[۱] جب تتلی آرام کر رہی ہو، اس وقت بھی اس کے پر وقتاً فوقتاً ہلتے نظر آتے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُڑنے کے خواب دیکھ رہی ہے۔

[۲] بہار میں جوشِ مسرت کا اظہار مقصود ہے۔

لیکن تتلیوں کے پھڑپھڑاتے پروں نے
اپنی ہوا باندھ رکھی ہے

---

(۵)

پھول کی پتی جھڑ کر
دوبارہ شاخ کی طرف پرواز کر گئی
ارے یہ تو تتلی تھی !

---

(۶)

ایک دوشیزہ چلی جا رہی ہے ،
تتلی کبھی اُس کے آگے ہو جاتی ہے ،
کبھی پیچھے ۔

---

(۷)

اری تتلی !
تُو اُس کے پیچھے جا رہی ہے ،
جس نے پھول چُرائے ۔

---

(۸)

تتلیاں سب کی سب ،
یوں معلوم ہوتی ہیں
کہ اِن کا سن پندرہ یا سولہ برس کا ہے ۔

---

(۹)

تتلی اِس طرح کھیل رہی ہے!
گویا اِس دُنیا میں
دُشمنی اَور کینے کا نام ہی نہیں

---

(۱۰)

تتلی یُوں اِدھر اُدھر اٹھکیلیاں کرتی پھرتی ہے
گویا اِس دُنیا میں
اسے اَور کسی چیز کی خواہش ہی نہیں

---

(۱۱)

تم نے کہا ایک دُوسرے کے ساتھ خوش رہیں؛
ہاں اگر کسی آئندہ جنم میں ہم خیاباں کی تتلیاں بن جائیں
تو ہم میں موافقت پیدا ہو سکتی ہے[1]۔

---

(۱۲)

کاش وُہ دِن کبھی نہ گزرتے
اَور میرا دِل ہمیشہ
تتلیوں کے پیچھے دوڑنے کی خوشی محسوس کرنے کے قابل رہتا!

حامد علی خاں

---

[1] مشہور شاعر اِستا نے اپنی بی بی کو طلاق دینے کے موقع پر یہ شعر کہے تھے۔

ہندوستان کی قومی زبان

(ہندی یا ہندوستانی)

اُردو ہندی کا جھگڑا یوں تو اُنیسویں صدی کے اواخر ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ مگر اب کچھ عرصہ سے یہ مسئلہ ایک ہنگامہ خیز بحث بن گیا ہے۔ اُردو کو پسند کرنے والے طبقے کی طرف سے اُردو کے حق میں اور ہندی کے پجاریوں کی طرف سے ہندی کی حمایت میں دلیلیں دی جا رہی ہیں۔ مضامین پر مضامین لکھے جا رہے ہیں۔ دونوں طرف سے اپنی اپنی زبان کو قومی زبان ثابت کیا جا رہا ہے۔ اور ہندوستانی قومیت کی بہت بڑی دماغی قوت کو جو ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں صرف کی جا سکتی تھی، اس باہمی نزاع پر ضائع کیا جا رہا ہے۔

کسی ملک کی قومی زبان کا مسئلہ اس وقت تک پیچیدہ رہتا ہے۔ جب تک اس کے تاریخی پس منظر کو پیشِ نظر نہ رکھا جائے۔ ہندوستان کی تاریخ کی گذشتہ سات آٹھ صدیوں پر نگاہ ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ جب مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں تمام ہندوستان کے باشندوں کو ایک دُوسرے کے ساتھ مِل بیٹھنے اور باہمی رسم و راہ کو بڑھانے کی ضرورت پڑی تو ان کے میل جول سے ایک زبان پیدا ہو گئی۔ ہندوستان کے باشندوں کی زبان ہونے کے سبب سے اس زبان کا نام ہندی یا ہندوستانی رکھا گیا۔ اور چونکہ مختلف مذاہب اور قوموں کے لوگوں کا اختلاط سب سے زیادہ شاہی افواج میں ہوتا تھا اور وہاں ہی سے زبان پیدا ہو کر پھیل رہی تھی۔ اس لئے اس زبان کو اُردو بھی کہا جانے لگا۔

مختصر تر لفظوں میں یوں سمجھئے کہ اُردو یا ہندوستانی بارھویں صدی سے لے کر اٹھارھویں صدی عیسوی تک کے ہندو مسلمانوں کے مِل بیٹھنے، دو مختلف معاشرتوں، مختلف مذہبوں اور مختلف تمدنوں کے باہم شیر و شکر ہونے کی زندہ یادگار اور ہندو اور مسلمان اہلِ قلم کی کوششوں سے لگایا اور سینچا ہُوا تناور درخت ہے۔

انجمنِ اُردو پنجاب کے فاضل صدر پنڈت برجموہن کیفی اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں :-

"اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترک مساعی اور اتحاد کا نتیجہ ہے۔ اس کی تنظیم و تدوین میں ان دونوں فرقوں کی شرکت ہے یہ تنظیم سلطان اور رعایا، حاکمی اور محکومی، افسری اور ماتحتی کی لم سے مبرا ہے۔ وُہ ایک مبارک ثمر تھا۔ اس ادبی کلپ برکش اور طوبیٰ کے پوند کا جو قدرت نے ہندوستان کی سرزمین میں بھیجے۔ یہاں معاشرت نے انہیں پیوند کیا۔ رواداری نے اس کو تہذیب و تمدن کے امرت سے سینچا اور شائستگی نے اس کی ضروری شاخ تراشی کی، حسن سلیقہ اور شعورِ لغیاتی نے موافق ہوا مہیا کی۔ تب یہ قلمی پودا (اُردو) پروان چڑھا اور پھلا پھولا۔" (بحوالہ "ادبی دُنیا" نومبر ۱۹۳۶ء صفحہ ۴۶۸)

اسی طرح سر تیج بہادر سپرو نے انجمن بہارِ ادب کے ایک جلسے میں فرمایا۔ کہ

"اُردو ہندو اور مسلمانوں دونوں کے اسلاف کی بنائی ہوئی زبان ہے۔" (اُردو اپریل ۳۸ء)

اس حقیقت سے کسی صاحب علم و بصیرت کو انکار نہیں کہ اُردو یا ہندوستانی ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی یادگار ہے۔ اور اس کی تشکیل میں دونوں قوموں کی روایات کا برابر کا حصّہ ہے۔ انگریزوں کے راج سے پہلے ہندوستان کی دفتری زبان تو فارسی تھی مگر ہندو اور مسلمان عوام جو زبان بولتے اور سمجھتے تھے۔ وُہ یہی اُردو یا ہندوستانی تھی۔ اور اُنیسویں صدی کے ربع آخر سے قبل ہندوستانیوں کے ذہن میں کوئی افتراق انگیز رجحان موجود نہ تھا۔ ہندو مسلمانوں کے صدیوں کے میل جول سے ایک زبان پیدا ہو گئی تھی۔ جسے ہندوستانیوں کی اکثریت بولتی اور سمجھتی تھی۔ ہندو اور مسلم یکساں اس کی آبیاری کرتے تھے۔ اس زمانے کے ہندو اہلِ قلم میں سے لچھمی نرائن شفق، ٹیک چند بہار۔ لالہ مادھو رام، دیا شنکر نسیم اور پنڈت نوبت رائے کے اسما ان ہندوستانیوں کے ذہن سے فراموش نہیں ہو سکتے جن کو ہندوستان کی قومی زبان سے ذرا بھی محبت ہے۔

مسلمانوں کی حکومت کے اختتام پر انگریزی حکومت کے ابتدائی دَور میں کلکتہ کا فورٹ ولیم کالج محض اس لئے کھولا گیا کہ فارسی کو ترک کر کے ہندوستان کی قومی اور وطنی زبان میں لٹریچر پیدا کیا جائے۔ اس کام کے لئے ہندوستان بھر کے ہندو مسلم اہلِ قلم حضرات کو چُن لیا گیا؛ اور ایک غیر ملکی حکومت کی سرپرستی میں جس زبان کو ملکی زبان قرار دے کر اس میں تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا گیا وُہ کسی پر مخفی نہیں۔

یورپ سے جو بہت سی نعمتیں ہندوستانیوں پر نازل ہوئیں۔ ان میں ایک "قومیت کا تصوّر" بھی ہے۔ اس تصوّر سے ہندوستان کے باشندے بہت متاثر ہوئے۔ مغربی خیالات اور مغربی ممالک کے واقعات کی رَو نے اس تصوّر کو تقویت بخشی۔ یہاں تک کہ اُنیسویں صدی کے اواخر ہی میں ہندوستان میں ایک نیشنل جماعت کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ اور ۱۸۸۵ء میں اس کی تشکیل بھی عمل میں آگئی۔

برادرانِ وطن یعنی ہندوؤں میں اس سے قبل علیحدہ قومیت کا تصوّر موجود نہ تھا۔ اس تصوّر کے پیدا ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہُوا کہ بعض ہندو لیڈروں نے ہندو عوام کو اپنے پراچین اور ویدک تمدّن کی طرف توجہ دلائی اور قوم کے تنِ مُردہ میں زندگی پیدا کرنے کے لئے اس کا احیا ضروری بتایا۔ چونکہ تہذیب و تمدّن کے مسائل میں زبان کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ اِس لئے اُردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے کر اس کے سامنے ہندی کو لا کھڑا کیا گیا۔ اور اسی وقت سے یہ جھگڑا پیدا ہو گیا۔

اُردو یا ہندوستانی کی تخلیق و تشکیل کا دُھندلا سا تاریخی پس منظر تو آپ نے دیکھ لیا اس کو سامنے رکھتے ہوئے یہی نتیجہ نکلتا ہے، کہ ہندوستان کی قومی زبان اُردو ہی ہو سکتی ہے اور ہے لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسا ہے تو پھر یہ ہنگامہ کیوں برپا ہے؟ جواب صاف

ہے کہ محض تعصب اور غلط تعصب کی وجہ سے ایک ایسی زبان کے مقابلے میں جو ہندو مسلمانوں اور دیگر ہندوستانی قوموں کے اتحاد اور یگانگت کی یادگار ہے۔ "ہندی" کو لاکر کھڑا کیا جا رہا ہے۔ سر تیج بہادر سپرو جیسے فاضل سے پوچھئے۔ تو وہ فرماتے ہیں کہ

"اُردو زبان پر اس سے زیادہ کوئی ظلم نہیں ہو سکتا کہ اس کو مسلمانوں سے منسوب کر کے چھوڑ دیا جائے۔ اُردو در اصل ہندو اور مسلمانوں دونوں کے اسلاف کی بنائی ہوئی زبان ہے۔ اُردو زبان کا بڑا کام یہ رہا ہے کہ ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کی تہذیب و تمدن کے سمجھنے اور اختیار کرنے میں سہولت دے تاکہ باہمی یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا اور قائم ہو سکے اور ہندو مسلم اتحاد کا انحصار محض اُردو کی بقا پر ہے۔" (اُردو ۔ اپریل ۱۹۳۸ء)

مگر ہم حیران رہ جاتے ہیں جب ہمیں ایک دوسری آواز سنائی دیتی ہے کہ

"اُردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔"

یہ آواز خواہ کتنے ہی بڑے اور عظیم الشان آدمی کی ہو مگر حقیقت سے بہت دُور ہے۔ اس سے ناجائز تعصب کی بُو آ رہی ہے۔ اور اس کو بلند کرنے والا ہندوستان کی آزادی اور ہندوستانی تہذیب و تمدن کا بہی خواہ نہیں کہلا سکتا۔

معاملہ بالکل صاف تھا کہ ہندوستان کی قومی زبان وہی ہے۔ جو ہندو مسلمانوں کے ہزار سالہ اتحاد و اختلاط کی یادگار ہے۔ مگر اس صاف معاملے کو ٹیڑھا اس طرح بنایا گیا کہ پہلے تو کہا گیا کہ بعض پُرانے مصنفین اور غیر ملکی مستشرقین نے ہندوستان کی قومی زبان "اُردو" کو نہیں قرار دیا بلکہ ان کے نزدیک ہندوستان کی قومی زبان کا نام "ہندوستانی" ہے۔ اس کا جواب دیا گیا کہ یہ تو اسی اُردو کا دُوسرا نام ہے تو ایک اَور بیخ نکالی گئی اَور وُہ یہ کہ ہندوستان کی قومی زبان ہندی یعنی ہندُستانی ہے۔ پہلے تو اس ہندی یعنی ہندستانی کی اُپج پر اعتراض ہوئے مگر جب رواداری کو کام میں لاتے ہوئے اسے بھی برداشت کر لیا گیا۔ تو ایک قدم اَور آگے بڑھایا گیا۔ اور "یعنی" کو اُڑا کر ہندوستان کی قومی زبان کا نام "ہندی اتھوا ہندوستانی" تجویز کیا گیا۔

اس کے بعد یہ بحث چلی کہ مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں چونکہ ہندوستانی زبان میں عربی اور فارسی کے بہت سے غیر مانوس الفاظ آ گئے ہیں۔ اس لئے ان کو نکال کر زبان کو پوتّر کر دیا جائے۔ ان متعصبانہ کوششوں کا نتیجہ اچھا کس طرح نکل سکتا تھا۔ ہُوا یہ کہ صدیوں کے گلے ملے ہوئے ہندو مسلمان ایک دُوسرے سے دُور ہونے لگے۔ اور آج ہندوستان کو ہر کام میں محض اس لئے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس کے باشندوں میں کسی امر پر بھی اتفاق رائے موجود نہیں۔ اور اس ملک کی دو بڑی قومیں ایک دوسرے سے دُور ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

اُردو کی ہمہ گیری اور ہندوستان کی قومی زبان ہونے کی اہلیت کا اعتراف تو مخالفین کے قلب و دماغ بھی کرتے ہیں۔ مگر چونکہ یہ اپنی

اور ویدک تہذیب کے احیا کا جن بھی سوار ہے۔ اس لئے اُردو کی مخالفت کے لئے طرح طرح کے حیلے اور بہانے تلاش کئے جاتے ہیں۔ ہندوستان کی سب سے بڑی قومی جماعت انڈین نیشنل کانگریس کے اس اعلان کے بعد کہ :-

"ہندوستان کی قومی زبان وہ صاف وسلیس اُردو ہے، جو شمالی ہندوستان کے شہروں میں بولی جاتی ہے اور جو فارسی اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں لکھی جاتی ہے۔"

اگر علی الاعلان مخالفت نہیں ہو سکتی تو غیر مانوس اور مانوس الفاظ کی آڑ میں ہندوستانی کو مٹانے کی ناپاک کوشش کی جاتی ہے حالانکہ مانوس اور غیر مانوس الفاظ کا سوال ہی سرے سے نیک نیتی پر مبنی نہیں۔ پھر خدا جانے کسی لفظ کے مانوس یا غیر مانوس ہونے کا فیصلہ کون کرے گا؟ بظاہر زبان سے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ نکال کر زبان کو پاکیزہ بنانے کے معصوم ارادے بہت خوش آئند ہیں۔ مگر عملاً ستم یہ ڈھایا جا رہا ہے کہ وُہ الفاظ جو صدیوں سے زیرِ استعمال ہیں اور جن کو ہندوستان کا بچہ بچہ سمجھتا ہے غیر مانوس قرار دے کر خارج کئے جا رہے ہیں۔ صوبہ متحدہ غیر مانوس نام تھا اس کی جگہ "جُبٹ صوبہ" کا مانوس نام وضع کیا گیا ہے۔ ضمنی سوال کی جگہ "دِم سوال"۔ لیکن کی جگہ پرنتو اور کیول جیسے مانوس الفاظ نے لے لی ہے۔ فرض۔ ادبی۔ عادت۔ وقت۔ زندگی۔ اُمید۔ قوت۔ تعلیم۔ تعلق۔ ہزار۔ فائدہ۔ ترقی۔ مشق۔ ذریعہ مضمون۔ حفاظت۔ شور و غل۔ قاعدہ۔ طلوع ہونا۔ طرزِ حکومت اور اور بہت سے ایسے الفاظ ہیں جنہیں ہر ہندوستانی خواہ ہندو ہو خواہ مسلم، سمجھتا اور روزمرہ کی گفتگو میں استعمال کرتا ہے۔ مگر ان سب کو غیر مانوس قرار دے کر ان کی جگہ کرتویہ، ساہتیہ، سوبھاؤ، سمئے، جیون، آشا، شکتی، شکشا، سمبندھ، انیکتا، ہتوں، وردھی، ابھیاس، دورا، درشے، رکچھا، نشچئے، کلاہل، ویاکرن، اودئے، راج نیتی جیسے مانوس الفاظ منتخب ہو گئے ہیں جنہیں سمجھنے والوں کی تعداد ہندوستان سے باہر تو خیر خود ہندوستان میں دس بیس لاکھ آدمیوں سے زیادہ نہ ہو گی۔

یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی، آیئے مستقبل کے آزاد ہندوستان کی مزعومہ قومی زبان کے ایک دو مستند نمونے دیکھ لیجئے، کیونکہ الفاظ کی تبدیلیوں کی ان مثالوں پر کہا جا سکتا ہے کہ ایسے الفاظ تو صرف وہی لوگ لکھتے ہیں جو ہندوستانی میں سنسکرت اور ہندی کے ہندوستانی عنصر کو غالب دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ مستقبل کے آزاد ہندوستان کی بلند عمارت کو تعمیر کرنے والے معماروں کے انداز بھی اچھے نہیں۔

صوبۂ یو۔پی اُردو کی جنم بھومی کہلاتا اور ہمیشہ سے اُردو کا مرکز رہا ہے۔ آج کل اس صوبہ کی حکومت خوش قسمتی سے آزادیٔ ہند کی علمبردار جماعت کانگریس کے ہاتھ میں ہے۔ جو چیز مثلاً قانون یا زبان، اس صوبہ کی قومی حکومت پیش کرے گی ظاہر ہے کہ وہی قومی کہلائے گی۔ اس صُوبہ کی وزارتِ تعلیم کا قلمدان شری سمپورنانند جی کو تفویض کیا گیا ہے۔ اگر آج ہندوستان آزاد ہو جائے تو زبان اور تعلیم کے مسائل یہی تعلیم کے ماہرین مل کر حل کریں گے جن کے سپرد آج تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ وزیرِ موصوف زبان کے متعلق کانگریس کے فیصلہ سے بھی بے خبر نہیں ہو سکتے۔ ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے ہندوستان میں بسنے والی قوموں میں جس قدر اتحاد اور یگانگت پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اس سے موصوف آگاہ ہوں گے مگر با ایں ہمہ موصوف کا طرزِ عمل یہ ہے کہ پچھلے دنوں اُنہوں نے ایک تقریر کی۔ اس تقریر کو یو۔پی کی حکومت

کے محکمۂ اطلاعات نے جس عبارت میں شائع کیا۔ وہ یہ تھی:۔

"لکشاسنگھٹن بمتت کے سمکش سنکیت پرانت کے شکشا سچیو مانئے شری سمپورنا نندجی کا ویاکھیان (پرکاش وبھاگ سنکیت پرانتیئے گورنمنٹ)

" ادھنک کال جس میں کہ ہم رہ رہے ہیں۔ اس کی یہ بھی ایک لبشتا ہے کہ تشکشنز ڈشمیا کے پرت لوگوں کا آگرشر ببیت وشدھ اور ببایک ہو گیا ہے۔ یہ بات ادھکانش سبئے سنسار پر گھٹت ہوتی ہے۔ اور ترن سارہم اپنے دیس میں بھی اس لبشیو بیاپی اندولن کے بھن بھن پہلوؤں کو دیکھ رہے ہیں۔ اوران کا ان بھون کر رہے ہیں۔ آج کل ہم اپنے کو جس ہاسنک اور بدھارتک پرتھت میں پاتے ہیں اور ہماری اس استھت کا جو سماجک راج نیتک اور ارتھک ادھار ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہم نے اپنے پوروجوں سے جو سنسکرت پائی ہے، اس سے وشیو دیاپی پرگت کو ہمارے سنکرتش سندیہہ ایک لبشیس روپ میں ایشتھت کیا ہے اور ایک بھارتیئے سمیہ بنا دیا ہے۔"

بقول فاضل مدیر "نگار" لکھنو یہ جناتی زبان سُن کر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ہم بیسویں صدی کے کسی جلسہ میں شریک ہیں۔ بلکہ چندر گپت اور اشوک کے دربار کا منظر سامنے آجاتا ہے۔ اور مسلمان تو مسلمان ہندو بھی پچاس فی صدی ان تقریروں کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہتی ہے۔ اسی طرح بھارت ساہتیہ پریشد کے اجلاس ناگپور کی صدارت کرتے ہوئے مہاتما گاندھی نے جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔ وہ یوں شروع ہوتا ہے:۔

" اس سبھا کا سبھا تپیتو دینے کا کارن جب میں ڈھونڈتا ہوں تو دو ہی پرتیت ہوتے ہیں۔ ایک میرا ساہتیہ کار نہ ہونا اور اس لئے کم سے کم دوش کا کارن ہونا۔ تتھا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم۔ جو کچھ ہو۔ میں آشا کرتا ہوں کہ ہم کچھ نہ کچھ سیوا کریں گے اور بھوشیہ میں اپنا شیو اکشیتر بڑھا دیں گے۔ یدی ہم شری نگر سے لے کر کھنیا کماری تک اور کراچی سے لے کے ڈبروگڑھ تک جو پردیش ہے، اسے ایک مانتے ہیں۔ اور اس کے لوگوں کو ایک پرجا سمجھتے ہیں۔ تو اس پردیش کے پرتیک بھاگ کے ساہتیہ کار بھاشا۔ شاستری اتیادی آپس میں کیوں نہ ملیں۔ اور بھن بھن بھاشاؤں دوارا ہندوستان کی سیوا کیوں نہ کریں"

(جامعہ مئی ۱۹۳۶ء)

اس سے بڑھ کر قابل غور گاندھی جی کا وہ خیال ہے جو ٹریبیون مورخہ ۸ جولائی ۱۹۳۷ء میں ہریجن کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے۔ اس میں گاندھی جی نے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ:۔

"ہندی زبان ہی ہندوستان کی قومی زبان ہے اور دیوناگری رسم الخط ہی ہندوستان کا رسم الخط ہونا چاہئے"۔

آج بدقسمتی سے ہندوستان غلام ہے اور ایک مدت سے ان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ مگر اب یہ غلامی زیادہ دیر تک باقی نہیں رہ سکتی۔ ہم جس دور میں سے گزر رہے ہیں اسے بقول پنڈت جواہر لال نہرو برطانوی شہنشاہیت کی شام کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔

سو جب تک ہم غلام ہیں آپ کا جو جی چاہے کیجئے۔ ہندوستان میں بسنے والی دو بڑی قوموں کے درمیان تشتت و افتراق کی خلیج کو وسیع کرتے چلے جائیے۔ آپ کو کوئی روکنے والا نہیں۔ بلکہ اُلٹی آپ کی پیٹھ ٹھونکی جائے گی۔ مگر آخر کار ہندوستان آزاد ہوگا۔ اور اسے آزاد ممالک کی طرح دُنیا کی دُوسری حکومتوں سے تعلقات پیدا کرنے ہوں گے۔ اس وقت ہندوستان میں بسنے والوں کو جو ہندوستان کو دُوسرے آزاد ممالک کے دوش بدوش کھڑا دیکھنا چاہیں گے۔ معلوم ہوگا کہ یہ خیال کس قدر خطرناک اور ہندوستان کو آزادی کی دوڑ میں پیچھے رکھنے والا تھا کہ:۔

"ہندی زبان ہی ہندوستان کی قومی زبان ہے اور دیوناگری رسم الخط ہی ہندوستان کا رسم الخط ہونا چاہیئے"۔

اب جب کہ یہ مسئلہ ایک ہنگامے اور منظم جنگ کی صُورت اختیار کر کے ہندوستان کی جنگِ آزادی میں رُکاوٹ پیدا کر رہا ہے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ اور حق و انصاف کا جو تقاضا ہو وہی فیصلہ کر کے اس روز روز کے جھگڑے کو ختم کر دیں۔ انڈین نیشنل کانگرس چونکہ ہندوستان کی سب سے بڑی قومی جماعت ہے اور ہندوستان کی آزادی کا انحصار اسی جماعت کی قربانیوں سے وابستہ ہے اس لئے اس جھگڑے کو سلجھانے اور عملی طور پر اسے دُور کر دینے کا فرض بھی اسی جماعت پر عائد ہوتا ہے۔

اس حقیقت سے تو کسی کو مجالِ انکار نہیں کہ کسی ملک کی قومی زبان وہی ہو سکتی ہے:۔

(۱) جسے اس ملک کے زیادہ سے زیادہ باشندے بولتے اور سمجھتے ہوں۔

(۲) جس زبان کو غیر ممالک کے لوگ اس ملک کی قومی زبان سمجھتے ہوں۔

(۳) جو بین الاقوامی تعلقات کے نبھانے میں ملک کے کام آسکے۔

(۴) کسی ایسے رسم الخط میں لکھی جاتی ہو جو اگر ساری دُنیا میں رائج نہ ہو۔ تو کم از کم جس ملک کی وُہ زبان ہو، اس کے اردگرد کے ممالک تو اس کے رسم الخط سے شناسا ہوں تاکہ حکومتوں میں باہمی تعلقات پیدا کرنے اور قائم رکھنے میں سہولت ہو۔

یوں تو ہندوستان میں بنگالی، مدراسی، ملیالم، گجراتی، سندھی، بھاشا اور پنجابی بے شمار زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جن میں سے بعض بجائے خود نہایت نہایت اعلیٰ درجے کی زبانیں ہیں مگر جو زبان مندرجۂ بالا خصوصیات کی حامل ہو سکتی ہے وہ صرف اُردو یا ہندوستانی ہی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہندوستان کے ۳۵ کروڑ باشندے سارے کے سارے نہ اُردو بولتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں۔ مگر جو زبان ہندوستان کے ہر حصے اور کونے میں بولی اور سمجھی جاتی ہندوستانی اکثریت کی زبان ہے۔ وُہ یہی اُردو یا ہندوستانی ہے۔

غیر ممالک کے باشندے بھی اسی اُردو کو ہندوستان کی قومی زبان سمجھتے ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں جب فارسی زبان کو ترک کر کے ہندوستان کی قومی اور ملکی زبان میں کتابیں ترجمہ کرنے کا سوال پیدا ہؤا تو غیر مُلکی حکومت کے نمائندوں نے اسی اُردو یا ہندوستانی کو ہندوستان کی قومی زبان قرار دیا۔ فورٹ ولیم کالج سے اُردو میں تو بے شمار کتابیں طبع ہو کر نکلیں۔ مگر اس زمانے میں سارے ہندوستان بھر سے ہندی کی چند مذہبی کتابوں کے سوا کوئی کتاب شائع نہ ہوئی۔

علاوہ ازیں ایک ہندوستانی کو خواہ وہ کسی مذہب و ملّت سے تعلق رکھتا ہو۔ جب ہندوستان سے باہر ہندوستان کی مُلکی زبان میں گفتگو کرنے کی ضرورت پڑتی ہے تو وہی زبان استعمال کرتا ہے جسے اُردو یا ہندوستانی کہا جاتا ہے۔

بین الاقوامی تعلقات قائم کرنے اور ان کو نباہنے کی صلاحیت اُردو میں ہندوستان کی دیگر تمام مروّجہ زبانوں سے زیادہ ہے ایس کی تو تشکیل ہی دُنیا کی بہت سی زبانوں کے امتزاج سے ہوئی ہے۔ اگر اس میں ایک طرف غیر ملکی زبانوں عربی، فارسی، ترکی اور انگریزی کے الفاظ موجود ہیں تو دوسری طرف ہندوستان کی صوبجاتی زبانوں بنگالی، ہندی، سنسکرت اور پنجابی کے الفاظ سے بھی اس کا دامن خالی نہیں۔

اس کے مقابلے میں سنسکرت آمیز ہندی صدیوں سے متروک ہو چکی ہے اور گو اب اسے پھیلانے اور قومی زبان بنانے کی سر توڑ کوششیں کی جا رہی ہیں مگر ابھی تک ہندوستان کے کسی حصّے میں بولی اور سمجھی نہیں جاتی۔ اس کی مثال تو ایک ایسی زبان کی سی ہے جس میں کبھی کبھار کوئی کتاب تو شائع ہو جاتی ہو مگر کہیں روزمرہ کی گفت گو میں استعمال نہ کی جاتی ہو۔

اُردو زبان جیسی وسیع اور اکثریت کی زبان کو مٹا کر اس کی جگہ ایک مٹی ہوئی زبان کو زندہ کرنے کے معنی تو یہ ہوں گے کہ ہندوستان تہذیب و تمدّن کے لحاظ سے کئی سَو سال پیچھے جا پڑے گا۔ اور نا معلوم عرصہ تک غلامی کی زنجیروں میں جکڑا رہے گا۔

پچھلے دنوں راشٹرپتی مسٹر سوبھاش چندر بوس پنجاب آئے تو انہوں نے اپنی تقریروں میں جگہ جگہ یہی فرمایا کہ ہندوستان کو برطانوی حکومت کی موجودہ مشکلات اور کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر جلد از جلد آزادی حاصل کرنی چاہیئے اور چونکہ بہت جلد آزادی کا حصُول یقینی ہے اس لئے نہ صرف آزادی حاصل کرنی چاہیئے بلکہ آزادی حاصل ہو جانے کے بعد آزادی کی رکھشا کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔

راشٹرپتی کی دُور رس نگاہیں مستقبل میں کتنی دُور اور کس قدر صحیح منزل تک پہنچ گئی ہیں۔ اے کاش سوبھاش چندر بوس اور آزادیٔ ہندوستان کے دوسرے علم برداروں کو یہ بھی سُوجھتا کہ آزاد ہندوستان کو اسی دُنیا میں رہنا ہوگا۔ یہ تو ہونے سے رہا کہ آپ ہندوستان کو آزادی دلا کر اِرد گرد کے حالات اور بین الاقوامی واقعات سے آنکھیں بند کر کے بیٹھ جائیں۔ اس زمانے میں تو کرۂ ارض کے کونے کونے کے واقعات کا اثر دُنیا کے تمام ممالک پر پڑتا ہے، اس لئے آزاد ہندوستان کے لئے ضروری ہوگا کہ وُہ تمام دُنیا اور کم از کم ایشیائی حکومتوں سے باہمی تعلقات پیدا کرے، ان سے تجارتی، اقتصادی اور جنگی معاہدے کرے۔ سو اگر یہ سب کچھ لابدی ہے تو ہندوستان کی قومی زبان کا مسئلہ دوسرے مسائل سے اہم اور سب سے پہلے حل ہونے کا محتاج ہے۔ اس سے تو کسی کو مجالِ انکار نہیں کہ جو زبان شری سمپورنانند جی وزیر تعلیمات صوبہ یوپی ہندوستان کی قومی زبان بنانا چاہتے ہیں وُہ ملکی اور قومی ضروریات کو پُورا نہ کر سکے گی اور نہ صرف بیرونی ممالک کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے میں ہارج ہوگی بلکہ اسے سمجھنے کے لئے تو خود ہندوستان کے ۳۵ کروڑ باشندوں میں سے چونتیس کروڑ پچاس لاکھ باشندوں کو از سرِ نَو زبان کی تعلیم حاصل کرنی پڑے گی۔

اسی طرح رسم الخط کا مسئلہ بھی بہت اہم ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے وسیع و عریض ملک کے مختلف صوبوں میں دیوناگری اور

بعض دوسرے رسم الخط رائج کئے جائیں مگر جو رسم الخط مستقبل کے آزاد ہندوستان کی قومی زبان کا ہو سکتا ہے وہ فارسی رسم الخط ہی ہے۔ یہ رسم الخط ہندوستان کے اردگرد کے تمام ممالک میں رائج ہے اور ہندی رسم الخط تو خود ہندوستان میں بھی بہت کم رائج ہے۔

رسم الخط کو دیوناگری میں بدلنے کے حق میں عام طور پر دو دلیلیں پیش کی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہندوستان کی تمام اقوام نے انگریزی کی تحصیل کی، جو نہ صرف الگ زبان تھی بلکہ اس کا رسم الخط بھی جُدا تھا۔ دُوسرے یہ کہ ترکوں نے اپنا عربی رسم الخط بدل کر لاطینی رسم الخط رائج کر دیا۔ یہ دلیلیں بظاہر تو وزن دار ہیں مگر ان پر ذرا سی غور کرنے سے اصل حقیقت معلوم ہو جاتی ہے۔ انگریزی زبان کی تحصیل اور انگریزی رسم الخط کی ترویج تو غلامی کی لعنتوں میں ایک لعنت تھی۔ آزاد ہندوستان کی عمارت تعمیر کرتے ہوئے غلامی کے زمانے کے واقعات کو جو حکومت کی تلوار کے سائے میں بروئے کار آئے تھے پیش کرنا کسی طرح درست نہیں۔ اسی طرح ترکوں کی مثال بھی صریحًا دھوکا ہے۔ اوّل تو ترکوں کے حالات ہم سے مختلف ہیں، وُہ چاروں طرف سے ایسی قوموں اور حکومتوں میں گھرے ہوئے ہیں جن میں سے اکثر کا رسم الخط لاطینی ہے۔ ان کے ساتھ روابط قائم کرنے اور حکومت کو مضبوط بنانے کے لئے پبلک کو ان ممالک کے حالات سے خبردار رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ ملک میں وہی رسم الخط رائج کیا جائے جو اُن کی ملکی ضروریات کا کفیل ہو سکے۔ مگر ہندوستان کے حالات تو اس کے بالکل خلاف ہیں۔ ہندوستان کی جغرافیائی حالت کا تقاضا تو یہ ہے کہ اگر ہندوستان کی قومی زبان کا رسم الخط دیوناگری ہو بھی تو اسے بدل کر نستعلیق کر دیا جائے، کیونکہ دیوناگری رسم الخط سے بیرونی دُنیا قطعًا ناآشنا ہے۔

دُنیا کی تمام قومیں ترقی کے میدان میں انتہائی سُرعت اور ثابت قدمی کے ساتھ بڑھتی چلی جا رہی ہیں، مگر غریب ہندوستان ابھی تک باہمی جھگڑوں کے باعث غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہُوا ہے اور اس کی غلامی نہ صرف اپنے لئے بلکہ دُنیا کے اور کئی ممالک کے لئے مصیبت کا مُوجب ہو رہی ہے۔ ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ وُہ باہمی جھگڑوں کو چھوڑ کر ملک کے مستقبل کو شاندار بنانے میں سردھڑ کی بازی لگا دے۔ ہندوستان کی آزادی کے لئے صحیح اور مضبوط قدم صرف اسی وقت اُٹھایا جا سکے گا جس وقت ہندوستان کی تمام قومیں اور بالخصوص ہندو مسلمان متحد و یکجان ہو کر جنگِ آزادی میں حصّہ لیں گے۔ ہندو مسلمانوں میں اتفاق اور اتحاد پیدا کرنے کا یہ نسخہ صحیح نہیں کہ ان کے گذشتہ اتحاد اور یگانگی کی جو نشانیاں باقی ہیں ان کو بھی مٹا دیا جائے۔ بلکہ صحیح نسخہ یہ ہے کہ گذشتہ پانچ سات صدیوں کے اتحاد کی یادگاروں کو قائم رکھ کر مضبوط کیا جائے۔ اُردو زبان ہندو اور مسلمانوں دونوں کے اسلاف کی بنائی ہوئی زبان ہے اور بقول سر تیج بہادر سپرو "ہندو مسلم اتحاد کا انحصار محض اُردو زبان کی بقا پر ہے۔" اس لئے ہر وُہ فرزندِ وطن جو وطن کا سچا بہی خواہ ہے اور ہندوستان کی آزادی کے لئے ہندو مسلم اتحاد کو ضروری سمجھتا ہے اُردو کی بقا اور ترقی کی کوشش کرے۔ کیونکہ ہندوستان کی آزادی کا انحصار محض ہندو مسلم اتحاد پر ہے اور اس اتحاد کا انحصار اُردو زبان کی بقا پر +

محمد فاضل

اُردُو

یہ جو اُردو زبان ہے پیارے　　جانِ ہندوستان ہے پیارے

فقرہ فقرہ ہے اِس کا سحرِ حلال　　یہ وُہ جادُو بیان ہے پیارے

اس کی تخئیل کی بلندی سے　　پست ہر آسمان ہے پیارے

دادِ رُوح القدس نے دی جس کی　　وُہ ہماری زبان ہے پیارے

کیوں چلاتے ہو اس پہ کُند چھُری　　یہ ابھی نوجوان ہے پیارے

کتنے جوکھوں سے یہ جوان ہوئی　　یہ بڑی داستان ہے پیارے

عربی، پارسی ہو یا ہندی،　　ایک ہی خاندان ہے پیارے

لگ گئی ہے کسی کی اس کو نظر　　مجھ کو ایسا گمان ہے پیارے

کیوں کرے ورنہ باغ کو برباد　　وُہ جو خُود باغبان ہے پیارے

جان سے بھی عزیز ہے اُردو　　کیونکہ مُلکی زبان ہے پیارے

اِس سے ہندوستاں کی عزّت ہے
اِس سے بھارت کی شان ہے پیارے

کشفی مُلتانی

جوار بھاٹا

افراد: پہلا مسافر: پاگل خانہ سے بھاگا ہوا قیدی
دُوسرا مسافر: خورشید ایک نوجوان
ریلوے گارڈ - اسٹیشن ماسٹر

منظر: ریل گاڑی کا فسٹ کلاس کا ڈبّہ

(چلتی گاڑی کا شور سُنائی دے رہا ہے۔)

مسافر: کھڑکی بند کرنے میں آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا!

خورشید: (خوشی سے) ضرور!

مسافر: (کھڑکی بند کرتے ہوئے) شکریہ! معاف کیجئے۔ میں ایک عرصہ سے تنہائی کی زندگی بسر کرنے کا عادی ہوگیا ہوں اس لئے میں نے کھڑکی بند کرنے کی اجازت چاہی۔

خورشید: جی ہاں!

مسافر: بالکل گوشۂ تنہائی۔ درونِ خانہ

خورشید: کیوں؛ خرابیٔ صحت کے باعث؟

مسافر: نہیں۔ ویسے تو میں بالکل تندرست ہوں۔

خورشید: شاید آپ احتیاط برتتے ہوئے ٹھنڈی ہوا سے بچنا چاہتے ہوں گے۔

مسافر: نہیں جناب۔ بات ذرا عجیب سی ہے۔ بالکل عجیب۔ اور شاید آپ اُسے پسند کریں گے۔

خورشید: کیوں نہیں۔

مسافر: ایک غلطی کا خمیازہ مجھے بھگتنا پڑا ــــ ایک عرصے کی بات ہے۔ ابھی وائرلیس کا رواج عام نہ تھا۔ اس وقت مجھے اس سائنس میں دلچسپی تھی ــــ بہت دلچسپی، قصہ کوتاہ مجھے لوگ دیوانہ سمجھنے لگے۔

خورشید: توبہ! توبہ! لوگ بھی پاگل تھے۔

مسافر: آپ تو مجھے پاگل نہیں سمجھتے۔

خورشید۔ ہرگز نہیں جناب،

مسافر۔ خیر، لوگوں کا بھی خیال تھا۔ اگر اُن کو صرف یہی فکر ہوتی تو کچھ مضائقہ نہ تھا۔ مگر میرا دماغ خود وائرلیس تھا جس سے وہ اور بھی متردد ہوئے

خورشید۔ وائرلیس دماغ ؛

مسافر۔ جی ہاں وائرلیس دماغ، بلکہ کان بھی وائرلیس۔ میں بہت زیادہ حساس ہوں۔ لکڑی کے ایک ڈبے میں سے آپ ہندوستان میں بیٹھے لندن کی خبریں سُن سکتے ہیں۔ مگر انجان کے لئے یہ ایک وہم ہے۔ انسانی دماغ بہت نازک اور حساس ہوتا ہے۔ اس سے بھی یہ کام لیا جا سکتا ہے۔

خورشید۔ یہ کیسے ممکن ہے ؛

مسافر۔ کیوں نہیں، ہماری آواز کرۂ ہوائی میں تیرتی پھرتی ہے۔ موجودہ سائنس نے ہمیں بتایا ہے کہ ہم اِن آوازوں کو پکڑ سکتے ہیں اسی نظریہ کا نتیجہ وائرلیس ہے۔ جتنا حساس یہ آلہ ہوگا۔ اتنی صاف آوازیں ہم سُن سکیں گے۔ میرا دعوےٰ اور تجربہ ہے کہ چونکہ میرا دماغ بہت زیادہ حساس ہے، اس لئے میں اِن آوازوں کو سُن سکتا ہوں۔

خورشید۔ حیرت انگیز اور عجیب بات ہے۔

مسافر۔ بُرا ہو تعصب کا، لوگوں نے اس پر غور کرنے کے بجائے مجھے دیوانہ سمجھا۔ میری باتوں کو مجذوب کی بڑ جانا۔ مجھ پر جبر کیا گیا۔ اور۔۔

خورشید۔ اس سے آپ کو بہت دُکھ ہُوا ہوگا۔

مسافر۔ دُکھ! دُکھ کی بھی ایک کہی۔

خورشید۔ اور شاید اُنہوں نے آپ کو پاگل خانے بھیج دیا ؛

مسافر۔ جی!

خورشید۔ اَور پھر رہا کر دیا ؛

مسافر۔ نہیں۔

خورشید۔ تو ؛

مسافر۔ مگر آخر کار میں آزاد ہو ہی گیا۔

خورشید۔ شکر ہے۔ اب آئندہ کیا ارادہ ہے ؛

مسافر۔ ارادہ ؛ بس یہی کہ اپنے وائرلیس دماغ کی تربیت کروں گا۔

خورشید۔ ضرور۔ مگر زیادہ تر کونسا ریڈیو سٹیشن آپ پکڑ سکتے ہیں ؛

مسافر۔ ریڈیو سٹیشن کونسا ہوتا ہے۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا۔ مگر آوازیں نہایت صاف سُنتا ہوں۔

خورشید۔ آپ کیا سُنتے ہیں؟

مسافر۔ آوازیں

خورشید۔ آوازیں؟

مسافر۔ صرف آوازیں!

خورشید۔ بالکل عجیب بات کہی آپ نے،

مسافر۔ واقعی؟

خورشید۔ عجیب اور دلچسپ۔

مسافر۔ میں اس وقت بھی ایک آواز سُن رہا ہوں۔

خورشید۔ اس وقت؟ مَیں قطعِ آواز تو نہیں کر رہا؟

مسافر۔ نہیں۔ آواز بالکل صاف سنائی دے رہی ہے۔

خورشید۔ آپ کے خیال میں کونسا سٹیشن ہوگا؟

مسافر۔ سٹیشن؟ کوئی معمولی سٹیشن نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک دیوتا کی آواز ہے۔ جو اکثر مجھ سے باتیں کرتا ہے۔

خورشید۔ (حیران ہوکر) دیوتا؟

مسافر۔ جی دیوتا! ہمالیہ کی چوٹی سے بول رہا ہے۔

خورشید۔ ہمالیہ کا دیوتا۔ اس کا مجسمہ کمرے کی آرائش کا کام تو خوب دے سکتا ہے۔

مسافر۔ خوفناک دیوتا۔

خورشید۔ خوفناک! دیوتا!

مسافر۔ مگر ان پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔

خورشید۔ آخر دیوتا ہے ـــ کیا وُہ بولتے ہیں؟ اور کرۂ ہوائی پر بھی اُن کا تصرف ہوتا ہے؟

مسافر۔ ضرور

خورشید۔ آپ اس کی آواز اس وقت بھی سُن رہے ہیں؟

مسافر۔ اس کی آواز بالکل صاف سُنائی دے رہی ہے۔

رشید۔ بالکل غیر معمولی سی بات،
سافر۔ اور اس نے ابھی حکم دیا ہے۔ کہ ـــــ
رشید۔ حکم، کیا؟
سافر۔ ہاں! فوری حکم
رشید۔ اُونہہ!
سافر۔ دیوتا کہتا ہے کہ میں تمہیں قتل کر دوں۔
رشید۔ مجھے قتل کر دیں؟
سافر۔ ہاں آپ کو قتل کر دوں! دیوتا خونی قربانی چاہتا ہے۔
رشید۔ مگر ـــــ
سافر۔ دیوتا کا حکم اٹل ہوتا ہے۔
رشید۔ دیکھئے مذاق ختم کیجئے۔ یہ ریل گاڑی ہے (اُٹھ کر گاڑی ٹھہرانے کی زنجیر کی طرف بڑھتا ہے)
سافر۔ بیٹھ جاؤ۔ اگر اس طرف ایک قدم بھی بڑھایا تو ـــــ
ورشید۔ کیا آپ مذاق کر رہے ہیں؟
سافر۔ مذاق، کیسا مذاق؟
ورشید۔ آپ سنجیدہ ہیں؟
سافر۔ بالکل ـــ (جیب سے چاقو نکالتا ہے)
خورشید۔ اوہو!
سافر۔ دیوتا کا حکم اٹل ہے۔

(خورشید کو احساس ہوتا ہے کہ اس کا ساتھی خوفناک قسم کا پاگل ہے۔)

خورشید۔ دیوتا کا حکم تو اٹل ہے مگر ـــ آپ کا وارلیس دماغ صبح سے ٹھیک تو ہے۔ بعض دفعہ اچھے اچھے ریڈیو سٹ کرہ فضائی کی دوسری آواز بھی پکڑنے لگتے ہیں۔
سافر۔ مگر میرا دماغ ایسا نہیں۔
خورشید۔ ہوگا، دیوتا بعض دفعہ ملکوتی زبان بولتے ہیں۔ اُن کی بات میں کوئی خاص رمز ہوتی ہے۔ شاید آپ مطلب ہی نہ سمجھے ہوں۔

مسافر ۔ ایسا نہیں ہے۔

خورشید۔ ہمالیہ میں ایک دیوتا میرا بھی آشنا ہے۔ شاید وُہ آپ کے دیوتا کا بھی آشنا ہوگا۔ وہ بعض اوقات مجھ سے مذاق کیا کرتا ہے۔ اور شاید ــــ

مسافر۔ مگر میرے دیوتا کا حکم تو مذاق نہیں ہے ۔

خورشید۔ ہو تو سکتا ہے ۔ آیئے ہم اس کا امتحان کرلیں ۔

مسافر۔ امتحان ؟ کیسا امتحان ؟ اس کا حکم اٹل ہے۔

خورشید۔ ہوگا ، ہوگا ! آپ ذرا چاقو کو اُدھر رکھ دیجئے تو مَیں آپ کو بتا سکوں گا ۔ کہ ــــ

مسافر۔ کیا ؟

خورشید۔ آپ تین بار دیوتا سے سوال کیجئے ۔ اگر وُہ تین بار یہی حکم دے تو مَیں حاضر ہوں ۔ ورنہ ــــ

مسافر۔ تین بار سوال کروں ؟ کیوں

خورشید۔ میرا دماغ بھی وائرلیس ہے ۔

مسافر۔ ہاں !

خورشید ۔ بالکل ! مَیں نے ہمالیہ کے سینکڑوں دیوتاؤں سے باتیں کی ہیں یقین جانئے نصف سے زیادہ دیوتا مسخرے ہوتے ہیں۔

مسافر۔ مگر میرا دیوتا تو ایسا نہیں ۔

خورشید۔ اس بات کا ثبوت ؟ ہاں اگر وہ تین بار کہہ دے ۔ تو

مسافر۔ اس کی حکم عدولی شاید اُسے اَور غضبناک بنا دے۔

خورشید۔ دیوتا کو غضب ناک نہ ہونے دیجئے ــــ احتیاط پھر بھی لازمی ہے ۔

مسافر۔ وُہ غصے میں دُنیا کو تباہ کر دے گا۔

خورشید۔ دیوتاؤں کا حکم ماننا ہی پڑتا ہے۔

مسافر۔ اَور مجھے ماننا ہی ہوگا ــــ

خورشید ۔ دیکھئے ، آپ کہتے ہیں کہ آپ کا دیوتا جو کہتا ہے ۔ وہ ٹھیک ہوتا ہے ، مگر میں کہتا ہوں کہ ہمالیہ کے دیوتا جو بات تین دُہرائیں ۔ وُہ ٹھیک ہوتی ہے ۔ اور اٹل ۔ ہم میں سے کون سچا ہے اس کا فیصلہ اگلے سٹیشن پر ہم گارڈ سے کرالیں گے ۔ وہ ضرور جانتا ہوگا کہ ــــ

مسافر۔ مجھے جو احکام ہیں ، تیسرے کو اس میں دخل دینے کا کیا حق ہے ۔

رشید ۔ بالکل بجا اور درست، آپ اپنی مرضی کیجئے، میں تو صرف چاہتا تھا کہ آپ ذرا اپنے دیوتا کے اصلی مقصد کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

مسافر ۔ میرا دیوتا قربانی مانگتا ہے ۔یہی اس کی مرضی ہے ۔ دیوتاؤں کی خوراک صرف قربانی ہوتی ہے ۔

رشید ۔ قربانی دینا اُن کی عادتیں بگاڑنے کے مترادف ہے گویا۔

مسافر ۔ قربانی دینا ہی ہوگی۔

رشید ۔ پھل پھول، سبزی کی بھینٹ دیوتا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

مسافر ۔ میرا دیوتا خون چاہتا ہے ۔

رشید ۔ نہیں صاحب اُیسا نہ کہئے، دیکھئے، دیکھئے ـــــ

(گاڑی کا شور آہستہ آہستہ مدھم ہوتا جا رہا ہے)

آپ جلد بازی کریں گے تو پھر لوگ آپ کو پاگل خانے بھجوا دیں گے ۔ ریلوے سٹیشن آگیا ہے ۔ اگر آپ نے اپنے وائرلیس دماغ کا کہا کیا تو آپ کو پچھتانا پڑے گا ۔ اب رُک جائیے ۔ یہ لوگ تو آپ کے وائرلیس دماغ کے قائل نہیں ۔کہیں پھر آپ کو دُکھ نہ دیں ۔ گاڑی ذرا چلنے دیجئے پھر دیوتاؤں کا ذکر چھیڑ دیں گے ـــــ

مسافر ۔ خوب! درست فرمایا آپ نے، مَیں ایسا ہی کروں گا، مگر سنئے اگر آپ نے میرے متعلق ایک لفظ بھی زبان سے نکالا، تو یہ چاقو آپ کے سینے سے پار ہوگا۔

خورشید ۔ اس کا یقین رکھئے ـــــ میں اتنا بیوقوف تو نہیں ہوں۔

مسافر ۔ پھر کہتا ہوں ـــــ (چاقو دکھاتا ہے)

خورشید ۔ صاحب! میں قسم کھاتا ہوں کہ ـــــ

مسافر ۔ اگر تم نے کہنا چاہا تو تم زمین پر تڑپ رہے ہوگے ۔ میرا کیا، میں پھر اُسی "پُرسکون" مقام پر بھیج دیا جاؤں گا ۔ جہاں سے ابھی آ رہا ہوں ـــــ باغ، باغیچہ، رصد گاہ کا پُرلطف کمرہ، مگر تم جہنم میں جا چکے ہوگے ۔

خورشید ۔ صاحب یقین رکھئے ۔ میں قسم کھاتا ہوں ـــــ

مسافر ۔ اگر تم خاموش رہے تو گویا ۵ منٹ کی اَور زندگی مل گئی ۔ سمجھے (چاقو دکھاتا ہے)

خورشید ۔ شکریہ! خوب

مسافر ۔ ۵ منٹ کی زندگی

خورشید ۔ آپ کا احسان ۔

(گاڑی پلیٹ فارم پر رُکتی ہے)

مسافر۔ ایسا نہیں ہے۔

خورشید۔ ہمالیہ میں ایک دیوتا میرا بھی آشنا ہے۔ شاید وُہ آپ کے دیوتا کا بھی آشنا ہوگا۔ وہ بعض اوقات مجھ سے مذاق کیا کرتا ہے۔ اور شاید ـــــ

مسافر۔ مگر میرے دیوتا کا حکم تو مذاق نہیں ہے۔

خورشید۔ ہو تو سکتا ہے۔ آیئے ہم اس کا امتحان کرلیں۔

مسافر۔ امتحان؛ کیسا امتحان؛ اس کا حکم اٹل ہے۔

خورشید۔ ہوگا، ہوگا! آپ ذرا چاقو کو اُدھر رکھ دیجئے تو مَیں آپ کو بتا سکوں گا۔ کہ ـــــ

مسافر۔ کیا؛

خورشید۔ آپ تین بار دیوتا سے سوال کیجئے۔ اگر وُہ تین بار یہی حکم دے تو مَیں حاضر ہوں۔ ورنہ ـــــ

مسافر۔ تین بار سوال کروں؛ کیوں

خورشید۔ میرا دماغ بھی وائرلیس ہے۔

مسافر۔ ہاں!

خورشید۔ بالکل! مَیں نے ہمالیہ کے سینکڑوں دیوتاؤں سے باتیں کی ہیں یقین جانئے نصف سے زیادہ دیوتا مسخرے ہوتے ہیں۔

مسافر۔ مگر میرا دیوتا تو ایسا نہیں۔

خورشید۔ اس بات کا ثبوت؛ ہاں اگر وہ تین بار کہہ دے۔ تو

مسافر۔ اس کی حکم عدولی شاید اُسے اَور غضبناک بنا دے۔

خورشید۔ دیوتا کو غضب ناک نہ ہونے دیجئے ـــــ احتیاط پھر بھی لازمی ہے۔

مسافر۔ وُہ غصے میں دُنیا کو تباہ کر دے گا۔

خورشید۔ دیوتاؤں کا حکم ماننا ہی پڑتا ہے۔

مسافر۔ اَور مجھے ماننا ہی ہوگا ـــــ

خورشید۔ دیکھئے، آپ کہتے ہیں کہ آپ کا دیوتا جو کہتا ہے۔ وہ ٹھیک ہوتا ہے، مگر میں کہتا ہوں کہ ہمالیہ کے دیوتا جو بات تین دُہرائیں۔ وُہ ٹھیک ہوتی ہے۔ اور اٹل۔ ہم میں سے کون سچا ہے اس کا فیصلہ اگلے سٹیشن پر ہم گارڈ سے کرالیں گے۔ وہ ضرور جانتا ہوگا کہ ـــــ

مسافر۔ مجھے جو احکام ہیں، تیسرے کو اس میں دخل دینے کا کیا حق ہے۔

خورشید۔ بالکل بجا اور درست، آپ اپنی مرضی کیجئے، میں تو صرف چاہتا تھا کہ آپ ذرا اپنے دیوتا کے اصلی مقصد کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

مسافر۔ میرا دیوتا قربانی مانگتا ہے۔یہی اس کی مرضی ہے۔ دیوتاؤں کی خوراک صرف قربانی ہوتی ہے۔

خورشید۔ قربانی دینا اُن کی عادتیں بگاڑنے کے مترادف ہے گویا۔

مسافر۔ قربانی دینا ہی ہوگی۔

خورشید۔ پھل پھول، سبزی کی بھینٹ دیوتا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

مسافر۔ میرا دیوتا خون چاہتا ہے۔

خورشید۔ نہیں صاحب ایسا نہ کیجئے، دیکھئے، دیکھئے ـــــ

(گاڑی کا شور آہستہ آہستہ مدھم ہوتا جارہا ہے)

آپ جلد بازی کریں گے تو پھر لوگ آپ کو پاگل خانے بھجوا دیں گے۔ ریلوے سٹیشن آ گیا ہے۔ اگر آپ نے اپنے وائرلیس دماغ کا کہا کیا تو آپ کو پچھتانا پڑے گا۔ اب رُک جائیے۔ یہ لوگ تو آپ کے وائرلیس دماغ کے قائل نہیں۔ کہیں پھر آپ کو دُکھ نہ دیں۔ گاڑی ذرا چلنے دیجئے پھر دیوتاؤں کا ذکر چھیڑیں گے ـــــ

مسافر۔ خوب! درست فرمایا آپ نے، مَیں ایسا ہی کروں گا، مگر سنئے اگر آپ نے میرے متعلق ایک لفظ بھی زبان سے نکالا، تو یہ چاقو آپ کے سینے سے پار ہوگا۔

خورشید۔ اس کا یقین رکھیئے ـــــ میں اتنا بیوقوف تو نہیں ہوں۔

مسافر۔ پھر کہتا ہوں ـــــ (چاقو دکھاتا ہے)

خورشید۔ صاحب! میں قسم کھاتا ہوں کہ ـــــ

مسافر۔ اگر تم نے کہنا چاہا تو تم زمین پر تڑپ رہے ہوگے۔ میرا کیا، میں پھر اُسی "پُرسکون" مقام پر بھیج دیا جاؤں گا۔ جہاں سے ابھی آ رہا ہوں ـــــ باغ، باغیچہ، رصدگاہ کا پُرلطف کمرہ، مگر تم جہنم میں جا چکے ہوگے۔

خورشید۔ صاحب یقین رکھیئے۔ میں قسم کھاتا ہوں ـــــ

مسافر۔ اگر تم خاموش رہے تو گویا ۵ منٹ کی اور زندگی مِل گئی ـــ سمجھے (چاقو دکھاتا ہے)

خورشید۔ شکریہ! خوب

مسافر۔ ۵ منٹ کی زندگی

خورشید۔ آپ کا احسان۔

(گاڑی پلیٹ فارم پر رُکتی ہے)

مسافر۔ لوگ اس طرف آرہے ہیں، اگر تم نے اُن سے کہہ دیا ـــــ کیا نام، کہ میں پاگل ہوں۔ تو جانتے ہو اس کا انجام؟
خورشید۔ جی ہاں، خوب جانتا ہوں مگر میں نے تو قسم ـــــ
مسافر۔ ٹھیک! ٹھیک! تم بہت خوش قسمت ہو تم اس چاقو کی قسم کھاؤ۔ تاکہ تمہاری قسم کا یہ شاہد رہے۔
خورشید۔ ضرور، ضرور، کتنا خوبصورت چاقو ہے۔
مسافر۔ خوبصورت، اور کافی بڑا۔
گارڈ۔ (دروازہ کھول کر ڈبے میں جھانکتا ہے) جنٹلمن معاف کیجئے، لاہور کے پاگل خانہ سے ایک خطرناک دیوانہ بھاگا ہوا ہے۔ ہمیں اُس کی تلاش ہے۔
مسافر۔ ہم نے تو اُسے نہیں دیکھا (خورشید کی طرف دیکھتا ہے)
خورشید۔ بالکل نہیں جناب!
گارڈ۔ کسی سیٹ (seat) کے نیچے تو نہیں۔
مسافر۔ یہ بھاگا ہوا پاگل کوئی زیادہ خطرناک ہے؟
گارڈ۔ اطلاع تو یہی ہے۔
مسافر۔ اچھا ہوا کہ میں ساتھ چاقو لیتا آیا۔ دیکھئے نا، یہ چاقو ایک نادر چیز ہے اگر وُہ پاگل کہیں سے ٹپک پڑا تو اس کی خوب خبر لوں گا۔
گارڈ۔ بشرطیکہ وہ آپ پر حملہ کرے، ورنہ خواہ مخواہ چاقو کا استعمال ـــــ
مسافر۔ چاقو ـــــ یہ ایک نادر تحفہ ہے، پُرانی یادگار
گارڈ۔ چاقو، پُرانی یادگار!
مسافر۔ صاحب، میں ذرا ڈرتا بہت ہوں۔ اس لئے مَیں حفاظتِ ذاتی کے لئے یہ چاقو ہمیشہ پاس رکھتا ہوں۔
گارڈ۔ بہتر ہے (سیٹوں کے نیچے دیکھتا ہے) یہاں تو وُہ نہیں ہے۔
مسافر۔ شکریہ (خورشید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) مسٹر، چاقو کی ہم دونوں کو ضرورت ہے۔
خورشید۔ جی، بالکل
گارڈ۔ کسی دُوسرے ڈبہ میں ہوگا۔ ہمیں لاہور سے تار مِلا ہے کہ اُسے فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سوار ہوتے دیکھا گیا ہے ـــــ
مسافر۔ اس کا حلیہ؟
گارڈ۔ تار میں تو نہیں لکھا۔ مگر دیوانے کو کون نہیں پہچان لیتا ـــــ

مسافر۔ کیوں نہیں۔

خورشید۔ (گارڈ سے) جناب ذرا ٹھہریئے، ہم دونوں کو آپ کی صحبت سے لطف آ رہا ہے۔

گارڈ۔ اس ذرہ نوازی کا شکریہ، ہم ڈرائنگ روم میں نہیں ہیں۔ یہ امرتسر کا ریلوے سٹیشن ہے۔ اور مجھے گاڑی اسٹارٹ (Start) کرنی ہے۔

خورشید۔ مگر ان سیٹوں کا ایک دفعہ اور جائزہ لے لیجیئے، شاید دُم مل جائے ـــــ میرے ساتھی کو ڈر محسوس ہو رہا ہے۔

گارڈ۔ ڈرنے کی کیا بات ہے ـــــ مجھے دُوسرے ڈبے بھی تلاش کرنے ہیں۔

(سٹیشن ماسٹر داخل ہوتا ہے)

سٹیشن ماسٹر۔ (گارڈ سے) او۔ کے مسٹر گارڈ۔

خورشید۔ (خود بخود) او۔ کے یقین جانئے میرا ساتھی بالکل فرزانہ ہے۔ یہ میرے دوست بھی ہیں۔

سٹیشن ماسٹر۔ مگر مسٹر تمہارا کیا حال ہے (مشتبہ نگاہوں سے دیکھتا ہے) تم کچھ گھبرائے سے ہو۔

خورشید۔ گھبرایا سا ہوں، میں؟

سٹیشن ماسٹر۔ (گھورتا ہے) جی ہاں! حضور کچھ گھبرائے سے ہیں۔

خورشید۔ جی میں دیوانہ ہوں ـــــ لاہور سے بھاگا ہُوا۔ پاگل خانہ، خوبصورت باغ، عالیشان عمارت، اس کی پُرلطف رصد گاہ۔ پھولوں کی کیاریاں، مگر وہ داروغہ ـــــ

سٹیشن ماسٹر۔ (خورشید کے لباس کو دیکھ کر) صاحب آپ ہمیں دیوانہ بنا رہے ہیں۔

خورشید۔ (دیوانہ وار قہقہہ لگاتے ہوئے) آپ دیوانے ـــ آپ سے مذاق ـــ سٹیشن ماسٹر، بھلا میں ایسا کر سکتا ہوں۔

سٹیشن ماسٹر۔ آپ کا نام؟ خورشید۔ میں چاند کا شہزادہ ہوں۔

سٹیشن ماسٹر۔ یعنی؟

خورشید۔ میں چاند کا شہزادہ تھا۔ وہاں بغاوت ہو گئی، باغیوں نے مجھے باہر پھینک دیا۔ میں ایک ٹی ٹرے (Tea-Tray) میں گرا۔ آپ نے دیکھی ہو گی، ٹی ٹرے، خادم نے اُٹھا کر مجھے اس ڈبے میں دھکیل دیا،

سٹیشن ماسٹر۔ (گارڈ سے) حضرت آخر مل ہی گئے، چاند کے شہزادے۔

گارڈ۔ مسٹر ذرا باہر تشریف لائیے، ٹی ٹرے میں بٹھا کر آپ کو چاند میں واپس بھیج دیا جائے۔ وہاں کی رعایا منتظر ہے۔ اور تخت خالی ـــــ

خورشید۔ اور میرا تاج! گارڈ۔ اور آپ کا محل

خورشید (مسافر سے) دوست الوداع ـــ مسافر۔ دیکھئے مجھے بھی ـــــ

خورشید۔ ٹی ٹرے دو کا بوجھ نہیں سہار سکے گی۔ سٹیشن ماسٹر۔ مسٹر شہزادہ چلئے۔

مسافر۔ سنئے تو، انہیں نہ لے جائیے۔ مجھے ان کی ضرورت ہے۔

سٹیشن ماسٹر۔ کیسی ضرورت؟

مسافر۔ میں اکیلا سفر نہیں کر سکتا، میرا دل کمزور ہے۔ ڈر لگتا ہے مجھے،

سٹیشن ماسٹر۔ مگر یہ تو پاگل ہے۔ خورشید۔ بالکل پاگل۔

مسافر۔ یہ تو میرے دوست ہیں، بالکل فرزانہ۔

خورشید۔ میں چاند کا شہزادہ ہوں۔ مجھے چاند نگری جانا ہے ابھی —— جلدی کرو —— میری سواری ٹرے ——

مسافر۔ یہ بالکل ٹھیک ہیں۔ میں انہیں ایک عرصہ سے جانتا ہوں ——

خورشید۔ میں ایک مہک ہوں۔ جسے جو سونگھتا ہے والہ و شیدا ہو جاتا ہے —— چاند کی روشنی مجھ سے پیدا ہوتی ہے۔ چاندنی رات کا سکون میرا سایہ ہے، چاند کا شہزادہ ——

(خورشید کو ڈبے سے باہر نکال دیا جاتا ہے سٹیشن ماسٹر اور خورشید پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں۔ سیٹی کی آواز، گاڑی حرکت کرتی ہے۔ گارڈ اپنے کمرے میں کھڑا جھنڈی ہلا رہا ہے۔ جب اس کا ڈبہ خورشید کے سامنے سے گزرتا ہے۔ تو وہ زور سے چلاتا ہے "چاند کے شہزادے آداب عرض"۔)

سٹیشن ماسٹر۔ اب ذرا آرام سے تشریف لے چلئے۔ خورشید۔ ایک بات تو سنئے ——

سٹیشن ماسٹر۔ (سختی سے) کہئے۔

خورشید۔ (گاڑی کی طرف تکتے ہوئے) چند لمحے اور ٹھہر جائیے۔ ذرا گاڑی دور نکل جائے۔

سٹیشن ماسٹر۔ (حیران ہو کر) کیوں؟ خورشید۔ (ایک اطمینان کا سانس لے کر) خدایا!

سٹیشن ماسٹر۔ (کشمکش و پیچ میں) مسٹر خیر تو ہے۔ خورشید۔ جان بچی لاکھوں پائے، میرا ساتھی ہی بھاگا ہوا پاگل تھا۔

سٹیشن ماسٹر۔ آپ کا ساتھی؟

خورشید۔ جی ہاں! وہ حضرت میرے سینے میں اپنا چاقو گھونپنے کے لئے تیار بیٹھے تھے —— فوراً اگلے سٹیشن پر فون کر دیجئے۔ اور میرے سامان کے لئے بھی۔

سٹیشن ماسٹر۔ مگر آپ نے یہ سوانگ ——

خورشید۔ جان کس طرح بچتی؟

(دور سے گاڑی کی آواز سنائی دے رہی ہے۔)

شیر محمد اختر

غزل

نام بدنام ہے ناحق شبِ تنہائی کا
وُہ بھی اِک رُخ ہے تری انجمن آرائی کا

آ چلا ہے مجھے کچھ وعدۂ فردا کا یقیں
دل پہ الزام نہ آجائے شکیبائی کا

اب نہ کانٹوں ہی سے کچھ لاگ نہ پھولوں سے لگاؤ
ہم نے دیکھا ہے تماشا تری رعنائی کا

دونوں عالم سے گزر کر بھی زمانہ گزرا
کچھ ٹھکانا بھی ہے اِس بادیہ پیمائی کا

خود ہی بیتابِ تجلّی ہے ازل سے کوئی
دیکھنے کے لئے پردہ ہے تمنّائی کا

لگ گئی بھیڑ یہ دیوانہ جدھر سے گزرا
ایک عالم کو ہے سودا ترے سودائی کا

پھر اُسی کافرِ بے مہر کے در پر فانی
لے چلا شوق مجھے ناصیہ فرسائی کا

فانی بدایونی

فردوسی کا شاہنامہ

ایشیا کے شاعروں میں فردوسی، کتابوں میں شاہنامہ اور سورماؤں میں رستم شہرت کے آسمان پر سورج کی طرح چمک رہے ہیں۔ فردوسی اسّی برس جیا، ۳۵ برس میں اس نے شاہنامہ پورا کیا۔ میں اس قلیل وقت میں اس دریا کو کوزے میں کیسے بند کروں؟

یونان کو اپنے شاعر ہومر اور اس کی کتاب ایلیڈ پر ناز ہے، پرانے ہندوستان کے سورماؤں کے کارنامے مہابھارت میں ثبت ہیں اس لئے ہندوستانیوں کو مہابھارت پر فخر ہے تو ایرانیوں کو شاہنامہ اور اس کے مصنف فردوسی پر کیوں فخر نہ ہو؟

دنیا کے تمام مشہور آدمیوں اور بڑے کارناموں کی طرح شاہنامہ اور اس کا مصنف بھی افسانوں اور من گھڑت کہانیوں کے پردوں میں چھپا ہوا ہے، کلکتہ کے "بلیک ہول" سے اسکول کا ہر بچہ واقف ہے، مگر جاننے والوں پر روشن ہے کہ اس ساری کہانی میں سچائی کی ایک بھی کرن نہیں، اسی طرح یہ بات مشہور ہے کہ فردوسی نے شاہنامہ گویا محمود سے فی بیت ایک اشرفی کے ٹھیکے پر لکھا تھا۔

دنیا کا کوئی ادبی شاہکار اجرت پر نہیں لکھا گیا اور کسی قوم پرست نے اپنے جذباتِ قوم پرستی کی تجارت نہیں کی اور کسی قوم کے مصلح نے اپنی قوم کو زندہ کرنے کی قیمت کسی غیر سے نہیں مانگی، اس لئے فردوسی جیسے غیور، قوم پرور عظمتِ ایران کے افسانہ گو، قومی فخر کے متوالے، قوم کو زندہ کرنے کی دھن میں آسمان و زمین سے لڑنے والے اور اہلِ ایران اور شاہانِ ایران کے سوا دوسرے کسی کو خاطر میں نہ لانے والے کے متعلق جس کا دعویٰ اور سچا دعویٰ یہ تھا کہ ع عجم زندہ کردم بدیں پارسی، یہ خیال بھی کہ اگر اس کو انعام کا لالچ نہ ہوتا تو وہ شاہنامہ نہ لکھتا ہمیں گوارا نہیں۔ اور ہمیں فردوسی اور اس کا بلند کیرکٹر اتنا عزیز ہے کہ ہم ان باتوں کو فرض بھی نہیں کر سکتے، یوں بھی محمود کی بادشاہت ۳۱ برس رہی، اور شاہنامہ ۳۵ برس میں لکھا گیا، نتیجہ خود آپ نکال لیجئے۔

غور کیجئے خود دار فردوسی کو جب معلوم ہوا کہ کوئی وزیر اس سے اس لئے ناراض ہے کہ وہ اس کے گھر پر سلام کو کیوں حاضر نہیں ہوتا تو فردوسی نے کہلا بھیجا کہ غلامی میری فطرت میں نہیں اور نہ مجھے مال اور عہدہ کا لالچ ہے، پھر میں جو بادشاہ کے دربار میں بھی نہیں جاتا وزیر کے در پر کیسے جانا پسند کروں گا۔ ؎

من بندہ کز مبادیٔ فطرت نبودہ ام — مائل بہ مال ہرگز و طامع بجاہ نیز
سوئے درِ وزیر چرا ملتفت شوم — چوں فارغم ز بارگہِ بادشاہ نیز

---

[1] یہ مضمون حسب اجازت آل انڈیا ریڈیو ممبئی شائع کرایا گیا۔ (شہاب)

بادشاہ خود باکمال اور اہلِ کمال کا سرپرست تھا۔ اس کے دربار میں جہاں مختلف خیال و مذاہب کے فاضل دربار کی زینت تھے وہاں فردوسی کی بھی کرسی کسی سے پیچھے اور کسی سے نیچے نہ ہوتی تھی۔

محمود جو ایک ایک قابلِ داد بات کے صلہ میں لاکھوں روپے دے دیا کرتا تھا سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے کہ اسے کسی قسم کا بخل ساٹھ ہزار دینار فردوسی کو عطا کرنے سے روک دیتا، ہاں فردوسی دربار سے جدا ہو گیا مگر جیسا کہ پہلے شاہی درباروں اور آج کی سیاست میں یہ تماشا عام ہے کہ حالات کے بدلنے سے کل کے سردار آج بر سرِ دار نظر آیا کرتے ہیں، فردوسی کو بھی کچھ ایسے ہی حالات کی بنا پر دربارِ محمود سے الگ ہونا پڑا، مگر فردوسی کا ظرف دیکھو کہ غزنین سے جاتے وقت مسجد کی دیوار پر ذیل کے دو شعر لکھ گیا ؎

خجستہ درگہِ محمودِ غزنوی دریاست | چگونہ دریا کاں را کرانہ پیدا نیست

چہ غوطہ ہا زدم و اندرو ندیدم دُر | گناہِ بختِ من ست ایں گناہ دریا نیست

اگر یہ واقعہ بھی تذکرہ نویسوں کی گپ نہیں تو ماننا پڑے گا کہ محمود بخیل نہ تھا، فردوسی اہلِ کمال اور اپنے وطن کا پجاری تھا مالی منفعت جو اسے حاصل تھی یا جس کی اسے توقع تھی اس سے ضرور محروم رہا، مگر حالات نے سخاوتِ محمود کے دریا کو اتھاہ بنا دیا۔ فردوسی کی جبلی بلند نظری نے اسے محمود کا بخل نہیں بلکہ اُسے صرف اپنی قسمت کی نارسائی ٹھہرایا، اور یہی اس کے کمال کے شایان تھا،

افسوس ہے کہ تذکرہ نویسوں نے گرمیٔ محفل کے لئے جو چاہا لکھ مارا، مگر اس میں ان کا بھی قصور نہیں کہ انسانی کمزوریوں میں سے یہ بھی ہے کہ اچھی بات کی پروا نہیں کی جاتی اور بری باتوں کو لوگ لے اُڑا کرتے ہیں۔ داغ ؎

خوبیاں لاکھ کسی میں ہوں تو پروا نہ کریں | لوگ کرتے ہیں بری بات کا چرچا کیسا

شاہنامہ کے مضامین چار قسم کے ہیں:۔

اوّل: زمانۂ تاریخ سے پہلے کے افسانے۔

دوم۔ ظہورِ اسلام سے پہلے کے شاہانِ ایران کے حالات

سوم: قدیم ایران کے رسم و رواج، قومی معاشرت اور ملکی قوانین وغیرہ۔

چہارم: الٰہیات و حکمت و اخلاق وغیرہ کے مسائل۔

شاہنامہ لکھنے سے فردوسی کا مقصد اہلِ ایران کو ان کی گزشتہ بڑائی یاد دلا کر پستی سے اُٹھانا اور پہلے عروج پر پہنچانا تھا۔ اسے ایرانیوں میں یہ یقین پیدا کرنا تھا کہ وہ خدا کی زمین پر تاج داری کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، باجگزاری کے لئے نہیں، وہ ایران کے سوا کسی اور ملک یا قوم کے افراد میں کوئی خوبی علمی یا نسبی یا اخلاقی نہیں پاتا اور اسی لئے ایرانیوں پر حکومت کرنے کا کسی کو اہل نہیں مانتا۔ جب بھی ایرانیوں اور غیر ایرانیوں میں جنگ چھڑی تو اس نے ایران کے مخالفوں میں کوئی نہ کوئی خامی نکال دی تھی کہ اگر کسی ایرانی شہزادے سے کسی سیاسی

سبب سے ناراض ہے تو اس کی شہزادگی میں بھی کوئی بیجا بات کہہ گیا۔

شاہ نامہ میں ایسے بادشاہ بھی نظر آتے ہیں جو گمنامی سے نکل کر شاہی خاندانوں کے بانی اور تختِ ایرانی کی زیب و زینت بنے تھے اگرچہ لوگ ان کے بادشاہ ہونے سے پہلے کسی کو خانہ بدوش اور کسی کو روپوش اور کسی کو چرواہا دیکھتے رہے تھے لیکن جب انقلابِ روزگار ان کو گمنامی سے نکال کر تخت پر لے آیا اور شاہی تاج ان کے سر پر رکھا گیا تو قدیم افسانوں کی مدد سے فردوسی کے قومی افتخار نے ان کو کسی نہ کسی قدیم نامدار اور مشہور بادشاہ کی نسل میں ثابت کر دیا۔ خیر اپنوں کو شہزادے کہنا تو کچھ برا نہیں، مگر بعض جگہ یہ بھی نظر آتا ہے کہ ایران کے بیرونی فاتحوں کو بھی کسی نہ کسی پہلو سے اپنے ہی کسی بادشاہ کی نسل سے بے تکلف کہہ دیا یا اس سے کوئی خاص رشتہ پیدا کر لیا، بحث امکانات سے نہیں، کہنا صرف یہ ہے کہ فردوسی اپنے خیال کو ہر حال میں درست ہی ثابت کرتا چلا جاتا ہے۔

شاہ نامہ میں بہت سی خلافِ عقل باتیں اور سینکڑوں سال زندہ رہنے والے انسانوں، دیووں اور بھوتوں کے حالات وغیرہ سبھی کچھ موجود ہے، مگر اس میں فردوسی کا کچھ گناہ نہیں، کیونکہ فردوسی سے پہلے کا ادب ایسی ہی باتیں بیان کرتا تھا۔ فردوسی نے ان کو جوں کا توں نقل کر دیا، تنقید نہیں کی، ہم چاہیں تو تاویل سے کچھ کا کچھ بنا دیں۔ ہمارے بعض ادیبوں نے کوشش کی ہے کہ ان افسانوں کو حقیقت کا لباس پہنا دیں جس میں بعض جگہ ان کو کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے۔

ایران کے اسلام سے پہلے کے بادشاہوں کے حالات کے بیان میں فردوسی نے ہر جگہ اپنا کمال اور اپنی اُستادی کے جوہر دکھائے ہیں اور وطن دوستی کا مظاہرہ کیا ہے، یہ نہیں کہ ان بادشاہوں کی کمزوریوں سے چشم پوشی کی ہو، نہیں موقع بموقع بے تکلف ان کی غلطیاں بھی ظاہر کی ہیں، مگر خوبیاں اس طرح اُجاگر کرتا ہے کہ برائیوں کی طرف پڑھنے والے کا دھیان نہیں جاتا۔ اگر جاتا ہے تو اکثر معاف کر دینے میں کوئی حرج نہیں دیکھتا۔

شاہ نامہ میں ایرانی رسم و رواج، ایرانی درباروں کی شان و شوکت، رعیت کا حال، فوجوں کی دھوم دھام، پہلوانوں کے ڈیل ڈول اور ان کے کرتب، خواتینِ ایران کے طور طریق، ہر طبقہ کے لوگوں کے لباس کی وضع قطع، میدانِ جنگ کا نقشہ، فوجوں کی ترکیب، میدان میں امیر و وزیر، پہلوانوں اور سرداروں کے خیموں کا رنگ ڈھنگ اور ترتیب، ان کے ہتھیاروں کے نام اور ہتھیاروں کی چمک دمک، سربازوں اور سورماؤں کے نعرے اور رجز، ان کی فخریہ بات چیت، دشمن کے سامنے ان کی صف آرائی، لڑنے کا ڈھنگ، کہیں دست بدست اور کہیں گتھ کر، کہیں ایک کی ایک سے پکڑ اور کشتی، ہتھیاروں کا استعمال، کھانے پینے کا سامان، عام مجلسوں اور درباروں میں شراب کی ریل پیل وغیرہ باتیں اس طرح بیان کی ہیں کہ پڑھنے والے کو عالمِ خیال میں ہزاروں برس کے واقعات کی تصویریں زندہ ہو کر چلتی پھرتی نظر آنے لگتی ہیں۔

ایک بادشاہ کی لڑکی مجبور ہو کر رستم کے پاس مدد مانگنے جاتی ہے، سوال بہر حال سوال ہے، مگر شہزادی کی خودداری کا یہ عالم ہے کہ سائلانہ التجاؤں کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ رہی ہے کہ ؎

منیژہ منم دختِ افراسیاب   برہنہ ندیدہ تنم آفتاب

ملکی حالات میں مشورہ کے لئے لیڈروں کی مجلس آراستہ ہے، ؎

پئے مشورت مجلس آراستند   نشستند و گفتند و برخاستند

مشورہ کی مجلس کا انداز دیکھ چکے، جنگ کے میدان میں ایرانی ہیرو کی سپہ گری کا تماشا دیکھئے۔ سامنے دشمنوں کا ٹڈی دل کھڑا ہے، اکیلا پہلوان رن میں کود پڑتا ہے، اس کے سارے ہتھیار بیک وقت قضا کا کام کرنے لگتے ہیں، وہ بجلی کی سی تیزی سے پرّوں کے پرے صاف کرتا چلا جاتا ہے ؎

برید و درید و شکست و ببست   یلاں را سر و سینہ و پا و دست

گھمسان کا رن پڑا، دونوں طرف کے یودھا دو پہاڑوں کی طرح آپس میں ٹکرا رہے ہیں۔ لوہے سے لوہا بجتا ہے، گھوڑے بجلی بنے ہوئے ہیں، جہاں ٹاپ پڑتی ہے، غبار کا بادل اٹھ کھڑا ہوتا ہے، ایسا نظر آتا ہے کہ زمین کا ایک طبق اڑ کر آسمان پر پہنچ گیا ؎

زُسمِ ستوراں دراں پہن دشت   زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

فریدون ایرانی بادشاہوں میں اپنی خوبیوں کے سبب سے بادشاہی کا نمونہ مانا گیا ہے، فردوسی جانتا ہے کہ وہ جنگلوں سے آیا اور جمشید کے تخت پر بٹھایا گیا تھا، ایرانی بادشاہوں کو مشورہ دیتا ہے کہ فریدوں کے کمالات فریدوں تک ہی محدود نہ تھے۔ اگر فریدونی صفات تم پیدا کروگے تو تم بھی فریدون بن جاؤ گے ؎

فریدونِ فرخ فرشتہ نبود   زمشک و زعنبر سرشتہ نبود

زداد و دہش یافت آں نکوئی   تو داد و دہش کن فریدوں توئی

فردوسی ایرانی قوم کو حکمران قوم دیکھنا چاہتا ہے، مگر ایک فرد کے لئے غذا، لباس اور بستر کے سوا اور کسی چیز کی تمنا کو حرص خیال کرتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ شاہنامہ جنگ نامہ ہے اور اس کے ہر لفظ میں نعرۂ جنگ گونج رہا ہے، لیکن اس کے سورما محبت و شوق کے جذباتِ لطیف سے خالی نہیں، اس لئے بہادروں کی پریم کہانیاں بھی جا بجا اس میں پائی جاتی ہیں، مگر جیسے یہ سورما ہیں ویسی ہی ان کی محبوبائیں بھی ہیں۔ مرد صحت و تندرستی کا پیکر ہیں، عورتیں نسوانیت کی مورت اور زندگی پوری جوانی کے ساتھ ان کی نس نس میں دوڑ رہی ہے۔ شاہنامہ کے سورما محبت میں سچے اور عورتیں وفا کی دیویاں ہیں۔

فردوسی کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ ہر واقعہ اور موقعہ کی اتنی تفصیل بیان کرتا ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اس کی تیز نگاہ سے اوجھل نہیں رہتی، اس کی زبان مطلب ظاہر کرنے پر قادر ہے، لفظوں کی اس کے پاس کمی نہیں، جہاں جس لفظ کی ضرورت ہوتی ہے، ہیرے کی کنی کی طرح اٹھاتا اور وہیں بٹھا دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کہیں اس کا بیان دبتا ہوا نظر نہیں آتا، اور فردوسی لفظوں سے رنگ اور قلم سے

مصوّر کے برش کا کام لیتا ہے اور پڑھنے والے کو شاہنامہ کے صفحات پر آج کی زبان میں سینما کا تماشا نظر آجاتا ہے۔

دیکھو رستم کا دادا زال، رودابہ کو چاہتا ہے، اس سے ملنے کے لئے جاتا ہے۔ مگر محبوبۂ دلبند قلعہ بند ہے، رسائی کا کوئی ذریعہ نہیں، لیکن دل کو دل سے راہ ہے، رودابہ کا دل زال کی آمد کا پتہ دیتا ہے، وُہ دیوار پر آتی اور سچ مچ زال کو نیچے کھڑا پاتی ہے تو اپنی چوٹی کھول کر دیوار کے نیچے لہرا دیتی ہے کہ اس سے زال کمند کا کام لے۔ زال اس ادا کو دیکھتا، فدا ہوتا، زلف کو آنکھوں سے لگاتا اور بوسہ دیتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ فردوسی نے اس واقعہ کی تصویر کھینچ دی ہے مگر اس تصویر کو اُس زمانہ میں جب کہ بی کلّو بھی سر کے چار بالوں کو پہاڑ کی طرح بھاری سمجھ رہی ہوں۔ اگر پسند نہ کیا جائے تو اِس میں حیرت کی کیا بات ہے؟

خواہ دوسروں کی زبان ہی سے سہی مگر جس وقت فردوسی اپنی قوم اور ملک کے مخالفوں کے خلاف بولتا ہے تو اس کی زبان سے بول نہیں آگ کے شعلے نکلنے لگتے ہیں، مثلاً ؎

زشیرِ شتر خوردن و سوسمار ۔۔۔ عدُو را بجائے رسیداست کار

کہ تختِ کیاں را کند آرزو ۔۔۔ تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

فردوسی کا مقصد پورا ہوگیا، اس نے فرزندانِ ایران کو ایسا بنا دیا کہ ان کا لباس ہزار بدل جائے مگر ان کی ایرانیت نہیں بدلتی۔

شاہنامہ کی قبولیت کا یہ عالم ہے کہ لوگ اس کے افراد سے اس طرح آشنا ہیں گویا وہ آج کل کے لوگ ہیں۔ نوشیرواں سے آج تک ایران میں بہت سے بادشاہ ہوئے، ان میں ایسے بھی تھے جن پر بجا طور پر فخر کیا جاسکتا ہے، مگر ان کی شہرت کتابوں میں بند ہے، لیکن شاہنامہ کے جمشید، فریدون، نوشیرواں، رستم وغیرہ کے نام بچہ بچہ کی زبان پر ہیں، صرف ایرانیوں کا مذکور نہیں، عام مسلمان بھی ان کو قبل اسلام نہیں بعد اسلام کے افراد خیال کرتے ہیں ثبوت میں رستم علی جمشید علی احمد سہراب وغیرہ نام آپ کے سامنے ہیں، مہا بھارت کا ارجن صرف ہندوستان کا ہیرو ہے مگر شاہنامہ کا ہیرو رستم گویا ساری دُنیا کا ہیرو ہے آج بھی رستم زماں کا خطاب اس پہلوان کو دیا گیا ہے جو فنِ کُشتی میں، کہ یہ بھی قدیم ایران میں جنگ کا ایک طریق تھا، اپنا حریف نہیں رکھتا، بادشاہوں کے دربار میں شاہنامہ پڑھا جاتا تھا اور دانا وزیر اس کے ذریعہ سے بادشاہوں کو ملک داری سکھایا کرتے تھے، ایران میں شاہنامہ خوانوں کی ایک جماعت تھی جو عام جلسوں، دوستوں کے جمگھٹوں میں قومی افتخار کی یہ داستانیں بڑے مؤثر لہجہ میں سنایا کرتے تھے

دُنیا کی متفرق زبانوں میں اس کے ترجمے ہوچکے ہیں، ہماری ہندوستانی زبان بھی اس کے منظوم ترجمہ سے محروم نہیں۔

خلاصہ یہ کہ شاہنامہ قدیم ایران کی شان و شوکت کا مرقع ہے، جسے فردوسی نے آج سے ہزار سال پہلے خونِ جگر سے لکھا تھا، فردوسی زندہ ہے، شاہنامہ زندہ ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایران کی وُہ روح زندہ ہے جو فردوسی نے شاہنامہ کے ترانوں سے ایرانیوں میں پیدا کی تھی +

مہر محمد خان شہاب مالیر کوٹلوی

ــــہ اصل میں "عرب" کا لفظ ہے، میں نے اسے ترک کر دیا ہے۔ شہاب

غزل

تم سے نظر ملا کر دیوانہ ہوگیا میں
کچھ راز بن گیا کچھ افسانہ ہوگیا میں

یہ سوچ کر کہ شاید پروانہ وار آؤ
افسردہ سا چراغِ غمخانہ ہوگیا میں

ہاں! اب اُٹھا رہے ہو دیوانہ وار نظریں
جب تم سے تنگ آکر دیوانہ ہوگیا میں

اب تو مری خموشی سب کہہ چکی ہے تم سے
اب تو سُنا سُنایا افسانہ ہوگیا میں

اِک بار اور دیکھا حسرت سے اُس کی جانب
پھر رفتہ رفتہ اُس سے بیگانہ ہوگیا میں

ہٹ کر غموں سے اکثر ٹھکرا دیا غموں کو
اکثر غموں سے گھُٹ کر دیوانہ ہوگیا میں

ہے کال آنسوؤں کا کیوں چشمِ غم میں جذبی
کس رندِ تشنہ لب کا پیمانہ ہوگیا میں

معین احسن جذبی

سٹریٹ فورڈ کا غنڈا

(ایک ایکٹ کی طربیہ تمثیل)

تمہید: مشہور فلاسفر فرانسس بیکن ملکۂ الزبتھ کے "لارڈ کیپر" کا لڑکا ۲۲ جنوری ۱۵۶۱ء کو پارک ہاؤس میں پیدا ہوا۔ لڑکپن ہی میں وہ محنت کش اور قابل تھا۔ ملکہ الزبتھ اُسے پیار سے ننھا لارڈ کیپر کہا کرتی تھی۔ بارہ سال کی عمر میں وہ ٹرینیٹی (Trinity) کالج کیمبرج میں حصولِ تعلیم کے لئے داخل ہوا۔ اُس وقت مغربی علوم اور خصوصاً علمِ منطق پر ارسطو کے خیالات کا غلبہ تھا۔ بیکن نے اس طرزِ تعلیم کے خلاف آواز بلند کی۔ اُس نے کہا کہ ارسطو کی تعلیم درست اور نادرست میں امتیاز نہیں کرسکتی اور نہ اس سے ہمارے علم میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ کتاب "نووم آرگینم" جس کا ہماری تمثیل میں ذکر ہے، اسی مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر لکھی گئی تھی۔ یہی وہ خیالات تھے جن کی وجہ سے بیکن کا فلسفہ ارسطو کے فلسفے سے ممتاز رہا۔

کالج چھوڑ کر اُس نے فرانس میں سکونت اختیار کرلی لیکن والد کی وفات کی وجہ سے دو سال بعد فرانس کو چھوڑ کر گھر کو لوٹنا پڑا۔ ۱۵۸۶ء میں وہ وکیل بن گیا اور جلد ہی پارلیمنٹ میں جگہ بھی حاصل کرلی۔ اب اُس نے ارل آف ایسیکس کے ذریعہ اٹرنی جنرل (سرکاری وکیل) بننے کی کوشش کی لیکن ابتداءً اس کوشش میں کامیاب نہ ہوسکا۔

ہمیں یہ بات نظر انداز نہیں کرنی چاہئے کہ بیکن کی زندگی کا واحد مقصد فلسفہ تھا اور اُس نے قانونی پیشہ صرف روپیہ کمانے کی خاطر اختیار کیا۔ فلاسفر کی حیثیت سے وہ معزز ترین انسان تھا لیکن قانونی پیشہ اختیار کرنے والے آدمی کی حیثیت سے اُسے اکثر کمینہ کہا جاتا ہے۔ جیمز اول کے عہد میں وہ "نائٹ" بنایا گیا۔ ازاں بعد سولسیٹر جنرل (سرکاری وکیل کا نائب) اور اس کے بعد اٹرنی جنرل (سرکاری وکیل) بن گیا۔ اور لارڈ ویرولم کا خطاب حاصل کیا۔ جلد ہی ترقی کرکے لارڈ چانسلر بن گیا۔ جب وہ لارڈ چانسلر تھا تو اس پر رشوت لینے کا الزام لگایا گیا۔ اس نے اپنا جرم تسلیم کرتے ہوئے کہا کہ میں نے رشوت تو لی ہے لیکن انصاف کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا۔ اس پر اُسے جرمانہ اور قید کی سزا ہوئی لیکن چند روز کے بعد ہی شاہی حکم سے سزا معاف ہوگئی۔ بقیہ زندگی اس نے مطالعہ اور تصنیف میں صرف کی۔ اس کی وفات ۹ اپریل ۱۶۲۶ء کو ہوئی۔

ذیل کی تمثیل اُس زمانہ سے تعلق رکھتی ہے جب کہ بیکن اٹرنی جنرل (سرکاری وکیل) تھا۔ یہ تمثیل اس بے بنیاد خیال کو مدِنظر رکھ کر لکھی گئی ہے کہ شیکسپیئر کے ڈراموں کا اصل مصنف بیکن تھا۔ اس نظریہ پر آج تک بہت مباحثہ ہوچکا ہے اور فی الحقیقت اس نظریہ کے حامیوں

---

۱ Stratford شیکسپیئر کے پیدا ہونے کی جگہ۔

نے اسے درست ثابت کرنے میں کمال کر دکھایا ہے۔ لیکن بنظرِ غائر دیکھنے سے یہ نظریہ بالکل غلط معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال یہ تمثیل اسی نظریہ پر ایک طنز ہے۔

افضل

بیکن اپنی لائبریری میں بیٹھا لکھنے میں مصروف ہے۔

(ذرا ہاتھ پھیلا کر) پبلک اس ڈرامے کی بہت تعریف کرے گی لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ ڈرامے میں نے ہی ـــــ یہ فضول خیال ہے ہاں یہ ڈراما بہت اچھا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے اسے بھی دینا پڑے گا۔ (دروازہ پر دستک)

(بیکن فوراً مسودہ میز کے نیچے چھپا دیتا ہے۔ بیگم فرانسس بیکن اندر داخل ہوتی ہے۔)

بیگم۔ اس دخل اندازی کے لئے معافی چاہتی ہوں۔ کیا لکھ رہے تھے آپ؟

بیکن۔ یونہی ایک مقالہ۔

بیگم۔ لیکن آپ نے تو کہا تھا کہ میں اب مقالہ کبھی نہیں لکھوں گا۔ میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ مقالہ لکھے بغیر نہیں رہ سکتے۔

بیکن۔ درست ہے لیکن یہ مقالہ تو غیر معمولی ہے۔ یہ عقل، عزت، ادب، نیکی اور گناہ ایسے عنوانات پر نہیں لکھا گیا ہے بلکہ اس میں فلسفیانہ رنگ نمایاں ہوگا۔ اس کا عنوان ہے "نووم آرگنیم"[1]

بیگم۔ کیا؟

بیکن۔ "نووم آرگنیم"

بیگم۔ یہ فرانسیسی زبان کا لفظ ہوگا!

بیکن۔ نہیں لاطینی کا۔

بیگم۔ کاش آپ اپنے مقالات کا عنوان عام فہم زبان میں رکھا کریں۔ میرا تو خیال ہے کہ آپ ایسا صرف اس لئے کرتے ہیں کہ لوگوں پر ظاہر ہو جائے کہ آپ لاطینی بھی جانتے ہیں۔ لاطینی تو اب کوئی نہیں لکھتا۔ آخر اس میں خوبی ہی کیا ہے؟

بیکن۔ صرف عنوان نہیں بلکہ تمام مقالہ ہی لاطینی زبان میں ہے۔

بیگم۔ اُف! میں تو اس کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھ سکوں گی۔

بیکن۔ تمہیں پڑھنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟

بیگم۔ (ذرا طیش میں آکر) مجھے یقین ہے کہ جو کچھ تم لکھتے ہو میں اُسے سمجھ سکتی ہوں۔

بیکن۔ یہ نہ سمجھ سکو گی۔ اچھا میں تمہارے لئے اس کا عام زبان میں ترجمہ بھی کر دوں گا۔

---

[1] Novum Organum بیکن کا لاطینی میں لکھا ہوا مقالہ جس میں اس نے وسعتِ علم پر بحث کی ہے۔

بیگم۔ وعدہ کرتے ہو

بیکن۔ ہاں

بیگم۔ (کچھ وقفہ کے بعد) اس کا موضوع کیا ہے۔

بیکن۔ کچھ کہہ نہیں سکتا ـــــ یہی، اِدھر اُدھر کی باتیں۔

بیگم۔ چھُپاتے کیوں ہو مجھ سے ؟

بیگن۔ نہیں نہیں، مجھے چھپانے کی ضرورت ؛ پھر تم سے ! تم تو میرے متعلق سب کچھ جانتی ہو۔

(دروازہ پر دستک)

بیکن۔ اندر آجاؤ۔ (نوکر اندر آتا ہے۔)

نوکر۔ ایک شخص آپ سے ملنا چاہتا ہے حضور!

بیکن۔ نام نہیں بتایا اُس نے ؛

نوکر۔ شاید شیکسپیر بتایا تھا۔

بیگم۔ فرانسس! یہ کون ہوسکتا ہے ؛ (نوکر سے) اُس نے کوئی کام بھی بتایا ؛

نوکر۔ حضور کہتا تھا کہ بڑا ضروری کام ہے۔ کچھ کُتّے کا ذکر کرتا تھا۔

بیگم۔ کُتا ؛ فرانسس میرا خیال ہے کہ تم کُتا نہیں خریدو گے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ ہم نے ایک دفعہ کُتا رکھا تھا لیکن اُس نے ہمیں بہت تنگ کیا۔ میں نے تو قسم کھالی تھی کہ کبھی کُتا نہیں رکھوں گی۔

بیکن۔ نہیں نہیں، نوکر غلط سمجھا ہوگا۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ کون ہے اور کس لئے آیا ہے۔ میرے اور اس کے درمیان کچھ لین دین کا ہے۔ اب تم جاؤ میں اس سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

بیگم۔ مجھے بھی سُن لینے دیجئے۔

بیکن۔ کوئی ضرورت تو نہیں۔ آدمی ذرا گنوار سا ہے۔

بیگم۔ میں نے کہا نہ تھا کہ تم مجھ سے کچھ چھپانا چاہتے ہو۔ اچھا میں جاتی ہوں لیکن دس منٹ میں واپس آجاؤں گی۔

(بیگم چلی جاتی ہے اور بیکن کمرہ میں ٹہلنا شروع کردیتا ہے۔ نوکر دوبارہ اندر آتا ہے۔)

نوکر۔ مسٹر شیکسپیر آگئے ہیں حضور!

(شیکسپیر اندر داخل ہوتا ہے۔ وہ شراب کے نشہ میں بدمست ہے)

بیکن ۔ کیا حال ہے مسٹر شیکسپیر؟

شیکسپیر ۔ اچھا ہوں ۔ اور آپ کا جناب؛ مَیں یُونہی ذرا سٹریٹ فورڈ سے باہر نکلا تو میں نے کہا کہ چلو جناب کی زیارت کا شرف بھی حاصل کرلیں۔

بیکن ۔ کیا حال ہے تمہارے کھیتوں کا؟

شیکسپیر ۔ کوئی خاص بُرا نہیں ۔ میرے ہمسائے بہت شریر ہیں میں مصائب میں مبتلا ہوں اس لئے آپ سے کچھ روپے لینے آیا ہوں۔

بیکن ۔ عزیز دوست یہ ناممکن ہے ۔ ابھی چھ ماہ بھی ہونے نہیں پائے کہ مَیں نے تمہیں پانچ ہزار روپے دیئے تھے ۔ ڈراموں سے آمدنی بھی تو کم ہوتی ہے ۔ اس حالت میں تمہارا روپے طلب کرنا فضول ہے اور میرے خیال میں تو تم مجھ سے بھی امیر ہو۔

شیکسپیر ۔ سنئے صاحب! میں نے کہہ تو دیا ہے کہ مَیں مشکلات میں گرفتار ہوں اور مجھے اپنی عزت برقرار رکھنی ہے۔

بیکن ۔ اور مجھے اپنی!

شیکسپیر ۔ افسوس کہ مَیں آپ کی مشکلات کے حل میں مدد نہیں دے سکتا ۔ ہر انسان خود غرض واقع ہُوا ہے لہٰذا پہلے مجھے اپنی ضروریات پُوری کرنی ہوں گی۔

بیکن ۔ ناممکن ۔ ایک پائی نہیں ملے گی۔

شیکسپیر ۔ مَیں روپے لُوں گا اور ضرور لُوں گا ۔ سات ہزار روپے۔

بیکن ۔ میں تمہیں پہلے کی طرح مقررہ اوقات پر مقررہ رقم دینے کو تیار ہوں لیکن اس طرح وقت بے وقت طلب کرنے پر تو میں ایک پائی بھی نہیں دُوں گا۔

شیکسپیر ۔ میں سٹریٹ فورڈ سے چل کر صرف اس لئے آیا ہوں کہ آپ سے روپے لوں اور لے کر ہی ٹلوں گا۔

بیکن ۔ تو تم بیست سالہ تعلقات کے بعد اپنا معاہدہ توڑ دو گے؛ تمہیں ضرور انتظار کرنا پڑے گا ۔ مَیں نے ایک اور ڈراما بھی لکھا ہے اور شاید یہ ڈراما آخری . . . . . .

شیکسپیر ۔ آخری؛ کیا آپ کا یہی خیال ہے؟

بیکن ۔ نہیں میرا یہ مطلب نہیں کہ یہ آخری ہوگا ۔ میں کچھ لکھے بغیر کیسے رہ سکتا ہوں ۔ حقیقی شاعر ایسا کبھی نہیں کرسکتا ۔ مَیں اسے چند ہی روز میں اختتام کو پہنچا دوں گا ۔ دو ماہ کے عرصہ تک گلوب[1] تھیئٹر میں اس کی نمائش بھی ہو گی ۔ اس میں تمہارا حصّہ کافی ہوگا ۔ اس ڈرامے کا نام "طُوفان" ہے ۔ یہ میری تصنیفات میں سے بہترین تصنیف ہوگی۔

شیکسپیر ۔ نام تو بہت اچھا ہے ۔ یہ ڈراما حزنیہ ہوگا یا طربیہ؟

---

[1] وہ تھیئٹر جہاں شیکسپیر کے ڈراموں کی نمائش ہُوا کرتی تھی +

بیکن ۔ اس کا انجام نہایت خوشگوار ہوگا ۔ ہاں تو تم کچھ انتظار کر سکو گے ؛

شیکسپیر ۔ اچھا کچھ کم دے دیجئے ۔ لیکن دیجئے ضرور ۔ دیکھئے مجھے دیر ہوتی ہے جلدی کیجئے۔

بیکن ۔ بھائی عقل کے ناخن لو ۔ یہ ناممکن ہے ، ذرا سوچو تو کہ میں نے تمہارے لئے کیا کچھ کیا ہے ۔ تم ایک جاہل اور گنوار لڑکے تھے ۔ میں نے تمہیں معزز بنا دیا ہے ۔ تم ایک ذرہ کی مانند تھے لیکن میں نے تمہیں آفتاب بنا دیا ہے ۔ تمہارا مستقبل نہایت شاندار ہے ۔ پھر بھی تم یہاں آکر مجھے بدنام کرتے ہو ۔

شیکسپیر ۔ دیکھئے حضرت! میں ایسے سخت الفاظ کی تاب نہیں لا سکتا ۔

بیکن ۔ نہیں ، میرا یہ خیال نہ تھا کہ میں تمہیں برا بھلا کہوں ۔ لیکن کیا یہ بے وقوفی کی انتہا نہیں کہ تم اس بطخ کو مار رہے ہو جو سونے کے انڈے دیتی ہے ؛ علاوہ ازیں تمہارا تمام فخر خاک میں مل جائے گا ۔ مستقبل کی دنیا تمہیں عظیم الشان ڈراموں کے مصنف کی حیثیت سے یاد کرے گی ۔ تمہارے لئے یہی کافی نہیں ؛

شیکسپیر ۔ خیر عظیم الشان ڈراموں سے مجھے کوئی سروکار نہیں ۔ اگر یہ ڈرامے فی الواقع عظیم الشان ہی ہیں تو آپ اپنا نام کیوں نہیں ظاہر کرتے ؛

بیکن ۔ ہاں میں نام ظاہر کرنے کا خواہشمند نہیں ۔

شیکسپیر ۔ بجا فرمایا جناب نے ۔ ڈراموں کی اشاعت کے لئے آپ کو کسی شخص کی ضرورت تھی ۔ آپ نے میری خدمات طلب کیں اور میں تیار ہو گیا ۔ کیا مجھے اُن کی قیمت دینی نہیں پڑتی ؛ ہر فضول اور لایعنی بات جو آپ لکھیں مجھے قبول کرنی پڑتی ہے " موت خواب کے مانند ہے " ہیملٹ میں یہ کیا لایعنی تحریر تھی ؛ کیا آپ گوارا کر سکتے ہیں کہ عوام اور بچے آپ کو دہریہ سمجھ کر سٹرٹ فورڈ کی گلیوں میں آپ کے پیچھے پیچھے آوازے کستے پھریں ۔ حیران ہوں کہ آپ کو خود ایسی بے معنی اور خلافِ عقل باتیں لکھنے سے شرم کیوں نہیں آتی ۔ مجھے یہ سب بے عزتی گوارا کرنی پڑتی ہے لہٰذا میں تنخواہ کا حقدار ہوں ۔ مجھ پر آپ کا کوئی احسان نہیں ۔

بیکن ۔ او بے حیا تجھے یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی ۔ اپنے محسن کو بدنام کرنا چاہتے ہو ۔ جاؤ نکل جاؤ یہاں سے ۔ (نوکر کو بلانے کے لئے گھنٹی پر ہاتھ رکھتا ہے ۔)

شیکسپیر ۔ بہت اچھا جناب ۔ آج دوپہر تک تمام لندن کے لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ ڈرامے آپ ہی نے لکھے ہیں ۔ میں آپ کو ہر ممکن نرمی دکھا چکا ہوں ۔ اچھا ——— خدا حافظ ! (دروازہ کی طرف جاتا ہے ۔)

بیکن ۔ خدا کے لئے واپس آجاؤ مسٹر شیکسپیر ۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے پاس کچھ نہیں ۔

شیکسپیر ۔ تو کہیں سے حاصل کر لیجئے ۔

اسی وقت تو یہ ممکن نہیں ۔

شیکسپیئر۔ اچھا، اگر آپ وعدہ کریں۔ تو میں ابھی جانے کی بجائے دوپہر کو چلا جاؤں گا۔

بیکن۔ حیران ہوں کہ کیا کروں۔ تم نہیں جانتے کہ میری طبیعت کتنی شکستہ ہو گئی ہے۔

شیکسپیئر۔ اچھا میں تمام معاملہ آپ ہی پر چھوڑتا ہوں۔ خدا حافظ! بیکن۔ خدا حافظ

شیکسپیئر۔ خیال رکھیئے گا سات ہزار روپے۔ ورنہ تمام بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔

(شیکسپیئر باہر جاتا ہے۔ اور بیکن سر پر ہاتھ رکھ کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ بیگم فرانسس بیکن اندر داخل ہوتی ہے)

بیگم۔ فرانسس، فرانسس! (بیکن اُسی حالت میں بیٹھا رہتا ہے) کیا کرتے ہو فرانسس، اُٹھو بھی۔

بیکن۔ تنگ مت کرو بیگم۔ تم نہیں جانتی ہو کہ آج کیا ہوا۔ آہ! میں تباہ ہو گیا ہوں۔

بیگم۔ یہ کیا مجذوبوں کی سی بڑ مار رہے ہو اور تم نے یہ حالت کیا بنا رکھی ہے؟

بیکن۔ مجھے اکیلا یہیں پڑا رہنے دو تو بہتر ہے۔

بیگم۔ آخر تمہیں ہو کیا گیا۔ میں تمہیں اس حالت میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔

بیکن۔ میں تو برباد ہو گیا ہوں بیگم! (آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں)

بیگم۔ خدا کے لئے ہوش میں آؤ فرانسس! اب تو تمہیں کچھ کرنا ہی پڑے گا۔

بیکن۔ (چونک کر) ہیں! تمہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا؟ کیا اُس جاہل نے یہ بات مشہور کر دی ہے۔

بیگم۔ کیا عرض کروں فرانسس! مجھے آج یہ سُن کر سخت صدمہ ہوا ہے کہ میرا شوہر ایک معزز آرٹی جنرل نہیں بلکہ اُس نے تمام عمر یہ ہزلیات جو ڈراموں کی شکل میں ظاہر ہو رہی ہیں، لکھتے گزار دی۔

بیکن۔ بیگم، بیگم! میرے لئے یہ ناقابلِ برداشت ہے۔ تمہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا؟

بیگم۔ میں دروازے کے پیچھے کھڑی تمہاری سب گفتگو سُن رہی تھی۔

بیکن۔ لیکن بیگم! اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ اگر یہ احسان فراموش شخص نہ مانا تو پھر کیا ہو گا۔ آہ! میں اس مشکل کو کس طرح حل کر سکتا ہوں، خودکشی کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔

بیگم۔ اب تو تمہیں کچھ انتظام کرنا ہی پڑے گا۔ کتنے روپے طلب کرتا ہے وہ؟ بیکن۔ پانچ ہزار

بیگم۔ میرا تو خیال ہے کہ اُس نے سات ہزار کہے تھے۔

بیکن۔ ہاں اتنے ہی کہے تھے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ پانچ ہزار ہی پر راضی ہو جائے گا۔ لیکن میرے پاس تو پانچ روپے بھی نہیں۔ ہمارا تو قرض ہی بہت زیادہ ہے۔ کاش گھر کا خرچ ہی کم ہوتا۔ بیگم۔ بالکل ٹھیک۔ تمام الزام میرے سر ہی تھوپ دو۔

بیکن۔ ساری امید کا مطلب یہ تھا میں تباہ حال ہو رہا ہوں، اور دنیا میں کوئی انسان نہیں جو مجھے پانچ ہزار روپے اُدھار دے سکے۔ ہر شخص کو معلوم

بیکن ۔ اس کا انجام نہایت خوشگوار ہوگا ۔ ہاں تو تم کچھ انتظار کر سکو گے ؛
شیکسپیئر ۔ اچھا کچھ کم دے دیجئے ۔ لیکن دیجئے ضرور ۔ دیکھئے مجھے دیر ہوتی ہے جلدی کیجئے ۔
بیکن ۔ بھائی عقل کے ناخن لو ۔ یہ ناممکن ہے ، ذرا سوچو تو کہ میں نے تمہارے لئے کیا کچھ کیا ہے ۔ تم ایک جاہل اور گنوار لٹ کے تھے ۔ میں نے تمہیں معزز بنا دیا ہے ۔ تم ایک ذرہ کی مانند تھے لیکن میں نے تمہیں آفتاب بنا دیا ہے ۔ تمہارا مستقبل نہایت شاندار ہے ۔ پھر بھی تم یہاں آکر مجھے بدنام کرتے ہو ۔
شیکسپیئر ۔ دیکھئے حضرت! میں ایسے سخت الفاظ کی تاب نہیں لا سکتا ۔
بیکن ۔ نہیں ، میرا یہ خیال نہ تھا کہ میں تمہیں بُرا بھلا کہوں ۔ لیکن کیا یہ بے وقوفی کی انتہا نہیں کہ تم اُس بطخ کو مار رہے ہو جو سونے کے انڈے دیتی ہے ؛ علاوہ ازیں تمہارا تمام فخر خاک میں مل جائے گا ۔ مستقبل کی دُنیا تمہیں عظیم الشان ڈراموں کے مصنف کی حیثیت سے یاد کرے گی ۔ تمہارے لئے یہی کافی نہیں ؛
شیکسپیئر ۔ خیر عظیم الشان ڈراموں سے مجھے کوئی سروکار نہیں ۔ اگر یہ ڈرامے فی الواقع عظیم الشان ہی ہیں تو آپ اپنا نام کیوں نہیں ظاہر کرتے ؛
بیکن ۔ ہاں مَیں نام ظاہر کرنے کا خواہشمند نہیں ۔
شیکسپیئر ۔ بجا فرمایا جناب نے ۔ ڈراموں کی اشاعت کے لئے آپ کو کسی شخص کی ضرورت تھی ۔ آپ نے میری خدمات طلب کیں اور میں تیار ہو گیا ۔ کیا مجھے اُن کی قیمت دینی نہیں پڑتی ؛ ہر فضول اور لایعنی بات جو آپ لکھیں مجھے قبول کرنی پڑتی ہے "موت خواب کے مانند ہے" ہیملٹ میں یہ کیا لایعنی تحریر تھی ؛ کیا آپ گوارا کر سکتے ہیں کہ عوام اور بچے آپ کو دہریہ سمجھ کر سٹریٹ فورڈ کی گلیوں میں آپ کے پیچھے پیچھے آوازے کستے پھریں ۔ حیران ہوں کہ آپ کو خود ایسی بے معنی اور خلافِ عقل باتیں لکھنے سے شرم کیوں نہیں آتی ۔ مجھے یہ سب بے عزتی گوارا کرنی پڑتی ہے لہٰذا میں تنخواہ کا حقدار ہوں ۔ مجھ پر آپ کا کوئی احسان نہیں ۔
بیکن ۔ او بے حیا تجھے یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی ۔ اپنے محسن کو بدنام کرنا چاہتے ہو ۔ جاؤ نکل جاؤ یہاں سے ۔ (نوکر کو بُلانے کے لئے گھنٹی پر ہاتھ رکھتا ہے ۔)
شیکسپیئر ۔ بہت اچھا جناب ۔ آج دوپہر تک تمام لندن کے لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ ڈرامے آپ ہی نے لکھے ہیں ۔ میں آپ کو ہر ممکن نرمی دکھا چکا ہوں ۔ اچھا ـــــ خُدا حافظ ! (دروازہ کی طرف جاتا ہے ۔)
بیکن ۔ خدا کے لئے واپس آجاؤ مسٹر شیکسپیئر ۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرے پاس کچھ نہیں ۔
شیکسپیئر ۔ تو کہیں سے حاصل کر لیجئے ۔
اسی وقت تو یہ ممکن نہیں ۔

شیکسپیئر۔ اچھا، اگر آپ وعدہ کریں۔ تو میں ابھی جانے کی بجائے دوپہر کو چلا جاؤں گا۔

بیکن۔ حیران ہوں کہ کیا کروں۔ تم نہیں جانتے کہ میری طبیعت کتنی شکستہ ہو گئی ہے۔

شیکسپیئر۔ اچھا میں تمام معاملہ آپ ہی پر چھوڑتا ہوں۔ خدا حافظ! بیکن۔ خدا حافظ

شیکسپیئر۔ خیال رکھئے گا سات ہزار روپے۔ ورنہ تمام بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔

(شیکسپیئر باہر جاتا ہے۔ اور بیکن سر پر ہاتھ رکھ کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ بیگم فرانسس بیکن اندر داخل ہوتی ہے)

بیگم۔ فرانسس، فرانسس! (بیکن اُسی حالت میں بیٹھا رہتا ہے) کیا کرتے ہو فرانسس، اُٹھو بھی۔

بیکن۔ تنگ مت کرو بیگم۔ تم نہیں جانتی ہو کہ آج کیا ہؤا۔ آہ! میں تباہ ہو گیا ہوں۔

بیگم۔ یہ کیا مجذوبوں کی سی بڑ مار رہے ہو اور تم نے یہ حالت کیا بنا رکھی ہے؟

بیکن۔ مجھے اکیلا یہیں پڑا رہنے دو تو بہتر ہے۔

بیگم۔ آخر تمہیں ہو کیا گیا۔ میں تمہیں اس حالت میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔

بیکن۔ میں تو برباد ہو گیا ہوں بیگم! (آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں)

بیگم۔ خدا کے لئے ہوش میں آؤ فرانسس! اب تو تمہیں کچھ کرنا ہی پڑے گا۔

بیکن۔ (چونک کر) ہیں! تمہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا؟ کیا اُس جاہل نے یہ بات مشہور کر دی ہے۔

بیگم۔ کیا عرض کروں فرانسس! مجھے آج یہ سُن کر سخت صدمہ ہؤا ہے کہ میرا شوہر ایک معزز اٹارنی جنرل نہیں بلکہ اُس نے تمام عمر یہ ہزلیات جو ڈراموں کی شکل میں ظاہر ہو رہی ہیں، لکھتے گزار دی۔

بیکن۔ بیگم بیگم! میرے لئے یہ ناقابلِ برداشت ہے۔ تمہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا؟

بیگم۔ میں دروازے کے پیچھے کھڑی تمہاری سب گفتگو سُن رہی تھی۔

بیکن۔ لیکن بیگم! اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ اگر یہ احسان فراموش شخص نہ مانا تو پھر کیا ہو گا۔ آہ! میں اس مشکل کو کس طرح حل کر سکتا ہوں، خودکشی کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔

بیگم۔ اب تو تمہیں کچھ انتظام کرنا ہی پڑے گا۔ کتنے روپے طلب کرتا ہے وہ؟ بیکن۔ پانچ ہزار

بیگم۔ میرا تو خیال ہے کہ اُس نے سات ہزار کہے تھے۔

بیکن۔ ہاں اتنے ہی کہے تھے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ پانچ ہزار ہی پر راضی ہو جائے گا۔ لیکن میرے پاس تو پانچ روپے بھی نہیں۔ ہمارا تو قرض ہی بہت زیادہ ہے۔ کاش گھر کا خرچ ہی کم ہوتا۔ بیگم۔ بالکل ٹھیک۔ تمام الزام میرے سر ہی تھوپ دو۔

بیکن۔ پیاری! میرا یہ مطلب نہ تھا۔ میں تباہ حال ہو رہا ہوں اور دُنیا میں کوئی ایسا فرد نہیں جو مجھے پانچ ہزار روپے اُدھار دے سکے۔ ہر شخص کو معلوم

ہے کہ میں حد سے زیادہ مقروض ہوں۔

بیگم۔ فرانسس تم اٹارنی جنرل ہو، کیا تمہارے پاس کوئی اہم مقدمات نہیں ؟

بیکن۔ ہیں تو سہی۔ ہر وقت ہی ہوتے ہیں اور مجھے اس بات کا فخر ہے کہ میں اُن کو خوب نبھاتا ہوں۔

بیگم۔ فخر کو چھوڑو۔ کیا تمہارے پاس کسی امیر کا مقدمہ نہیں ؟ **بیکن۔** ہے کیوں نہیں ؟

بیگم۔ خوب ! **بیکن۔** پھر ؟

بیگم۔ خدا جانے تمہیں کیا ہو گیا ہے، کوئی بات سمجھتے ہی نہیں۔ اچھا صاف صاف کہتی ہوں کہ کیا کبھی کسی نے تمہیں رقم پیش نہیں کی ؟

بیکن۔ تمہارا مطلب ہے رشوت ؟

بیگم۔ مجھے خوب یاد ہے فرانسس کہ ایک دفعہ تم نے کہا تھا کہ اگر ہم گلاب کے پھول کا نام تبدیل کر دیں تو اُس کی خوشبو اتنی ہی خوشگوار ہو گی جتنی کہ موجودہ صورت میں ہے۔ اچھا تم جو چاہو اسے کہہ لو۔ کیا تم رشوت نہیں لے سکتے ؟ **بیکن۔** ہرگز نہیں

بیگم۔ تو پھر تم اپنی بے عزتی گوارا کر لو گے ؟ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارا نام ان ڈراموں کے مصنف ہونے کی حیثیت سے ظاہر ہو جائے ؟ ہاں تو تمہارے ہاتھ میں کوئی ایسا آدمی نہیں جو تمہیں پانچ ہزار روپے دے سکے ؟

بیکن۔ شاید ـــــــ ہاں ہاں وہ ! **بیگم۔** خوب ! اُس کا نام کیا ہے ؟

بیکن۔ کئی ہیں۔ مثلاً ایک رابنسن ہے۔ اُس کے پاس بے شمار روپیہ ہے۔ ابھی کل ہی اس نے رشوت دینے کی کوشش کی۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں اشارۃً اُس کا ذکر کیا تھا۔

بیگم۔ اچھا تو جب کل تم اُس سے کچہری میں ملو تو اُسی وقت پانچ ہزار روپے لے لینا۔

بیکن۔ نہیں مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا۔

بیگم۔ اگر تم سے یہ نہ ہو سکے گا تو مجھے بھی دوبارہ دیکھنے کی اُمید منقطع کر دو۔

بیکن۔ اچھا، اچھا بیگم۔ لیکن تمہیں نہیں معلوم کہ میرے لئے یہ کتنا مشکل ہو گا۔

بیگم۔ میں یہ جاننا چاہتی بھی نہیں۔ (جاتے وقت) بہتر ہو گا کہ تم کچھ زیادہ ہی لے لینا۔ بقیہ رقم سے میں اپنی ضروریات پوری کرونگی۔ (بیگم چلی جاتی ہے)

بیکن۔ (کمرہ میں ٹہلتے ہوئے) جو ہونا ہے وُہ ہو کر ہی رہے گا۔ اگر آج میرا نام ظاہر نہیں ہو گا تو سو دو سو سال بعد ایسا ہو جائیگا۔ صبر ! ـــــ نہیں بیگم یہ نہیں مانے گی۔ حیران ہوں کہ ان حالات میں کیا کروں۔ آج چھٹی ہے مجھے وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ بہتر ہو گا کہ میں یہ ڈراما ختم کر دوں۔ آہ میں نے شاعری شروع ہی کیوں کی۔ اب یہ سلسلہ منقطع ہونے کی بھی اُمید نہیں۔ ہاں جب وہ رُوسیاہ مر جائے گا تب یہ ممکن ہو سکتا ہے۔

(پردہ)

مترجمہ
افضل

(سرجان سکوائر)

بہار

اُٹھ دیکھ، کہ گلشن میں بہار آئی ہوئی ہے
ایک ایک کلی حُسن پہ اترائی ہوئی ہے

اے سروِ خراماں روشِ باغ کی جانب
پھولوں کی نظر صبح سے للچائی ہوئی ہے

گنجینہ بنا ہے چمنستاں زرِ گُل سے
اور دَولتِ قاروں مرے ہاتھ آئی ہوئی ہے

ندی کے کناروں پہ چمکتا ہُوا ریتا
چاندی کی ہوائی ہے کہ بُرکائی ہوئی ہے

یا باغ کے اِس دامنِ رنگیں کے سرے پر
مُقیّش کی اِک گوٹ سی لہرائی ہوئی ہے

کاجل کی پہاڑی سے بہے دودھ کے دھارے
بگلوں پہ سیہ فام گھٹا چھائی ہوئی ہے

اِس غنچہ کو چھیڑا، کبھی اُس گُل کو جھنجوڑا
ہر موجِ ہوا، باؤلی، ہرجائی ہوئی ہے

گرِدُوں پہ کماں کی ہے یہ رنگین سی چُوڑی
یا کوئی پری تالبِ بام آئی ہوئی ہے

اَے حُسنِ نظر باز ترے تیر سے ہر سُو
دل تا بہ جگر زندگی برمائی ہوئی ہے

حامد علی خاں

مصر کا ایک ٹھگ

ابراہام میندوزا، غالباً ایک معمولی قابلیت کا تعلیم یافتہ ٹھگ ہے جو موٹر کاروں کی چوری کرتا اور دھوکے سے انہیں اونے پونے بیچ دیتا ہے۔ وہ فرانسیسی گو اچھی جانتا ہو مگر انگریزی زبان میں بہت کم درک رکھتا ہے۔ اپنے شہر کے ہوٹلوں کے گرد منڈلانا اور متمول اجنبی نوواردوں کی تاک میں رہنا اُس کے پیشے کے لوازم میں سے ہے۔ یوروپین موسیقی اور ماہرانِ موسیقی، گھوڑ دوڑ اور برطانوی پالیٹکس کے متعلق اُس کی معلومات نہ فقط سطحی بلکہ سخت مضحکہ انگیز بھی ہیں۔ اگر ان باتوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہم کو اُس کی نفسیاتی معلومات پر حیرت ہوتی ہے، وہ یوروپین، بالخصوص انگریزی فطرت کو خوب سمجھتا ہے اور اپنی گفتگو میں صرف اُنہیں موضوعات کو لیتا ہے جو ایک انگریز سیاح کے لئے دلچسپی کا موجب ہوں۔

اس افسانے میں اُس نے اپنے شکار کے پہچاننے میں سخت غلطی کھائی ہے جس انگریز سے اُس کا سابقہ پڑا ہے، وہ ایک گرگِ باراں دیدہ سے کم نہیں جو عربی زبان سے بخوبی واقف ہے (جبھی تو اُس کی گالیوں سے حظ اُٹھاتا رہا) اور مصری ٹھگوں کے ہاتھ غالباً دیکھ چکا ہے اس لئے اُسے دھوکا دینا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

میں سکندریہ میں "محمد علی کیفے" میں بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ پاس ہی ایک گراموفون پڑا چیخ رہا تھا۔ یہ ایک عشقیہ گیت تھا جس کی لَے ناک سے نکلتی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور جس کا سوز و گداز کم از کم بیس برس پہلے ختم ہو چکا ہوگا۔ یوں تو کیفے میں گاہکوں کا کافی ہجوم تھا مگر پھر بھی کچھ میزیں تھیں جو خالی پڑی تھیں، مجھے کافی پیتے کچھ بہت دیر نہ ہوئی ہوگی کہ ایک نہایت خوش پوش شخص کیفے میں داخل ہوا۔ اُس نے ایک یکچشمہ اپنی دائیں آنکھ پر لگاتے ہوئے کیفے کا جائزہ لیا، پھر اُسے اُتار کر بائیں آنکھ پر لگایا اور دوبارہ دیکھا۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اُس نے مجھے دیکھا یا نہیں مگر وہ سیدھا میری میز کی طرف بڑھا، تعظیماً میری طرف جُھکا اور بیٹھ گیا۔

اُس نے انگریزی میں پوچھا "آپ کے لئے کچھ لانے کو کہوں؟"

مجھے بے حد حیرت ہوئی اور مَیں نے کہا "معاف کیجئے گا۔ میں سمجھ نہیں سکا، میرا مطلب یہ ہے۔ نہیں۔ بے حد شکریہ آپ کا۔"

"میں کسی قدر کاہو کے ساتھ کچھ کافی پیوں گا، اور کچھ تھوڑی سی اَور چیز بھی۔ شاید، ذرا سوچ لوں۔"

میں نے کہا "پئیں گے آپ؟"

"میں موٹر کار خریدتا اور بیچتا ہوں، میرا کاروبار بہت وسیع ہے۔ اس لئے جب تھک جاتا ہوں تو تازہ دم ہونے کے لئے کچھ کھا پی

بتا ہوں۔"

"بے شک! بے شک!!"

"لیکن آج مجھے کچھ فکر لاحق ہو رہا ہے، میری بیوی مجھے چھوڑ گئی ہے، وہ فرانسیسی نژاد ہے، میں بیروت کا باشندہ ہوں میرا نام ابراہام بندرزا ہے، میں لے ونت کے ایک پرانے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ یوں تو میں کسی سے اپنی مصیبتیں بیان نہیں کرتا مگر آپ کی صورت سے ہمدردی ٹپکی پڑتی ہے۔ اس لئے آپ سے سب کچھ کہتا ہوں! Waiter، افسوس وہ ایک مہذب زبان نہیں سمجھتا۔"

زاں بعد اس نے جو کچھ اُسے درکار تھا عربی زبان میں طلب کیا، بہرے نے بے معنی سی ہنسی میں دانت دکھلاتے ہوئے شستہ فرانسیسی میں جواب دیا۔ ابراہام میندوزا نے اپنا یکچشمہ پھر آنکھ پر لگاتے ہوئے مجھ سے کہا:۔

"آپ کو شاید کسی قدر تعجب ہوتا ہوگا کہ میں ایک عظیم غم کو دل میں لئے ہوں اور پھر بھی کھا رہا ہوں، وجہ ظاہر ہے، مجھے کسی نہ کسی طرح زندہ بھی تو رہنا ہے ——— میرے کاروبار کو میری پوری تندہی کی ضرورت ہے ——— لیکن میں اپنی نسبت حد سے زیادہ باتیں کہہ رہا ہوں، آپ کی شادی ہو چکی ہوگی شاید؟"

"جی نہیں"

"مہربان ہے اللہ"

ایک لمحے سے کچھ کم کے لئے وہ چپ رہا۔ میں کافی پیتا رہا اور گراموفون اور بھی زور سے بجتا بلکہ چیختا رہا۔

"گانا سننا بہت اچھا ہے" مسٹر میندوزا نے کہا "اِن وحشی ملکوں میں ایک مہذب کان کے لئے گانا بھی تو نہیں ملتا جب میں پیرس میں تھا تو ہر رات اوپیرا جاتا تھا، میری بیوی ——— لیکن اُس وقت وہ میری بیوی نہ تھی۔ وہ گانا سننے کی بہت شوقین ہے اور وہ میرے بھی مذاق کو بہتر بنا رہی تھی۔ میں تو پوسنی (Puccini) کا بہت مداح ہوں۔ آپ کی کیا رائے ہے اُس کے متعلق؟"

پوسنی کے متعلق میری جو بھی رائے تھی میں نے اُسے بتا دی۔ ابھی میں اُسے بتا ہی رہا تھا کہ ایک قاب قسم قسم کے کھانوں سے بھری ہوئی آ پہنچی۔

اُس نے کہا "یہ زیتون آپ کے لئے ہیں۔ آپ کی ہمدردی مجھے بھا گئی ہے، آپ کو میرے ساتھ کھانا ہی ہوگا۔ اور یہ رہے رول (Rolls) گو تازہ نہیں مگر کھائے جا سکتے ہیں۔ ہاں، تو پوسنی کے متعلق آپ مجھ سے متفق ہیں، بہت خوب، مگر ویگنر کی نسبت میں کچھ اعلےٰ رائے نہیں رکھتا۔ آپ جانتے ہی ہیں میں نے اُس کا "فگارو کا نکاح" (Marriage of Figaro) سنا ہے، میں ———"

"تو آپ کی مراد ویگنر سے نہیں، ہے نا؟" میں نے جس قدر کہ ممکن تھا نرمی سے کہا۔

"نہیں، نہیں، نہیں ——— ہاں، ہاں، میری مراد ویگنر سے ہے لیکن "فگارو کے نکاح" سے نہیں، میں ابھی ایک لمحے میں اُس کا

نام بتلاتا ہوں۔" وہ سوچتا بھی جاتا تھا اور کاہو بھی کھاتا جاتا تھا۔

"آگیا یاد نام اُس کا۔ ہالینڈ کا اُڑنے والا آدمی (The Flying man of Holland)۔"

"اُڑنے والا ڈچ مین؟ (The Flying Duchman?)"

"ہاں، ہاں، شور، میرا خیال ہے یہاں شور بہت ہے میری بیوی کہتی ہے یہ حد سے زیادہ جرمن ہے، اور مجھے اُس سے اتفاق ہے کیونکہ وُہ موسیقی میں بہت درک رکھتی ہے۔ تو آپ ویگنر کے متعلق مجھ سے متفق ہوئے نا؟"

"میں ویگنر کا بہت مشتاق ہوں"

"تو بس ٹھیک ہی ہے، کیا آپ کے پاس اپنے گھوڑے بھی ہیں؟"

"نہیں"

"میرے ایک بھائی کو گھوڑوں کا بڑا شوق ہے، گھڑدوڑ میں وُہ بہت خوش رہتا ہے۔ قاہرہ کی تمام گھڑدوڑوں میں میرا بھائی اپنے گھوڑوں سمیت شامل ہوتا ہے، اُس نے بہت سی انعامی تھیلیاں جیتی ہیں۔ اُس نے ایک انگریز لارڈ سے گھوڑا خریدا، ماں اور باپ کی طرف سے اُس کا گھوڑا ایک اعلےٰ شجرہ رکھتا ہے۔ اگر آپ قاہرہ جائیں تو اپنے بھائی کے نام آپ کو تعارفی خط دوں گا۔"

"شکریہ، مگر میں تو ابھی ابھی قاہرہ سے آرہا ہوں۔"

"اوہو یہ بات ہے، مگر آپ کچھ کھا نہیں رہے ہیں؟"

"شکریہ! میں اصل میں ——"

"وُہ آپ سے کچھ نہیں لیں گے، بل میں چکاؤں گا"

"میں یہ نہیں سوچ رہا تھا، لیکن ——"

"بے شک، ایسا ہی ہے، آپ کی پارلیمنٹ کا کیا حال ہے؟"

"اچھا ہے، مہربانی آپ کی۔"

"آپ تو قدامت پسند ہی ہوں گے؟"

"قطعی طور پر نہیں۔"

"پارلیمنٹ میں جوشیلے لوگوں کی شمولیت کچھ اچھی بات نہیں، قدامت پسند ہی حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہیں ساری تاریخ اُن کی پُشت ہے، یہ جوشیلے لوگ سب جگہ تباہی مچا رہے ہیں اور تجارت کا تو اُنہوں نے خانہ ہی خراب کر دیا ہے۔ جب ان کا پلڑا بہت بھاری ہو تو کچھ کام نہیں ہو سکتا۔ مسٹر بالونڈ (Mr. Balwind) ..... کیا وُہ ایک قابلِ اعتماد شخص نہیں؛ میں تو اُس میں

سوائے نیکی کے اور کچھ نہیں دیکھتا ـــــ عوام اُسے چاہتے ہیں، ہے نا؟

"کچھ غیر ہردلعزیز بھی نہیں"

"انگریز قوم کا دِل درست ہے، میرے دِل میں انگریز قوم کے لئے بہت عزت کا احساس ہے ـــ میں یہ کچھ اس لئے نہیں کہتا کہ آپ انگریز ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ میری سمجھ مجھے ایسا بتاتی ہے۔ میری بیوی کی بہن نے مرنے سے پیشتر ایک انگریز سے شادی کی تھی۔ آہ! آپ شاید میری بیوی کی فوٹوگراف کی تصویر دیکھنا پسند کریں گے؟"

یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنی جیب سے ایک قیمتی اور شوخ رنگ رومال نکالا، اپنی اُنگلیاں اُس سے پونچھیں، پھر اپنا بڑا سا بٹوہ نکالا۔ اور اُس میں سے ایک کسی قدر فربہی لئے مسکراتی ہوئی خاتون کا فوٹو۔

اُس نے فخر سے کہا "میری بیوی (اور جب کہ میں اُسے دیکھ رہا تھا اور دِل ہی دِل میں اُس کی تعریف کر رہا تھا، اُس نے تائید کے طور پر اتنا اور اضافہ کیا) مسز ابراہام میندوزا۔"

میں نے کہا "نہایت عمدہ تصویر ہے۔" اور یہ تھا بھی ٹھیک۔

"آہ! آپ اُس کے مداح ہیں، ہر شخص کو اُس سے محبت ہے۔ لیکن آج اُس سے مجھے ایک عظیم غم ملا ہے۔ میرا خیال ہے وُہ مجھ سے ناراض ہے لیکن اِس میں میرا قصور نہیں۔ مَیں نہیں جانتا آیا کوئی اَور آدمی ہے جو اُس کے ساتھ کہیں چلا گیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو مَیں برباد ہو گیا، مر مٹا، نہ رہا، میں اُس آدمی کو گولی مار دوں گا مگر میرا خاندان اسے پسند نہ کرے گا۔ مَیں اپنے خاندان کی بہت عزت کرتا ہوں۔"

مَیں اس نتیجے پر پہنچا کہ مسٹر میندوزا کے ساتھ کافی ملاقات ہو چکی۔ اور اپنی پیالی بیئر سے تک خالی کر کے میں نے کہا "تو آپ کا غم مجھے اُمید ہے جلد رفع ہو جائے گا۔ ہاں تو اب مجھے چلنا چاہئے، شب بخیر۔"

وُہ جھٹ اپنے ریشمی رومال سے مُنہ پُونچھ، کھانے کو پرے ہٹا، کھڑا ہو گیا اور بولا:-

"مَیں تھوڑی دُور آپ کے ساتھ ہی چلتا ہوں۔" مَیں حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔

بہرو مجھے بِل دینے ہی کو تھا کہ مسٹر میندوزا نے اُسے اُس کے ہاتھ سے اُچک لیا اور فصیح ترین عربی زبان میں کہنے لگا، "خچر کہیں کا، مادرزاد احمق باپ کا بیٹا، اندھی بھیڑ، مریل گدھوں کا بھائی، جنوں سوار ٹرٹر کرنے والا وحشی، میرے بجائے میرے گاہکوں کو بِل دیتا ہے تُو! کیا مجھے تیرا کام تجھے سکھانا ہی ہوگا۔ اناڑی نائی کہیں کا۔"

میں ایک عظیم مسرت کے ساتھ گالیوں کی اس بوچھاڑ کو سنتا رہا۔ بہرہ بھی چپ چاپ کھڑا سُنا کیا گویا کچھ نہیں سمجھا۔ تا آنکہ اُسے "نائی" کہا گیا۔ اس لفظ سے ایسا معلوم ہوتا تھا وہ بہت سٹپٹا گیا۔

بہرے نے اپنی پیرسی فرانسیسی میں کہا "تو کیا میں منیجر سے جناب کی رپورٹ کروں، جناب نے اِس شریف آدمی کی موجودگی میں مجھے

گالیاں دیں اور میری اہانت کی، کہنے کو تو جناب مجھے "نائی" کہہ سکتے ہیں مگر جناب یہ توہین ہے۔"

میں نے کہا "مسٹر مینڈوزا! مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے، مگر آپ براہِ کرم میرا بل ہرگز ادا نہ فرمائیے۔"

"جانے بھی دیں آپ، اور کسی وقت آپ میرا بل ادا کر دیجئے گا۔"

اُس نے اپنا بھی اور میرا بھی بل چکا دیا اور جیسا کہ اُس نے ابھی ابھی مجھے پُرزور طور پر آگاہ کیا تھا وہ کچھ گز میرے ساتھ چلا، یہانتک کہ ہم اُس کی موٹر کار تک آن پہنچے۔

اُس نے پوچھا "کون ہوٹل میں ٹھہرے ہیں آپ؟"

"یقیناً آپ کو مجھے میرے ہوٹل تک پہنچانے کا خیال بھی نہ کرنا چاہیے۔"

"آپ بیٹھیے تو، آپ بہت ہمدرد واقع ہوئے ہیں، آپ نے مجھے بہت سے ایسے افسوسناک اقدامات سے بچا لیا ہے جو شاید اگر میں آپ سے نہ ملتا تو کر ہی گزرتا، آپ میرے دِل کو غم سے آزاد کر رہے ہیں۔"

درحالیکہ میرے بُشرے سے ہمدردی کا اظہار ہو رہا تھا، میں اُس کی موٹر کار میں بیٹھ گیا۔

. . . .

اپنے ہوٹل کے دروازے پر مَیں نے اُس کی مہربانی کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اگر آپ کبھی لندن آئے تو مجھے آپ سے مِل کر خوشی ہوگی مگر میں نے اُسے اپنا پتہ نہیں دیا۔

اُس نے کہا "ذرا سُنیئے تو، وُہ موٹر گاڑی جس میں آپ یہاں آئے ہیں میں نے آٹھ سو پونڈ میں خریدی تھی۔ میں اُسے صرف پانسو پونڈ میں ہی آپ کو دے ڈالوں گا، آپ سے سودا نہیں کروں گا۔ لیکن میں غم میں مبتلا ہوں، اگر اس گاڑی کے مجھے پانسو پونڈ ہی مِل جائیں تو میں اپنا وقت اور روپیہ اپنی بیوی کا سُراغ لگانے میں صرف کرسکوں گا۔ اور اُسے واپس اپنے پاس لاؤں گا —— یہ ایک خوبصورت گاڑی ہے، صرف پانسو پونڈ۔ ـ ـ ـ ـ ـ ـ"

(ای۔ ڈی۔ گوسے ٹین)

(انگریزی سے ترجمہ)

نند کشور جھنگن ایم، اے

سوال

یہ سندرتا اتنے دِنوں تک کس پردے میں چھپی ہوئی تھی ؛
آج آکاش بنا ہے سُندر، سُندر چاند، ستارے سُندر،
سُندر پتے، پھول اور ڈالی، اور پھلواری، سارے سُندر!
سُندر پنچھی کے رس والے، میٹھے میٹھے پیارے نغمے،
آج صدائیں ندی کی، ہیں مست انوکھے نیارے نغمے!
رات سُہانی اور اندھیری، پریتم کے نینوں کا کاجل،
رُوپ کی رکھالے آئیں گے سُکھ سیجوں پر پریم کے بادل
آج بدل کر رُوپ منوہر دُنیا ہے مستی میں ناچی،
یہ سُندرتا اتنے دِنوں تک کس پردے میں چھپی ہوئی تھی ؛
پریم کے میٹھے میٹھے رس والے جذبوں سے بوجھل جوبن!
تیر نگاہیں ہونٹ کماں سے، اور زلفوں کی زہری ناگن!
سانس کِسی خوشبو کی لہریں، نرم، اچھوتی، ہلکی ہلکی!
سُورگ سے آئی بھُو کی لہریں گرم، سُہانی، بھینی بھینی!
پریم کا پنچھی ڈر سے جھجکتا، رُکتا رُکتا، چھُپتا پھرتا!
پریم شکاری بیباکی سے ہنستا ہنستا آگے بڑھتا!
سُکھ کی متوالی برساتیں سب جنموں کے گہرے بندھن!
پریمی اور پریتم کی باتیں اور اِندر کے سُورگ کا آنگن!
یہ سُندرتا اتنے دِنوں تک کس پردے میں چھپی ہوئی تھی ؛

میراجی

محفلِ ادب

مرزا غالب کی ایک غیر مطبوعہ غزل

فصیح الملک، خدائے سخن، نواب مرزا اسداللہ خاں صاحب غالب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک غیر مطبوعہ غزل، وہ متبرک روحانی تحفہ جو اب تک مرزا غالب کے کسی دیوان یا ضمیمہ میں شائع نہیں ہوا اور جو امیر الامرا نواب یار محمد خاں صاحب مرحوم کے کتب خانۂ قدیم سے بذریعۂ خاص حاصل کر کے "دین و دُنیا" میں شائع کیا جا رہا ہے، (جوہر قریشی بھوپال)

بھولے سے کاش وہ اِدھر آئیں تو شام ہو (۹) — کیا لطف ہو جو ابلقِ دَوراں بھی رام ہو

تا گردشِ فلک سے یونہی صبح و شام ہو — ساقی کی چشمِ مست ہو اَور دَورِ جام ہو

بیتاب ہوں بلا سے کن انکھیوں سے دیکھ لیں — اے خوش نصیب کاش قضا کا پیام ہو

کیا شرم ہے، حریم ہے، محرم ہے رازدار — میں سر بکف ہوں تیغِ ادا بے نیام ہو

میں چھیڑنے کو کاش اُسے گھُور لوں کہیں — پھر شوخ دیدہ برسرِ صد انتقام ہو

وُہ دن کہاں کہ حرفِ تمنّا ہو لب شناس — ناکام بدنصیب کبھی شاد کام ہو

گھُس مِل کے چشمِ شوق قدم بوس ہی سہی — وہ بزمِ غیر ہی میں ہوں پر اژدہام ہو

اتنی پیوں کہ حشر میں سرشار ہی اُٹھوں — مجھ پر جو چشمِ ساقیِ بیت الحرام ہو

پیرانہ سال غالبِ میکش کرے گا کیا

بھوپال میں مزید جو دو دِن قیام ہو

"دین و دُنیا"

کیا شہنشاہِ اکبر رُوپ متی پر عاشق تھا؟

مالوہ کی ایک حسینہ رُوپ متی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ اپنے زمانہ کی سب سے حسین عورت تھی۔ بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ یہ شاہدانِ بازاری کے طبقہ سے تعلق رکھتی تھی، بعض مؤرخوں نے اُس حسینہ کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ شہنشاہ اکبر بھی اس پر بُری طرح مِٹا ہوا تھا چنانچہ

اکبر نے ادہم خاں کو اسی لئے مالوہ کو فتح کرنے کے لئے بھیجا تھا تاکہ وہ حاکم مالوہ سے روپ متی جیسی حسین عورت کو چھین سکے۔ یہ واقعات کس حد تک صحیح ہیں اس کا اندازہ مندرجہ ذیل مضمون سے ہو سکتا ہے :-

رُوپ متی مالوہ کے ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ لیکن وُہ اس بلا کی حسین تھی کہ اس زمانہ میں جس شخص کی بھی نظر رُوپ متی پر پڑ جاتی تھی وہ تصویرِ حیرت بن کر رہ جاتا تھا۔

روپ متی حسین ہی نہیں تھی بلکہ وہ نہایت ہی طبّاع اور ذہین بھی تھی، ہندی زبان کی وہ ایک نہایت ہی اچھی شاعرہ تھی، وہ ہندی اشعار نہایت نازک مضمون میں ادا کرتی تھی، اور مشکل مضمون کو بس آسانی کے ساتھ نظم کر دیتی تھی کہ سننے والے حیرت کرتے تھے۔ ان خصائل سے لوگ نادیدہ اس کے فریفتہ ہو جاتے تھے۔ فرمانروائے مالوہ جس کا نام باز بہادر تھا روپ متی پر فریفتہ تھا اور اُس نے صدہا تدبیروں سے اُسے رام کیا تھا۔ ۹۶۷ھ اور بقول بعض مؤرخین ۹۶۹ھ میں اور غالباً یہی صحیح بھی ہے جب جلال الدین محمد اکبر بادشاہ نے ادہم خاں کو برفاقت پیر محمد خاں مالوہ کی تسخیر کے لئے روانہ کیا تو باز بہادر فرمانروائے مالوہ جو عیاشی اور عیش و عشرت کے فراہم کرنے میں مشہور تھا، روپ متی کے ساتھ خلوت نشاط میں مشغول تھا۔ اگرچہ بادشاہ کی بحر امواج فوج کی آمد کی خبر سب طرف منتشر ہو چکی تھی اور بدقسمت باز بہادر کو تحقیق ہو چکا تھا کہ شاہی فوجیں عنقریب مالوہ پر حملہ آور ہونے والی ہیں۔ مگر اُسے روپ متی کے عشق نے اس قدر اندھا اور مدہوش کر دیا تھا کہ دین و دُنیا کی خبر نہ تھی، وہ خوابِ غفلت میں یہاں تک پڑا رہا کہ شاہی فوجیں آفتِ ناگہانی کی طرح سر پر ٹوٹ پڑیں اور بیدار ہُوا تو ایسے وقت کہ موقع ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ صبح کی پو پھٹی تھی کہ شاہی لشکر شہر میں درّانہ گھس آیا اور قتلِ عام شروع کر دیا۔ باز بہادر کو خبر ہوئی تو وہ گھبرا کر اُٹھا اور کوئی تدبیر بنائے نہ بن پڑی یہاں تک کہ اپنی بہت سی ناموسوں اور رُوپ متی کو شاہی لشکر کے ہاتھوں میں چھوڑ کر تنہا گھر سے نکل گیا، اور بیجا نگر یا بیجا گڑھ کے جنگلوں کی طرف بحالت بے سرو سامانی فرار ہو گیا۔

ادہم خاں بغیر لڑے بھڑے تمام خزانوں اور گھوڑوں اور ہاتھیوں اور اسباب تجمّل پر قابض ہو گیا اور بہت سی پری تمثال اور زہرہ جبیں عورتیں لوٹ میں آئیں، ادہم خاں نے جب رُوپ متی کے حُسن کی تعریف سُنی تو اس کی ملاقات کی رغبت ظاہر کی۔

پری جمال رُوپ متی جیسے حُسن و جمال کے لئے مشہور تھی ویسے ہی باز بہادر کی سچی پرستار بھی تھی۔ اس نے اوّل اوّل بہت سے اس قسم کے عذر اور حیلے اُٹھائے جن سے ادہم خاں اپنے ارادہ سے باز آجائے لیکن چونکہ اُس کے دِل پر رُوپ متی کے عشق کا تیر کاری لگ چکا تھا اور نادیدہ اُس کے عشق میں گھائل اور بسمل ہو چکا تھا اس لئے حکماً رُوپ متی کو ملاقات کرنے کے لئے مجبور کیا۔ رُوپ متی نے اس پر بھی اس کی اطاعت نہ مانی۔ حتّے الامکان اس کے دفعیہ کی کوشش کرتی رہی لیکن جب ادہم خاں کا اصرار اور بیجا اصرار حد درجہ کو پہنچ گیا اور روپ متی کو یقین ہو گیا کہ ادہم خاں اپنے اس ارادے سے باز آنے والا نہیں تو اُس نے اپنے ذہن میں فیصلہ کر لیا اور قطعی فیصلہ کر لیا کہ چاہے کچھ بھی ہو مگر میں تو اُس کے پاس ہرگز نہ جاؤں گی۔ یہ ٹھان کر اُس نے نہایت عجز و انکسار سے ایک روز کی مُہلت مانگی اور ادہم خاں سے کہلا بھیجا۔

کہ براہِ عنایت کل تک مجھے مہلت دیں تاکہ میں آپ سے ملاقات کرنے کے لئے تیار ہو جاؤں۔ یہ سُن کر ادہم خاں عورت کے قریب میں آ گیا اور کل کے وعدہ پر مطمئن ہو کر جوشِ مسرت میں پھولا نہیں سمایا۔

دوسرا روز ہُوا تو پری تمثال رُوپ متی نے غسل کیا عمدہ اور شاہانہ لباس زیبِ جسم کئے۔ سونے کے جڑاؤ زیورات اور گرانبہا جواہر بدن پر سجائے، غرضکہ زیب و زینت اور امکانی آرائش میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا، ملاقات کا جو وقت مقرر ہُوا تھا اس سے کچھ پیشتر نازک ادا رُوپ متی ایک بڑے کمرے میں جو نہایت آراستہ اور سامانِ عشرت سے پُر تھا نہایت نرم قالین پر تکیہ لگا کر بیٹھ گئی اور ایک ملازم کو ادہم خاں کے پاس روانہ کیا اور کہلا بھیجا کہ رُوپ متی آپ کے انتظار میں بیٹھی ہیں، تشریف لائیے اور جلد تشریف لائیے۔

ادہم خاں پہلے ہی سے منتظرِ وقت تھا، ملازم کے پہنچتے ہی اور اجازت کا مژدہ سنتے ہی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہُوا، اور جوشِ مسرت کو دبائے ہوئے رُوپ متی کے محل میں پہنچا۔ باغیچہ کی سیر کرتا ہُوا اور ایک ایک مکان کو دیکھتا ہُوا روپ متی کے کمرے میں آیا۔ دیکھا تو ایک حُسن کی دیوی نُور کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی نہایت زیب و زینت اور جاہ و جلال سے ایک بیش قیمت مسند پر تکیہ لگائے بیٹھی ہے اور بڑی آن بان اور شان و شوکت سے بیٹھی ہے، یہ سامان دیکھ کر ادہم خاں اپنی خوش قسمتی پر نہایت نازاں ہُوا اور بڑی خوشی اور مسرت کے ساتھ آگے بڑھا، اس کی یہ مسرت اصل میں عارضی اور تھوڑی دیر کی تھی، قریب جا کر بیٹھا، اور دیکھا تو رُوپ متی کو مردہ پایا۔ رُوپ متی جس مسند پر تکیہ لگائے بیٹھی تھی اس کے کنارے ایک بلّوری گلاس رکھا تھا اور اس پر ایک لکھا ہُوا کاغذ ڈھکا تھا۔ گلاس میں تھوڑا سا پانی تھا جس میں زہرِ ہلاہل گھلا ہُوا تھا۔ کاغذ پر رُوپ متی کے ہاتھ کے یہ فقرے لکھے ہوئے موجود تھے۔ شریف لوگ اپنی عصمت اور آبرو کو کبھی برباد نہیں کیا کرتے، اور عصمت کے پیچھے جان پر کھیل جایا کرتے ہیں، مَیں نے صرف اپنے شوہر کے ننگ و ناموس رکھنے کی غرض سے اپنی جان اور کیسی جان جس کی تلافی ہزاروں بھی نہیں کر سکتیں نہایت مایوسی اور ناامیدی کی حالت میں دے دی۔ ادہم خاں ان فقروں سے اس قدر متاثر ہُوا کہ اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا اور وہ اپنی بیہودہ کارروائی پر نہایت نادم و پشیمان ہُوا۔ رُوپ متی کے اس مایوسانہ حالت میں جان دینے پر سخت افسوس کیا اور اپنے نفس کو ملامت کرتا ہُوا اس کمرے سے باہر آیا۔

صاحب صحائف الاخبار اسی کتاب کی تیسری جلد میں ۹۶۶ھ کے واقعہ پر ریمارک کرتا ہُوا لکھتا ہے "رُوپ متی ایک بازاری مغنیہ عورت تھی جو حُسن جمال اور نزاکت و لطافتِ طبع میں اعلےٰ درجہ کی شہرت رکھتی تھی، اور قطع نظر حسن و جمال کے فنِ موسیقی اور دلربائی میں اپنا نظیر نہیں رکھتی تھی۔ جلال الدین محمد اکبر شاہ نے اسے بہتیرا رام کرنا چاہا، اور نئی نئی تدبیروں سے اپنی خدمت میں حاضر ہونے کی تکلیف دی، مگر چونکہ وہ اپنے وطن کے ایک بڑے امیر کبیر اور عیش پسند شخص سے رابطۂ محبت اور علاقۂ مؤدت رکھتی تھی اور دونوں شخصوں میں سے ایک دوسرے کا عاشق تھا۔ اس لئے وُہ حالتِ مجبوری میں زہرِ ہلاہل کا ساغر مُنہ سے لگا کر ہمیشہ کے لئے زمین میں چھپ گئی اور جلال الدین محمد اکبر کے ہاتھ میں اپنی عزت دینے کے خوف سے ہمیشہ کے لئے دُنیا سے مفارقت کر گئی۔

مگر جن لوگوں کو تاریخ سے دلچسپی ہے وُہ صحائف الاخبار کی اس خبر کا صحیح اور ٹھیک اندازہ کر سکتے ہیں کہ کس درجہ کی خبر ہے اور مصنف صحائف الاخبار نے کہاں تک سچائی اور دیانت سے کام لیا ہے۔ تاریخ میں کہیں اس کا پتہ نہیں چلتا کہ جلال الدین محمد اکبر نے ایک ایسی بزاری اور مغنیہ عورت کی کبھی خواہش کی ہو، بلکہ جہاں تک دیکھا جاتا ہے اور اس واقعۂ خاص کے متعلق تاریخی اوراق کو اُلٹ پلٹ کیا جاتا ہے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کو روپ متی کے مالوہ میں ہونے کی خبر تک نہ تھی، اور اُس کے حُسن و خوبی کی خبر سے اس کے کان آشنا تک نہ تھے۔ افسوس ہے کہ لوگ ایک ایسی بے سروپا بات کو جس کی کچھ اصل نہ ہو ایک عظیم الشان بادشاہ کی طرف منسوب کرنے میں ذرا مضائقہ نہیں کرتے اور جو جی میں آتا ہے بے دھڑک لکھ مارتے ہیں۔

"دین و دُنیا"

مشینیں

کیا کبھی آپ ایک ایسی دُنیا کا تصور کر سکتے ہیں جس میں کوئی مشین نہ ہو۔ یعنی کوئی ایسا آلہ نہ ہو جس سے انسان اپنی محنت بچا سکے؟ مجھے اندیشہ ہے کہ تہذیب و تمدن کے موجودہ مرحلے پر پہنچ کر آپ ایسی دُنیا کا تصور بھی کرنے سے عاجز رہ گئے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ انسان جس دن سے اس سیارے پر آباد ہوا ہے اسی دن سے مشین کا محتاج ہے۔ جب دُنیا بالکل جنگل بیابان تھی اور انسان اس میں جانوروں کی طرح پھرا کرتا تھا۔ اس وقت بھی جب اسے زمین کھودنے کی ضرورت پڑی ہو گی۔ تو اس نے محض اپنے ناخنوں سے کام نہ لیا ہو گا۔ بلکہ کسی نکیلی لکڑی سے ضرور مدد لی ہو گی۔ جانوروں کو زمین کھودنے کی ضرورت پڑتی ہے تو وُہ صرف اپنے پنجوں سے مٹی کو کریدتے ہیں اور بڑی محنت سے گڑھا تیار کرتے ہیں لیکن انسان وحشت کی ابتدائی منزل میں بھی اتنی عقل ضرور رکھتا ہو گا کہ زمین کھودنے میں کسی درخت کی نکیلی ٹہنی یا کسی نکیلے پتھر سے مدد لی جا سکتی ہے۔ بس اُسی دن فطرت نے اس کے کان میں پھونک دیا ہو گا کہ ہر کام میں ہاتھ کی محنت بچانے کے لئے کسی نہ کسی معاون چیز سے مدد لینا ضروری ہے۔

آج کی تقریر سے میرا یہ مطلب نہیں کہ میں زمانۂ وحشت سے لے کر اس وقت تک مشین کی تاریخ بیان کروں۔ کیونکہ اگر میں اس چکر میں پڑ گیا۔ تو خدا جانے کتنی غیر دلچسپ تفصیلات بیان کرنی پڑیں۔ اور سُننے والے اُکتا کر ریڈیو بند کر دینے پر مجبور ہو جائیں۔ زمین کھودنے کا ذکر میں نے اس لئے کیا کہ بعض مذہبی کتابوں سے بھی سُراغ ملتا ہے کہ انسان کی سب سے پہلی "میکانکی کوشش" یہی تھی۔ جب قابیل اپنے بھائی ہابیل کو بے جان کر چکا۔ تو اس فکر میں غلطاں ہوا کہ اب اس لوتھ کو کیا کروں جو نہ ہلتی جُلتی ہے۔ نہ بولتی چالتی ہے بڑے باوا نے دیکھ لیا تو وہ کیا کہیں گے؟ اور میں کیا جواب دوں گا؟ اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ ایک جیتا جاگتا کوّا ایک مرے ہوئے کوّے کی لاش کو گھسیٹ کر لایا۔ اس کے بعد چونچ اور پنجوں سے زمین کھودنے لگا۔ جب چھوٹا سا گڑھا کھُد گیا تو اس نے مردہ کوّے کی لاش کو اس گڑھے میں رکھ کر اُوپر سے مٹی ڈال دی۔ اور اس کام سے فارغ ہو کر کائیں کائیں کرتا ہُوا اُڑ گیا۔ یہ دیکھ کر قابیل کی سمجھ میں

بات آگئی، اس نے جھٹ ایک گڑھا کھودا۔ اور اپنے بھائی کی لاش کو اس میں رکھ کر دفن کر دیا۔ زمین کھودتے وقت اس نے اپنے پنجوں کے سوا اور جس چیز سے بھی کام لیا ہوگا۔ وہ اس دُنیا کی پہلی مشین تھی۔

ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ جیسے جیسے ضرورت پڑتی گئی، انسان کی محنت بچانے والی مشینیں خود بخود بنتی چلی گئیں۔ پتھر کا زمانہ آیا پھر لوہے کا زمانہ آیا۔ یہاں تک کہ تمدن شروع ہُوا اور اپنے ساتھ بڑا ساز و سامان لے آیا۔ جس طرح آج ہم نئی نئی مشینوں کی ایجاد پر حیران ہوتے ہیں۔ اسی طرح جب ابتدائی زمانے میں کسی نے اناج پیسنے کے لئے چکّی بنائی ہوگی۔ تو دُنیا دیکھ کر دنگ رہ گئی ہوگی کہ واہ رے تیرے کمال کے قربان۔ پتھر پر اناج کے دانے رکھ کر اس پر دُوسرا پتھر مار مار کر ان کا چُورا بنایا کرتے تھے تو بڑی مصیبت ہوتی تھی۔ اب کتنا مزا ہے۔ دانوں کی مٹھی بھر کر ڈال دی، ہتھے کو پکڑ کر چار پانچ چکّر دیئے اور لے لو! وہ آٹا نکل آیا۔

خیر اس قصّے کو چھوڑیئے، یہ میرے آپ کے پیدا ہونے سے پہلے کی باتیں ہیں۔ ان کا کیا ذکر۔ لیکن غور کیجئے کہ جو مشینیں ہم نے دیہات اور قصبوں میں اپنے بچپن کے زمانے میں دیکھی تھیں اور جو اب تک بھی موجود ہیں ان میں اور نئی مشینوں میں کتنا زمین و آسمان کا فرق ہے۔ باربرداری کے چھکڑے، چیں چیں کرتے ہوئے گڈے۔ چرخہ، ڈھینکلی، دھان کوٹنے کا جندر، خراس، پن چکّی، پَوَن چکّی، کولھو، رہٹ، کپاس کا بیلنا، دُھنیئے کی ڈھچک ڈھیں، کھدر بُننے کی کھڈّی، دہی بلونے کی متھنی، یعنی ایک غیر مہذّب اور غیر شائستہ گنوار دیہاتی کے ہاں بھی اتنی زیادہ مشینیں موجود ہیں، اور ان کا مقصد وہی ہے، جو آج کل کی گرانبار اور عظیم الشّان مشینوں کا ہے، یعنی انسان کی محنت کو بچانا، اور تھوڑے وقت میں زیادہ کام کر لینا۔

یہ تمام مشینیں سَو فیصدی سودیشی تھیں، لیکن جب بدیشی اثر آیا تو اپنے ساتھ بیسیوں اَور مشینیں لے آیا۔ مثلاً کپڑا سینے کی مشین، سوّیاں بنانے کی مشین، آئس کریم جمانے کی مشین، گوشت کا قیمہ کرنے کی مشین۔ پھلوں سے رس نچوڑنے کی مشین، جُرابیں بُننے کی مشین، کڑھائی اور زردوزی کی مشین، بال کاٹنے کی مشین، سیب چھیلنے اَور تراشنے کی مشین، دُودھ سے مکھن نکالنے کی مشین، زمین سے پانی نکالنے کا پمپ، گھڑیاں اور کلاک، غرض سینکڑوں ایسی مشینیں نکل آئیں جن سے بے شمار کام آسان ہو گئے۔ مثلاً جس قمیص کو ہاتھ سے سینے میں پُورا دن صرف ہوتا تھا۔ وُہ سینے کی مشین سے ایک گھنٹے میں تیار ہونے لگی۔ جتنی سوّیاں انگلیوں کی پوروں سے بٹ بٹ کر صبح سے شام تک تیار ہوتی تھیں۔ اتنی سوّیاں مشین کے ایک ہی گھان میں چند منٹ کے اندر نکلنے لگیں۔

یہ تو گھریلو ضرورت کی مشینیں تھیں۔ جب چھاپے خانے قائم ہوئے تو بے شمار اور مشینیں نکل آئیں۔ چھاپنے کاٹنے کی مشین، سینے اور ٹانکے لگانے کی مشین۔ سوراخوں کی قطار بنانے والی مشین، جیسے چیک بُک میں یا ڈاک کے ٹکٹوں کے درمیان ہوتی ہیں۔ کاغذ کو لکیر دار بنانے کی مشین اب تک ان تمام مشینوں کو ہاتھ سے چلایا جاتا تھا۔ لیکن بھاپ کی طاقت اور بجلی کی طاقت نے تو قیامت ہی برپا کر دی۔ آٹے کی مشین، چاول نکالنے کی مشین، ریل کا انجن، کرین۔ کپڑا بُننے کی مشین، کھانڈ بنانے کی مشین۔ دیا سلائی بنانے کی مشین، کپاس

اٹنے کی مشین اور روئی دُھننے کی مشین، سوڈا واٹر کی مشین، مُرغی کے انڈوں سے چوزے نکالنے کی مشین، گراموفون یعنی گانے کی مشین، ٹیلیفون یعنی باتیں کرنے کی مشین، ٹیلیگراف یعنی تار دینے کی مشین، سر کے بال دھونے اور سکھانے کی مشین۔ اُور تو اُور مشین گن یعنی بہت سے انسانوں کو ایک دم خدا گنج پہنچانے کی مشین، موٹر کار، ہوائی جہاز، سمندری جہاز، بجلی کے زور سے چلنے والی لفٹ، پنکھے، ہیٹر، استریاں اور پچاس ہزار اُور مشینیں اُور میں ریڈیو مشین تو بھول ہی گیا۔

اب ذرا خیال تو فرمایئے۔ کیا ہماری زندگی کا کوئی ایک شعبہ بھی ایسا ہے جس میں مشین موجود نہ ہو؟ مشین کے بنے ہوئے اور مشین کے سِلے ہوئے کپڑے پہن کر گھر سے نکلئے تو دروازے پر ایک مشین کھڑی ہے، جسے گاڑی یا موٹر کہتے ہیں۔ اس میں سوار ہو کر ریلوے سٹیشن پہنچیے، ٹکٹ بابو کی خدمت میں مشین کے بنے ہوئے روپے پیش کیجئے، وہ مشین کا چھپا ہُوا ٹکٹ الماری سے نکال کر تاریخ چھاپنے والی مشین میں غڑپ سے دخل کر کے آپ کے سامنے ڈال دے گا۔ ٹکٹ لے کر آپ مشین کے بنے ہوئے بوٹ سے رپ رپ کرتے ہوئے پلیٹ فارم پر پہنچیے۔ جو مشین کے سیمنٹ سے بنا ہُوا ہے۔ اس کے بعد ریل گاڑی میں سوار ہو جایئے، جو شروع سے لے کر آخر تک مشین ہے۔ اگر آپ کوشش کیجئے کہ اپنی زندگی کا کوئی لمحہ مشین کی مدد کے بغیر بسر کر لیں، تو میرا خیال ہے کہ یہ قریب قریب ناممکن ہے۔

ہاں ریلوے سٹیشن کی ایک اُور مشین کا تو میں نے ذکر ہی نہیں کیا۔ سٹیشن کی ڈیوڑھی میں ایک اُونچا سا لیٹر بکس کی شکل کا دیو کھڑا ہے اس کے مُنہ میں اکنّی ڈال کر ہتّی کھینچیے، تو پھٹ سے ایک پلیٹ فارم ٹکٹ نکل آئے گا۔

اب تازہ مشینوں کا قصہ سُن لیجئے۔ آج کل بعض اخباروں کے دفتروں میں ٹیلی پرنٹر مشینیں لگ گئی ہیں۔ دنیا بھر کی خبریں تار پر آتی ہیں۔ اور خود بخود کاغذ پر چھپتی چلی جاتی ہیں۔ اس مشین کو نہ چلانے کی ضرورت ہے، نہ تار وصُول کرنے والے کی۔ ایڈیٹر صاحب اس مشین کو اپنے کمرے میں بند کر کے کہیں چلے جائیں تو جب واپس آئیں گے تاروں کا ڈھیر لگا ہُوا ہوگا۔ مشین برابر چل رہی ہو گی اور تار وصول کر رہی ہو گی۔

اگر آپ کہیں جا رہے ہیں، اور اپنے سیکرٹری کو جو ابھی دفتر میں نہیں آیا، ساری ڈاک کے جواب لکھوانا چاہتے ہیں تو ڈِکٹوگراف کو سامنے رکھ کر تمام چٹھیوں کے جواب بکتے چلے جایئے، آپ کے تمام جواب ہوبہو اس مشین میں بھر جائیں گے۔ اب آپ تشریف لے جایئے سیکرٹری صاحب آ کر اس ڈِکٹوگراف کو گراموفون کی طرح چلا کر آپ کے ہر ارشاد کی تعمیل کر دیں گے، اور آپ کو واپسی پر تمام خطوط کے جواب تیار ملیں گے۔ دستخط کر دیجئے اور ڈاک میں ڈال دیجئے۔

ایک نئی مشین "ڈِکٹوفون" کے نام سے نکلی ہے۔ وہ آپ کی میز پر رکھی ہے۔ دفتر کے دس الگ الگ کمروں میں آپ کے کارکن بیٹھے ہیں۔ آپ جس سے چاہیں وہیں بیٹھے بیٹھے بات کر سکتے ہیں۔ بلکہ اگر ضرورت ہو تو سب کے ساتھ باتیں کر سکتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ آپ کو یا آپ کے کارکنوں کو اپنی جگہ سے اُٹھ کر کہیں آنے جانے کی ضرورت ہرگز نہ پڑے گی۔

اخباروں میں آئے دن طرح طرح کی مشینوں کی خبریں چھپتی رہتی ہیں۔ ایک صاحب نے "مقیاس المحبت" بنایا ہے۔ یعنی ایسی مشین جس سے محبت

نہیں ہو سکے گی۔ پُرانے مذاق کی طرح کہانی لڑکی کی چوٹیاں گن گن کر اس کے ... سے سیلمین کی باہمی محبت کا اندازہ لگایا ... معاملہ
بھی مشین کے سپرد ہو گیا۔ اس سے چاہنے والوں اور چاہے جانے والیوں کے دلوں کی محبت کا پتہ چلایا جا سکے گا۔ ایک اور مشین بن گئی ہے وہ جس
شخص کے ہاتھ دی جائے گی وہ جھوٹ نہ بول سکے گا۔ سچی بات خود بخود اس کے منہ سے نکلتی جائے گی۔ اس سے چوروں اور ڈاکوؤں سے اقرارِ
جرم کرانا بہت سہل ہو جائے گا۔

ایک اور مشین آنے والی ہے جسے "ٹیلی وژن" کہتے ہیں۔ اب تک تو ریڈیو پر گانے اور بولنے والوں کی آوازیں ہی سنائی دیتی ہیں۔ یہ مشین گانے
والوں کی صورتیں بھی نظر آیا کریں گی، اور گانے والیاں صرف اپنے گلے ہی سے نہیں بلکہ نرت بھاؤ سے بھی آپ لوگوں کا دل بہلایا کریں گی۔

پچھلے دنوں چارلی چپلن کی ایک فلم دیکھی جس میں مشینوں کے اس طوفان پر طنز کی گئی تھی۔ اور ایک کھانا کھلانے کی مشین کا خاکہ اڑایا گیا تھا
جو بجلی کی طاقت سے چلتی تھی۔ ایک بے حد مصروف آدمی اپنے دفتر میں بیٹھا ہے، کام کی کثرت ہے، اپنی کرسی سے اٹھ کر ادھر اُدھر جا نہیں سکتا۔ کھانا کھانے
کا وقت آ جاتا ہے۔ کھانا کھلانے والی مشین لا کر اس کی کرسی کے پاس لگا دی جاتی ہے۔ یہ مشین لقمہ تیار کر کے اس شخص کے منہ تک لاتی ہے
اور وہ اس لقمہ کو کھا لیتا ہے، پھر دوسرا لقمہ آتا ہے اور ٹیلیفون کی گھنٹی سے اس شخص کی توجہ بٹ جاتی ہے۔ مشین تو آخر مشین ہی ہے۔ وہ لقمہ وہیں
پھینک کر تیسرا لقمہ لینے کے لئے دوسری طرف مڑ جاتی ہے اور یہ شخص دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ اس مشین کی تیز رفتاری اور اس شخص کی مدہوشی
اس قدر مزے کی تھی کہ ہنسی کے مارے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔

بلاشبہ ہمارا زمانہ "مشین کا زمانہ" ہے۔ ہزار ہا قسم کے کارخانے چل رہے ہیں، اور دنیا جہان کی چیزیں ان میں سے بن بن کر نکلتی چلی
آتی ہیں۔ دُنیا میں کروڑوں انسان بیکار اور بے روزگار پھر رہے ہیں۔ اس لئے مشینوں نے انسانی محنت کو بہت بڑی حد تک بچا دیا ہے۔
پُرانے زمانے میں جو کام ایک ہزار آدمی ایک سال میں کرتے تھے۔ اسے آج کل کی مشینیں صرف ایک آدھ آدمی کی مدد سے صرف ایک دن میں
کر ڈالتی ہیں۔ اس میں شک نہیں، مشینوں کی وجہ سے ہر انسان کو اس کی ضرورت کی چیزیں کم قیمت پر اور آسانی سے مل جاتی ہیں۔
اور انسان پہلے کی نسبت زیادہ آرام سے زندگی بسر کر رہا ہے۔ لیکن جن کروڑوں انسانوں کو مشینوں نے بیکار کر دیا ہے۔ وہ تو دل سے
چاہتے ہیں کہ خدا ان سب مشینوں کو تباہ کر دے تاکہ ان کے پیٹ میں ٹکڑا پڑ سکے۔ لیکن ان کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ دُنیا ترقی
کے راستے پر دوڑتی چلی جاتی ہے۔ اور کوئی طاقت اس کی رفتار کو روک نہیں سکتی۔ مشینوں کے ساتھ ہی ساتھ آدمی بھی مشین ہی بن رہے
ہیں۔ میرا دل خواہ آپ سے کتنی ہی باتیں کرنے کو چاہے لیکن نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ مشین کا حکم آ گیا ہے کہ پندرہ منٹ پورے
ہو گئے۔

(سالک) (بہ شکریہ سٹیشن ڈائرکٹر صاحب لاہور ریڈیو) "شیرازہ"

مطبوعات

اُردو کے سَو شعر: مکتبہ جامعہ دہلی نے "اُردو کے سَو شعر" کے نام سے پانچ چھوٹے چھوٹے مجموعے شائع کئے ہیں۔ ان سب مجموعوں کے مرتّب محمود علی خاں صاحب جامعی ہیں۔ پہلا مجموعہ مختلف شعرائے متقدمین کے سَو منتخب اشعار پر مشتمل ہے۔ دُوسرے مجموعے میں متوسطین کے سَو اشعار جمع کئے گئے ہیں۔ دو مجموعوں کا تعلق متاخرین اُور دورِ حاضر کے شعراء سے ہے۔ آخری مجموعے میں قدیم و جدید شعراء کے ایسے اشعار جمع کئے گئے ہیں جو ضرب المثل کے طور پر مشہور ہیں۔

عوام کو اپنے ادباء سے روشناس کرنے کا یہ بہت اچھا طریقہ ہے لیکن اس قسم کے مجموعوں کی قیمت اُور بھی کم ہونی چاہئے تاکہ ہر شخص آسانی سے خرید سکے۔ ہر مجموعے کی قیمت ۸ھر ہے۔ مکتبۂ جامعہ دہلی سے طلب فرمائیے۔

انیسِ نسواں: شیخ محمد اکرام صاحب بیرسٹر ایٹ لا جو کبھی مخزن کے ایڈیٹر تھے اُور جنہوں نے پہلے پہل دہلی سے عصمت جاری کیا تھا پھر میدانِ صحافت میں آئے ہیں۔ چنانچہ جنوری ۱۹۳۹ء سے اُنہوں نے انیسِ نسواں کے نام سے ایک بلند پایہ رسالہ جاری کیا ہے جس کا اہم ترین مقصد مسلمان عورتوں کی مذہبی و معاشرتی اصلاح ہے۔ وُہ لکھتے ہیں:۔

"یہ خوشی کی بات ہے کہ تعلیمِ نسواں کی ترقی جو آج نظر آرہی ہے ۱۹۰۸ء میں نہ تھی جب میں نے رسالہ "عصمت" دہلی سے جاری کیا تھا۔ مگر یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ نسوانی ترقی کی موجودہ روش کچھ پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھی جارہی۔ یہ ترقی کی اصلی شاہراہ سے دُور ہوتی جارہی ہے۔ . . . . . مغرب خود اپنی موجودہ تہذیب سے مطمئن نہیں اُور اِس لامذہبیت سے بیزار ہے۔ مادّہ پرست یورپ اب حیران ہے کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے کیا مُسلم خاتون اس تہذیب کی تقلید کرنا چاہتی ہے جس نے مذہب کو کھلونا اور نمائشی چیز بنا رکھا ہے۔ کیا مُسلم خاتون اِس معاشرت کو معراجِ ترقی سمجھنا چاہتی ہے جس نے بے غیرتی اُور بے حیائی میں کمال پیدا کر لیا ہے جس کے نزدیک حرام و حلال میں کوئی تمیز نہیں رہی۔ کیا مسلم خاتون اس معاشرت کی نقّال بننا چاہتی ہے جو گھر کی دل آویزی کو برباد کر کے ہوٹلوں اُور فلم گھروں کو آباد کر رہی ہے۔ کیا مسلم خاتون اُس معاشرت کو اختیار کرنا چاہتی ہے جو آئے دن نئے سے نیا حیا سوز لباس اختراع کرتی ہے اور عورت کے جوہرِ نسائیت اور شرافت کو غارت کر رہی ہے۔"

ناپی جاسکے گی۔ پُرانے مذاق کی لڑکیاں کانچ کی چوڑیوں کو توڑ کر اس کے ریزوں سے سہیلیوں کی باہمی محبت کا اندازہ کیا کرتی تھیں۔ اب یہ معاملہ بھی مشین کے سپرد ہو گیا۔ اس سے چاہنے والوں اور چاہنے والیوں کی دلوں کی محبت کا پتہ چلایا جا سکے گا۔ ایک اور مشین بن گئی ہے وہ جس شخص کے لگا دی جائے گی وہ جھوٹ نہ بول سکے گا۔ سچی بات خود بخود اس کے مُنہ سے نکلتی جائے گی۔ اس سے چوروں اور ڈاکوؤں سے اقرارِ جرائم کرانا بہت سہل ہو جائے گا۔

ایک اور مشین آنے والی ہے جسے ٹیلی وژن کہتے ہیں، اب تک تو ریڈیو پر گانے اور بولنے والوں کی آوازیں ہی سُنائی دیتی ہیں، یہ مشین آ گئی تو ان کی مُورتیں بھی نظر آیا کریں گی، اور گانے والیاں صرف اپنے گلے ہی سے نہیں بلکہ نرت بھاؤ سے بھی آپ لوگوں کا دِل لبھایا کریں گی۔

پچھلے دنوں چارلی چپلن کی ایک فلم دیکھی جس میں مشینوں کے اس طوفان پر طنز کی گئی تھی۔ اور ایک کھانا کھانے کی مشین کا خاکہ اُڑایا گیا تھا جو بجلی کی طاقت سے چلتی تھی۔ ایک بیحد مصروف آدمی اپنے دفتر میں بیٹھا ہے، کام کی کثرت ہے، اپنی کرسی سے اُٹھ کر ادھر اُدھر جا نہیں سکتا۔ کھانا کھانے کا وقت آ جاتا ہے۔ کھانا کھلانے والی مشین لا کر اس کی کرسی کے پاس لگا دی جاتی ہے۔ یہ مشین لقمہ تیار کر کے اس شخص کے مُنہ تک لاتی ہے اور وہ اس لقمہ کو کھا لیتا ہے، پھر دوسرا لقمہ آتا ہے اور ٹیلیفون کی گھنٹی سے اس شخص کی توجہ بٹ جاتی ہے مشین تو آخر مشین ہی ہے۔ وُہ لقمہ وہیں پھینک کر تیسرا لقمہ لینے کے لئے دُوسری طرف مُڑ جاتی ہے اور یہ شخص دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ اس مشین کی تیز رفتاری اور اس شخص کی بدحواسی اس قدر مزے کی تھی کہ ہنسی کے مارے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔

بلاشبہ ہمارا زمانہ "مشین کا زمانہ" ہے۔ ہزارہا قسم کے کارخانے چل رہے ہیں، اور دُنیا جہان کی چیزیں اُن میں سے بن بن کر نکلتی چلی آتی ہیں، دُنیا میں کروڑوں انسان بیکار اور بے روزگار پھر رہے ہیں۔ اس لئے مشینوں نے انسانی محنت کو بہت بڑی حد تک بچا دیا ہے۔ پُرانے زمانے میں جو کام ایک ہزار آدمی ایک سال میں کرتے تھے۔ اسے آج کل کی مشینیں صرف ایک آدھ آدمی کی مدد سے صرف ایک دن میں کر ڈالتی ہیں۔ اس میں شک نہیں، مشینوں کی وجہ سے ہر انسان کو اس کی ضرورت کی چیزیں کم قیمت پر اور آسانی سے مِل جاتی ہیں۔ اور انسان پہلے کی بہ نسبت زیادہ آرام سے زندگی بسر کر رہا ہے۔ لیکن جن کروڑوں انسانوں کو مشینوں نے بیکار کر دیا ہے۔ وُہ تو دل سے چاہتے ہیں کہ خدا ان سب مشینوں کو تباہ کر دے تاکہ ان کے پیٹ میں ٹکڑا پڑ سکے۔ لیکن ان کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ دُنیا ترقی کے راستے پر دوڑتی چلی جاتی ہے۔ اور کوئی طاقت اس کی رفتار کو روک نہیں سکتی۔ مشینوں کے ساتھ ہی ساتھ آدمی بھی مشین ہی بن رہے ہیں۔ میرا دل خواہ آپ سے کتنی ہی باتیں کرنے کو چاہے لیکن نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ مشین کا حکم آ گیا ہے کہ پندرہ منٹ پورے ہو گئے۔

(سالک) (بہ شکریہ سٹیشن ڈائرکٹر صاحب لاہور ریڈیو) "شاہزادہ"

مطبوعات

اُردو کے سَو شعر: مکتبہ جامعہ دہلی نے "اُردو کے سَو شعر" کے نام سے پانچ چھوٹے چھوٹے مجموعے شائع کئے ہیں۔ ان سب مجموعوں کے مرتب محمود علی خاں صاحب جامعی ہیں۔ پہلا مجموعہ مختلف شعرائے متقدمین کے سَو منتخب اشعار پر مشتمل ہے۔ دُوسرے مجموعے میں متوسطین کے سَو اشعار جمع کئے گئے ہیں۔ دو مجموعوں کا تعلق متاخرین اُور دورِ حاضر کے شعراء سے ہے۔ آخری مجموعے میں قدیم و جدید شعراء کے ایسے اشعار جمع کئے گئے ہیں جو ضرب المثل کے طور پر مشہور ہیں۔

عوام کو اپنے ادباء سے روشناس کرنے کا یہ بہت اچھا طریقہ ہے لیکن اس قسم کے مجموعوں کی قیمت اُور بھی کم ہونی چاہئے تاکہ ہر شخص آسانی سے خرید سکے۔ ہر مجموعے کی قیمت ۴ر ہے۔ مکتبۂ جامعہ دہلی سے طلب فرمائیے۔

انیسِ نسواں: شیخ محمد اکرام صاحب بیرسٹرایٹ لا جو کبھی مخزن کے ایڈیٹر تھے اُور جنہوں نے پہلے پہل دہلی سے عصمت جاری کیا تھا پھر میدانِ صحافت میں آئے ہیں۔ چنانچہ جنوری ۱۹۳۹ء سے اُنہوں نے انیسِ نسواں کے نام سے ایک بلند پایہ رسالہ جاری کیا ہے جس کا اہم ترین مقصد مسلمان عورتوں کی مذہبی و معاشری اصلاح ہے۔ وُہ لکھتے ہیں :۔

"یہ خوشی کی بات ہے کہ تعلیم نسواں کی ترقی جو آج نظر آرہی ہے ۱۹۰۸ء میں نہ تھی جب میں نے رسالہ "عصمت" دہلی سے جاری کیا تھا۔ مگر یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ نسوانی ترقی کی موجودہ روش کچھ پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھی جارہی۔ یہ ترقی کی اصلی شاہراہ سے دُور ہوتی جارہی ہے۔ . . . . . . مغرب خود اپنی موجودہ تہذیب سے مطمئن نہیں اُور اِس لامذہبیت سے بیزار ہے۔ مادہ پرست یورپ اب حیران ہے کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے کیا مُسلم خاتون اس تہذیب کی تقلید کرنا چاہتی ہے جس نے مذہب کو کھلونا اور نمائشی چیز بنا رکھا ہے۔ کیا مُسلم خاتون اِس معاشرت کو معراجِ ترقی سمجھنا چاہتی ہے جس نے بے غیرتی اُور بے حیائی میں کمال پیدا کر لیا ہے جس کے نزدیک حرام و حلال میں کوئی تمیز نہیں رہی۔ کیا مسلم خاتون اس معاشرت کی نقال بننا چاہتی ہے جو گھر کی دل آویزی کو برباد کرکے ہوٹلوں اُور فلم گھروں کو آباد کر رہی ہے۔ کیا مسلم خاتون اُس معاشرت کو اختیار کرنا چاہتی ہے جو آئے دن نئے سے نیا حیاسوز لباس اختراع کرتی ہے اور عورت کے جوہر نسائیت اور شرافت کو غارت کر رہی ہے۔"

اس اقتباس سے "انیسِ نسواں" کی حکمتِ عملی پر پوری طرح روشنی پڑ جاتی ہے۔ اس وقت تک تین پرچے ہماری نظر سے گزر چکے ہیں۔ ترتیبِ مضامین بہت اچھی ہے اور مضامین دلچسپ اور مفید ہیں۔ نئے مضامین کے ساتھ بعض پرانے مضامین کے اقتباس بھی نظر آتے ہیں۔ آنریبل سر عبدالقادر بھی اس پرچے کے مضمون نگار ہیں۔ عورتوں کے لئے یہ رسالہ نہایت مفید ہے اور ان کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ بیگم محمد اکرام رسالے کی جائنٹ ایڈیٹر ہیں۔ معنوی خوبیوں کے ساتھ رسالے کی ظاہری صورت بھی اچھی ہے۔ چندہ سالانہ پانچ روپے ہے لیکن ایک سستا ایڈیشن بھی چھپتا ہے۔ جس کا چندہ تین روپے ہے۔ فی پرچہ ۸ ر و ۴ر
خواتین کو یہ پرچہ ضرور خریدنا چاہئے۔ دفتر رسالہ "انیس نسواں" دہلی سے طلب فرمائیے۔

ہونہار:۔ یہ بچوں کا ایک ہفتہ وار اخبار ہے جس کے ایڈیٹر میاں عبدالمجید بھٹی ہیں۔ یہ پرچہ ظاہری اور معنوی اعتبار سے بچوں کے مشہور اخبار "پھول" کے انداز کا ہے۔ میاں صاحب بچوں کے بہت اچھے شاعر بھی ہیں۔ یہ پرچہ غالباً چھ سات سال سے جاری ہے اور بہت اچھا کام کر رہا ہے۔ چندہ سالانہ صہ فی پرچہ ا ر۔ دفتر رسالہ "ہونہار" ریلوے روڈ۔ لاہور سے طلب کریں۔

۱۰۰ ایک سو

برس کی عمر کا راز

جو سنہ ۱۸۳۹ء سے سنہ ۱۹۳۹ء تک پہنچ کر

کارخانہ

اصغر علی محمد علی تاجرِ عطر لکھنؤ

نے حاصل کی

مال کی عمدگی دیانتداری اور خوش معاملگی

سے

سید عبداللطیف پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر ہمایوں۔ ۲۳ لارنس روڈ سے شایع کیا۔

قواعد

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ۱؍ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتہً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱؍ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸؍

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجیئے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ۔ لاہور

The Title Page and Picture Printed at Half-Tone Press,
Langley Road, Ram Nagar Lahore.

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگار علامہ فضیلت آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر حامد علی خاں، بی۔ اے

فہرستِ مضامین

"ہمایوں" بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۹ء

تصاویر (۱) جھیل ڈل کشمیر (۲) تیرتا مشاعرہ (۳) چار چنار میں (۴) ڈل چار چنار میں ایک مشاعرہ

چندہ سالانہ صہ ششماہی ؁ (مع محصول) — قیمت فی پرچہ ۸؍

جہاں نما

اُردو کی ہمہ گیری

الٰہ آباد کے مشہور بیرسٹر مسٹر پیارے لال بنرجی کی بہو مسز پورنیما بنرجی جو آج کل سیاحت میں مصروف ہیں کچھ عرصہ قبل انگلستان پہنچیں۔ وہاں کے اخبارات میں اُن کا جو مختصر سفرنامہ شائع ہُوا اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کی عملداری صرف ہندوستان ہی تک محدود نہیں بلکہ دیگر ایشیائی ممالک میں بھی اس کے جاننے اور بولنے والے موجود ہیں۔

مسز پورنیما بنرجی لکھتی ہیں کہ "بصرے کے عالیشان ہوٹلوں کے ملازم ہندوستانی (اُردو) بڑی روانی سے بولتے ہیں اب تک ہماری زبان انگریزی سے خوب مقابلہ کر رہی ہے۔"

بغداد کے متعلق لکھتی ہیں کہ "افسوس ہارون الرشید کے دار السلطنت میں صرف دس منٹ ٹھہرنے کا موقع ملا۔ مگر ہندوستانی (اُردو) یہاں بھی خوب چل رہی ہے۔"

کس قدر افسوس ہے کہ بعض کوتاہ بیں حضرات محض بے جا تعصب کے باعث اُس زبان کو مٹا دینے پر تُلے ہوئے ہیں جس میں ترقی کی اتنی غیر معمولی صلاحیت ہے کہ وہ بڑی بڑی ترقی یافتہ زبانوں کے ساتھ بغیر کسی مصنوعی کوشش کے مقابلہ کر رہی ہے یہی وہ زبان ہے جو ہندوستان کی دو بڑی قوموں کے میل ملاپ سے پیدا ہونے کے باعث اہلِ ملک کے درمیان اتحاد کا واحد ذریعہ ہے۔

اِس سال کے آغاز میں جب یومِ اُردو منایا گیا تو الٰہ آباد میں اس کے دو اجلاسوں میں سے ایک کے صدر سر تیج بہادر سپرو تھے۔ اُن کے الفاظ اب تک ہمارے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ اُنھوں نے یہ بتاتے ہوئے کہ زبان ہندو یا مسلمان نہیں ہوتی فرمایا: "میں جو زبان بولتا ہوں اسے میں نے کسی پنڈت یا مولوی سے نہیں پڑھا بلکہ یہ ہمارا پدری ترکہ ہے جس طرح باپ دادا سے سنتے چلے آئے ہیں اُسی طرح ہم بولتے ہیں میں اس وقت بھی جو آپ کے درمیان موجود ہوں اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں آپ لوگوں میں سے کچھ لوگوں کو خوش کرنا چاہتا ہوں اور نہ میں اس معاملے کو صرف آپ کا معاملہ سمجھ کر آپ کا ساتھ دینے آیا ہوں میں اس لئے آیا ہوں کہ نہ صرف اپنے پدری ترکے کو محفوظ کرنے اور محفوظ رکھنے میں حصہ لوں بلکہ اُن چیزوں کا رد کروں جو اس کے پامال کرنے میں استعمال کی جا رہی ہیں۔ یہ ہمارا حق ہے اور بحیثیت ہندوستانیوں کے ہمارا فرض ہے۔ ہمیں اس معاملے میں ایک دوسرے کا ساتھ دینا ہے۔ ملک میں سیاسی اختلافات کتنے ہی کیوں نہ ہوں مگر زبان کا مسئلہ ایسا نہیں ہے جس پر ہاتھ ڈالا جائے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ زبان بولی اور سمجھی جانے کے لحاظ سے تمام صوبوں میں یکساں مرتبہ نہیں رکھتی اور نہ کسی زبان کے لئے ایسا ممکن ہے

مگر پھر بھی ہر جگہ سمجھی جانے کے لحاظ سے قومی زبان ہونے کا مرتبہ رکھتی ہے۔ ایسی صورت میں کسی کا یہ کہنا کہ ہم تو سنسکرت الفاظ استعمال کریں گے کہاں تک حق بجانب ہو سکتا ہے اور ہمارے لئے یہ کہاں تک جائز ہے کہ ہم کسی کے کہنے سے اپنے ادب کو خراب کرلیں۔

ایک اور موقع پر سرتیج بہادر نے یہ بھی کہا تھا کہ ایک زمانے میں میرا خیال تھا کہ "اُردو کے بجائے ہندوستانی کا نام قومی زبان کے لئے قابلِ ترجیح ہے لیکن اب میں اس کے حق میں نہیں کیونکہ ہندوستانی کا لفظ دھوکے کی ٹٹی کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے جس کے ذریعہ سے خود غرض لوگ اپنے خود ساختہ پیمانے سے زبان و ادب کو ناپ رہے ہیں۔

اسی سلسلے میں اُنہوں نے یہ بھی فرمایا کہ "جس اختراع و تصرف کے ساتھ آج کل اُردو پر ہاتھ ڈالا جا رہا ہے۔ مجھے اس پر سخت اعتراض ہے۔ میں یہ ہرگز گوارا نہیں کر سکتا کہ جس زبان کو دہلی اور لکھنؤ کے اساتذہ نے دو سو ڈھائی سو برس مانجھ کر اس زینے تک پہنچایا ہے اُس کو اس طرح برباد کیا جائے۔ میں اُردو کو مسلمانوں کی زبان نہیں سمجھتا۔ اُردو ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے۔ یہ ہمارا ناقابلِ تقسیم ترکہ ہے۔ میں اُردو میں بلا ضرورت غیر مانوس سنسکرت اور غیر مانوس عربی الفاظ داخل کرنے کا یکساں مخالف ہوں۔ اگر اُردو پر یہ اعتراض ہے کہ اُس کے بعض الفاظ دیہاتیوں کی سمجھ سے باہر ہیں تو ہندی میں اور خصوصاً اُس ہندی میں جو آج کل بولی جاتی ہے صدہا الفاظ ایسے ہیں جو دیہاتی نہیں سمجھتے۔"

بہار کی تعلیمی جدوجہد

بہار میں اَن پڑھوں کو تعلیم دینے کے لئے جو جدوجہد کی جا رہی ہے اُس میں وہی طریق کار اختیار کیا گیا ہے جس کا تجربہ اس سے پہلے سوویٹ روس میں ہو چکا ہے۔ روس میں جن لوگوں نے عوام کو تعلیم دینے کے کام میں غیر معمولی سرگرمی دکھائی تھی انہیں ایک تمغہ دیا جاتا تھا جو لینن کے نام سے منسوب تھا۔ بہار میں بھی اُن رضاکاروں کو جو تعلیم کے کام میں غیر معمولی دلچسپی لیتے ہیں۔ ایسے تمغے دیئے گئے ہیں جو گاندھی صاحب، پنڈت جواہر لعل نہرو، ڈاکٹر راجندر پرشاد، پنڈت موتی لال نہرو، دیش بندھو سی آر داس، مسٹر سبھاش چندر بوس، مسز کملا نہرو، ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور، راجہ رام موہن رائے، علامہ اقبالؒ اور لیڈی ہیلٹ وغیرہ کے ناموں سے منسوب ہیں۔ ۱۴ر جولائی ۱۹۳۹ء کو اس تحریک کی پہلی سالگرہ منائی گئی تھی اور مستحق کارکنوں کو تمغے اور سند عطا کی گئی تھیں۔ یوپی کی ہندو حکومت کی یہ فراخ دلی قابلِ تعریف ہے کہ اُس نے ایک مسلمان کے نام کا تمغہ بھی مقرر کیا ہے۔ حکومتِ پنجاب کو بھی عوام کی تعلیم کے لئے ایسی کوئی مہم شروع کرنی چاہئے۔ اگر تمغے دینے کا خیال ہو تو کم از کم ایک تمغہ ضرور ٹیگور یا کسی دوسرے ہندو بزرگ کے نام سے منسوب کرنا چاہئے تاکہ قومیتِ متحدہ کا خواب جلد شرمندۂ تعبیر ہو۔

مجسٹریٹ ہندوستانی خواتین

لکھنؤ میں چار خواتین مجسٹریٹ مقرر کی گئی ہیں۔ مسز بی این ملّا اور مسز علی ظہیر کو چھ مہینے کے لئے مجسٹریٹ درجۂ سوم کے اختیارات دیئے گئے ہیں۔ یہ اختیارات لکھنؤ کے حدودِ بلدیہ کو چھوڑ کر باقی تمام ضلع لکھنؤ پر حاوی ہیں۔ ان دونوں خواتین کا اجلاس لکھنؤ میں ایک ہی مقام پر ہوا کرے گا۔

مسز شوراج وتی نہرو کو بھی چھ مہینے کے لئے یہی اختیارات دیئے گئے ہیں لیکن اُن کا دائرۂ عمل بلدیہ لکھنؤ کے حدود میں ہوگا۔ مسز بسنتی مکند کو حدودِ بلدیہ لکھنؤ کو چھوڑ کر باقی تمام ضلع لکھنؤ میں کچھ عرصے کے لئے مجسٹریٹ درجۂ سوم کے اختیارات دیئے گئے ہیں۔

بیمہ کمپنیوں کے متعلق حکومتِ ہند کا قانونِ جدید

یکم جولائی ۱۹۳۹ء سے بیمہ کمپنیوں کے متعلق حکومتِ ہند نے ایک جدید قانون نافذ کیا ہے۔ اس وقت واقعی ایک ایسے قانون کی شدید ضرورت تھی۔ گزشتہ بیس سال کے عرصے میں بیمہ کے کام نے غیر معمولی وسعت اختیار کی ہے۔ موجودہ حالات میں یہ ضروری تھا کہ کمپنیوں کے تحفظ اور بیمہ کرانے والوں کے مفاد کی پاسبانی کے لئے حکومت کی طرف سے کوئی انتظام ہوتا۔ نئے قانون نے اس قسم کے تحفظ کا نہایت اچھا انتظام کر دیا ہے۔ چنانچہ ادنیٰ درجے کی ناقابلِ اعتبار کمپنیوں کے قیام میں بہت سی رکاوٹیں حائل ہو گئی ہیں اور اچھی کمپنیوں کی ساکھ قدرتاً پہلے سے بھی بڑھ گئی۔ جدید قانون کی بڑی بڑی دفعات یہ ہیں :۔

(۱) تمام بیمہ کمپنیوں کے اندرونی انتظام پر حکومت کی زیادہ شدید نگرانی۔

(۲) ہر قسم کے بیمہ کے کام پر قانونی پابندیاں۔

(۳) بیمہ کرانے والوں کے حقوق کا تعین، اُن کی پوری پوری وضاحت اور نگہداشت۔

(۴) بیمہ کے ایجنٹوں کی سرگرمیوں کی نگرانی اور اُن کے قانونی اختیارات کی وضاحت۔

(۵) غیر ملکی بیمہ کمپنیوں کی سرگرمیوں پر پابندیاں۔

(۶) پراویڈنٹ سوسائٹیوں پر مرکزی حکومت کی نگرانی اور اُن کے دائرۂ عمل کی وضاحت۔

(۷) حکومت کے اختیارات کی توسیع۔

شہد سے دمہ کا علاج

دمہ کے علاج کے ایک ماہر جرمن ڈاکٹر نے یہ تجربہ کیا ہے کہ شہد کو سونگھنے سے دمہ کے مریض کو افاقہ ہو جاتا ہے۔ شہد کا

برتن ناک کے سامنے رکھ کر سانس خوب اندر کی طرف کھینچنی چاہیے۔ شہد کو اس طرح چند مرتبہ سونگھنے سے تنفّس بہت صاف اور باقاعدہ ہو جاتا ہے۔

یہ طریق دمہ کا قطعی علاج نہیں ہے۔ نہ متذکرۂ صدر جرمن ماہر نے یہ دعویٰ کیا ہے۔ لیکن ایک بار یہ عمل کرنے سے اتنا فائدہ ضرور ہو جاتا ہے کہ اس کے بعد مریض کا کم از کم ایک گھنٹہ آرام سے گزرتا ہے۔ فوری علاج کے طور پر ہر مریض کو اس کا تجربہ کرنا چاہیے۔

دستخطوں کی قیمت

لندن میں بڑے آدمیوں کے دستخط فروشوں نے حال میں قیمتوں کی جو فہرست شائع کی ہے۔ وہ قابلِ ملاحظہ ہے۔ چند نمونے یہ ہیں:۔

مہاتما گاندھی (پچاس فیصدی خیرات کے لئے) ——— ۲۰۰ پاؤنڈ

ہٹلر ——— ۱۵۰ //

روزویلٹ ——— ۴۰ //

مسولینی ——— ۳۰ //

ڈیوک آف ونڈزر ——— ۵ //

پوپ ——— ۱ //

انسانی جسم کے اجزائے ترکیبی اور اُن کے عناصر

ایک اوسط درجے کے صحیح الجسم جوان آدمی کا جسم حسبِ ذیل اجزاء سے مرکب ہوتا ہے:۔

گوشت	۴۳ سیر	چربی	۴۱ سیر
ہڈی	۱۲ سیر	بھیجا	½۱ سیر
کھال	½۵ سیر	سینے کے اندرونی اعضاء	½۳ سیر
خون	½۳ سیر	پیٹ کے اندرونی اعضاء	۵ سیر

اس حساب سے ایک جوان اور توانا آدمی کے جسم کا اوسط وزن تقریباً ۸۰ سیر ہوتا ہے۔ اس میں چوالیس سیر پانی اور تینتیس سیر ٹھوس اجزا

ہوتے ہیں۔ اس پانی اور ٹھوس مادّے کا کیمیائی تجزیہ کیا جائے تو چودہ عناصر کی تشخیص ہوتی ہے :۔

(۱) آکسیجن (۲) ہائیڈروجن (۳) کاربن (۴) نائٹروجن (۵) فاسفورس (۶) گندھک (۷) سیلیکن (۸) کلورین (۹) فلورین (۱۰) پوٹاسیم (۱۱) سوڈیم (۱۲) کیلسیم (۱۳) میگنیشیم (۱۴) فولاد۔

ہندوستانیوں کی قلیل آمدنی اور زندگی کا پست معیار

پروفیسر فنڈلے شیراس نے کچھ عرصہ قبل مختلف ممالک کی فی کس سالانہ آمدنی کا اندازہ لگایا تھا۔ ذیل کے اعداد و شمار قابلِ لحاظ ہیں :۔

مُلک	آمدنی
برطانیہ	۱۰۱۰ روپے
فرانس	۵۴۵ روپے
جرمنی	۵۱۹ روپے
اٹلی	۳۱۹ روپے
جاپان	۱۸۶ روپے
ہندوستان	۶۳ روپے

پروفیسر شیراس لکھتے ہیں :۔

"شرق و غرب میں آمدنی کے اس فرق کا بڑا باعث مشرقی ممالک میں اُجرتوں کی کمی ہے۔ اور اُجرتوں کی کمی کا سبب محض یہ نہیں کہ مشرق اور مغرب میں کارخانوں کی اُجرتوں کے درمیان بہت غیر متناسب فرق ہے بلکہ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ مشرقی ممالک میں زراعت کا پیشہ اب تک سب سے زیادہ عام ہے اور زراعتی کام کرنے والوں کی اُجرتیں بہت کم ہیں۔"

مشرق اور مغرب کی آمدنی کے اس فرق کی وجہ خواہ کچھ ہو ہندوستان کی حالت یقیناً قابلِ رحم ہے۔ پروفیسر فنڈلے شیراس نے ایک ہندوستانی کی آمدنی کے اوسط کا جو اندازہ کیا ہے، ہندوستان کے ماہرینِ اقتصاد اُسے درست نہیں سمجھتے۔ اُن کا اندازہ اس سے بھی کم ہے۔ لیکن اگر پروفیسر صاحب کے اندازے کو بھی درست تسلیم کر لیا جائے تو کوئی محبِ وطن ہندوستانی اپنے وطن کے ہولناک افلاس پر آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

حامد علی خاں

جھیل ڈل کشمیر

تیرتا مشاعرہ

چار چنار میں

ڈل چار چنار میں ایک مشاعرہ
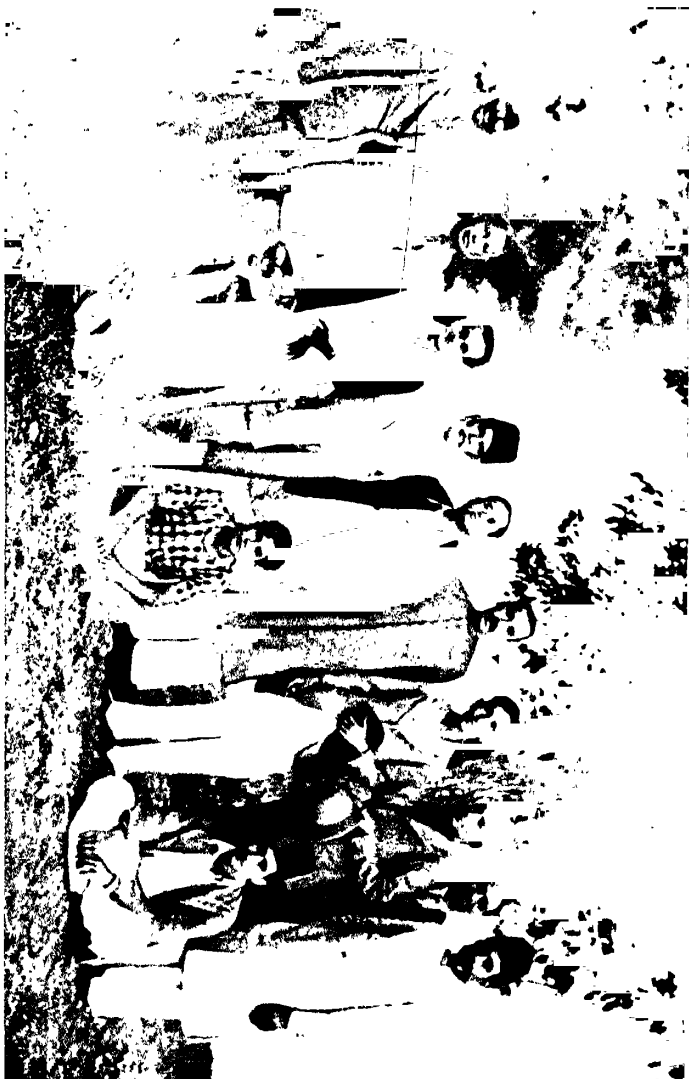
(کھڑے ہوئے دائیں سے بائیں) مہر شکوہ آبادی۔ بشیر احمد۔ سعید احمد۔ قیس شروانی۔ آغا علی خان۔ اثر صہبائی
سراج الدین احمد۔ وشوناتھ ماہ۔ مقبول احمد۔ محمد شفیع۔
(بیٹھے ہوئے) امیر الدین۔ اندر کمار۔ خورشید علی خان نواب۔

تیرتا مشاعرہ

جب ہنگامہ خیز سیاسی جلوسوں اور باقاعدہ علمی جلسوں سے طبیعت تھک گئی تو جی چاہا کہ کسی اطمینان بخش فضا میں شعر و سخن سے زندگی کا لطف اُٹھایا جائے۔

حال کے بعض عاشق مزاج اصحاب میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ کبھی ایک دقیانوسی شاعر کی طرح یہ اعتراض نہیں کرتے کہ "جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو"۔ ہمارے دوست قیس شروانی (سکرٹری بزم اُردو کشمیر) بھی اس خوبی کے مالک ہیں۔ لیلائے کشمیر کا سامنا تھا۔ چنانچہ جب میں نے تجویز کی کہ اس نظارہ بازی سے مل کر لطف اُٹھایا جائے تو قیس صاحب نے رقابت کے فطری جذبات کو ٹھکرا کر خندہ پیشانی سے اپنے ایک درجن دوستوں کو نقاب کشائی کے کارِ خیر میں شریک کر لیا۔

کشمیر کی ڈل جھیل دُنیا کے بہترین نظاروں میں شمار کی جاتی ہے۔ تین طرف بلند پہاڑ جن کے پہلو میں مغلوں کا پری محل، شاہی چشمہ، نشاط باغ اور شالامار اور ذرا آگے بڑھ کر ہارون کا ذخیرۂ آب اور چوتھی طرف کُھلا میدان اور کھیتیاں جن میں پہلے نسیم باغ اور نگین باغ اور ذرا پیچھے ہٹ کر ہری پربت جس کی چوٹی پر دُور سے چمکتا ہوا اکبرِ اعظم کا شاندار قلعہ جلوہ افگن۔

گرمیوں کے موسم میں دن کو ذرا تپش ہو بھی تو شام ہوتے ہی ڈل کے پانیوں پر وہی "خنکی ہوائیں پر نہ زیادہ بہت نہ کم" پھر اس پر شکارہ کشتی میں سیر! طبیعت ہلکی پھلکی ہو جاتی ہے اور دل مطمئن۔ آنکھیں کبھی اس منظر کے دیکھنے کو کُھلتی ہیں اور کبھی آپ سے آپ مُند جاتی ہیں! یہاں ریل یا موٹر کی چھک چھک جھک جھک بک بک نہیں کہ جسم کو اُبھارے اور دل کو اُکسائے بلکہ وہ سکون و خاموشی ہے جو تھکے ماندوں کو سُلائے اور چُست و چالاک دماغ کو امن و شانتی کا پیام دے۔ مانجھی مزے سے چپّو چلا رہے ہیں (ہاں ذرا بے تکلف ہو کر کبھی کبھی مل کر یہ ہلکا سا نعرہ لگاتے ہیں "راجہ صاحب کو"، "نواب صاحب کو!" "کو" پر آواز اُونچی ہو جاتی ہے اور اسی سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو خطاب کیا جا رہا ہے اور یہ آپ ہی کی ذاتِ شریف کی تعریف ہے)۔

۷ر جولائی ۱۹۳۹ء کی شام تھی اور ہم تیرہ آدمی اس تیرتے مشاعرے میں شریک تھے۔ تیرہ انگریزوں کے ہاں منحوس نمبر ہے لیکن ہندوستانیوں کے ہاں جو نہ تین میں ہوں نہ تیرہ میں اُس کا وجود ناکارہ ہے۔ کم از کم اُس شام کو ہم تیرہ کو بارہ یا چودہ کرنے پر کبھی راضی نہ ہوتے۔ ہر شخص میں ایک انوکھا پن تھا۔ دُنیا میں کون ہے جو انوکھا ہو کر نظر نہ آئے اگر اُس کے لئے فضا سازگار ہو، بندشیں نہ ہوں، تعصب نہ ہو، حسد بھرا مقابلہ نہ ہو پھر دیکھیئے کہ ہر آدمی کیونکر انسان بن جائے!

غرض یہ تیرہ آدمی چار شکاروں میں "چار چنار" کے ننھے منّے جزیرے کی طرف چلے۔ پبلک کی نظروں سے اوجھل ہو کر میں نے

تجویز کی کہ ہر شخص اپنا کلام کسی نہ کسی قسم کی لَے میں پڑھے۔ ہر ایک نے بے تکلف ہو کر گلے بازی کا حق ادا کیا۔ سننے والے کتنے تھے؟ ایک درجن یا پھر چند اُس کشمیر کے رہنے والے جس کے فراز میں موسیقی کا نشیب ہے۔ شکارے خاموشی سے چل رہے تھے اور شاعر اپنی مستی میں گا رہے تھے۔

یہ ہندوستان کے چند شہرہ آفاق شعراء اور ہزاروں بے تاب سامعین کا دم بخود کر دینے والا ہنگامہ خیز "نشری" مشاعرہ نہ تھا بلکہ محض تیرہ "خلوتیانِ" ڈل کی ایک شاعرانہ صحبت تھی۔

اُس روز ریاست میں سرکاری طور پر سوگ تھا۔ ہارمونیم طبلہ ممنوع نہیں تو مکروہ ضرور سمجھا جاتا لیکن یہاں کس شے کی کمی تھی گلا ہر ایک کا اپنا ساز، اور اس کے ساتھ جنابِ نواب کے لبوں نے جو طبلے کا کام دیا تو نقل پر اصل کا دھوکا ہو گیا۔ اِدھر یہ مختصر صحبت اُدھر ڈل کا سہانا سماں پھر کیونکر ہر مصرع کی قیمت دُگنی چوگنی نہ ہو جاتی کیونکہ ہر شعر دل میں نہ اُتر جاتا۔ شام کی جادو بھری فضا نے انسانی آواز کی دلکشی کو چار چاند لگا دیئے۔ ہر شے ہر بات حُسن میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوئی۔ مغلوں نے اِس پیاری جھیل کا نام جو "دامنِ پاک" رکھا تو خوب رکھا۔ یہاں آ کر محسوس ہوتا ہے کہ حُسن اور پاکیزگی دراصل ایک ہی چیز ہے۔

وہ مصرع بھول جائیں وہ شعر بھول جائیں لیکن وہ صحبت کیونکر بھول سکتی ہے جس میں انسان اور فطرت نے مِل کر حُسن کی تخلیق کی ڈل کے شفاف پانی نے اُس کا مُنہ دھویا، ڈوبتے سورج کی سنہری کرنوں نے اُسے آراستہ کیا اور انسانوں کی مشتاق نگاہوں نے خلوص سے ٹکٹکی باندھ کر اُسے دیکھا اور اپنے دِل میں جگہ دی۔

اِس دَوران میں والدِ محترم اور اُن کے اُس ادبی دائرے کی یاد دِل میں تازہ ہوئی جو بیس تیس سال ہوئے گرمیوں کی تعطیلات میں کشمیر میں رونق افروز ہُوا کرتا تھا اور حضرتِ ہمایوں مرحوم کی مشہور نظم "شالامارِ کشمیر" کے یہ آخری شعر بے اختیار زبان پر آ گئے

محوِ خیال کیوں ہے ذرا آنکھ تو اُٹھا — دیکھ اور محوِ صنعتِ پروردگار ہو
منظر نہیں یہ شانِ خدا کا ظہور ہے — پانی کو چوم کوہ سے لے ہمکنار ہو
لہروں میں، بادلوں میں، ہوا میں، پہاڑ میں — وہ رُوح ہے کہ جاں تری اُس پر نثار ہو
دل چاہتا ہے اپنا ہو مسکن نسیمِ باغ — مر جائیے تو ڈل کے کنارے مزار ہو
سو جائیں ایک تینے کا سینے پہ رکھ کے ہاتھ — مدفن دلِ تپاں کا جو زیرِ چنار ہو

ناظر بڑا مزا ہو جو اقبال ساتھ دے
ہر سال ہم ہوں شیخ ہو اور شالامار ہو

بشیر احمد

اڑتیس (٣٨) سال پہلے

خانصاحب منشی سراج الدین احمد صاحب نے میری گزارش پر یہ چھوٹی سی تمہید لکھی ہے ۔ والدِ محترم بہت خوش ہو کر خانصاحب کا ذکر مجھ سے کیا کرتے تھے کہ ہم لوگ جب کشمیر جاتے ہیں تو یہ رونقِ محفل کا موجب ہوتے ہیں ۔ فرمایا کرتے تمہیں ان سے ضرور ملائیں گے ۔ عجیب بات ہے کہ میں نے پہلی بار خانصاحب کو یومِ اُردو کی تقریب پر لاہور میں پچھلے سال دیکھا اور اس دفعہ کشمیر میں پہلی بار اُن سے صحیح معنوں میں ملنا ہوُا ۔ ماشاءاللہ مجسّم رونق ہیں ۔ (ا ب)

آج سے تقریباً اڑتیس سال پہلے علامۂ فصیح آنریبل میاں محمد شاہ دین مرحوم اور آنریبل سر میاں محمد شفیع مرحوم نے کشمیر
نا شروع کیا ۔ وُہ زمانہ تھا کہ مغلیہ باغات یعنی شالامار، نشاط اور چشمۂ شاہی بربادی اور کس مپرسی کی حالت میں پڑے تھے ۔ مگر
ن دنوں چند ادب دوست احباب کی ایک مجلس بنام "مفرح القلوب" سری نگر میں قائم تھی جس کا ہفتہ وار اجلاس کشتی میں بیٹھ کر
ہیل ڈل میں منعقد ہوُا کرتا تھا اور یہ مجمع مندرجہ بالا باغات میں جا کر بھی محفلِ ادب کی نشست قائم کیا کرتا تھا ۔ یہ سب اصحاب سرکاری
مدہ دار تھے جن میں کے تین آخر منسٹر اور بعض دوسرے بہت معزز عہدوں سے ریٹائر ہوئے ۔ یہ خود ہی شاعر، خود ہی گویّے، خود ہی ہارمونیم
طبلہ نواز تھے ۔ غزلیں لکھی جاتی تھیں اور چناروں میں جھُولے ڈال کر موسیقی کے ساتھ گائی جاتی تھیں ۔ غرض کہ یہ سماں باغِ جنت کے کسی
رنے سے کم نہ ہوتا تھا ۔ مگر اس تمام مجلس کے مرکز میاں صاحبان مرحوم ہی ہوُا کرتے تھے ۔ اس مجلس 'مفرح القلوب' کا اس قدر
ہرہ ہوُا کہ خود مہاراجہ صاحب آنجہانی نے متعدد مرتبہ مختلف اراکینِ مجلس سے خواہش ظاہر فرمائی کہ انہیں بھی کسی وقت اس قسم کی سیر
رائی جائے ! جس میں ایسے ایسے معزز لوگ بن پیئے مست ہو کر محفلِ حال و قال برپا کر دیتے ہیں ! مجلس کے یہ اجلاس برباد باغات
کے دروازے بند کر کے ہوا کرتے تھے اور اسی مجلس کی سرگرمیوں نے کشمیر کے عوام اور ہندوستان کے سیاحوں کی توجہ ان باغات
کی طرف مائل کی تا آنکہ دو چار سال کی تخمینہ سازی کے بعد ۱۹۰۸ء کے قریب سر جان مارشل نے ان باغات کی مرمت اور نئے سرے
سے تزئین کرائی جس کے بعد دیواریں، الوان، بارہ دریاں، نہریں، فوارے، روشیں اور صحنِ چمن نئے رنگ میں جلوہ افروز ہو گئے اور
مفرح القلوب کے ہفتہ وار جلسوں نے ہر اتوار کو ایک عام میلے کی صُورت اختیار کر لی جو اب تک جاری ہے ! امسال جناب میاں بشیر احمد صاحب
بیرسٹر کی آمد پر پُرانی مجلس کے بعض کہنہ سال اراکین نے چھوٹے پیمانے پر پھر ایک مختصر سا اجلاس ترتیب دیا ۔

سراج الدین احمد

جھیل ڈل (کشمیر) کی ایک پُرکیف شام

کارفرما تھا میاں صاحب کا جس میں فیضِ عام ‏ ‏ ‏ یادگارِ جنّتِ ارضی ہے وُہ رنگین شام

جنتِ کشمیر جس کا ہر گوشہ حسنِ فطرت کا لاجواب نمونہ اور ہر منظرِ جمیل رعنائیوں اور نظر فریبیوں کی نہ بھولنے والی دُنیا ہے ہر سال اہلِ ذوق کی بیسیوں محفل آرائیوں کا مرجع بنی اور بنتی رہے گی۔ یہی وہ رُوح پرور وادی ہے جس میں پہنچ کر ہر صاحب نظر دیدۂ دل وا کرنے پر مجبور رہے اور اپنے اپنے مذاق کے مطابق بقدرِ ہمت اس عالمِ رنگ و بُو سے بہرہ اندوز ہوتا ہے۔ اگر زندہ دل دوستوں کے راحت طلب اور عشرت آفریں مجمع ساغر و مینا سے خالی ہوں تو چنگ و رباب کو گرمیٔ محفل کا ذریعہ بنا لیا جاتا ہے اور اگر کہیں لیلائے سخن کے شیدائی باہم مِل بیٹھتے ہیں تو گرد و پیش کی جنت گاہ میں اپنی نغمہ سنجیوں سے فردوسِ گوش کا سماں بھی پیدا کر لیتے ہیں۔

اسی جنتِ ارضی میں کچھ مدت سے ملک کے بہترین ادبی رسالہ "ہمایوں" کے فاضل ایڈیٹر اور انجمنِ اُردو پنجاب کے سکرٹری مخدومی جناب میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا بھی فروکش ہیں۔ اور ازراہِ کرم بزمِ اُردو جمّوں و کشمیر کے ایک ادبی جلسہ و مشاعرہ کی صدارت فرما کر یہاں کے ادبی حلقے کو اپنے دیدار سے مشرف اور اپنی ادب نوازی سے متعارف فرما چکے ہیں۔ متذکرہ صدر مشاعرہ کے بعد آپ ایک مخصوص و محدود ادبی محفل آرائی بھی چاہتے تھے۔ چنانچہ یہ مجوزہ مجلس شعر و سخن ۱۱ر جولائی کو سری نگر کی رُوح پرور جانفزا جھیل "ڈل" میں شام کے وقت منعقد ہوئی۔ جس سے پہلے مخدوم محترم کی طرف سے شرکائے محفل کے کام و دہن کی ضیافت ان کی قیام گاہ ونیڈ وز ہوٹل میں چائے سے کی گئی جس میں اصحابِ ذیل نے شرکت فرمائی:-

(۱) الہ آباد کے خوش گو شاعر اور سلجھا ہوا مذاق رکھنے والے بزرگ جناب نواب آغا محمود علی خاں صاحب الہ آبادی (۲) حضرت آثر صہبائی صاحب ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی وکیل سری نگر (۳) کشمیر کی ہر ادبی محفل میں اپنی بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی سے چار چاند لگا دینے والے بزرگ جناب خانصاحب منشی سراج الدین احمد صاحب پنشنر میر منشی ریزیڈنسی کشمیر۔ (۴) جناب سیّد مہربان حسین صاحب تہر شکوہ آبادی جو ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اور موسمِ بہار میں اکثر کشمیر آیا کرتے ہیں۔ (۵) جناب نواب خورشید علی خانصاحب نواب فرخ آبادی خلف الرشید جناب مضطر فرخ آبادی (آپ بھی آج کل بغرضِ سیاحت واردِ کشمیر ہیں) (۶) جناب ملک مقبول احمد صاحب ڈپٹی رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز کشمیر آپ کشمیر کے بامذاق اور سخن رس بزرگ اور بزمِ اُردو کے محسن ہیں (۷) بزمِ اُردو جموں و کشمیر کے صدر اور ریاست جموں و کشمیر کے مشہور شاعر ڈرامہ نویس اور مصنف

جناب پنڈت وشوناتھ صاحب درماہ بی۔اے (۸) پنڈت صاحب موصوف کے خوش گلو اور ہونہار صاحبزادے عزیز آنند کمار (۹) کشمیر کی ہر دلعزیز ادبی محفل کی زینت اور بزم اُردو جموں و کشمیر کے جائنٹ سکرٹری جناب بابو محمد شفیع صاحب کلیم (۱۰) جناب خواجہ سعید احمد صاحب قتیل سکرٹری ریڈنگ روم بزم اُردو۔ (۱۱) جناب خانصاحب منشی سراج الدین احمد صاحب کے صاحبزادے عزیز امیر الدین احمد صاحب (۱۲) خاکسار قیس شروانی جنرل سکرٹری بزم اُردو جموں و کشمیر۔

حاضری کے فوراً بعد اس عالی شان ہوٹل کے ہال میں حضرت میاں صاحب ممدوح نے ایک پُرتکلف ٹی پارٹی دی جس سے فارغ ہونے کے بعد تقریباً چھ بجے شام کشمیر کے شعراء سیاحین مقامی بزرگوں اور چند ارکان بزم کی یہ جماعت حضرت میاں صاحب کی کار کے ذریعے سے گگری بل پہنچی گگری بل سے چند خوبصورت اور جاذب نظر شکارے بھی میاں صاحب نے کرایہ پر لے رکھے تھے۔ چنانچہ تقریباً پونے سات بجے احباب کا یہ مختصر مگر بامذاق قافلہ جناب میاں صاحب موصوف کی سرکردگی میں گگری بل سے روانہ ہوا۔ موسم بے حد خوشگوار و پُرلطف تھا۔ اردگرد و پیش کے مناظر فرحت انگیز۔ دائیں جانب تختِ سلیمان کی مشہور پہاڑی، بائیں جانب خوشنما ہاؤس بوٹوں کی قطاریں جن میں شاہانہ زندگی بسر کرنے والے دیسی اور یورپین سیاح فروکش تھے پھر دُور سے نظر آنے والی ہری پربت کی پہاڑی جس کی چوٹی پر سری نگر کا مشہور قلعہ ہری پربت واقع ہے۔ سامنے میلوں تک پھیلا ہوا جھیل کا ساکن و شفاف پانی جس کی سطح پر تیرنے والی سُبک و تیز رفتار کشتیاں اِدھر سے اُدھر ڈل کے ساکن پانی سے چھیڑ کرتی ہوئی گزر جاتی تھیں اس خیال سے کہ یہ سیر ایک بزم کی صُورت میں کی جائے تمام شکاروں کے پہلو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر چلائے جا رہے تھے۔

کچھ آگے بڑھے تو چند یورپین عورتیں اور مرد مصروفِ غسل نظر آئے۔ جو ایک بڑی کشتی کی چھت سے جھیل میں چھلانگیں لگا رہے تھے۔ چونکہ میاں صاحب اپنے ساتھ ایک کیمرہ بھی لائے تھے جس کے ذریعہ سے آپ اکثر کشمیر کے بے نظیر مناظر کے فوٹو لیا کرتے ہیں۔ لہٰذا ساری پارٹی نے یک زبان ہو کر اُن سے درخواست کی کہ اس منظر کا بھی ایک فوٹو ضرور لیجئے۔ چنانچہ موصوف اپنا شکارا الگ کر کے کچھ دُور واپس لے گئے جہاں آپ نے اس حسین منظر کا فوٹو لیا اور پھر پارٹی میں آ ملے۔ اتنی دیر میں شکارے آگے بڑھ چکے تھے اور جھیل کا عرض بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ مشرق کی جانب مہاراجہ بہادر کشمیر کے خوبصورت اور جدید وضع کے شاندار محلات صاف نظر آ رہے تھے۔ جو عین دامنِ کوہ میں واقع ہیں۔ ان محلات سے شمال کی جانب پری محل کے کھنڈر تھے۔ چنانچہ تھوڑی دیر پری محل کی وجہ تسمیہ پر پُرلطف بحث ہوتی رہی۔ جو کافی دلچسپ تھی۔ پھر کلیم صاحب نے خوش الحانی کے ساتھ ایک غزل سنائی جس نے اس لطف میں بہت کچھ اضافہ کر دیا۔ یہاں سے شکاروں کا رُخ "چار چنار" کی جانب کر دیا گیا۔ جو گگری بل سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر جھیل کے بیچوں بیچ شاہانِ مغلیہ کی اعجوبہ پسندی کی یادگار ایک خشکی کے چھوٹے سے قطعہ کی صُورت میں ہے جس کے چاروں کناروں پر چنار کے چار درخت لگائے گئے ہیں اور جسے آج بھی اپنے محلِ وقوع کی ندرت اور گردوپیش کے مناظر کی دلکشی کے باعث کشمیری زبان میں رُپ لنکا یعنی چاندی کی لنکا کہا جاتا ہے۔ کلیم صاحب کے بعد جناب مہر شکوہ آبادی نے اپنا کلام سنایا جنہیں جی بھر کے داد دی گئی۔ آپ کے بعد نواب فرخ آبادی نے اپنے لحن داؤدی سے کام لیتے ہوئے اپنا کلام سنایا۔ پھر حضرت نواب محمود الہ آبادی نے اپنی ایک بہاریہ نظم سنائی جسے بے حد پسند کیا گیا۔ آپ کے بعد قتیل صاحب نے اپنی پُرکیف نظم سنا کر داد حاصل کی۔ پھر جناب خانصاحب منشی سراج الدین صاحب کی باری آئی تو آپ نے فرمایا کہ آج سے تقریباً ۳۸ سال پہلے بند دوست ڈل کی سیر کر رہے

---

* قیس صاحب بیان کرنا بھول گئے کہ اس محفل میں تیرھواں میں بھی شریک تھا۔ لے

تھے کہ سب کو ایک حسبِ حال نظم لکھنے کا خیال آیا۔ اور سب اصحاب نے مل کر ایک نظم موزوں کی تھی۔ وہ آپ حضرات کو سناتا ہوں۔ آپ نے اپنے مخصوص انداز میں بلند آواز کے ساتھ نظم مذکور سنائی۔ جسے سن کر سب بے حد محظوظ ہوئے۔ آپ کے بعد ماہ صاحب صدر بزمِ اُردو نے اپنی ایک فرحت انگیز غزل سنائی، آپ کی غزل بھی بلحاظ کامیاب ہی۔ اتنی دیر میں چار چنار کا چھوٹا سا جزیرہ آگیا جس میں اُترنے سے پہلے حضرت میاں صاحب نے خود جزیرہ میں اُتر کر اور ہم سب کو اپنی اپنی جگہ شکاروں میں ٹھہرا کر فوٹو لیا۔ یہ شکاروں کا فوٹو بھی غالباً اپنی قسم کا واحد فوٹو تھا۔ جب ہم لوگ "چار چنار" میں اُترے تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ مغرب کی جانب گلمرگ کے بالائی پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں پر جو آسمان سے باتیں کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں شفق کی سُرخی ایک عجیب کیفیت پیدا کر رہی تھی۔ اس مختصر سے جزیرے کے چاروں جانب جھیل کا ساکن پانی اور اس پر تیرنے والے ہلکے اور سبک شکارے جھیل کی مطمئن دُنیا کو بے قرار کرنے کی بے سُود کوشش کرتے ہوئے کناروں کی جانب پوری تیزی سے جا رہے تھے۔ مگر شاعروں اور ادیبوں کی یہ مختصر سی جماعت جو کبھی عالمِ رنگ و بُو میں کھو جانے کی تمنائی نظر آتی تھی۔ اور کبھی کارگاہِ حیات میں ایک نئی رُوحِ زندگی پھونکتی دکھائی دیتی تھی، ۱۱ر جولائی کی اس معمولی شام کو اپنے لئے ہر ممکن طریقے سے پُرکیف بنانے کی خواہاں تھی۔ چنانچہ جناب میاں صاحب کے ارشاد پر چند باقاعدہ تصویریں اُتروانے کے بعد ہم سب جزیرے کے سبز مخملیں فرش پر بیٹھ گئے اور بادۂ سخن کا دَور چلنے لگا۔ اِسی حالتِ بے خبری میں جناب میاں صاحب ممدوح کے کیمرے نے میاں صاحب سمیت احباب کا خود بخود ایک اَور فوٹو لے لیا۔ آخر جب شام کی تاریکی آہستہ آہستہ گرد و پیش کی رعنائیوں اور دلکشیوں کو اپنے آغوش میں لے کر عاشقِ شاہدِ فطرت کی باوفا نگاہوں سے چھپا چکی۔ تو بادلِ ناخواستہ اس زندہ دل گروہ نے شکاروں کا رُخ کیا۔ شکاروں میں بیٹھ کر خاکسار قیس شروانی کو غزل سنانے کا حکم مِلا جس کی تعمیل کی گئی۔ پھر حضرت آثر صہبائی نے اپنی بہار آفریں تازہ غزل سُنائی۔ اس کے بعد میاں صاحب نے "پہلگام" کے عنوان سے اپنی ایک پُرکیف نظم بڑی خوش الحانی کے ساتھ سنائی۔ آخر میں عزیز آنند کمار نے نغمہ سرائی کی اور جناب نواب فرخ آبادی نے اپنی آواز اور حرکات سے طبلہ نوازی۔ انجامِ کار جب نگری بل پہنچے تو تختِ سلیمان کی جاذبِ نظر پہاڑی بجلی کے قمقموں کی فراوانی سے ایک نئی نویلی دُلہن معلوم ہوتی تھی۔ شکاروں سے اُترے تو سب نے اپنے آپ کو پھر اُسی پُرشور ہنگامہ آفریں اور مطلب پرست دُنیا میں پایا۔ جہاں من و تُو کا امتیاز ہی ہر انسان کا طرۂ افتخار ہوتا ہے اور جس میں قوم، مذہب، نسل، اور رنگ ہی ہر شعبۂ زندگی میں کارفرما ہے۔

کاش! افسانۂ زندگی کا یہ دلچسپ باب اتنا مختصر نہ ہوتا ——

اللہ بس باقی ہوس۔

قیس شروانی

از سری نگر

مُشاعرہ

منعقدہ ڈل ۷ جولائی ۱۹۳۹ء

جھیل ڈل

۱۹۰۱ء کی گرمیوں میں میاں محمد شاہدین و میاں محمد شفیع مرحوم و مغفور کشمیر آئے ہوئے تھے مجلس مفرح القلوب کا خاص اجلاس میاں صاحبان مرحوم کی آمد پر جھیل ڈل میں منعقد ہوا اور چودھری خوشی محمد صاحب ناظر نے مندرجہ ذیل اشعار جن میں بعض فی البدیہہ تھے کشتی میں بیٹھے ہوئے لکھے تھے۔ آج ۱۱ جولائی ۱۹۳۹ء کو میاں بشیر احمد صاحب کی سرپرستی میں اُس قسم کا اجلاس پھر جھیل ڈل میں بپا ہوا جہاں خاکسار نے اِن اشعار کا اعادہ کیا۔ ناظر صاحب نے اب ان اشعار میں بہت اضافہ کر دیا ہے۔

سراج الدین احمد

اللہ اللہ ہے کیا حُسنِ چمن پانی میں
گل و گلزار ہے اور سرو و سمن پانی میں

کیسے کیسے ہیں دل افروز نظارے اس میں
کوہ پانی میں چمن پانی میں بن پانی میں

تودۂ سیم ہے یہ ڈل کے کنارے میں نہاں
برفِ کہسار ہے یا عکس فگن پانی میں

اک طرف کوہ پہ ہے تختِ سلیماں قائم
اک طرف سبز پری کا ہے وطن پانی میں

عشق پیچاں ہے اِدھر اور گُلِ ریحاں ہے اُدھر
ہے یہ منصور تو وہ دار و رسن پانی میں

آبِ ڈل حسن و لطافت میں ہے گر آبِ حیات
صورتِ خضر ہے ہر شاخِ سمن پانی میں

سبز شاخیں ہیں مگر مصحفِ قدرت کی سطور
حاشیہ ان کا ہوا میں ہے متن پانی میں

اِک طرف پھول کنول کا وہ سجیلا بانکا
مسکراتا ہے کھڑا غنچہ دہن پانی میں

نیلگوں آب پہ دیکھو گُلِ تر کی سُرخی،
حُسن کی آگ ہے کیا شعلہ فگن پانی میں

اس کے پتوں پہ ہے یہ قطرۂ باراں کی بہار
سبز تھالوں میں ہیں یا دُرِّ عدن پانی میں

نچلی رہتی نہیں جس طرح کسی شوخ کی آنکھ
کھیلتی پھرتی ہے سُورج کی کرن پانی میں

ہیں شکارے پہ سیہ چشم بتانِ کشمیر
یا نکھرتے ہیں غزالانِ ختن پانی میں

بہارِ کشمیر

یہ سچ ہے کیفِ دل کہاں حریمِ روزگار میں — کہ جس کا ذرہ ذرہ ہو دیارِ غمگسار میں
مگر نظر اُٹھا تو اب کہ اس بہشت زار میں — مچل رہی ہیں فطرتیں نسیمِ خوشگوار میں
مسرتوں کا جوش ہے شبابِ نوبہار میں

گھٹائیں اپنی گود میں ہیں مستیاں لئے ہوئے — ہوا کے زم دوش پر صراحیاں لئے ہوئے
چمن کے ذرے ذرے کی جوانیاں لئے ہوئے — گلوں کے حسن و عشق کی کہانیاں لئے ہوئے
چمک رہی ہیں بجلیاں تبسمِ بہار میں

لرز رہی تھی بزمِ گل عتابِ برشگال سے — وہ ٹپکیں رس کی بوندیاں حجابِ برشگال سے
برس پڑیں وہ مستیاں شرابِ برشگال سے — اُبل پڑیں جوانیاں شبابِ برشگال سے
مچل رہے ہیں زمزمے صدائے آبشار میں

زمینِ صحنِ باغ کو نئی ملی ہیں لذتیں — فضائے حسن و عشق میں مچل رہی ہیں اُلفتیں
چمن کے رہنے والوں کی بدل رہی ہیں قسمتیں — جہانِ آب و گل سے وہ اُبھر رہی ہیں رحمتیں
خوشی کی لہر آ گئی چمن کے قلبِ زار میں

ہے ضوفگن یہ عکسِ گل حسین آبشار میں — نہا رہی ہے یا پری اُتر کے جوئبار میں
کچھ اتنا کیف بڑھ گیا تھا میرے قلبِ زار میں — نگاہ جم کے رہ گئی فضائے کوہسار میں
اُتر رہی تھیں دیویاں بہار کی بہار میں

محمود علی خاں

غزل

نہ کر یوں حشر برپا بلبلِ ناشاد رہنے دے — قفس میں کون سنتا ہے تری فریاد رہنے دے
نہ چھیڑ افسانہ اے صیاد تو برق و نشیمن کا — خیالِ آشیاں سے اب مجھے آزاد رہنے دے
مری بربادیوں پر اے فلک اُن کو مسرت ہے — تو میں برباد ہی اچھا مجھے برباد رہنے دے
مرے ناشاد رہنے میں اگر وہ شاد ہوتے ہیں — تو اُن کو شاد رہنے دے مجھے ناشاد رہنے دے

ترے رحم و کرم پر ہے ترے نواب کی قسمت   اُسے برباد کر دے یا اُسے آباد رہنے دے

نواب خورشید علی خاں

غزل

گرانا بجلیاں تجھکو رُخِ جانانہ آتا ہے   مسیحائی کہاں کی جب نظر ویرانہ آتا ہے

وہ صورِ بے صدا پنہاں ہے تیرے اِک تبسم میں   کہ اسرافیلِ محشر میں نظر دیوانہ آتا ہے

ضیائے حُسن ہے لاکھوں میں شمعِ حُسن واحد ہے   ضیا کو چھوڑتا ہے شمع پر پروانہ آتا ہے

جو پھیلاؤ میں اُلجھا رازِ ہستی کب ملا اس کو   ق   تلاشِ حق میں مرکز پر دلِ دیوانہ آتا ہے

جو مٹتے آپ ہیں اُن پر فدا ہوتا ہے ہر کوئی   تڑپ کر شمع سوزاں پر ہر اِک پروانہ آتا ہے

سکونِ دل اگر مل جاتا رہبر، تو جبیں میری   دکھا دیتی کہاں تک سجدۂ شکرانہ آتا ہے

ترے اعمال عقبےٰ میں پنہ دیں گے تجھے اے مہؔ
کسی کے کام کون اے ہمدمِ فرزانہ آتا ہے

وشوناتھ درماؔہ

غزل

تری یاد میں کچھ عجب بے خودی ہے   کہ مستی ہی مستی مری زندگی ہے

فراغت ہے اب فکرِ سود و زیاں سے   محبت کی دیوانگی مل گئی ہے

چمن ہے، شبِ ماہ ہے، میں ہوں، وہ ہیں   الٰہی! یہ کتنی سہانی گھڑی ہے

مرے روبرو ہے مرا ماہِ کامل   مرے دل میں چھٹکی ہوئی چاندنی ہے

قیامت کی شوخی، قیامت کی مستی،   اُن آنکھوں میں کیا جانے کیا شے بھری ہے

قیامت کی ایماں شکن صُورتیں ہیں،   الٰہی! یہ تیری ہی صُورت گری ہے

تمہاری جوانی سے کھینچی ہے مَیں نے   مرے شیشۂ شعر میں جو بھری ہے

اثرؔ اسکو پاتا ہوں میں بے خودی میں
مری بے خودی ہی مری آگہی ہے

اثرؔ صہبائی

غزل

ہماری دسترس سے دُور جس دلبر کی ہستی ہے
نہ جانے رُوح اُس کے دیکھنے کو کیوں ترستی ہے

یہ مانا کارگاہِ دہر رنج و غم کی بستی ہے
خیالِ ترکِ دُنیا بھی مگر ہمت کی پستی ہے

شباب آنے پہ فردوسِ نظر اُس بُت کی ہستی ہے
سراپا حُسن میں ڈوبا ہُوا، آنکھوں میں مستی ہے

مجھے ڈر ہے کہ حُسنِ کج ادا رُسوا نہ ہو جائے
وُہ سمجھے ہیں کہ اب جنسِ وفا دُنیا میں سستی ہے

ادا میں دلکشی ہے چال ہے کافر کی مستانہ
نگاہوں میں شرابِ حسن کی اِک گونہ مستی ہے

الٰہی رہ گئیں گھُٹ گھُٹ کے دل کی حسرتیں دل میں
مری جولانیوں کو تنگ کیوں میدانِ ہستی ہے

جوانی اور عزمِ اتقاء و زُہد ناممکن
ابھی تو قیس تیری آنکھ میں اُلفت کی مستی ہے

قیس شروانی

پہلگام (کشمیر)

حُسن کے جلوے ہیں تیری وادیوں میں پہلگام
عشق کی سطوت ہے تیری چوٹیوں میں پہلگام

یاد آ جاتی ہے کوئی زندگی بھُولی ہُوئی،
کیسی موسیقی ہے تیرے پانیوں میں پہلگام

بھاگ کر ہنگامۂ دُنیا سے رُوحِ عافیت
ہو گئی روپوش تیری گھاٹیوں میں پہلگام

گلشنِ فردوس کے نغمہ سرا رنگیں طیور
ہیں نوا پرداز تیری ڈالیوں میں پہلگام

برفِ زریں، جوئے سیمیں، قوسِ رنگیں، حورِ عیں،
لُطفِ جنت ہے تری رعنائیوں میں پہلگام

اس چمن میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں کس کو جا بجا
چھُپ رہا ہے کون تیری پتّیوں میں پہلگام

خفتگانِ خاک کو دیتی ہے پیغامِ حیات
نعرہ زن ہے برق تیری وادیوں میں پہلگام

رہ گیا تھا اِک بشیرِ خستہ دل آشفتہ جاں
وُہ بھی شامل ہے ترے شیدائیوں میں پہلگام

بشیر احمد

دِلّی والے اور گرمیاں

"بادشاہ! شاہجہان آباد اُجڑ گیا!!"

("نوبتِ پنج روزہ" میں علامہ راشد الخیری کا بہادر شاہ ظفرؒ سے خطاب)

ارے بیٹے کیا ذکر نکالا ہے، تم جن جاتے ہو یاں نشتر چلتے ہیں۔ کجا شاہجہان آباد کجا دہلی، دہلی بھی نہیں ڈیلہی! کہاں گھوڑا
ان گدھا۔ دونوں کے موازنے کا کوئی تک بھی ہوا دلّی اب دِلّی نہیں رہی اور رہتی بھی کیسے؛ دِلّی میں اب دِلّی والے کہاں ہیں!
ن پر کبھی مرہٹوں کی آفت آئی کبھی نادر شاہی قتل کی مصیبت۔ کچھ غدر کے ہاتھوں تباہ ہوئے کچھ وبا اور کال سے تاراج بہت
ے پھانسیوں پر چڑھا دیئے گئے، بہت سے گھر بار چھوڑ جلاوطن ہوئے۔ کچھ لوگوں کو باغیوں نے لوٹا یا گوروں نے مارا۔
اصل دِلّی والوں کا سُکھ چین تو اُسی وقت رخصت ہوا جب اپنی بادشاہت کو گھن لگا۔ ان آفات نے رہے سہے کس بل
ی نکال دیئے۔ جو دو چار گھرانے بچ رہے تھے اُن کے لئے پنپنا دشوار ہوا، پھر دِلّی دِلّی والوں سے خالی کیوں نہ ہوتی؛ جب
ین ہی نہ رہے تو مکانوں کی زینت کس سے ہو؛ بڑی بڑی عمارتیں کھنڈر اور اچھے اچھے مکان ڈھنڈار ہو گئے۔ امی جی
وجانے کے بعد دِلی پھر سے بسنی شروع ہوئی اور اُجڑا اُجڑ کر بسنا تو اُس کی قسمت میں لکھا ہے۔ کے دفعہ بس بس کر
جڑ چکی ہے؛ پھر اُس کے بسنے کا کیا اعتبار؛ یوں کہنے کو کہہ لو کہ یہاں سب کچھ ہے، پوں پوں کرتی موٹریں، گھڑ گھڑ کرتی
ٹریمیں، ٹن ٹن کرتی سیکلیں، گالیاں بکتے تانگے والے، بڑی بڑی عالیشان عمارتیں (جن کی تعمیر ختم ہوتے ہی مرمت شروع
ہو جاتی ہے)، مرد عورت کا امتیاز اٹھانے والا فیشن، بجلی کے بلب جن سے کم از کم بینائی تو زائل ہو جائے، نلوں کا پانی جن میں
خدا جانے کب سے زنگ چڑھ رہا ہے، گِٹ پٹ گِٹ پٹ کرنے والے بابو، سینما جن میں سُنا ہے تصویریں بولتی اور ناچتی ہیں
بڑھتی ہوئی آبادیاں، اور خدا جانے کیا کیا۔ پر میاں چاہے کچھ ہو جائے دِلّی تو اب پہلی سی دِلّی بنتی نہیں۔ اُس وقت یہاں
دِلّی والے رہتے تھے، لال حویلی (قلعۂ معلیٰ) میں چہل پہل تھی، رعیت اپنے بادشاہ اور بادشاہ اپنی رعیت پر جان دیتا تھا۔ قلعۂ معلیٰ
کی زبان تصنع سے خالی، کوثر میں دُھلی، شیرینی میں ڈوبی ہر چہار طرف نوا سنجی کرتی تھی۔ خلوص اور محبت کا دَور دورہ تھا۔ پریشانیوں
اور افسردگیوں کا نام نہ تھا، مفلسی اور بے روزگاری کسی پر چھائی نہ تھی؛ ارے میاں یوں کہو شاہی کو زوال نہ تھا۔ ہائے کیا تھا
اور کیا ہو گیا۔ ہنگامۂ ۵۷ء کے بعد سے تو بس رونا ہی رونا ہے جس کے پاس جی چاہے چلے جاؤ، جہاں طبیعت آئے پوچھ لو کہ

کیوں بھئی خوش تو ہو، کوئی تکلیف تو نہیں ؟ اور وہ تم کو اپنے دُکھوں اور پریشانیوں کی ایک طویل فہرست سنائے گا۔ آج بھلا بے اطمینانی کس کو نصیب نہیں ؛ کیا یہی برکتیں ہیں دِلّی ،نہیں نہیں تمہاری ڈیلہی میں بسنے کی ؛

دِلّی بسے تک (یعنی غدر سے پہلے) سب کو اطمینان اور آسودگی میسر تھی۔ کسی کو کوئی روگ نہیں تھا۔ غریب سے غریب بھی پیٹ بھرنے کو نہایت آسانی سے کما لیتا بلکہ کچھ جمع ہی کر رکھتا تھا ورنہ جو ذرا کھاتے پیتے تھے اُن کا تو کہنا ہی کیا عیش وعشرت کے جلسے تھے ،رقص و سرود کی محفلیں تھیں ، ذکر حق کی مجلسیں تھیں ، دوست احباب کا مجمع تھا مگر اب اُن میں سے کچھ بھی نہ رہا۔ وہ محفلیں افسردہ ، وہ مجلسیں خاموش ، وہ جلسے اُجاڑ اور وہ مجمع منتشر ہیں۔ دِلّی والوں کو پردیسیوں کی ، جن سے دِلّی اب بھری پڑی ہے ،نظر لگی۔ اُن کے دل چراغ مفلس کی طرح بجھ گئے اور اُن کی ہنسی خوشی کا زمانہ ختم ہو گیا۔

دِلّی والے ہمیشہ سے میلوں ٹھیلوں کے رسیا، کھیل تماشوں کے عاشق اور رنگ رلیوں کے شوقین تھے۔ برسات کا موسم ان چیزوں کی جان ہے ، ادھر بادل گھر کر آئے اُدھر مرد اور عورتیں ، بچّے اور بوڑھے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے لیکن گرمیوں میں وُہ بہار نہیں۔ آج کا رنگ نہیں دیکھتے ؛ زمین انگارے اُگلتی ہے ، آسمان شرارے بکھیرتا ہے ، ہوا شعلے دہکاتی ہے اور ہر بشر کا پتلا حال ہے۔ پہلے بھی گرمیاں کوئی جنّت سے نہیں آتی تھیں۔ آج کل سے کوئی اکیس ہی ہوتی تھیں ، اُنیس نہیں۔ تو کیا اُس وقت دِلّی والے ہماری طرح بے کل رہتے تھے ؛ توبہ کرو بھائی ، جب ہی تو کہتا ہوں نئے زمانے کے نئے نئے چونچلے ہیں۔ موت بھی آتی ہے تو نئی نئی طرح۔ یہ بال بگلا ہو گئے مگر ہم نے ساری عمر تمہارا یہ لنگڑا بخار ، لُو، بخار ، گردن توڑ بخار ، اپریشن کمپریشن کبھی نہ سُنا۔ ہاں بھائی جب ساری دُنیا فیشن کرے تو بچاری بیماری کیوں نہ نئی نئی ادائیں دکھائے۔ خیر ، میں یہ کہہ رہا تھا کہ دِلّی والے گرمیوں کے جُھلسا دینے والے دِن رات بھی بڑے مزے سے گزارتے تھے۔ تمہاری طرح نہ "پہاڑ جا رہا ہوں" "پہاڑ جا رہا ہوں" کہہ کر اتراتے تھے نہ ہائے گرمی ! ہائے گرمی ! کہہ کر گھبراتے تھے۔ یہی زمین تھی ، یہی آسمان ، یہی گرمی تھی ، یہی جُھلسن ، پر معلوم بھی نہ ہوتا تھا کہ گرمیاں کب آئیں اور کب گئیں۔ اب تم جو پُوچھتے ہو ، نہ جانے طنزاً یا واقعی کہ اگلے وقتوں میں دِلّی والے گرمیاں کس طرح گزارتے تھے تو پیارے اُن دنوں کی یاد ہی سے دل قابُو میں نہیں رہتا اور شاید یہ بے وقت کی راگنی بھی ہو۔ اِن باتوں کے دیکھنے اور سننے والے تو تہ خاک برٹ ہی چکے اب ان کے سمجھنے اور پسند کرنے والے بھی نہ ہوں گے بہر حال تمہارا اصرار ہے تو سنو :۔

آخر شب ہے۔ آغوشِ مشرق میں ابھی کچھ اندھیرا کچھ اُجالا ، کچھ سیاہی کچھ سپیدی نمایاں ہے۔ خدا کے گھروں میں حضرت بلالؓ کی سی جگر کے پار ہو جانے والی صدائیں گُونج رہی ہیں ۔ نسیم صبح گاہی خوب اٹھکیلیاں کر رہی ہے۔ در اصل یہی وقت سونے کا ہے۔ خواب سحر کی سی لذت رات کے اَور حصّوں میں کہاں ؛ مگر نہیں۔ اس وقت برکتیں جو نازل ہوتی ہیں ! پھر یہ سماں کیوں

لٹوایا جائے۔ لوگ باگ آنکھیں ملتے اُٹھ بیٹھے۔ ہماری طرح گن دوپہری تھوڑی تھے! گھروں میں اکھاڑے بنے ہوئے ہیں کہ لوگ دنگل اور ورزش کے شوقین تھے۔ جو باہر جانا نہیں چاہتے وہ یہیں اُترتے ہیں۔ کچھ نہیں تو ہزار پانسو ڈنٹر، بیٹھکیاں، مگدر وغیرہ نکال لئے، پسینے پسینے ہو گئے، اُٹھے، نہائے دھوئے، کپڑے بدلے اور بارگاہِ خداوندی میں سربسجود ہوئے۔ ریاضت و عبادت سے فارغ ہو کر سیر بھر پکا ملائی (بالائی) دار دودھ پیا اور لگے ہاتھوں دو گھی میں چک چکاتے پراٹھے بھی دڑک لئے۔ اُن کا اُصول تھا "جاپڑا چلیے ستر بلا ٹلے"۔ اب سارے گھر نے طرح طرح کے خوشبودار شربت نوش کئے، کوئی بیچارہ غریب ہُوا یا شوقین تو اس نے ستو گھول لئے۔ اس سے فراغت پاکر گھر والیاں پکانے ریندھنے، لڑکیاں بالیاں سینے پرونے اور مرد پڑھنے لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ مردوں کا زیادہ تر وقت درس و تدریس میں گزرتا تھا۔ کوئی بحرِ علوم کی غواصی کر رہا ہے، کوئی علم کے دریا بہا رہا ہے اور کوئی علم کے جواہرات رول رول کر اپنا دامن بھر رہا ہے۔ لڑکیاں ہنڈکلیا اور سلائی کے سبق لے رہی ہیں تو لڑکے خوش خطی کی مشق کر رہے ہیں۔ کبھی اُن لوگوں کے خط اُٹھا کر دیکھو، موتی جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک ہم لکھتے ہیں جیسے بچھا اپنے دیدے مٹکا رہا ہو۔ دس گیارہ بجے خاصی حدّت ہو گئی اس لئے گرمی سے بچنے کی تیاریاں شروع ہوئیں مرزا نوشہ نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

روزہ مرا ایمان ہے غالبؔ لیکن
خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

مصرعِ ثانی اگلے وقتوں کے گرما کی تفسیر ہے۔ دھوپ میں تیزی شروع ہوئی اور سب اندر کمروں اور دالانوں، کوٹھڑیوں اور کوٹھیوں میں گھس گئے۔ باہر پٹلپٹی کے پردے چھوڑ دیئے گئے۔ اُن میں رُوئی بھری ہوئی تھی۔ ہاں ہاں روئی، چونکتے کیوں ہو؛ یہ اس لئے کہ روئی میں تمام حِدّت جذب ہو جائے۔ اندر اندھیرا سا ہو جاتا تھا۔ اب ایک چرخہ نما پنکھا جسے "خس کا پنکھا" کہتے تھے چلا۔ اب اس کے بنانے والے نہ رہے! یہ ایک بکس سا ہوتا تھا جس میں ایک موکھا بنایا جاتا تھا۔ اس موکھے کو خس سے ڈھکتے تھے، اندر ایک گھرنی ہوتی تھی۔ خس کو خوب تر کر کے گھرنی کو چلایا جاتا تھا تو موکھے میں سے نہایت ٹھنڈی اور مفرح ہوا نکل کر سارے کمرے میں پھیل جاتی تھی۔ اس سے ہمارے بجلی کے فین، بھئی تھوڑی مقابلہ کر سکتے ہیں کہ سو کر اُٹھو تو سر میں ہی خشکی کر دی اور نزلہ ہُوا سو الگ۔ اماں! ہٹو بھی کس فضول چیز کا نام لیا، آیا کہیں سے ایئر کنڈیشنڈ فین! خس کے پنکھے کے علاوہ فرشی پنکھے لگے، کہیں چھت کا کھینچنے والا، کہیں تار کا دستی۔ جو صاحب مقدور ہوئے انہوں نے کھڑکیوں اور دروازوں میں خس اور جوانسے کی ٹٹیاں کھڑی کروالیں اور اُن کو گھڑی گھڑی چھڑکوانے کا انتظام کیا۔ جو بڑے ٹھاٹ باٹ کے آدمی تھے ان کے ہاں تہ خانے تھے۔ انہوں نے ان کو ہر طرح دُھوپ اور گرمی سے محفوظ کر کے ٹھنڈا کروایا۔ یہ تھے صاحب خس خانے! اب برفاب کو بیان کرتا ہوں۔ اُن وقتوں میں برف ورف نہیں تھی کہ حلق تر ہُوا نہیں اور آگ لگی۔ ارے میاں! ان نئی نئی چیزوں کا بس اوپری

ہی ٹیپ ٹاپ ہے ورنہ دل کی یہ چوٹی ہیں ۔ نمک اور شورے کا تیزاب برف میں ملا ہُوا پایا جائے گا تو وُہ تو اندر سے قتل ہی کریگا۔
پہلے وقتوں میں اوّل تو جگہ جگہ کنوئیں تھے جن کا پانی ٹھنڈا اور میٹھا ہوتا تھا اور اگر کسی وقت مرضی کے موافق نہ بھی ہُوا تو جن طریقوں سے اسے ٹھنڈا کیا جاتا تھا اُن میں قدرت سے مدد لی جاتی تھی ۔ گھڑونچیوں پر بالو کی ریت بچھی ہے یا تسلوں میں شورے کا پانی بھرا ہے ان میں تانبے کے کاغذی کٹورے تیر رہے ہیں ۔ بہنگیوں اور چھینکوں میں جست کی صُراحیاں اور سوندھی مٹی کی منکینیاں لٹک رہی ہیں ۔ ایک طرف بھبکے رکھے ہیں جن میں سے کسی پر پنڈول (زرد رنگ) اور کسی پر بھوڈل (سفیدی سی) ملی ہوئی ہے کہ ذرا ہوا لگی اور پانی ٹھنڈا ایسا کہ نڈھال طبیعت بھی بحال ہو جائے ۔ ایک اَور طریقہ تھا ۔ کڑاکے کی سردیوں میں گنّے کے پتّوں پر سکوروں میں پانی بھر کر رکھ دیا جاتا تھا جو سردی کی وجہ سے جم جاتا تھا ۔ اب اس جمے ہوئے پانی کے تھلے کر کے گڑھوں میں دبا دیتے تھے ۔ پہاڑوں پر جو برف گرتی ہے اس کے ٹکڑوں کو بھی زمین میں دبا دیا جاتا تھا ۔ گرمیوں میں یہ تھلے اور ٹکڑے کام آتے تھے مگر ان تک پہنچ صرف نوابوں اور بڑے بڑے اُمراء کی تھی ۔ پھر اس برف کو تمہاری طرح غضب سے پانی میں نہیں ڈال دیا جاتا تھا بلکہ پانی کو اس سے لگا کر ٹھنڈا کرتے تھے ۔ یہ تھا میاں دِلّی والوں کا برفاب اور وہ تھے یہاں کے خس خانے ۔ غالبؔ بچارے کے شعر مذکور میں مفلسی کے اظہار سے زیادہ ان ہی دو بیش بہا چیزوں کے ناپید ہو جانے کا ملال ہے ۔

ایک دو کے درمیان دوپہر کا کھانا کھایا جاتا تھا ۔ جو صاحب استطاعت ہوتے وُہ دیوان خانوں میں کھاتے تھے جہاں چار آتے چار جاتے رہتے تھے ۔ پُرانے زمانے میں دیوان خانوں کا رواج تھا ۔ یہ بیٹھک اس کے بعد کی اور کم درجے کی چیز ہے اور اب تو بھائی نہ دیوان خانے ہیں نہ بیٹھکیں بلکہ کیا کہتے ہو اُنہیں ؟ وہی فرنگیوں کی ریس ، ہاں ڈرائین روم ! کوئی قریبی رشتے دار میاں بیوی ، مہمان آ گئے تب تو سب نے ساتھ بیٹھ کر کھا لیا ورنہ عام طور پر مردوں کا الگ اور عورتوں کا الگ دسترخوان بچھتا تھا ۔ یہ نہ کہنا کہ یہ دقیانوسی رسم بہت بُری ہے ۔ اصل میں اس میں بھی ایک مصلحت تھی ۔ پہلے زمانے کی عورتیں ! کیا کہنے ، شرم و حیا کی پوٹ تھیں ، کیا مجال جو غیر تو غیر باپ بھائی کے سامنے بھی آنچل تو سرک جائے ۔ بھلا ایسے لحاظ کی عورتیں مردوں کے سامنے کیسے آزادی سے پیٹ بھر سکتی تھیں ؛ کھانے سے فارغ ہو ہوا سہ پہر تک خس خانے میں اینڈتے رہے ۔ چار کے لگ بھگ باہر نکلے صحن میں چھڑکاؤ ہُوا ، پلنگ بچھے ، بچھونے کئے گئے ۔ چار چار چوکیاں مِلا کر چوکے بنائے ، اُن پر سفید سفید چاندنیاں اس طرح کسی گئیں کہ سلوٹ کا نام نہیں ۔ پشت پر کمر لگانے کے لئے گاؤ تکیے رکھ دیئے ۔ ایک طرف گھڑونچی پر گیرو بھرے ہوئے مٹکے اور لال تندئیں لپٹی ہوئی صراحیاں رکھی ہیں ۔ اُن پر قلعی دار کاغذی کٹورے جھلمل جھلمل کر رہے ہیں ۔ بر تر میں جھجر وغیرہ کے پیالے اور آبخورے جن میں افشاں چھڑکی ہوئی ہے ، رکھے ہیں ۔ ان کی خاصیت یہ ہے کہ ہوا لگتے ہی پانی ٹھنڈا ہوتا ہے ۔ اب ملنے جلنے والیاں آنی شروع ہوئیں ڈولی اُتروائی گئی ، صاحب خانہ نے پیسے بھجوائے ۔ مہمان بی بی آ کر گھر والی سے گلے ملیں ۔ بہوؤں بیٹیوں نے آداب سلام کیا ۔

آنے والی نے دُعائیں دیں "بیٹی جُگ جُگ جیئے" "اللہ تیرا نصیب اچھا کرے" "بوڑھ سہاگن ہو" "دودھوں نہائے پوتوں پھلے" وغیرہ۔ دستور کے مطابق آنے والی نے اپنے ساتھ جو مٹھائی لائی ہے وہ میزبان کے نذر کی تاکہ بچوں میں تقسیم ہو جائے۔ جو بیویاں مٹھائی نہیں لاسکتی تھیں وہ بچاری تکّس (جہاں تک مجھے علم ہے اب دلّی میں کوئی تکّس بنانا نہیں جانتا۔ اب تو پان بس یُونہی کاغذ میں لپیٹ کر دے دیتے ہیں، پہلے کاغذ کا باقاعدہ لفافہ سا بنایا جاتا تھا اور پنواڑی اس میں پان رکھ کر دیتے تھے) میں تھوڑے سے پان[1] ہی لیتی آئی۔

اب زنانے میں اور مردانے میں، آئے گئے نے اور گھر والوں نے مل کر ہلکا سا ناشتہ کیا جس میں صرف موسم کے پھل اور فصل کی ترکاریاں ہوتی تھیں۔ سہ پہر اور فجر کے ناشتے میں خصوصاً نہار مُنہ تربوز کا زور ہوتا تھا۔ ٹانکی لگا کے دیکھی، سُرخ ہُوا تو خرید لیا اور بچوں بیچ کاٹ کر دو ٹکڑے کئے۔ لون چھڑکا اور ذرا کی ذرا کھلی ہوا میں رکھ دیا کہ ٹھنڈا ہو جائے۔ پھر بڑی بڑی قابوں میں سُرخ سرخ قتلے کر لئے۔ شربت بنا سو الگ۔ خربوزے عموماً دوپہر اور شام کے کھانے کے بعد کھاتے تھے۔ یادش بخیر! خربوزے کا نام آتے ہی قلعۂ معلّے کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ منشی پیارے لال قلعے کے داروغہ تھے۔ دروازے پر حاضری دیتے۔ بیگمات کو اطلاع ہوتی۔ کسی کو کبھی کبھار کوئی کام کاج ہُوا تو اُنہوں نے تعمیل ارشاد کر دی۔ قضاعنداللہ ایک دن منشی جی بیمار پڑ گئے تو انہوں نے اپنے داماد سے کہا "بیٹا! مجھ میں آج سکت نہیں۔ تم ذرا لال حویلی ہو آؤ، کوئی کام ہو تو اُسے سلیقے سے کر دینا۔" داماد صاحب قلعے پہنچے، دربان نے اندر خبر کی۔ کوئی قلماقنی باہر آئی، پوچھا کیا ہے۔ داماد صاحب نے مدعا عرض کیا۔ قلماقنی اُلٹے پیروں واپس ہوئی اور جا کر عرض پرداز ہوئی "علیا حضرت! آپ کا منشی ماندہ ہو گیا اور بخار میں لوٹھ پڑا ہے۔ اگر کہیں مر گیا تو ایسا اچھا آدمی کہاں سے آئے گا۔ اس بچارے نے اپنے داماد کو بھیجا ہے کہ کوئی کام ہو تو فرما دیا جائے۔ مجھے تو غریب بس اللہ کا جی معلوم ہوتا ہے۔" بیگم صاحبہ نے افسوس ظاہر فرمایا "بیشک منشی بہت ہی اچھا آدمی ہے، اگر خدانخواستہ مر گیا تو بہت بُرا ہو گا — اچھا دیکھو، یہ بچارہ آیا ہے تو اسے دس روپے دے دو اور کہو ہمارے لئے تھوڑے سے خربوزے لے آئے۔" اس زمانے میں خربوزے ٹکے سیر بکا کرتے تھے، داماد صاحب نے منڈی سے جھٹ دس روپے کے خربوزے خرید ایک بہت بڑے چھکڑے میں رکھوائے اور خوش خوش قلعے چلے کہ مجھے بھی خدمت کے لائق سمجھا۔ اندر خبر ہوئی، اُردبیگنی نے جھانک کر دیکھا تو وہیں کی وہیں رہ گئی۔ قدرے توقّف کے بعد دوڑی ہوئی اپنی بیگم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا "علیا حضرت! غضب ہو گیا، یہ شخص تو واقعی اللہ کا جی ہے چھکڑا بھر خربوزے لایا ہے۔ ہائے اگر ہمارا منشی مر گیا تو کیا ہو گا!" بیگم صاحبہ نے حیرت سے سُنا اور قدرے خفگی سے مُنہ پھیر لیا۔ اُردبیگنی باہر دربان کے پاس آئی اور کہا "اس نگوڑے مردوے سے کہہ دو، خربوزے اپنے کھانے کے لئے منگوائے تھے، بیلوں کے لئے نہیں۔"

[1] آنے جانے والیاں تو اب شاید پان نہیں لاتیں لیکن یہ رسم ابھی دِلّی میں باقی ہے کہ متوفّی کو دفن کر کے واپسی پر پان لے کر گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ صلاح الدین (تجدید)

داماد صاحب نے جو یہ سُنا تو دھم ہو گئے کہ نہ جانے اب کیا ہو۔ بھاگم بھاگ خسر کے پاس گئے اور سارا ماجرا کہہ سُنایا۔ منشی جی نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور جس طرح ہو سکا چھکڑا لے منڈی پہنچے۔ خربوزے والے سے سلام دُعا کے بعد کہا "شیخ صاحب! یہ خربوزے حاضر ہیں۔ دو روپے نفع میں واپس لے لو اور میں آٹھ میں سے دو کے تم سے اور لُوں گا۔" شیخ صاحب رضی ہو گئے۔ منشی جی نے اچھے اچھے چھوٹے چھوٹے دس پندرہ دانے "شرطی میٹھے" چُن لئے اور چھ روپے ڈب میں رکھ، گھر کو آئے۔ یہاں آکر اُنہیں پوچھا پنچھایا، پھر اُن پر کیوڑے کا ایک پچارا دے کر چاندی کے ورق لگائے اور سینی میں آراستہ کر، خوان پوش ڈھاک قلعے لے گئے۔ قلماقنی منشی جی کو دیکھ مسکرا دی اور خوشی خوشی خربوزے اندر لے گئی۔ اللہ رے خیالِ نفاست و نزاکت!

شام ہوتے مرد سیر و تفریح کو نکلے۔ ادھر عورتیں جھپا جھپ نہا دھو سنگھار میں مصروف ہوئیں کہ مردوں نے دن بھر انہیں گھر بار اور بال بچوں کی لارا لیری میں بے حال دیکھا ہے تو واپسی پر سچ مچ کی بیگم بھی بنا دیکھیں۔ چنانچہ اُبٹنے اور کھلی سے مُنہ ہاتھ دھویا۔ آنولوں اور ریٹھوں سے بال دھوئے، سر گوندھا، پٹیاں جمائیں اور ببریاں نکالیں۔ آنکھوں میں دنبالہ دار سُرمہ لگایا، دانتوں میں مسّی ملی۔ پان کھا کر لب لال کئے۔ باریک رینگ کے ہلکے پیازی، دودھیا کاسنی، دھانی، شربتی، فیروزی، آبی یا بادامی رنگے ہوئے دوپٹے اوڑھے۔ بابل لیٹ اور چکن یا ستار لیٹ اور کھپوار کی محرم کرتیاں اور کلی دار ڈھیلے اور کسی کسی نے تنگ پجامے پہنے۔ سیاٹ یا کلابتون کی جُوتیاں زیبِ پا کیں اور ہاتھوں میں پھنسی ہوئی رنگ برنگی چوڑیاں پہنیں۔ اتنے میں برت کی (لگی بندھی) مالن پھول لے کر آ گئی۔ اس کے چھبیے میں گجرے، کنٹھے، ہار، بالیاں، پہنچیاں سب ہی چیزیں ہیں۔ آج موتیا کی بہار ہے، کل چنبیلی کی، پرسوں چمپا کا زور ہے اترسوں یاسمن کا۔ کبھی موگرے کا رنگ ہے کبھی مولسری کا۔ جس نے جو چاہا خرید لیا۔ اب یہ کھانے پکانے والیاں گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر شوہروں کی بیویاں بن گئی ہیں۔ ان کے جسم مجلّا ہیں اور معطر!

بازاروں میں بڑی رونق ہے۔ دِلّی والے سیل (سیر) میں مصروف ہیں۔ کیسے کیسے بے فکرے، بانکے اور سجیلے چھیلیں کرتے پھر رہے ہیں۔ ذرا اُن کے لباس اور وضع قطع کو دیکھنا! جوان آڑی اور سن رسیدہ سیدھی دو پلڑی ٹوپیاں پہنے ہیں۔ کسی کے سر پر پچ گوشی ہے جس پر چاند صراحیاں بنی ہیں، کوئی سوزنی کی گول ٹوپی اوڑھے ہے۔ گُدّی پر پٹھے اور مُنہ میں گلوری دبی ہے چہروں پر نیش عقرب مونچھیں اور چڑھی ہوئی ڈاڑھیاں ہیں۔ بوڑھوں کے بھی یہ دم خم کہ دیکھا کیجئے۔ کسرتی بدن اور یہ ڈنٹر اُن پر پھنسا ہُوا رفل یا باریک ڈوریئے کا چُست انگرکھا جس پر چلچل (ابرق) چھڑکی ہوئی ہے۔ اِکّا دُکّا اچکن بھی دکھائی دے جاتی ہے۔ اس کے نیچے تن زیب، نینوں، ململ یا کچی چکن کا کرتہ جس پر بیوی یا بیٹی کے ہاتھ کا کیکری کٹاؤ کا کام ہُوا ہے کُرتے کے نیچے پھوار، گلشن یا کسی مہین کپڑے کی نیم آستین سی نبٹی ہے، جیسے تم بنیان پہنا کرتے ہو۔ بوڑھے اِک برا اور جوان آڑے چوڑی دار پجامے پہنے ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں گول شرعی موری کا پجامہ بھی نظر آجاتا ہے۔ پیروں میں ساٹ

ڈیڑھ حاشیہ، انگوری بیل یا زری کے استر اور سبک پنجے کی جوتیاں ہیں۔ اس ٹھاٹ اور بانکپن کے علاوہ تعطر کا یہ عالم کہ پاس سے گزر و تو دماغ مہک جائے۔ یہ لوگ فی الواقع زندہ رہنا جانتے تھے اور زندہ رہنے کا حق رکھتے تھے۔ خلوص وہمدردی اُن کا شیوہ اور خوش مذاقی، بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی ان کی عادت تھی لہٰذا حزن والم پاس آ کے نہ پھٹکتا تھا۔ راستے میں خوش فعلیاں ہو رہی ہیں۔ ہنسی مذاق کیا جا رہا ہے۔ یار لوگ کھلی بازی کر رہے ہیں۔

سیر و تفریح کا مرکز جامع مسجد ہے جہاں بازاروں کی چہل پہل، دکانوں کی سجاوٹ، امیروں کی آن بان اور خوش باشوں کی دل لگیاں دیکھنے کے لائق ہیں۔ سقے مشکیزوں میں ٹھنڈا پانی بھرے پیتل کے کٹورے بجا رہے ہیں اور ساقی تر اور تازہ بھرے ہوئے حقے لئے کھڑے ہیں۔ علاوہ ازیں طرح طرح کی چیزیں اور قسم قسم کا سامان فروخت کے لئے موجود ہے۔ ایک جانب فصل کی ترکاریاں بک رہی ہیں لیکن دُکانداروں کی آوازیں آج کی سی مکروہ نہیں بلکہ ایک تو لحن رسیلا پھر صدائیں ایسی کہ اب تو پہیلیاں معلوم ہوں۔ ذرا سننا سودے والوں کی کیا پربین آوازیں آ رہی ہیں:۔

قطب صاحب کے چھینٹے۔ زمیوے کھرنیاں لو	= کھرنیاں
سالونے سلونے شربت کو۔ نانی کے نواسے خون کے پیاسے شربت کو	= فالسے
ریشم کے جال میں ہلایا، نکتیوں بنا جلیبا کاٹ کی لکڑی کا قدرتی بنا جلیبا	= جلیبا
جھرنے کا بتاشہ گولر۔ ٹھنڈا اور میٹھا	= گولر
شاہ مرداں کی لاڑیاں۔ ٹھنڈی اور میٹھی سولہ کوڑی، لو سیریاں لو	= گاجریں
کرانے کا لڈو	= آم
شیدی کنور کے باغ کا بیدانہ بنا	= کھجور

اب ان آوازوں کو سُنے تیس تیس برس سے اُوپر ہو گئے۔ وہ صدائیں مفقود، وہ لہجے معدوم۔ گاہک بھی ایسے قدردان کہ جو مانگ لیا وہ دے دیا۔ کوئی جھکا باول نہیں کرتا اور دُکاندار بھی دھاندلی بازی جائز نہیں سمجھتے۔ سودا لے لوا آگے بڑھے اور بل مارتے ہوئے حوض قاضی فتحپوری سے چاندنی چوک جا پہنچے۔ جہاں گھڑ گھڑ اور بھڑ بھڑ کی بجائے پُرسکون اور صاف و شفاف نہر بہتی اور دونوں کناروں پر سر سبز و شاداب درخت لہلہاتے تھے۔ جو ذرا کم کن زکم کس بل کے ہوئے وہ پاس ہی سے لوٹ آئے۔ امراء گھوڑا گاڑی، بگھی، لینڈو، وکٹوریا، وگینٹ اور تام جھام میں سیر کرتے تھے۔ دو گھڑی سیر سپاٹے میں گزار کر گھر واپسی ہوئی۔

رات کا سماں نرالا ہے، کہیں چراغ روشن ہیں، کہیں شمعیں جل رہی ہیں، کسی گھر میں قندیلیں جگمگ جگمگ کر رہی ہیں، کسی کے ہاں فانوس اور جھاڑ کا لطف ہے۔ کہیں گانے بجانے اور ناچ رنگ کے جلسے ہیں، کہیں کھیل تماشے کے پے ہیں۔ کوئی چھپیی، شطرنج، گنجفہ، گنجفہ، تاش اور چوسر میں محو ہے تو کوئی ستار، طبلہ، بین، جلترنگ اور بانسری میں مست ہے۔ رات کا کھانا بقدرِ امارت دیر میں کھایا جاتا تھا۔ اماں! رات گئے تک گہما گہمی رہتی تھی۔ پچھلے پہر سونے کے لئے لیٹے اور علی الصباح پھر تازہ دم اٹھ بیٹھے۔

تم دل میں سوچتے ہو گے کہ یہ لوگ آخر کماتے کب تھے ؛ تو میاں بات یہ ہے کہ وہ وقت آج کے سے منحوس تو تھے نہیں کہ نفسی نفسی کا عالم ہے، بے روزگاری کا رونا ہے، افسروں کی جھڑکیاں ہیں، ہندو مسلمانوں کی کشیدگیاں ہیں اور زر، زمین اور زن فساد کی جڑ ہیں۔ نا بھائی نا، یہ باتیں جب کاہیکو تھیں۔ مسلمان تو غدر میں لٹے ہیں ورنہ ان کے پاس تو آٹھ آٹھ نو نو سال کے اندوختے تھے۔ جڑیں بندھی تھیں۔ آبائی مکانوں میں رہتے بستے تھے۔ نہ اوائی تھی نہ توائی بلکہ دن عید تھا اور رات شب برات۔ کہاں تک خرچ ہوتا خاصکر اس صورت میں کہ لہو ولعب کا زور نہ تھا۔ کھانا اور اس سے اتر کر پہننا یا سیر سپاٹا، یہی بڑے خرچ تھے۔ تم زیادہ سے زیادہ سیر سپاٹے کو فضول خرچی گن لو، مگر دولھا! یادِ رفتگاں اور زندگی کے دوسرے جھمیلوں کے ہوتے ہوئے انسان اگر دو گھڑی بھی ہنس بول کر نہ گزارے تو جینا اجیرن نہ ہو جائے ؟

میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ دِلّی والے گرمیوں سے دبنے والے نہیں تھے۔ ان دنوں میں بھی وہ ایسی ایسی رنگ رلیاں مناتے کہ ہم کو خیال تک نہیں ہو سکتا، چنانچہ گرمیوں کے میلوں کا ایک منظر فردوس آشیاں حضرت علامہ راشد الخیری نے یوں دکھایا ہے :

"دلّی بسے تک جبیٹھ بیساکھ کی ٹھیٹ گرمی میں جب چیل انڈا چھوڑتی ہے، آسمان سے آگ برستی اور زمین سے شعلے نکلتے ہیں، کوٹلے اور پیر غیب کی یہ کیفیت رہی کہ فجر ہی سے دکانداروں کے تمبو تن جاتے تھے۔ دو رویہ دُکانیں الگ الگ بازاروں میں منقسم ہوتی تھیں۔ ایک قطار حلوائیوں کی ہوتی تھی سا نواع واقسام مٹھائیاں، پوری کچوری، رایتہ، چٹنی، مربے، بیگن، آلو اور مرچیں تلی ہوئی، دہی کھٹا، نمکین لونجی، اچار، غرض ہمہ نعمت موجود تھی۔ حلوائیوں کے بعد کنجڑوں کی دُکانیں تھیں جواب سبزی فروش کہلاتے ہیں ان بیچاروں کے پاس سیب، سردے، انگور تو نہ تھے مگر جو ہوتا تھا وہ ایسا کہ پھر ویسا نہ ملا۔ گنڈیریاں صبح ہی سے گلاب میں بسائی جاتی تھیں، جلیبا، بیدانہ، شہتوت، کیوڑے میں ڈبوئے جاتے تھے۔ جھربیاں شہد سے زیادہ میٹھی، دریا پار کے خربوزے، ریتی کے شہد سی تربوز، پتلی پتلی لکڑیاں، ٹھنڈے کھیرے، قطب کی کھرنیاں، اندھیری باغ کے فالسے، رنجگی کے لوکاٹ گلاب میں بسے ہوئے، کیوڑہ چھڑکا ہوا ...... یہ وہ ترکاریاں تھیں جن کو دیکھ کر آنکھوں میں طراوت اور دل کو فرحت ہوتی تھی اور جو سچ مچ گلاب کیوڑے کے گھونٹ تھے۔ ان سے آگے نانبائیوں کی دُکانیں ہوتی تھیں اور میاں شبراتی کے روپے میدے کے پراٹھے اپنا جواب نہ رکھتے تھے اور آگے بڑھتے تو کبابی تھے۔ پیاز کا لچھا، ادرک کی قاشیں پڑی اور سرخ مرچیں چھڑکی

ہوئی۔ گولے، سیخ، گولیاں، تتیئ، ہر قسم کے موجود۔ المختصر جمعرات ایک خاصہ اچھا بازار تھا جہاں کھانے پینے کی ہر شئے موجود ہوتی تھی۔ درگاہ کے مغرب میں کھلونے بکتے تھے کہ بال بچوں والے خالی ہاتھ نہ جائیں۔ پانچ بجے سے میلہ شروع ہوتا تھا۔ حقّے والے پتلی پتلی نَلکیں، موتیا اور چنبیلی کے پھول لپیٹے ہوئے جا بجا لئے کھڑے ہیں۔ ایک طرف مشاعرہ ہے، دوسری طرف داستان ہے۔ کہیں پتنگ بازی ہے کہیں جھولے ہیں...... چھ بجے کے بعد دنگل شروع ہوا۔ کُشتیاں ہوئیں، کسرتیں ہوئیں۔ سامنے دریا میں تیراک ہیں، غرض ہر فن مولا اپنے اپنے کمال دکھا رہے ہیں۔ سقّے قدم قدم پر چکونیوں اور اندارے کی مشکیں لئے کھڑے ہیں۔ یہ وہ پانی تھا کہ برف کو شرمائے۔ کٹوروں کی جھنکار ایسی سُریلی اور دلکش کہ خواہ مخواہ پیاس لگے ــــــ" (از نوبتِ پنج روزہ یعنی وداعِ ظفر)

آہ! اب یہ سب صحبتیں ختم اور شہر آبادی کے تمام جمگھٹے فسانۂ شب ہو گئے۔ میاں! دِلّی عبارت تھی خلوص و ہمدردی، وضعداری اور ہنگاموں سے۔ قلعے کے چُہلیں، چاندنی چوک کی آرجار، جامع مسجد کی گہما گہمی، جمنا کے پُل کی سَیر۔ پھول والوں کا میلہ، سلطان جی کی سترھویں اور کچھ اور نہیں تو جمعرات کی فاتحہ، غرض بے شمار بہانے تھے جن کی بدولت زندگی میں چار چاند لگے تھے۔ اب نہ قلعہ کی بہار ہے، نہ بازاروں کی رونق، نہ شہر ہے نہ نہر۔ دِلّی کی عمارتیں اور مکان، کوچے اور بازار سب ڈھا کر برابر کر دیئے گئے۔ اوّل وقتوں میں لوگوں کی وضعداری کا یہ عالم کہ جو بات شروع کر دی اسے آخر دم تک نبھایا، ناموس کا اتنا پاس کہ جان جائے پر آن نہ جائے۔ بھرم اتنا کہ سب کچھ انگیز و مگر اپنی ضرورت کا کسی کو کانوں کان علم نہ ہونے دو۔ عالمگیر تباہی کے بعد اچھے اچھے گھرانوں کی بُڑھیاں بُڑھیاں جن کے دسترخوان سے بیسیوں کے پیٹ بھرتے تھے، پھٹّی جُوتی پہنے، جس کے کنتے نکلے ہوئے ہیں۔ لیری اور چکٹ برقع اوڑھے سپڑ سپڑ کرتی جارہی ہیں مگر کیا مجال جو امداد کے لئے کوئی حرف زبان پر تو آجائے۔ برخلاف ان لوگوں اور اُن وقتوں کے آج کی ڈیلہی پر نظر ڈالو۔ ہائے جہاں آباد کے اُس ازلی پرستار نے جو علاّمہ راشد الخیری کی ہیئت میں جلوہ گر ہوا کیسے پُرسوز اور حسرت بھرے لہجے میں وہ الفاظ کہے تھے جو زیبِ دہ عنوان ہیں۔

تمہارے نزدیک بے شک دہلی نے بڑی ترقّی کر لی ہو گی پر بنّے! ہم اُن وقتوں کے دلدادہ، اس ترقّی پر تّی کو خاک بھی نہیں سمجھتے ہے۔

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سُبو پھر ہم کو کیا؟
آسماں سے بادۂ گلفام اگر برسا کرے! (غالبؔ)

(اس مضمون کا ایک حصّہ دِلّی ریڈیو میں پڑھا گیا)

صادق الخیری

پیام

حسنِ ازل کو دیکھ لے، پردۂ جانِ پاک میں ‏ ‏ ‏ ایسی نظر کہاں ہے اب عرصۂ آب و خاک میں!
موسمِ گل گزر چکا، بند ہوا درِ نشاط ‏ ‏ ‏ بیٹھ گئی عروسِ مے چھپ کے حریمِ تاک میں
اُف رے فریبِ کائنات، عشق ہے صرفِ ننگ و نام ‏ ‏ ‏ اب وہ کرامتیں کہاں دامنِ چاک چاک میں
عقل کی نارسی نے کی دعوتِ آسماں قبول ‏ ‏ ‏ جلووں کا اِک ہجوم تھا گرچہ حجابِ خاک میں

ہائے وہ عہدِ گل کہ تھا بزم میں دورِ جام بھی
بادہ بھی تھا بقدرِ ظرف اور صلائے عام بھی

اُٹھ کہ نگارِ صبح نے رُخ سے اُلٹ دیا نقاب ‏ ‏ ‏ راہ بدل رہی ہے پھر گردشِ ماہ و آفتاب
مطربِ نغمۂ ازل، نشترِ تیز چاہیئے ‏ ‏ ‏ جاگ رہی ہے نبضِ ہوش، قلبِ جنوں ہے محوِ خواب
اِس ترے جہل پر نثار علم و یقین و عقل و ہوش ‏ ‏ ‏ روزِ الست جو ہوا تیری بنائے انتخاب
بھول سکی نہ کائنات معرکۂ نیاز و ناز ‏ ‏ ‏ حُسن کی بزمِ امتحاں اور وُہ عشق کا جواب
تُو نے دیا چمن کو رنگ، رنگ کہ نُور بن گیا ‏ ‏ ‏ تُو نے کیا کلی کو پھُول، پھُول کہ ہو گیا گلاب
عشق کا راگ، تیری لے، صبحِ ازل کا وُہ سکوت!! ‏ ‏ ‏ حُسن نے بیخودی میں آپ بڑھ کے اٹھا لیا رباب
عام ہے دعوتِ نظر دیدۂ شوق چاہیئے ‏ ‏ ‏ حُسن ہے اب بھی گرمِ سیر زلف بدوش و بے حجاب

اُٹھ کہ جبیں سیاہ ہے شاہدِ کائنات کی
شمع بھڑک رہی ہے پھر انجمنِ حیات کی

علی اختر

برضا و رغبت

(ڈراما)

افرادِ ڈراما

وکیل۔ ایک دُبلے پتلے نوجوان وکیل

منشی۔ وکیل کے منشی

سُہیلہ۔ ایک مسٹریس۔ گرجدار زنانہ آواز

منیجر۔ مقامی گرل سکول کے منیجر

عبد الصمد۔ سہیلہ کا بڑا بھائی

کیپٹن یٰسین خاں۔ برما میں فوجی ڈاکٹر۔ دیو ہیکل آدمی اور
بادل کی سی گرجدار آواز

قاضی۔ ملازم۔ چپراسی وغیرہ

پہلا ایکٹ

موقع:۔ وکیل کا دفتر

(وکیل اپنے کمرے میں بیٹھے ہیں کہ منشی جی آتے ہیں۔)

منشی جی۔ ایک عجیب عورت آئی ہے۔

وکیل۔ کیسی؟

منشی۔ خوب گوری چٹی۔ بڑی خوبصورت کشیدہ قامت، کوئی چوبیس برس کی عمر۔

وکیل۔ اس میں کون عجیب بات ہے؟

منشی۔ ارے صاحب کیا بتاؤں۔ عورت ہے جیسے شیرنی۔ نام نہیں بتاتی۔

وکیل۔ (چیخ کر) کیا فضول باتیں کرتے ہو۔ آخر ہے کون؟

منشی۔ برہمن معلوم ہوتی ہے۔ ماتھے پر تلک لگا ہے۔ آپ دیکھیں تو کہیں۔ عجیب صورت ہے۔ وہ مضمون کہ ؎

دلکشی چال میں ایسی کہ ستارے جھک جائیں

یا

سرکشی چال میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں

وکیل۔ (ہنس کر) تم بھی خوب آدمی ہو۔ اتوار کے دن مشغلے

خوب ڈھونڈتے ہو۔ مجھے آپ ۵۷،۴ والی مسل دے دیجئے
پھر جائیے باہر ستارے جھکائیے۔
منشی۔ قانونی مشورہ لینے آئی ہے۔
وکیل۔ (چونک کر) ارے! تم بھی عجب آدمی ہو۔ کام کی بات
تو بتاتے نہیں۔ کھڑے ستارے اور گور زجھکا رہے ہو۔
منشی۔ اور کیسے بتاؤں؟
وکیل۔ (جھلّا کر) پھر کیا طے ہؤا؟
منشی۔ میں نے کہا۔ پچاس فیس ہو گی۔
وکیل۔ تو کیا بولی؟
منشی۔ کہنے لگی میں خود طے کر لوں گی۔
وکیل۔ یہ کہہ دو کہ پچیس فیس مشورہ ہو گی اور بات چیت
کرنے سے پہلے رکھ دے ورنہ میں بات چیت نہیں کرونگا۔
منشی۔ بہت اچھا!
(چلا جاتا ہے۔ اور فوراً ہی سہیلہ داخل ہوتی ہے۔)
سہیلہ۔ کیا میں آسکتی ہوں؟
وکیل۔ ضرور ضرور تشریف لائیے۔
سہیلہ۔ آداب عرض۔
وکیل۔ آداب عرض ہے۔
سہیلہ۔ یہ نوٹ ہیں پچیس ۲۵ جناب کی فیس۔
وکیل۔ اوہ۔ شکریہ۔ شکریہ۔ اجی اس کی کیا ضرورت تھی۔
ایسی بھی کیا جلدی۔ شکریہ۔
سہیلہ۔ وکیل صاحب میں کچھ کہنا چاہتی ہوں معاف فرمائیے گا
وکیل۔ ارشاد۔ ارشاد۔ فرمائیے۔ فرمائیے۔ شوق سے۔

سہیلہ۔ یہ آپ کا منشی بڑا بدتمیز ہے۔
وکیل۔ (گھبرا کر) کیا ہؤا؟ کیا ہؤا؟
سہیلہ۔ ہؤا یہ کہ جب میں آئی تو میرا نام پوچھا۔ میں نے کہا
کہ اگر وکیل کروں گی تو نام بتاؤں گی ورنہ مصلحت نہیں ہے
وکیل۔ بہت مناسب کیا۔
سہیلہ۔ لیکن باوجود اس کے اُس نے چار دفعہ بدتمیزی
سے پھر پُوچھا۔
وکیل۔ بڑے بدتمیز ہیں۔
سہیلہ۔ اس کے علاوہ یہ ملاحظہ ہو کہ آپ تو فیس کے معاملے
میں اتنے خلیق ہیں اور اُس کی بدتمیزی دیکھئے کہ کہتا
کہ فیس پہلے دو ورنہ وکیل صاحب کہتے ہیں کہ بات نہیں
کروں گا۔
وکیل۔ (زور دے کر تعجب سے) اوف ..... وہ .....
عجیب بدتمیز آدمی ہے۔ بھلا فیس بھی کوئی چیز ہے لاحول
ولا قوۃ۔ فیس کہیں بھاگی تھوڑی جاتی ہے۔ مجھے
سخت شرمندگی ہے۔
سہیلہ۔ وکیل صاحب میں نے بڑے ضبط سے کام لیا ہے
ورنہ میں ان کا ایک ہی گھونسے میں جبڑا توڑ دیتی یا اُٹھا
کر برآمدہ کے باہر پھینک دیتی۔
وکیل۔ مجھے بیحد افسوس ہے۔ کیا میں اسے بُلاؤں؟
سہیلہ۔ نہیں جناب۔ مجھے اپنے کام کی جلدی ہے۔
وکیل۔ فرمائیے حاضر ہوں۔
سہیلہ۔ میرا نام مس سہیلہ قریشی ......

وکیل۔ (چونک کر) اچھا آپ ہیں۔ میں پہچان گیا جناب کو۔
آپ تو ایم اے پاس ہیں۔
سہیلہ۔ جی ہاں۔ میں سیکنڈ مسٹریس ہوں۔ ہوں کیا البتہ تھی۔
وکیل۔ جی مجھے سب معلوم ہے۔
سہیلہ۔ تو پھر مقدمہ کا حال بھی معلوم ہوگا۔
وکیل۔ تفصیل نہیں معلوم مگر سُنا ضرور (ہنس کر) معاف کیجیے گا۔
عجیب باتیں سننے میں آئیں۔
سہیلہ۔ تو پہلے آپ وہ باتیں بتائیے۔
وکیل۔ آپ معاف کیجیے گا میں نے تو افواہ سُنی ہے۔
سہیلہ۔ آخر کیا؟
وکیل۔ یہ کہ آپ ہندو ہوگئیں۔ ہندوانہ نام رکھا ہے۔
معاف کیجیے گا۔ ماتھے پر اس وقت بھی تلک لگا ہُوا ہے۔
سہیلہ۔ اس وقت تو نہیں ہے۔ (پیشانی صاف کرتے ہوئے)
وکیل۔ چھوٹ گیا ہے۔ ...... ہاں اب چھوٹ گیا۔
سہیلہ۔ اور کیا؟
وکیل۔ (ہنس کر) یہ بھی سُنا کہ آپ ہندوؤں سے کُشتی لڑتی
ہیں۔ معاف کیجیے گا۔ منشی جی کو برآمدہ سے نیچے تو پہلوان
ہی پھینک سکتا ہے (قہقہہ)
سہیلہ۔ (قہقہہ لگا کر) اچھا اور کیا سُنا؟
وکیل۔ یہ سُنا کہ آپ لڑکیوں کو بھی ہندوؤں سے کُشتی لڑاتی
ہیں اور جب مینیجر صاحب نے بازپرس کی تو آپ نے اُن
کو اور ہیڈ مسٹرس صاحبہ کو چاقو سے زخمی کیا۔ جس کا مقدمہ
چل رہا ہے۔

سہیلہ۔ اور کچھ؟
وکیل۔ اور کوئی خاص بات نہیں۔ مگر معاف کیجیے گا عام
خیال آپ کے بارہ میں کچھ اچھا نہیں۔ بُرا نہ مانیے گا۔
سہیلہ۔ بات یہ ہے وکیل صاحب کہ یہ سب باتیں سچ ہیں۔
وکیل۔ سچ ہیں!
سہیلہ۔ جی ہاں۔
وکیل۔ تب تو غلطی پر آپ ہی ہیں!
سہیلہ۔ ہرگز نہیں۔ آپ اگر سُنیں تو میں آپ کو اپنا قصہ
سناؤں تاکہ آپ خود انصاف کریں۔
وکیل۔ فرمائیے۔
سہیلہ۔ میرے والد مرحوم کے ایک عالی خاندان برہمن میدا
دوست درجن بھر تھے۔ ایسے دوست کہ جیسے بھائی۔
بڑے زبردست پہلوان تھے۔ میرے والد ڈاکٹر تھے
اور دوا کی غلطی سے ان کی اکلوتی بیٹی مرگئی۔ میرے
والد بھائی کی طرح اُن سے محبت کرتے تھے۔ اور اُنھوں
نے اس کے بدلہ میں مجھے دے دیا۔ میں جب چھ مہینہ
کی تھی۔ درجن مہاراج نے اُسی تاریخ سے میرے والد کو
دودھ پلائی خرچہ پانچ روپیہ دینا شروع کیا اور میرا نام
سُندری یا سُندر رکھ دیا۔ میں دو سال کی ہوئی تو میرے
والد مر گئے۔ اور جب تین سال کی ہوئی تو والدہ صاحبہ
بھی مرگئیں۔ والدہ کے مرنے پر درجن مہاراج نے
مجھے رکھنا چاہا تو میرے بھائی اور چچا اور رشتہ داروں
نے نہ دیا۔ حالانکہ والد صاحب کی تحریر بھی تھی۔ درجن

مہاراج پہلوان آدمی غصّہ میں جبراً مجھے لینے آگئے اور

ساتھ دو چار اور پہلوان لے آئے۔ یہاں میرے عزیز

رشتہ داروں نے انکار کیا۔ جھگڑا ہوگیا۔ لاٹھی چلی۔ درجن

مہاراج نے سب کو مارا اور ایک نوکر کو جان سے مار ڈالا

اور مقدمہ چلا۔ پھانسی کی سزا ہوئی۔

وکیل۔ پھانسی کی سزا۔

سہیلہ۔ جی ہاں۔ مگر اپیل میں جنم قید رہ گئی۔

وکیل۔ جنم قید ہوسکتی ہے۔ بلکہ یہ بھی زیادہ ہے۔

سہیلہ۔ خیر۔ جنم قید کاٹنے کے بعد وہ پھر مجھے لینے چڑھ دوڑے

وکیل۔ پھر بھی آگئے ؛

سہیلہ۔ جی ہاں۔ اور یہ کہا کہ بیٹی میری ہے، ہرگز نہ چھوڑونگا

بلکہ اب کی پھانسی چڑھوں گا۔

وکیل۔ تو آپ تو کافی بڑی ہوں گی . . . .

سہیلہ۔ جی ہاں میری عمر کوئی سولہ برس کی تھی۔ وہ گھر پر

چڑھ آئے۔ میں نے چھپ کر دیکھا اور میرا دل پسیج گیا۔

جب وہ شیر کی طرح گرج کر چھاتی پیٹ کر کہتے کہ بیٹی میری

ہے۔ میں بغیر اس کے مر جاؤں گا۔

وکیل۔ عجیب آدمی۔

سہیلہ۔ پھر صلاح مشورہ ہؤا۔ مجھ سے انکار کرا دیا گیا۔

وکیل۔ آپ نے انکار کردیا ؛

سہیلہ۔ اور کیا کرتی۔ مگر خوب روئی اکیلے میں۔ مگر وہ انکار

کو نہیں مانے اور خون خچر پر تُل گئے تو پولیس میں رپورٹ

ہوئی۔ ایک حاکم مقرر ہؤا۔

وکیل۔ یہ کیوں ؛

سہیلہ۔ اُنہوں نے عرضی دی تھی کہ میں راضی ہوں اور لوگ

جبراً روکتے ہیں

وکیل۔ آپ کی عمر کا سوال . . . .

سہیلہ۔ جی ہاں یہ طے ہوگیا کہ میں سولہ برس کی ہوں۔

وکیل۔ پھر کیا ہؤا ؛

سہیلہ۔ یہ طے ہؤا کہ میں حاکم کے سامنے انکار کردوں۔ تو

درجن مہاراج پھر کچھ نہ بولیں گے۔

وکیل۔ بڑا دلچسپ مقدمہ ہوگا۔

سہیلہ۔ میرا تحریری انکار موجود تھا اب حاکم کے روبرو زبانی

انکار کرنے بر قع پہن کر پیش ہوئی۔ مجھ سے حاکم نے جب

پوچھا تو میں نے کہہ دیا کہ یہ تحریر میری ہے اور میں نے

انکار کیا ہے۔

وکیل۔ انکار کرگئیں ؛

سہیلہ۔ سنیئے تو میں نے انکار کردیا تو درجن مہاراج نے

کہا کہ میں ایک بات کہتا ہوں۔ حاکم نے اجازت دے

دی۔ اُنہوں نے مجھ سے چیخ کر کہا کہ اری تو میری بیٹی

ہے۔ بیٹی سُندری۔ اتنا کہہ کر دیو ہیکل پہلوان نے بچوں

کی طرح روتے ہوئے اپنی چھاتی پیٹ لی اور چیخ کر کہا

اری بیٹی تجھے سپنے میں دیکھ دیکھ کے چودہ برس کی جیل

بھگتی ہے۔ اسے تجھ بنا مر جاؤں گا۔ کہاں جاتی ہے۔

یہ کہہ کر ہاتھ جو بڑھائے تو میرے اُوپر ایسا جادو ہؤا کہ میرے

منہ سے ایک چیخ نکلی اور بچوں کی طرح دوڑ کر میں اُن سے

چمٹ گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(آواز رقت آمیز ہوجاتی ہے اور روتی ہے ۔)

وکیل ۔ ارے ۔ ارے ۔ ارے ! آپ روتی ہیں ۔

سہیلہ ۔ (کھنکھار کر) جی نہیں ۔ روتی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ دل بھر آیا ۔

وکیل ۔ واقعی میرے دل پر بھی اثر ہؤا ۔ آپ نے عجیب قصہ سنایا ۔ پھر کیا ہؤا ؟

سہیلہ ۔ ہوتا کیا ۔ انہوں نے مجھے گلے سے لگایا اور بچوں کی طرح خوب روئے ۔ سب چپ کے چپ رہ گئے ۔ اسی تاریخ سے انہوں نے مجھے لے لیا ۔ میں اُن کی بیٹی اور وہ میرے باپ ۔ کوئی ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ کی جائداد ہے وہ میرے نام کردی ۔ مجھے تعلیم دلائی ۔ آج آٹھ سال سے میں اُن کی بیٹی ہوں ۔ اور وہ میرے باپ ۔

وکیل ۔ اور آپ کے بھائی اور دوسرے عزیز ؟

سہیلہ ۔ پھر سب سے صلح ہوگئی ۔ اس وقت اُن کی عمر ستّر برس کی ہوگی ۔ مگر پہلوان بنے ہوئے ہیں ۔ یہ ہیں وہ ہندو جنہوں نے مجھے کشتی سکھائی ۔ کسرت کرائی اور صبح اٹھ کر وہ میرے ماتھے پر تلک لگا دیتے ہیں ۔ اسکول جاتے وقت صاف کرلیتی ہوں ۔ مجھے وہ سُندری کہتے ہیں ۔ بڑے کٹر برہمن ہیں مگر میرے ہاتھ کا پکا کھانا کھا لیتے ہیں ۔ محبت کا یہ حال ہے کہ مجھے اگر کہیں ذرا دیر لگ جائے تو بے کل ہو جاتے ہیں ۔ مجھے دیکھنے آدمی دوڑا دیتے ہیں ۔ اب وکیل صاحب غور کیجئے کہ ایسے بزرگ سے اگر میں نے کشتی سیکھی اور وہ بھی اپنے گھر پر کمرے میں بند ہو کر تو دن کا یا اور لڑکیوں نے مجھ سے کشتی سیکھی تو اسکول کا کیا نقصان ہؤا ۔

وکیل ۔ کچھ نہیں ۔ مگر معاف کیجئے گا یہ بھی تو مشہور ہے کہ بلدیو مہاراج اور دوسرے بدمعاش بھی آتے ہیں ۔

سہیلہ ۔ دیکھئے چاچا پہلوان ہیں اور اُن سے ملنے ہر قماش کے پہلوان آتے ہیں تو بھلا اُن سے مجھے کیا تعلق ۔ میں جانتی ہی نہیں آتے ہوں گے ۔

وکیل ۔ مگر یہ مقدمہ کیسے اٹھا ؟

سہیلہ ۔ اسسٹنٹ مسٹریس مس ٹومس سے میری دشمنی ہے اور منیجر صاحب اور ہیڈ مسٹریس کو اُس نے ورغلایا ۔ انہوں نے مجھے ایک دن دفتر میں بلا کر کہا کہ اپنے یہاں لڑکیوں کو مت بلاؤ ۔ میں نے انکار کیا تو بات بڑھ گئی ۔ اور اتنی بڑھی کہ مس ٹومس بد زبانی کرنے لگی اور بابا کو بدمعاش کہا ۔ میں نے اُسے ایک چانٹا مارا تو وہ اور ہیڈ مسٹریس دونوں مجھے مارنے پل پڑیں ۔ میں نے مس ٹومس کو اٹھا کر دے مارا جس سے اُس کا کولہا اُتر گیا اور ہیڈ مسٹریس کی ناک پر ایک گھونسا دیا تو وہ غش کھا کر گریں اور ناک سے خون جاری ہوگیا ۔ مگر اتنے میں خود منیجر صاحب رول لے کر میری طرف بڑھے اور مجھے چڑیل اور بدمعاش کہا ۔ میں نے دوات ان کے کھینچ ماری تو انہوں نے میرے اوپر رول سے حملہ کیا ۔ ایک رول میرے بائیں ہاتھ میں لگا ۔ دوسرا مارا تو میں نے رول کو ہاتھ پر روک کر مارا جو انہیں "باہرلی" پڑ تو بری طرح گرے ۔ اٹھ کر بھاگے جو سہی تو جالا لینے کا بانس دیوا

کے سہارے رکھا تھا میں نے لے کر دیا جو کمر پر تو پھر گرے
میں پھر جو لپکی تو نکل گئے۔

وکیل۔ (قہقہہ لگا کر) آپ نے تو کمال کر دیا۔ یہ "باہرلی" کیا ہوتی ہے؟

سہیلہ۔ (تعجب سے) آپ نے گاماں کی "باہرلی" نہیں سنی۔ یہ ایک داؤں ہے۔ دشمن کا سیدھا ہاتھ پکڑ کر اس کے سیدھے پیر میں اپنا سیدھا پیر باہر کی طرف سے لگا کر اڑا دیا۔

وکیل۔ آپ نے تو کمال کر دیا۔

سہیلہ۔ کمال کیا کیا۔ اپنی جان بچائی۔ اس کے بعد منیجر صاحب اور ہیڈ مسٹریس نے مجھے ڈسمس کر کے مقدمہ چلا دیا۔

وکیل۔ اس مقدمہ میں آپ مجھے وکیل کرنا چاہتی ہیں؟

سہیلہ۔ دراصل اس مقدمہ میں صلح کرنے جا رہی ہوں اور آپ کو بطورِ وکیل ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔

وکیل۔ کب؟

سہیلہ۔ ابھی۔

وکیل۔ مگر کن شرائط پر صلح چاہتی ہیں۔

سہیلہ۔ بس آپ میرے ساتھ چلئے اور اگر ضرورت ہو تو میری قانونی مدد کیجئے۔

وکیل۔ بہت خوب میں حاضر ہوں۔

سہیلہ۔ دوسرا معاملہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔

وکیل۔ کوئی دوسرا معاملہ بھی ہے؟

سہیلہ۔ جی ہاں۔

وکیل۔ وہ کیا ہے؟

سہیلہ۔ اسی مقدمہ کی شاخ ہے۔ اور وہ ایسا معاملہ ہے کہ میرے ہوش ٹھکانے نہیں۔

وکیل۔ وہ کیا؟

سہیلہ۔ وہ یہ کہ مس ٹومس رخصت لے کر آگرہ پہنچیں جہاں میرے بڑے بھائی عبدالصمد صاحب انسپکٹر اسکول ہیں۔ ان سے مل کر اس نے معلوم کیا کیا جڑ دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا جو اس خط سے ظاہر ہے۔ یہ خط میری ایک سہیلی کا ہے اور اس کا کچھ حصہ آپ کو سنا سکتی ہوں۔ پورا خط نہیں دکھا سکتی۔

وکیل۔ سنائیے۔

سہیلہ۔ سنئے وہ لکھتی ہے:۔

"پیاری بہن سہیلہ۔ یہ خط تم کو اس لئے لکھتی ہوں کہ تم ہوشیار ہو جاؤ۔ مس ٹومس نے یہاں آ کر مقدمہ اور مار پیٹ کا سارا حال تمہارے بھائی صاحب سے کہہ دیا۔ وہ تم سے بے حد خفا ہیں۔ ابا سے ملنے آئے تھے۔ معلوم ہوا کہ تمہاری زبردستی شادی کرنے کا انتظام ہو گیا۔ برما میں کوئی ڈاکٹر ہے اس سے تمہاری شادی طے ہو گئی۔ اس کو بلا بھی لیا ہے۔ کل وہ ہمارے یہاں آیا تھا۔ اس کا نام کیپٹن لٹیپن خاں ہے۔ دیو کا دیو ہے۔ بڑی بھاری جہاز ایسی موٹر میں آیا تھا۔ یہ بھی سنا ہے کہ اس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں مگر جب اس نے سنا کہ تم نے ڈپٹی صاحب کو مچھندر کہا تھا تو اس نے مونچھیں منڈوا لیں۔ اب سنا ہے کہ آج ورنہ کل تمہارے بھائی اسے لے کر تمہارے پاس آتے ہیں اور تمہاری شادی اس کے ساتھ

زبردستی کردیں گے۔"

وکیل۔ معاف کیجئے گا۔ عجیب معاملہ ہے۔ آپ خود سمجھدار تعلیم یافتہ ہیں۔ آپ کے بھائی صاحب بھی تعلیم یافتہ ہیں میری عقل کام......

سہیلہ۔ بات دراصل یہ ہے کہ اُنہوں نے کئی شخصوں کا انتخاب کیا مگر میں نے انکار کردیا۔

وکیل۔ کیوں؟

سہیلہ۔ کیوں؟ ارے صاحب ایک ڈاکٹر صاحب تھے۔ وُہ مجھ سے ملائے گئے۔ مگر دو چار روز بعد ہی مجھے اُن کی ناک پر ایک گھونسہ مارنا پڑا۔ بھاگ گئے ورنہ اور مارتی۔

دوسرے ایک رئیس زادے وکیل تھے وہ "مچھندر" شام کو میرے ساتھ ٹہلنے نکلے ادوا اور اُستانیاں تھیں۔ ایک گائے جو دوڑی تو مارے ڈر کے ہم لوگوں کو مصیبت میں چھوڑ کر چیخ کر بھاگے، مَیں نے ان کی بزدلی پر نکتہ چینی کی تو بگڑنے لگے۔ اور بات ایسی بڑھی کہ میں مارنے کو تُل پڑی۔ ساتھ والوں نے بیچ بچاؤ کرادیا۔

تیسرے حضرت اس قدر گھنے ہوئے تھے کہ مجھے ان کو مشورہ دینا پڑا کہ آپ چلنا پھرنا بند کردیں۔ ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ چلتے پھرتے کسی کا دھکا لگے اور آپ ٹوٹ پھوٹ جائیں۔ اس پر وہ سخت خفا ہوئے۔

غرض اس قسم کے دو چار اور تھے۔

وکیل۔ (ہنس کر) لہٰذا اب اُنہوں نے زبردستی کی ٹھانی ہے

سہیلہ۔ جی ہاں۔ اور میں بارہا ظاہر کرچکی ہوں کہ اِس معاملے میں کسی کو دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور میں کوئی بچی نہیں۔

وکیل۔ یہ آپ کے بڑے بھائی ہیں۔

سہیلہ۔ مجھ سے اٹھارہ برس بڑے ہیں۔

وکیل۔ تو کیا آپ اُن کا کہنا مان جائیں گی۔

سہیلہ۔ ہرگز نہیں۔ مجھے تو اس ڈاکٹر کے نام سے نفرت ہے۔

وکیل۔ کیوں؟

سہیلہ۔ بڑا موذی ہے۔ میں نے آپ کو پُورا خط نہیں سنایا۔ ایک گورے کو اُس نے جان سے مار ڈالا۔

وکیل۔ جان سے مار ڈالا۔

سہیلہ۔ جی ہاں۔ اور بچ گیا۔

وکیل۔ وُہ کیسے؟

سہیلہ۔ نہ معلوم کیسے؟ اور ولایت میں تھا تو ایک انگریز کو ایسا مارا کہ اُس کے دانت توڑ دیئے اور جیل بھگتی۔

وکیل۔ سزا یافتہ ہے!

سہیلہ۔ جی ہاں۔ اور آئے دن یہاں انگریزوں سے لڑتا رہتا ہے۔ اور اب کہتا ہے کہ مجھ سے زبردستی شادی کرے گا۔

وکیل۔ زبردستی کرے گا۔ کیسے؟

سہیلہ۔ بھائی صاحب کے بل بوتے پر۔ آپ یہ بتلایئے کہ اِس آفت سے میں کیسے بچوں؟

وکیل۔ مجھے وکیل کر لیجئے۔

سہیلہ۔ پہلے مجھے اطمینان دلایئے کہ آپ اس زبردستی کی شادی کو کیسے روکیں گے۔ ایسے کہ مجھے کچھ نہ کرنا پڑے۔

وکیل۔ قانون کے زور سے۔

سہیلہ۔ وہ کیسے؟ آخر میں بھی تو سنوں۔ میں آپ کو ڈبل فیس دوں گی۔

وکیل۔ تسلیم۔ تسلیم۔ میری فیس دو سو روپیہ ہوگی۔ گارنٹی کی ساتھ (میز پر گھونسہ مار کر)

سہیلہ۔ اگر آپ مجھے اطمینان دلادیں تو میں سو روپیہ ابھی دوں گی اور باقی بعد میں۔

وکیل۔ دیکھئے بغیر آپ کے اقرار کے شادی ناممکن۔ آپ اقرار تو نہیں کریں گی؟

سہیلہ۔ ہرگز نہیں۔

وکیل۔ تو پھر جب وہ آئیں تو آپ چپکے سے مجھے بلوا بھیجئے اور کہہ دیجئے کہ میرا وکیل جواب دے گا۔ پھر میں سمجھ لونگا۔

سہیلہ۔ وہ کیسے؟

وکیل۔ (گرج کر) وُہ ایسے کہ جب آپ نے انکار کردیا تو اُس کے بعد اگر تقاضا بھی کیا تو وہ ناجائز اور جرم ہے۔

سہیلہ۔ پھر اس جرم کو کون روکے گا؟

وکیل۔ میں روکوں گا۔

سہیلہ۔ وُہ نہ رُکے تو؟

وکیل۔ قانون روکے گا۔

سہیلہ۔ وہ پھر بھی نہ مانے تو؟

وکیل۔ (چیخ کر) ہتکڑیاں ڈلوا دوں گا۔ وہ ڈاکٹر ہے کیا چیز!

سہیلہ۔ وکیل صاحب یہ سمجھ لیجئے کہ میں بھائی صاحب سے کوئی گستاخی نہیں کرنا چاہتی۔ وہ ڈاکٹر کون چیز ہے۔ میں خود اُس کی زبردستی کا جواب اچھی طرح دے سکتی ہوں۔ مگر بھائی صاحب کا خیال ہے۔

وکیل۔ بے شک۔ بے شک

سہیلہ۔ تو اب منیجر صاحب کے یہاں چلئے۔

وکیل۔ بہت اچھا چلئے۔

(اُٹھتی ہے)

سہیلہ۔ چلئے

وکیل۔ وہ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ۔ ذرا ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے

سہیلہ۔ جی۔ کیا فرمایا؟

وکیل۔ وہ ــ ذرا ــ بات دراصل یہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ویسے تو فیس ۔ ۔ ۔ ۔ کا ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی ضرورت نہیں ہے۔

سہیلہ۔ اوہو معاف کیجئے گا ۔ ۔ ۔ ۔ یہ لیجئے۔

وکیل۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ قطعی جلدی نہیں ۔ ۔ ۔ بات تو دراصل ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی ضرورت ۔ ۔ ۔ افوہ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ تو شرمندہ کرتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ خیر شکریہ شکریہ!

سہیلہ۔ باقی سو بعد کامیابی

وکیل۔ انشاءاللہ!

سہیلہ۔ چلئے۔ **وکیل۔** چلئے۔

(دونوں چلے جاتے ہیں۔)

دوسرا ایکٹ

موقع: منیجر صاحب کا بنگلہ

(منیجر صاحب اپنے کمرے میں بیٹھے ہیں کہ نوکر آتا ہے)

نوکر۔ مس سہیلہ مع اپنے وکیل کے صلح کرنے آئی ہیں۔

منیجر۔ بلا لو۔

نوکر۔ بہت اچھا (جاتا ہے)

(تھوڑی دیر بعد وکیل اور سہیلہ داخل ہوتے ہیں)

وکیل۔ آداب عرض ہے جناب

سہیلہ۔ آداب عرض ہے

منیجر۔ آداب عرض۔ آداب عرض۔ تشریف رکھئے۔ مس سہیلہ ادھر...... ادھر صوفے پر آیئے۔

سہیلہ۔ جی میں آرام سے......

منیجر۔ نہیں نہیں نہیں۔ ادھر۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

سہیلہ۔ شکریہ!

وکیل۔ جناب مس۔ معاف فرمایئے گا۔ وقت نہ آپ کا ضائع ہو اور نہ میرا۔ میں اپنی مؤکلہ کی طرف سے صلح اور باعزت صلح کا خواستگار ہوں۔ لہٰذا شرائط صلح فرمایئے۔

منیجر۔ معاف کیجئے گا۔ آپ کی مؤکلہ صاحبہ نے آپ کو بتایا نہیں۔ میں تو شرائط عدالت تک میں بتا چکا ہوں۔

وکیل۔ وہ کیا؟

منیجر۔ بے حد معقول۔ یہ کہ مس ٹومس اور ہیڈ مسٹریس اور مجھ سے تحریری معافی مانگیں اور مس ٹومس اور ہیڈ مسٹریس کی طرف سے اسکول میں سو سو روپیہ چندہ دیں۔ ان کو تو دینا منظور ہے مگر معافی سے انکار ہے۔

سہیلہ۔ معافی کا سوال ہی نہیں۔

منیجر۔ صلح پھر ناممکن۔

سہیلہ۔ اپنا نفع نقصان سوچ لیجئے۔

منیجر۔ میں کیا سوچوں۔ آپ سوچئے۔ وہ کیجئے جس میں آپ کا نقصان نہ ہو۔

سہیلہ۔ میرا کیا نقصان ہو سکتا ہے۔

منیجر۔ (چیخ کر) نقصان ہی نہیں! وکیل صاحب ان کو سمجھائے ان کے بزرگوار چچا صاحب صلح نہیں ہونے دیتے۔

سہیلہ۔ بیشک۔ وہ کہتے ہیں جیل چلی جاؤ مگر معافی نہ مانگو۔

منیجر۔ اور جیل ہو گئی تو آپ کیا کریں گی؟

سہیلہ۔ آپ کو بچانے کی فکر۔

منیجر۔ ہیں!...... اس سے کیا مطلب...... دیکھئے وکیل صاحب آپ نے۔

سہیلہ۔ مطلب آپ خوب جانتے ہیں۔ آپ کے فائدہ کے لئے صلح کرنا چاہتی ہوں۔

منیجر۔ میرا فائدہ؟

سہیلہ۔ (زور دے کر) جی ہاں۔ آپ کا فائدہ۔

منیجر۔ یہ کیا معمّا؟ صاف کہئے۔

سہیلہ۔ کہہ دوں۔ بُرا تو نہ مانیں گے۔

منیجر۔ ہرگز نہیں۔

سہیلہ۔ سنئے۔ چچا کہتے ہیں کہ معافی مانگی تو زہر کھا لوں گا۔

جیل چلی جا لہٰذا میں اُن کا کہنا مانوں گی۔

منیجر۔ پھر فکر کا ہے کی۔

سہیلہ۔ فکر یہ کہ وہ کچھ اور بھی تو کہتے نہیں۔

منیجر۔ وہ کیا؟

سہیلہ۔ وہ یہ کہ تو جیل جا اور تیرے پیچھے مَیں بھی۔ منیجر کو مار کر جیل آتا ہوں۔

منیجر۔ دیکھئے وکیل صاحب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھئے ان کی دھمکیاں دیکھئے اِن کی زیادتی۔

سہیلہ۔ بخدا میں زیادتی نہیں کرتی۔ میں اصلیت بتاتی ہوں۔ میرے پیچھے وہ چودہ برس کی جیل بھگت چکے ہیں جو آپ کو معلوم ہے اور خون کرنے کو تیار ہیں۔

منیجر۔ میں دھمکیوں میں نہیں آتا۔

سہیلہ۔ دھمکی نہیں حقیقت ہے۔ پھر آپ کو معلوم ہے کہ بلدیو مہاراج ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

منیجر۔ اوّل درجے کا بدمعاش ہے بلدیو مہاراج۔

سہیلہ۔ سمجھ لیجئے آپ۔ چاچا کو وہ چاچا کہتا ہے اور وہ اور اُس کا باپ ایک اُستاد کے شاگرد ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ چاچا جی تم جیل گئے تو تمہارے پیچھے میں بھی آتا ہوں۔ جہاں تین دفعہ بھگتی وہاں ایک دفعہ اور سہی۔

منیجر۔ وکیل صاحب۔ فرمائیے کیا رائے ہے۔ دیکھا آپ نے اپنی مؤکلہ کو۔

سہیلہ۔ اور بلدیو مہاراج کے آٹھ نوٹ گرد کہتے ہیں کہ اُستاد تم جیل گئے تو ہم بھی نہیں رُکتے۔ پیچھے پیچھے ہم بھی آتے ہیں۔

منیجر۔ وکیل صاحب آپ چُپ کیوں ہیں۔ کیا یہ سب بدمعاش نہیں؟

وکیل۔ بدمعاش ہیں جبھی تو ان کی بدمعاشی سے آپ کو بچانا چاہتا ہوں۔

سہیلہ۔ میں جانتی ہوں کہ یہ سب اوّل درجے کے بدمعاش ہیں۔

منیجر۔ اور آپ کی حمایت پر تُلے ہوئے ہیں۔

سہیلہ۔ میری بدقسمتی۔ مگر منیجر صاحب واضح رہے کہ ان بدمعاشوں نے سوائے مار پیٹ کے اور کبھی کسی معاملہ میں سزا نہیں پائی ہے۔

وکیل۔ جھگڑا ختم کیجئے۔ سُن لیجئے کان کھول کر کہ میں اور میری مؤکلہ صاحبہ آپ کے فائدہ کے لئے صلح چاہتے ہیں۔

سہیلہ۔ میں ہرگز معافی نہیں مانگوں گی۔ اور اگر مجھ کو جیل یا سزا ہوئی تو میں کیا کوئی بھی طاقت آپ کو ان پہلوانوں سے نہیں بچا سکے گی۔

منیجر۔ اس کا مطلب یہ کہ ناجائز دباؤ سے کام لیا جائے گا۔

وکیل۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ آپ کی محبت اور آپ کی ہمدردی کے خیال ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(ملازم داخل ہوتا ہے اور بات کاٹ دیتا ہے گھبراہٹ کا لہجہ)

نوکر۔ ایک بڑا بھاری موٹر آیا ہے۔ اس میں ایک بڑا ڈبل آدمی ہے صاحب۔ دیو کا دیو۔ مِس صاحب کے مکان کا پتہ پوچھتے تھے۔ میں نے کہا یہاں ہیں۔ تو پہلے تو کہا ہمارا سلام کہو۔ میں نے نام پوچھا تو کہا ہم بھی چلتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔

وہ ۔۔ وہ آ گئے ۔۔۔۔۔۔۔

(برآمدہ میں بوٹ کی زبردست چاپ جیسے کوئی پیر پٹخ کر چلتا ہو۔ کیپٹن یٰسین خاں مع سہیلہ کے بھائی عبدالصمد کے داخل ہوتے ہیں۔)

کیپٹن یٰسین۔ (گرجتی ہوئی شیر کی سی آواز) ہم حاضر ہو سکتے ہیں۔ (دونوں یہ کہتے داخل ہوتے ہیں۔)

منیجر۔ آیئے۔ آیئے۔

ڈاکٹر۔ خاکسار کیپٹن یٰسین خاں

سہیلہ۔ بھائی صاحب آداب۔

عبدالصمد۔ جیتی رہو۔

ڈاکٹر۔ اور آپ میرے دوست ۔۔۔۔۔ مسٹر عبدالصمد صاحب ۔۔۔۔۔

منیجر۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔

عبدالصمد۔ مجھے بھی آپ سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔

منیجر۔ تشریف رکھئے نا ۔۔۔۔

عبدالصمد۔ مجھے جناب سے کچھ کہنا ہے۔

منیجر۔ کوئی خاص بات؟

عبدالصمد۔ جی ہاں۔

منیجر۔ آیئے۔ برابر والے کمرے میں آیئے۔

(دونوں جاتے ہیں)

منیجر۔ فرمایئے ۔۔۔۔ بیٹھ جایئے۔

عبدالصمد۔ سب سے پہلے تو مجھے سہیلہ کی بدتمیزی کی معافی مانگنی ہے۔

منیجر۔ شکریہ۔

عبدالصمد۔ آپ کی شرائط صلح بھی سنی ہیں۔ وہ سب منظور کرتا ہوں۔

منیجر۔ شکریہ۔ شکریہ۔

عبدالصمد۔ خاص بات اس وقت یہ ہے کہ میرے ساتھی ڈاکٹر صاحب ۔۔۔۔ ابھی ابھی میں چاہتا ہوں کہ سہیلہ کا ان سے نکاح ہو جائے۔ اگر آپ اجازت دیں ۔۔۔۔ ہم قاضی صاحب کو شہر سے ساتھ لائے ہیں۔

منیجر۔ نکاح۔ اتنی جلدی!

عبدالصمد۔ آپ جانتے ہیں کہ اس لڑکی کی آزادی کا کیا حال ہے۔ جو نکل گئی تو پھر کچھ نہ ہو سکے گا۔ میں تنگ آ گیا ہوں۔ میری مدد کیجئے۔

منیجر۔ بہت خوب۔

عبدالصمد۔ قاضی صاحب موٹر میں بیٹھے ہیں۔ بلوا لیجئے۔ چلئے جلدی۔

منیجر۔ چلئے۔

(دونوں پہلے کمرے میں آتے ہیں)

عبدالصمد۔ ڈاکٹر صاحب غیر حاضری معاف۔

ڈاکٹر۔ منیجر صاحب کہاں گئے۔

منیجر۔ یہ رہا۔ فرمایئے!

(قاضی صاحب آتے ہیں۔ انتہائی عربی لہجہ)

قاضی۔ السلام علیکم

کئی آوازیں۔ وعلیکم السلام

منیجر۔ ادھر آیئے قاضی صاحب۔ اس طرف۔ اس طرف۔

قاضی۔ بہت اچھا......

منیجر۔ چپراسی...... یہ خوان لئے کیوں کھڑے ہو.....

اُدھر میز پر رکھ دو۔ اُس میز پر۔

(طویل خاموشی۔ جسے وکیل توڑتا ہے۔)

وکیل۔ معاف کیجئے گا۔ یہ معاملہ کیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

قاضی صاحب قبلہ کیسے تشریف لانا ہوا۔

قاضی۔ بڑے تعجب کی بات ہے۔ معاف کیجئے گا۔ اور لوگ تو

خدا کو عقل سے پہچان لیں گے مگر وکیل دیکھ کر بھی نہ پہچانینگے

منیجر۔ قہقہہ

سہیلہ۔ (منیجر صاحب سے) منیجر صاحب۔ میں تو ذرا وکیل

صاحب کے ساتھ جاتی ہوں...... ایک ضروری کام ہے

...... بھائی صاحب...... میں آدھ گھنٹہ بعد

ملوں گی......

عبدالصمد۔ ٹھہرو ذرا۔

سہیلہ۔ مجھے ضروری کام ہے۔

عبدالصمد۔ ہم بھی چلتے ہیں۔

سہیلہ۔ میں بعد میں آجاؤں گی۔

عبدالصمد۔ ذرا ٹھہرو تو۔

سہیلہ۔ میں ٹھہر نہیں سکتی۔

عبدالصمد۔ ذرا تو ٹھہرو۔ ایسی کیا جلدی ہے۔ ٹھہرو۔

سہیلہ۔ جی نہیں۔

عبدالصمد۔ ایسے۔ ایسے۔ ایسے۔ لڑکی تو پاگل ہوئی ہے۔

مانتی نہیں (ڈانٹ کر) بیٹھو سیدھی طرح۔

سہیلہ۔ بھائی صاحب بات مت بڑھائیے۔

عبدالصمد۔ کیا بکتی ہے۔ خبردار جو ہلی جگہ سے..... قاضی

صاحب آپ شروع کیجئے۔

وکیل۔ (اکڑا ہوا سنجیدہ لہجہ) جناب من..... یہ کیا مذاق

ہو رہا ہے۔ مس صاحبہ کو جانے سے کوئی نہیں روک سکتا

...... لیکن نہیں مس صاحب آپ کہیں نہ جائیں۔

جناب من۔ یہ آپ کی چھوٹی بہن ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں

کہ آپ زبردستی سے کام لیں۔

عبدالصمد۔ (چیخ کر) آپ کون؟

وکیل۔ اور آپ کون؟

عبدالصمد۔ میں بڑا بھائی ہوں واضح رہے۔

وکیل۔ اور میں بڑے بھائی سے بھی زیادہ یعنی ان کا وکیل

ہوں۔ واضح رہے۔

عبدالصمد۔ وکیل ہوں گے آپ اُس مقدمہ کے لئے۔

وکیل۔ جی نہیں بلکہ اس مقدمہ کے لئے۔

عبدالصمد۔ کس مقدمہ کے لئے۔

وکیل۔ اس کے لئے کہ آپ جبر نہ کر سکیں۔ کوئی نکاح ہرگز

جبراً نہیں ہو سکتا۔

عبدالصمد۔ یہ مجھ کو معلوم ہے۔

وکیل۔ (سہیلہ سے) مس صاحبہ آپ ذرا نہ گھبرائیے۔ آپ

چپ چاپ بیٹھی رہیئے۔ بالکل چپ۔ ان کو کرنے دیجئے

نکاح۔ دیکھیں تو کیسے کرتے ہیں؟

عبدالصمد۔ قاضی صاحب بسم اللہ کیجئے آپ۔

قاضی۔ (کھانس کر) اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ڈاکٹر۔ (بات کاٹ کر) منکہ لیٰسین خاں ولد فراہیم خاں

میں نے پچاس ہزار روپیہ پر۔ آدھا معجل اور آدھا موجل

۔ ۔ ۔ پچاس ہزار روپیہ پر ۔ ۔ ۔ ان سے ۔ ۔ ۔ ۔

ان سے نکاح کرنا قبول کیا ہے۔ ان سے ۔ ۔ ۔ ان سے

۔ ۔ ۔ جناب سہیلہ قریشی صاحبہ سے ۔ ۔ ۔ نکاح قبول

کیا ہے۔

قاضی۔ تکرار کیجئے۔

ڈاکٹر۔ ہم حجت و تکرار کسی سے نہیں کرتے۔

قاضی۔ اجی تین دفعہ کہئے کہ قبول کیا۔

ڈاکٹر۔ (دہاڑ کر) قبول کیا چھتیس دفعہ ۔ ہزار دفعہ ۔ ۔ ۔ ۔

قبول کیا قبول کیا۔ اور نہیں تو ما سے یونہی جھک مارنے

آئے ہیں۔ قبول کیا۔ بالکل قبول کیا ۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔

وکیل۔ مس صاحبہ۔ آپ کیوں گھبراتی ہیں۔ خبردار۔ یہ تو

تماشا ہے۔

ڈاکٹر۔ ہاں تماشا ۔ ۔ ۔ وکیل صاحب ذرا سوچ سمجھ کر۔

قاضی۔ یہ لیجئے خانہ پری ہو گئی۔ اب دُلہن کا اقرار۔

ڈاکٹر۔ دُلہن کے اقرار کی قطعی ضرورت نہیں۔

وکیل۔ یہ کیسے؟

ڈاکٹر۔ خاموش رہئے آپ۔ قاضی صاحب آپ خود دُلہن

سے دریافت کیجئے۔

قاضی۔ (سہیلہ سے) آپ کو لیٰسین خاں صاحب ولد فراہیم خاں

صاحب سے بعوض پچاس ہزار روپیہ سکہ شاہی کہ نصف

جس میں مہر موجل و نصف مہر معجل ہے نکاح منظور ہے؟

وکیل۔ اس سوال کا جواب اپنی مؤکلہ کی طرف سے میں دونگا

ڈاکٹر۔ (گرج کر) آپ کون؟

وکیل۔ میں اپنی مؤکلہ کے نکاح کا شرعی وکیل ہوں۔ قاضی

صاحب قبلہ میری وکالت سے انکار نہیں کر سکتے۔

قاضی۔ آپ کی وکالت کی سند؟

وکیل۔ خود میری مؤکلہ موجود ہیں روبرو مس صاحبہ کہہ دیجئے۔

سہیلہ۔ میرا وکیل جواب دے گا۔ میں نے وکیل آپ کو کیا ہے۔

قاضی۔ (ڈاکٹر سے) ڈاکٹر صاحب آپ بتائیے کیا حکم ہے۔

ڈاکٹر۔ تو کیا آپ نے ان کو وکیل مان لیا۔

قاضی۔ جی ہاں!

ڈاکٹر۔ (بگڑ کر) خوب۔ خوب حضرت خوب ۔ ۔ ۔ فیس تو

آپ کو ہم دیں اور آپ دشمن سے مل گئے۔ قاضی صاحب

قبلہ ذرا سوچ کے۔ سوچ کر قبلہ۔

قاضی۔ یہ تو شرعی معاملہ ہے۔

ڈاکٹر۔ شرع ہم بھی جانتے ہیں۔ وکیل کوئی چیز نہیں

آپ لکھئے ۔ ۔ ۔

وکیل۔ مجھے نکاح نامنظور ہے۔

قاضی۔ ارے! اب کیا کروں

ڈاکٹر۔ وکیل صاحب ذرا ہوش سے۔ آپ جانتے ہیں میں

بڑا خونی آدمی ہوں۔

وکیل۔ (ہنس کر) معلوم کتنے خونی میں نے پھانسی چڑھوا دیئے۔

ڈاکٹر۔ (گرج کر) خبردار۔ قاضی صاحب آپ رجسٹر میں لکھیئے۔

قاضی۔ کیا لکھوں؟

ڈاکٹر۔ دُلہن کا نام خانے میں لکھ کر خانہ پُری ختم کیجئے۔

قاضی۔ بغیر دُلہن کے اقرار کے لکھ لوں۔

ڈاکٹر۔ اقرار کوئی چیز نہیں۔

قاضی۔ اصل چیز اقرار ہے۔

ڈاکٹر۔ پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ ارے صاحب مجھے دُلہن کے سب رشتہ داروں نے منظور کر لیا ہے۔

وکیل۔ اور نکاح؟

ڈاکٹر۔ (بگڑ کر) اور نکاح کے کیا سینگ ہوتے ہیں مطلب میرا یہ ہے کہ اس قاضی والے جھنجھٹ کی نہ تو مجھے ضرورت اور نہ اس صورت میں اس کا میں قایل۔ سوچا تھا کہ چلو رسم ہے یہ بھی کر لو۔ آپ لوگ نہیں مانتے نہ سہی ہٹاؤ قصہ۔

وکیل۔ پھر اس سے کیا مطلب؟

ڈاکٹر۔ مطلب میرا یہ ہے کہ کیا فائدہ ہوا جو میں دُلہن کو اپنی کہہ کر یوں ہی چلتا بنا۔

وکیل۔ آپ ناجائز دباؤ ڈالیں گے تو اس کے لئے قانون موجود ہے۔ اور اگر آپ نے ایسا فعل کیا تو وہ دفعہ ۳۶۶ کی تعریف میں رہے گا۔ مذاق نہ باشد۔

ڈاکٹر۔ جناب من۔ ان قانونی تعریفوں میں آنے جانے سے تو میں منع کرتا نہیں ہوں مگر ہاں یہ جانتا ہوں کہ ابھی ابھی اپنی دُلہن کو پھول کی طرح اُٹھا کر موٹر میں بٹھا کر رواں ہو جاؤں گا۔

وکیل۔ اور کوئی نہ روکے گا آپ کو؟

ڈاکٹر۔ روکنے والوں کے لئے ایک پانچ فائر کا ریوالور ایک بارہ فائر کا پستول۔ ایک کارتوسی بندوق اور ایک رائفل موجود ہے۔ یہ تو ہے اُن کتوں کے لئے جن کو آپ پولیس کہتے ہیں ورنہ ...... بہادروں کے لئے اور کچھ ....

وکیل۔ وہ کیا؟

ڈاکٹر۔ اس سے بھی زیادہ خطرناک ہتیار۔

وکیل۔ کیسے؟

ڈاکٹر۔ دو جوڑی جُوتے۔

(قہقہہ لگاتے ہیں سب)

ڈاکٹر۔ خیر اب مذاق ہو چکا۔ قاضی صاحب قبلہ آپ جلدی تحریر کیجئے۔

قاضی۔ کہہ چُکا کہ وکیل نے انکار کر دیا ہے۔

ڈاکٹر۔ وکیل کوئی چیز نہیں۔ یہ میں کہہ چکا۔

قاضی۔ وکیل سب کچھ ہے۔

ڈاکٹر۔ سب کچھ؟

قاضی۔ جی ہاں سب کچھ۔

ڈاکٹر۔ اور جو یہ وکیل صاحب ہاں کہہ دیں .... یہ کہہ دیں کہ قبول کیا تو؟

قاضی۔ تو ٹھیک ہے۔

ڈاکٹر۔ پھر تو آپ لکھ لیں گے؟ .... نکاح ہو جائے گا؟

...... کچھ جھگڑا پھر تو نہ رہے گا؟

قاضی۔ قطعی نہ رہے گا اور میں لکھ لوں گا۔

ڈاکٹر۔ (وکیل صاحب سے) وکیل صاحب!

وکیل۔ فرمائیے۔

ڈاکٹر۔ آپ کہئے کہ قبول کیا۔

وکیل۔ میں تو نہیں کہتا۔

ڈاکٹر۔ دیکھئے ٹھیک بات نہیں ہے۔ میں بُرا آدمی ہوں۔

وکیل۔ میں آپ کو جیل بھجوا دوں گا۔

ڈاکٹر۔ (نرمی سے) میرے پیارے وکیل صاحب۔ آپ اقرار کیجئے ورنہ ٹھیک نہ ہوگا۔ دیکھئے میں ڈاکٹر ہوں اور اس طرح گلا گھونٹ سکتا ہوں کہ آپ جلد سے جلد مر جائیں میں آپ کو مار ڈالوں گا۔

وکیل۔ (قہقہہ) بسم اللہ

(ڈاکٹر ایک دم سے وکیل پر جھپٹتا ہے اور اُس کا گلا دباتا ہے)

ڈاکٹر۔ اوں.... ہوں.... گلا گھونٹ دوں گا۔

وکیل۔ ارے میرا گلا.... خاخا.... عو۔ عوعو....

ڈاکٹر۔ چپراسی.... دروازے بند کرو.... کوئی روکے تو گولی مار دو.... گولی گولی۔

وکیل۔ غوع.... غو.... قاع۔ قہ.... ارے ارے۔ قہہ۔ غاخا.... مرا۔

ڈاکٹر۔ کہو قبول کیا۔

وکیل۔ قبول.... ع....

منیجر۔ ارے چھوڑیئے.... غضب!

ڈاکٹر۔ (دھاڑ کر) چپراسی.... گولی مار دو۔

چپراسی۔ بہت اچھا.... خبردار۔

منیجر۔ ارے مرا۔

قاضی۔ خدا کے لئے۔

ڈاکٹر۔ بولو۔ بولو۔ (وکیل کا گلا ڈھیلا کرتا ہے)

وکیل۔ (ہانپ کر زور سے سانس لے کر) قبول کیا۔

ڈاکٹر۔ پوری بات۔ پوری بات۔ پوری بات۔ پوری بات۔

وکیل۔ عا.. عا.. عا.... چھوڑو۔ ارے کہتا ہوں۔ قبول کیا۔ اپنی مؤکلہ کی طرف سے کہتا ہوں کیپٹن یٰسین خاں کو مذکورہ مہر و شرائط پر قبول کیا۔ قبول کیا۔ آہ۔ آہ۔ آع.... عا۔ آہ۔ ہائے مرا۔

ڈاکٹر۔ قاضی صاحب قبلہ۔ لکھیئے.... دیکھتے کیا ہیں۔

قاضی۔ خدا کی شان دیکھتا ہوں۔

ڈاکٹر۔ لکھیئے صاحب۔ قاضی صاحب قبلہ۔ شان بعد میں دیکھیئے گا۔

قاضی۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ

وکیل۔ آ آہ۔

ڈاکٹر۔ وکیل صاحب پڑے رہئے چپ۔ قاضی صاحب (چیخ کر) لکھیئے۔

قاضی۔ یہ رجسٹر سرکاری ہے۔

ڈاکٹر۔ ہم بھی جانتے ہیں۔

قاضی۔ پھر کیسے لکھ دوں؟

وکیل ۔ (ہنس کر) معلوم کتنے خونی میں نے پھانسی چڑھوا دیئے ۔

ڈاکٹر ۔ (گرج کر) خبردار ۔ قاضی صاحب آپ رجسٹر میں لکھیئے ۔

قاضی ۔ کیا لکھوں ؛

ڈاکٹر ۔ دُلہن کا نام خانے میں لکھ کر خانہ پُری ختم کیجئے ۔

قاضی ۔ بغیر دُلہن کے اقرار کے لکھ لوں ۔

ڈاکٹر ۔ اقرار کوئی چیز نہیں ۔

قاضی ۔ اصل چیز اقرار ہے ۔

ڈاکٹر ۔ پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ ۔ ارے صاحب مجھے دُلہن کے سب رشتہ داروں نے منظور کر لیا ہے ۔

وکیل ۔ اور نکاح ؛

ڈاکٹر ۔ (بگڑ کر) اور نکاح کے کیا سینگ ہوتے ہیں مطلب میرا یہ ہے کہ اس قاضی والے جھنجھٹ کی نہ تو مجھے ضرورت اور نہ اس صورت میں اس کا میں قایل ۔ سوچا تھا کہ چلو رسم ہے یہ بھی کر لو ۔ آپ لوگ نہیں مانتے نہ سہی ہٹاؤ قصہ

وکیل ۔ پھر اس سے کیا مطلب ؛

ڈاکٹر ۔ مطلب میرا یہ ہے کہ کیا فائدہ ہُوا جو میں دُلہن کو اپنی کہہ کر یوں ہی چلتا بنا ۔

وکیل ۔ آپ ناجائز دباؤ ڈالیں گے تو اس کے لئے قانون موجود ہے ۔ اور اگر آپ نے ایسا فعل کیا تو وہ دفعہ ۳۶۶ کی تعریف میں رہے گا ۔ مذاق نہ باشد ۔

ڈاکٹر ۔ جناب من ۔ ان قانونی تعریفوں میں آنے جانے سے تو میں منع کرتا نہیں ہوں مگر ہاں یہ جانتا ہوں کہ ابھی ابھی اپنی دُلہن کو پھول کی طرح اُٹھا کر موٹر میں بٹھا کر روانہ ہو جاؤں گا ۔

وکیل ۔ اور کوئی نہ روکے گا آپ کو ؛

ڈاکٹر ۔ روکنے والوں کے لئے ایک پانچ فائر کا ریوالور ایک بارہ فائر کا پستول ۔ ایک کارتوسی بندوق اور ایک رائفل موجود ہے ۔ یہ تو ہے اُن کتوں کے لئے جن کو آپ پولیس کہتے ہیں ورنہ ...... بہادروں کے لئے اور کچھ ....

وکیل ۔ وہ کیا ؛

ڈاکٹر ۔ اس سے بھی زیادہ خطرناک ہتیار ۔

وکیل ۔ کیسے ؛

ڈاکٹر ۔ دو جوڑی جُوتے ۔

(قہقہہ لگاتے ہیں سب)

ڈاکٹر ۔ خیر اب مذاق ہو چکا ۔ قاضی صاحب قبلہ آپ جلدی تحریر کیجئے ۔

قاضی ۔ کہہ چکا کہ وکیل نے انکار کر دیا ہے ۔

ڈاکٹر ۔ وکیل کوئی چیز نہیں ۔ یہ میں کہہ چکا ۔

قاضی ۔ وکیل سب کچھ ہے ۔

ڈاکٹر ۔ سب کچھ ؛

قاضی ۔ جی ہاں سب کچھ ۔

ڈاکٹر ۔ اور جو یہ وکیل صاحب ہاں کہہ دیں ..... یہ کہہ دیں کہ قبول کیا تو ؛

قاضی ۔ تو ٹھیک ہے ۔

ڈاکٹر ۔ پھر تو آپ لکھ لیں گے ؛ ..... نکاح ہو جائے گا ؛

. . . . . کچھ جھگڑا پھر تو نہ رہے گا؟

قاضی۔ قطعی نہ رہے گا اور میں لکھ لوں گا۔

ڈاکٹر۔ (وکیل صاحب سے) وکیل صاحب!

وکیل۔ فرمائیے۔

ڈاکٹر۔ آپ کہئے کہ قبول کیا۔

وکیل۔ میں تو نہیں کہتا۔

ڈاکٹر۔ دیکھئے ٹھیک بات نہیں ہے۔ میں بُرا آدمی ہوں۔

وکیل۔ میں آپ کو جیل بھجوا دوں گا۔

ڈاکٹر۔ (نرمی سے) میرے پیارے وکیل صاحب۔ آپ اقرار کیجئے ورنہ ٹھیک نہ ہوگا۔ دیکھئے میں ڈاکٹر ہوں اور اس طرح گلا گھونٹ سکتا ہوں کہ آپ جلد سے جلد مر جائیں میں آپ کو مار ڈالوں گا۔

وکیل۔ (قہقہہ) بسم اللہ

(ڈاکٹر ایک دم سے وکیل پر جھپٹتا ہے اور اس کا گلا دباتا ہے)

ڈاکٹر۔ اول . . . . ہوں . . . . . گلا گھونٹ دوں گا۔

وکیل۔ ارے میرا گلا . . . . . . خاخا . . . عو۔ عوعو . . . .

ڈاکٹر۔ چپراسی . . . . . دروازے بند کرو . . . . . کوئی روکے تو گولی مار دو . . . . گولی گولی۔

وکیل۔ غوع . . . . غو . . . . . قاع۔ قہ . . . . ارے ارے۔ قہہ۔ غاحا . . . . مرا۔

ڈاکٹر۔ کہو قبول کیا۔

وکیل۔ قبول . . . . ع . . . .

مینجر۔ ارے چھوڑیئے . . . . . غضب!

ڈاکٹر۔ (دہاڑ کر) چپراسی . . . . گولی مار دو۔

چپراسی۔ بہت اچھا . . . . خبردار۔

مینجر۔ ارے مرا۔

قاضی۔ خدا کے لئے۔

ڈاکٹر۔ بولو۔ بولو۔ (وکیل کا گلا ڈھیلا کرتا ہے)

وکیل۔ (ہانپ کر زور سے سانس لے کر) قبول کیا۔

ڈاکٹر۔ پوری بات۔ پوری بات۔ پوری بات۔ پوری بات۔

وکیل۔ عا . . . عا . . . چھوڑو۔ ارے کہتا ہوں۔ قبول کیا۔ اپنی مؤکلہ کی طرف سے کہتا ہوں کیپٹن یٰسین خاں کو مذکورہ مہر و شرائط پر قبول کیا۔ قبول کیا۔ آہ۔ آہ۔ آع . . . عا۔ آہ۔ ہائے مرا۔

ڈاکٹر۔ قاضی صاحب قبلہ۔ لکھیئے . . . . دیکھتے کیا ہیں۔

قاضی۔ خدا کی شان دیکھتا ہوں۔

ڈاکٹر۔ لکھیئے صاحب۔ قاضی صاحب قبلہ۔ شان بعد میں دیکھیئے گا۔

قاضی۔ لاحول ولا قوۃ الّا باللہ

وکیل۔ آ آہ۔

ڈاکٹر۔ وکیل صاحب پڑے رہیئے چُپ۔ قاضی صاحب (چیخ کر) لکھیئے۔

قاضی۔ یہ رجسٹر سرکاری ہے۔

ڈاکٹر۔ ہم بھی جانتے ہیں۔

قاضی۔ پھر کیسے لکھ دوں؟

ڈاکٹر۔ (بگڑ کر) آپ نے کہا تھا کہ وکیل کہہ دے تو لکھ دوں گا
اور پھر کوئی جھگڑا نہ ہوگا۔ اب یہ حرکت!

قاضی۔ مگر یہ جبراً کو کب کہا تھا؛

ڈاکٹر۔ نہ ابرن نہ جبراً۔ یہ کیا غضب ہے قاضی صاحب
غور فرمایئے۔ دُلہن کا بھائی مجھے برما سے بُلاتا ہے۔ دلہن
کا چچا۔ دُلہن کے خالو۔ دلہن کی خالہ اور ماموں اور بھائی
سب مجھ کو پسند کرتے ہیں اور لڑکی دینا منظور کرتے
ہیں اور آپ وکیل کا اڑنگا لگاتے ہیں تو وکیل بھی کہہ
دیتا ہے اور اب لگائی ہے آپ نے اپنی ابرن اور
جبراً۔ ذرا ہوش میں قبلہ۔

قاضی۔ (نرمی سے) ڈاکٹر صاحب میں مجبور ہوں۔

ڈاکٹر۔ دیکھئے قاضی صاحب آپ دشمن سے مل گئے لکھیئے
آپ قبلہ۔ (ڈانٹ کر) لکھیئے۔

قاضی۔ (گڑگڑا کر) مَیں کیسے لکھوں۔ عذابِ خدا سے
ڈرتا ہوں۔

ڈاکٹر۔ (دہاڑ کر) ارے میں خود عذابِ خداوندی ہوں قاضی
صاحب قبلہ۔

قاضی۔ خدا کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

ڈاکٹر۔ تو آپ نہیں لکھیں گے؛

قاضی۔ (چُپ رہتا ہے)

ڈاکٹر۔ بولئے۔

قاضی۔ لکھنے سے فائدہ کیا ہوگا۔ نکاح ناجائز۔

ڈاکٹر۔ (چیخ کر) اجی مجھے اس جھنجھٹ کی ضرورت ہی کب تھی۔
مگر تم یوں نہیں مانو گے۔ . . . . تیری قاضی قبلہ کی۔
اوں ہوں . . . . ہوں۔

(قاضی کا گلا گھونٹتا ہے۔)

قاضی۔ عوع۔ ارے مرا۔ عوع

(گلا دبنے کی دُوسری آوازیں)

ڈاکٹر۔ مار ڈالوں گا۔

مینیجر۔ ڈاکٹر صاحب یہ کیا . . . . .

عبد الصمد۔ چھوڑو۔

ڈاکٹر۔ چپراسی . . . . چپراسی . . . . گولی۔

چپراسی۔ ہٹو صاحب۔ ہٹو۔ ہٹو۔ (پستول دکھا کر)

قاضی۔ لکھتا ہوں۔ لکھتا ہوں . . . . .

(چھوڑتا ہے)

ڈاکٹر۔ (گرج کر) ابھی لکھو ایک منٹ میں۔ جان سے مار
ڈالوں گا۔

قاضی۔ یہ لو . . . . یہ لو . . . . اعوذ باللہ من الشیطان
الرجیم . . . . یا اللہ۔ یا اللہ۔

ڈاکٹر۔ (سہیلہ سے) بیگم صاحبہ محترمہ۔ مؤدبانہ التماس ہے
کہ اس خاکسار کے ساتھ چلیئے۔

سہیلہ۔ (خاموش)

ڈاکٹر۔ میری پیاری بیگم صاحبہ . . . . . (بڑھ کر ہاتھ
پکڑ کر اُٹھاتا ہے)

سہیلہ۔ (چیخ کر) ارے میرا ہاتھ ٹوٹا۔ چھوڑیئے۔

ڈاکٹر۔ اوہ۔ معاف کیجیئے گا۔ زور سے دب گیا۔ معاف کیجئے

میں نہایت ہی ادب سے معافی مانگتا ہوں۔ مجھ کو خیال رکھنا چاہئے تھا کہ عورتوں کے ہاتھ کمزور ہوتے ہیں۔ اور زور سے نہیں دبانا چاہئے۔ مجھے اُمید ہے آپ معاف کرینگی۔

سہیلہ۔ (خاموش)

ڈاکٹر۔ آیئے۔ اُٹھئے۔ میں ہاتھ زور سے ہرگز نہیں پکڑوں گا۔

سہیلہ۔ آپ زور سے ہاتھ دباتے ہیں . . . . . ارے میرا ہاتھ ٹوٹا۔

ڈاکٹر۔ اوہ . . . . . معاف کیجئے گا . . . . . . آیئے تشریف لایئے . . . .

سہیلہ۔ تو ہاتھ تو چھوڑیئے۔

ڈاکٹر۔ آپ کا ہاتھ چھوڑ دوں! خدا نہ چھڑائے . . . . . آیئے۔ آیئے۔

سہیلہ۔ ارے۔ ارے۔ بھائی صاحب۔ بھائی صاحب۔

ڈاکٹر۔ بھائی صاحب سے پھر ملیئے گا۔

سہیلہ۔ مگر نکاح . . . . .

ڈاکٹر۔ ہو تو گیا!

سہیلہ۔ نہیں ہُوا۔ . . .

ڈاکٹر۔ نہ سہی۔

سہیلہ۔ (پست آواز میں) قاضی صاحب۔ قاضی صاحب

قاضی صاحب۔ فرمایئے!

ڈاکٹر۔ پیاری بیگم صاحبہ۔ قاضی کو چولہے میں ڈالیئے۔

سہیلہ۔ (پست آواز میں) نکاح میں خامی ہے۔

ڈاکٹر۔ پختہ کرلیں گے۔ چلیئے۔

سہیلہ۔ بس ایک بات۔

ڈاکٹر۔ نہ ایک نہ آدھی۔

سہیلہ۔ قاضی صاحب رجسٹر میں لکھ لیجئے۔ لکھ لیجئے۔

قاضی۔ کیا لکھوں؟

سہیلہ۔ برضا ورغبت

ڈاکٹر۔ اچھا قاضی صاحب لکھ لیجئے۔ خدا حافظ۔ حضرات خدا حافظ۔ سرِ دست تو ہم جاتے ہیں۔

(ڈاکٹر اپنی دُلہن کو لے کر جاتا ہے۔ اور سب کہتے ہیں)۔

(خدا حافظ ـــــ خدا حافظ)

ڈاکٹر۔ (گرج کر) خدا حافظ!

عظیم بیگ چغتائی

نشیدِ شین

(ذیل کے نفسیاتی نقش سے اُس نظریہ کے (جس کو نظریۂ روح الحرف کہہ سکتے ہیں) اظہار کی کوشش کی گئی ہے کہ ہر حرفِ ابجد اپنا ایک جُدا رنگ و آہنگ رکھتا ہے اور ایک فردِ بشر کی طرح ایک امتیازی شخصیت کا مالک ۔ ایک روح کا حامل اور ایک جداگانہ تقدیر کا مظہر ہوتا ہے۔)

شینِ فرّی شاں ہوں مَیں شنجرف سا ہے رنگ مرا
شوخ ہوں شنگ ہوں شوریدہ ہی آہنگ مرا

"ش" ہوں کشورِ ابجد کا شہنشاہ ہُوں مَیں
دلکشی کے لئے مامورِ من اللہ ہوں مَیں

شفقِ شام میں ہے رنگ نمایاں میرا
اک شرر شرق میں خورشیدِ درخشاں میرا

ہے نشاط و طرب شمعِ شبستاں مجھ سے
ہے شکوہ و شرفِ خونِ شہیداں مجھ سے

عشق کے دل میں بنایا ہے نشیمن مَیں نے
کر دیا غمکدۂ خاک کو گلشن مَیں نے

رنگ پر داز ہوں مَیں حُسن کے افسانے میں
تو مجھے دیکھ کسی شوخ کے شرمانے میں

شجرِ شعر کی ہر شاخ ہے رنگیں مجھ سے
زندگی شاد ہے دُنیا ہے یہ شیریں مجھ سے

کیوں نہ ہو جلوہ نما شانِ جمالی مجھ میں
عارضِ شاہدِ قدرت کی ہے لالی مجھ میں

سیّد حمید کاظمی

ذہنی بیماریاں

بیماری دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک جسمانی مثلاً بخار، ہیضہ۔ دوسری ذہنی جیسے ہسٹیریا۔ جسمانی بیماری کا علاج دوا دارو سے کیا جاتا ہے لیکن ذہنی بیماری میں دوا دارو کام نہیں دیتے۔

اب سے کوئی پچاس برس پہلے ذہنی بیماریوں کے علاج کا کوئی طریقہ ہمیں معلوم نہ تھا۔ کیونکہ اس وقت تک ابھی یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ یہ ذہنی بیماریاں پیدا کس طرح ہوتی ہیں۔ ان بیماریوں کا علاج پہلے پہل ہمارے ہی زمانے میں دریافت ہُوا ہے۔

اس کا آغاز فرانس کے مشہور ڈاکٹر چارکو (Charcot) سے ہوتا ہے۔ اس نے پچھلی صدی کے آخری حصے میں یہ رائے ظاہر کی کہ ہسٹیریا اور دوسری ذہنی بیماریاں کسی جسمانی خرابی کی وجہ سے پیدا نہیں ہوتیں بلکہ ان کا تعلق ہمارے "خیالات" سے ہوتا ہے۔

چارکو کے بعد اس کے شاگرد ژانے (Janet) نے یہ بات پیش کی کہ ہر انسان کے اندر کئی انسان چھپے ہوتے ہیں۔ وُہ بیٹا بھی ہوتا ہے۔ خاوند بھی۔ سرکار کا ملازم بھی۔ اپنے وطن کا خیرخواہ بھی۔ کسی خاص مذہب کا پیرو بھی وغیرہ وغیرہ۔ جب تک اپنی ان مختلف حیثیتوں میں انسان سمجھوتے کی صُورت قائم رکھ سکتا ہے وہ ذہنی طور پر تندرست رہتا ہے۔ لیکن جس طرح کسی ملک میں خانہ جنگی کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی ریاستیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح انسان کے اندر بھی جب پھوٹ پڑ جاتی ہے تو اس سے ذہنی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ آپ نے ڈاکٹر جیکل و مسٹر ہائیڈ والی فلم دیکھی ہوگی۔ اس میں اسی پھوٹ کو ظاہر کیا گیا ہے۔ غالباً آپ اس ذہنی بیماری سے بھی واقف ہونگے جس میں مریض پر باری باری سے دو مختلف حالتیں طاری ہوتی ہیں۔ ایک حالت وہ جس میں وہ اپنے آپ کو وہی کچھ سمجھتا ہے جو وہ ہوتا ہے، پھر دوسری حالت طاری ہوتی ہے جس میں وہ نپولین یا شہنشاہ اکبر یا کچھ اَور بن جاتا ہے۔ اس حالت میں وہ اپنی اصلی حالت کو بھول جاتا ہے۔ ان دو حالتوں کا سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔ اس کی وجہ وہی ژانے والی پھوٹ ہے۔

اب ایک دوسری ذہنی بیماری کا حال سنیئے۔ اس میں بھی مریض پر دو مختلف حالتیں باری باری سے طاری ہوتی رہتی ہیں۔ ایک حالت میں وہ خوش ہوتا ہے حالانکہ خوش ہونے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہوتی۔ وُہ خوب باتیں کرتا ہے، ہنستا ہے۔ غُل مچاتا ہے۔ پھر دوسری حالت طاری ہوتی ہے اور وہ بغیر کسی وجہ کے اُداس، غمگین اور خاموش ہو جاتا ہے۔ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔ یہ بھی وہی پھوٹ ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ انسان میں یہ پھوٹ پیدا کس طرح ہوتی ہے۔ ژانے اس مشکل کو اچھی طرح حل نہ کر سکا۔

اس اُلجھن کو آخر کار آسٹریا کے مشہور ڈاکٹر فرائیڈ (Freud) نے سلجھایا۔

فرائیڈ کہتا ہے کہ ایک طرف ہماری خواہشیں ہیں۔ جنسی خواہشیں۔ بڑا بننے کی خواہشیں اور اسی طرح کی اور خواہشیں۔ دُوسری طرف سماج۔ تہذیب اور مذہب۔ سماج اور تہذیب کی بنیاد اس بات پر ہے کہ ہم اپنی خواہشوں کو قابو میں رکھیں کیونکہ اس کے بغیر سماجی زندگی ممکن نہیں۔ لیکن ہماری خواہشیں بھی کچھ ایسی نرم آسامی نہیں ہوتیں، وُہ ضد کرتی ہیں کہ ان کی تسکین کا سامان مہیا کیا جائے مثال کے طور پر جنسی خواہشوں کو لیجئے۔ اِن خواہشوں کی تسکین کے لئے سماج نے صرف ایک راہ مقرر کر دی ہے یعنی شادی مگر مشکل یہ ہے کہ موجودہ حالات میں شادی کوئی پچیس تیس برس کی عمر میں ہونے لگی ہے۔ اس وقت تک جنسی خواہشیں انتظار نہیں کر سکتیں مگر سماج اور تہذیب شادی کے سوا کسی دوسرے طریقے کی اجازت نہیں دیتیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سماج کی خاطر ہمیں اپنی خواہشوں کو دبانا پڑتا ہے۔

مگر جب ہم اپنی خواہشوں کو اُن کی تسکین کا سامان مہیا کئے بغیر ٹال دیتے ہیں۔ تو وُہ اُجالے سے سرک کر ہمارے دل کی اندھیری کوٹھڑی میں جا چھپتی ہیں۔ وہ خواہشیں ہماری آنکھ سے اوجھل تو ہو جاتی ہیں مگر مِٹ نہیں جاتیں بلکہ ہمارے دل میں جیتی جاگتی موجود ہوتی ہیں۔ اگرچہ ہم اس بات سے واقف نہیں ہوتے، اور یہی دل میں چھپی ہوئی خواہشیں ذہنی بیماریاں پیدا کرتی ہیں۔ آپ سوال کریں گے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ خواہشیں ہمارے دل کے اندر چھپی ہوں اور ہمیں اُن کی خبر نہ ہو۔ اِس سوال کا جواب دینے سے پہلے ایک اور بات کا بیان کر دینا ضروری ہے۔

فرائیڈ کا خیال ہے کہ ذہنی بیماریوں کی وجہ زیادہ تر جنسی خواہشیں ہوتی ہیں جن کو ہم سماج کی خاطر تسکین دیئے بغیر ٹال دیتے ہیں اور وہ ہمارے دل کے اندر جا چھپتی ہیں۔ ذہنی بیماریوں کے علاوہ یہ چھپی ہوئی خواہشیں ہماری عام زندگی پر بھی اثر ڈالتی ہیں۔ آپ کو جو لوگ اُداس صُورت، زندگی سے بیزار، بات بات پر خفا ہو جانے والے نظر آتے ہیں وہ سب اُن ہی دل میں چھپی ہوئی خواہشوں کے شکار ہیں۔

اس کے علاوہ جو خواب ہم سوتے میں دیکھتے ہیں، وہ بھی اکثر اُن چھپی ہوئی خواہشوں ہی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ گویا جن خواہشوں کو ہم ٹال دیتے ہیں، وہ تھوڑی بہت تسکین خواب کے ذریعہ سے پا لیتی ہیں۔ خوابوں کے علاوہ فحش گوئی، فلم، لطیفے، رومانی ناول اور غزل بھی ان چھپی ہوئی جنسی خواہشوں کی تسکین کا سامان مہیا کرتے ہیں۔

اب میں آپ کے سوال کا جواب دیتا ہوں، آپ نے یہ کہا تھا کہ اگر ہماری جنسی خواہشیں ہماری نظر سے اوجھل ہو جاتی ہیں، تو پھر ہمیں پتہ کیسے چلتا ہے کہ وہ ہمارے دِل کے اندر چھپی بیٹھی ہیں۔

اس کا جواب ہے : اُن اثرات سے جو وہ ہماری زندگی پر ڈالتی ہیں۔ جیسا کہ ذہنی بیماریاں۔ جو ان اثرات کی ایک مثال ہیں۔ اس پر آپ سوال کریں گے کہ یہ کس طرح پتہ چلا کہ ذہنی بیماریاں اِن خواہشوں کی وجہ سے ہوتی ہیں جن کو ہم نے ٹال دیا تھا اور جو ہمیں خبر ہوئے بغیر ہمارے دل کے اندر جا چھُپتی تھیں ؛ میں جواب دوں گا کہ ہسٹیریا اور دوسری ذہنی بیماریوں کا علاج اس طرح کیا جاتا ہے کہ ان دل میں چھپی ہوئی خواہشوں کا کھوج نکالا جاتا ہے اور انہیں دل کی اندھیری کوٹھڑی سے نکال کر اُجالے میں لایا جاتا ہے اور مریض کو بتایا جاتا ہے کہ تمہاری بیماری اس چھپی ہوئی خواہش کی وجہ سے تھی جس کو تم نے ٹال دِیا تھا۔ اس کے علاوہ اصل مشکل کا حل پیدا کرنے میں اُس کی مدد کی جاتی ہے۔ وہ اصلی مشکل کیا ہے ؛ وُہی ہماری خواہش کا زور ایک طرف اور سماج اور مذہب کی رُکاوٹیں دوسری طرف۔ مریض سے کہا جاتا ہے کہ وُہ اس مشکل کو ٹالنے کی کوشش نہ کرے، بلکہ اس کو اچھی طرح حل کرے تاکہ اس کی خواہشیں پھر دل میں نہ جا چھپیں۔ جب مریض کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی بیماری کی اصلی وجہ کیا تھی اور آئندہ کے لئے وہ اس مشکل کو اچھی طرح حل کر لیتا ہے تو اس کی ذہنی بیماری بھی دُور ہو جاتی ہے۔ اس پر آپ یہ سوال کریں گے کہ ان چھپی ہوئی خواہشوں کا کھوج کس طرح نکالا جاتا ہے۔ اِس سوال کا اِس وقت تفصیل سے جواب دینا مشکل ہے۔ اِس لئے اِس بارے میں مَیں صرف اتنا کہوں گا کہ ایک طریقہ چھپی ہوئی خواہشوں کے کھوج نکالنے کا ہپنوٹزم (Hypnotism) ہے۔

میں نے ابھی کہا تھا کہ یہ چھپی ہوئی خواہشیں ذہنی بیماریاں پیدا کرنے کے علاوہ تندرست انسان کی زندگی پر بھی اثر ڈالتی ہیں۔ اب میں چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔ جنسی خواہشوں کی مثالیں یہاں پیش نہیں کی جا سکتیں۔ اس لئے میں دوسری خواہشوں کا ذکر کروں گا۔ آپ کا کوئی دوست آپ کو شام کے کھانے کی دعوت دیتا ہے۔ آپ شام کو گھر سے نکلنا نہیں چاہتے۔ پھر بھی دوست کے اصرار پر مجبوراً دعوت قبول کر لیتے ہیں۔ مگر عین وقت پر اس دعوت کو بالکل بھُول جاتے ہیں اور جب دعوت کا وقت گزر جاتا ہے تو یاد آتا ہے اوہو مجھے تو دوست کے ہاں دعوت پر جانا تھا۔ یہ اکثر ہوتا ہے۔ مگر کیوں ؛ وجہ اس کی یہ ہوتی ہے کہ وُہ دُوسری خواہش کہ یہ دعوت کی آفت ٹل جاتی تو بہتر ہوتا۔ دل میں چھپی بیٹھی تھی۔ اور بغیر ہمیں خبر ہوئے اس نے دعوت کے خیال کو بالکل دماغ سے نکال دیا + آپ نے اُس صدر کا حال بھی سُنا ہوگا جو اُٹھا تو اس بات کا اعلان کرنے کہ "صاحبان۔ اب جلسہ کی کاروائی شروع ہوتی ہے۔" مگر کہہ یہ گیا کہ "صاحبان اب جلسہ کی کاروائی ختم ہوتی ہے۔" اس کی وجہ ؛ دل میں چھپی ہوئی خواہش کہ کہیں اس جلسے کا جھگڑا ختم ہو اور گھر چلیں + پھر اس عورت کا قصہ جو حکم چلانے کی عادی تھی۔ وہ اپنے خاوند کی بیماری کا حال اپنی سہیلی کو سُنا رہی ہے : "ڈاکٹر صاحب آج میرے خاوند کو دیکھنے آئے تھے۔ وہ کہہ گئے ہیں پرہیز کی ضرورت نہیں جو مَیں چاہوں وہ کھا سکتے ہیں۔" نہیں نہیں مجھ سے غلطی ہوئی "جو وہ چاہیں وہ کھا سکتے ہیں"۔ یہ غلطی کیوں ہوئی ؛ 'جو وہ چاہیں وہ کھا سکتے ہیں' کے بدلے 'جو مَیں چاہوں وہ کھا سکتے ہیں'۔ کیوں مُنہ سے نکل گیا ؛ اس کی وجہ خاوند پر حکومت کرنے کی خواہش + ایک اور مثال

اس بزرگ کی جنھوں نے تقریر کرتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ" اس پانچ لاکھ کی آبادی والے شہر میں اس بات کو سمجھنے والے ہاتھ کی ایک انگلی پر گنے جا سکتے ہیں۔" اور پھر معافی مانگتے ہوئے کہا۔" مجھ سے غلطی ہوئی، ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔" اس غلطی کی وجہ ؛ دل میں چھپا ہُوا خیال کہ اس شہر میں یہ بات صرف ایک شخص سمجھتا ہے اور وہ مَیں ہوں۔

ان مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے دل میں چھپی ہوئی ایسی خواہشیں ہوسکتی ہیں جن کی موجودگی کا خود ہمیں بھی علم نہ ہو اور یہ بھی کہ ایسی چھپی ہوئی خواہشیں ہماری زندگی پر اثر ڈال سکتی ہیں۔

فرائڈ پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس نے جنسی خواہشوں پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے اور ہماری دوسری خواہشوں کو بالکل نظرانداز کر دیا ہے۔ اس کمی کو ڈاکٹر آڈلر (Adler) نے پورا کیا۔ آڈلر کا خیال ہے کہ ذہنی بیماریوں کی جڑ جنسی خواہشیں نہیں بلکہ بڑا بننے کی خواہش ہے۔ ہر انسان میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ وُہ بڑا بنے۔ مگر ایک تو یہ مشکل پیش آتی ہے کہ ہر ایک میں بڑا بننے کی خواہش تو موجود ہوتی ہے مگر صلاحیت موجود نہیں ہوتی۔ اور دوسری یہ کہ لوگ اس کو بڑا بننے نہیں دیتے۔ گھر کے اندر ماں باپ بڑے بھائی صاحب اس کی چلنے نہیں دیتے اور گھر سے باہر دوسرے لوگ۔ الیکشن لڑا ہار گئے۔ افسر نے ڈانٹ دیا، ہمسائے نے کھری کھری سنا دیں۔ اس پر ستم یہ کہ دولت پاس نہیں۔ علم بھی واجبی سا۔ چھوٹا سا قد، ناک بیٹھی ہوئی۔ جب ان مصیبتوں کا خیال آتا ہے تو اپنے گھٹیا پن کا احساس ہوتا ہے جس سے دل دُکھتا ہے۔ وہ اپنے گھٹیا پن کے خیال کو بھول جانا چاہتا ہے۔ آخر کار وہ خیال دبا دیا جاتا ہے۔ مگر وہی جنسی خواہشوں والا قصہ پیش آتا ہے۔ اپنے گھٹیا پن کا خیال اُجالے سے سرک کر دل کی اندھیری کوٹھڑی میں جا چھپتا ہے۔

آڈلر کا خیال ہے کہ یہ دل میں چھپا ہُوا اپنے گھٹیا پن کا خیال ذہنی بیماریوں کی جڑ ہے نہ کہ جنسی خواہشیں جیسا کہ فرائڈ کہتا ہے۔

اب سنیئے۔ صُورت یہ ہوئی انسان بڑا بننا چاہتا ہے۔ بڑا بننے کی کوشش کرتا ہے مگر کامیاب نہیں ہوتا۔ اس ناکامی سے دل دُکھتا ہے۔ جس سے اپنے گھٹیا پن کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس خیال کو آخر کار انسان بھُول جاتا ہے۔ مگر گھٹیا پن کا خیال مِٹ نہیں جاتا بلکہ دل میں جا چھپتا ہے۔ اب ایک طرح سے وہی لڑنے والی پھوٹ پڑ جاتی ہے۔ اندر اپنے گھٹیا پن کا خیال اور باہر بڑا بننے کی خواہش۔

پھر اب کیا کیا جائے ؛ سیدھی طرح تو بڑا بننا مشکل ہے۔ اب دوسرے طریقوں سے اپنی تسلی کیجئے۔ جب سیدھی اُنگلی سے گھی نہیں نکلتا تو اُسے ٹیڑھا کرنا پڑتا ہے۔ بیوی کو ڈانٹا، بچوں کو پیٹا، مہترانی کی خبر لی۔ کمشنر صاحب کے دفتر کو جہاں آپ ملازم ہیں" میرا دفتر" کہا۔ فوجی قسم کی مونچھیں رکھیں۔ اس کے علاوہ ضلع کا حاکم سکول میں ساتھ پڑھتا رہا ہے۔ لاٹ صاحب کی طرف سے ٹی پارٹی کا دعوتی رقعہ بھی تو آیا ہے۔ اس شہادت کے بعد بڑا آدمی ہونے میں شبہ کی کیا گنجائش ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی بڑائی کی تہ میں وہی دل میں چھپا ہُوا اپنے گھٹیا پن کا احساس ہے۔ یہ حرکات ایسے شخص سے سرزد نہیں ہوسکتیں جسے اپنی ذاتی بڑائی کا یقین ہو۔

کلبوں، خفیہ مجلسوں، فرقے بندی، پارٹی بازی کی تہ میں بھی وہی اپنے گھٹیا پن کا احساس ہوتا ہے۔ کمزور اور گھٹیا انسان

ریوڑ اور گلّے کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ فرد پارٹی کا ممبر بن کر محفوظ ہو جاتا ہے۔ اور پارٹی کے ممبر آپس میں ایک دوسرے کی تعریف سے بڑے بھی بن جاتے ہیں۔

تمغے، خطابات، اعزازات بھی ان انسانوں کو بڑا بنا دیتے ہیں جن میں بڑا بننے کی صلاحیت موجود نہیں ہوتی۔

ایک طریقہ بڑا بننے کا یہ ہے کہ آپ لوگوں سے اُونچے ہو جائیں۔ اور دُوسرا یہ کہ آپ دوسروں کو نیچے لے آئیں۔ یہ نہایت سہل ہے۔ جب دو چار دوست اکٹھے ہوئے دُنیا بھر کو احمق، ذلیل، کمینہ بنا دیا۔ نتیجہ؟ آپ کے تیس مارخاں ہونے میں شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

ہم دوسروں کی نسبت سے بھی بڑے بن سکتے ہیں۔ "اِن سے ملئے آپ فلاں خان بہادر کی سالی کے بیٹے ہیں"، "یہ فلاں ڈپٹی کمشنر صاحب کے داماد ہیں"، "وہ لاہور کے رئیس اعظم کے ہم زلف ہیں"۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ گھٹیا پن کا خیال چھپ کر کام بھی کرتا رہا اور بڑے بھی بن گئے۔ آپ کو جو لوگ شیخی باز، دوسروں کی عیب جوئی کرنے والے اور پارٹی باز نظر آتے ہیں وہ سب اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اندر اپنے گھٹیا پن کا احساس باہر بڑا بننے کی خواہش۔

اب شاید آپ یہ سوال کریں کہ اب فرائڈ کی بات مانی جائے یا آڈلر کی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فرائڈ اور آڈلر دونوں تقریباً ایک ہی بات کہتے ہیں۔ وہ یہ کہ ذہنی بیماریاں دل میں چھپی ہوئی خواہشوں کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ اور ان کے علاج کا طریقہ بھی دونوں کا ایک ہی سا ہے۔ یعنی چھپی ہوئی خواہشوں کو اندھیرے سے نکال کر اُجالے میں لانا۔ فرق اتنا ہے کہ فرائڈ جنسی خواہشوں پر زیادہ زور دیتا ہے اور آڈلر بڑا بننے کی خواہش پر۔ مگر ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ فرائڈ بڑا بننے کی خواہش کا منکر نہیں اور نہ آڈلر جنسی خواہشوں کا۔

نتیجہ اس ساری گفت گو کا یہ ہے کہ جو مشکلات ہمیں پیش آئیں اُنہیں ٹالنے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ ان کا مناسب حل سوچا جائے۔ اسی بات پر ہماری ذہنی صحت کا دار و مدار ہے۔

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو)

سعید اللہ

اس بزرگ کی جنہوں نے تقریر کرتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ " اس پانچ لاکھ کی آبادی والے شہر میں اس بات کو سمجھنے والے ہاتھ کی ایک انگلی پر گنے جا سکتے ہیں " اور پھر معافی مانگتے ہوئے کہا " مجھ سے غلطی ہوئی، ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں " اس غلطی کی وجہ ؛ دل میں چھپا ہوا خیال کہ اس شہر میں یہ بات صرف ایک شخص سمجھتا ہے اور وہ میں ہوں۔

ان مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے دل میں چھپی ہوئی ایسی خواہشیں ہو سکتی ہیں جن کی موجودگی کا خود ہمیں بھی علم نہ ہو اور یہ بھی کہ ایسی چھپی ہوئی خواہشیں ہماری زندگی پر اثر ڈال سکتی ہیں۔

فرائڈ پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس نے جنسی خواہشوں پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے اور ہماری دوسری خواہشوں کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کمی کو ڈاکٹر آڈلر (Adler) نے پورا کیا۔ آڈلر کا خیال ہے کہ ذہنی بیماریوں کی جڑ جنسی خواہشیں نہیں بلکہ بڑا بننے کی خواہش ہے۔ ہر انسان میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ بڑا بنے۔ مگر ایک تو یہ مشکل پیش آتی ہے کہ ہر ایک میں بڑا بننے کی خواہش تو موجود ہوتی ہے مگر صلاحیت موجود نہیں ہوتی۔ اور دوسری یہ کہ لوگ اس کو بڑا بننے نہیں دیتے۔ گھر کے اندر ماں باپ بڑے بھائی صاحب اس کی چلنے نہیں دیتے اور گھر سے باہر دوسرے لوگ۔ الیکشن لڑا ہار گئے۔ افسر نے ڈانٹ دیا، ہمسائے نے کھری کھری سنا دیں۔ اس پر ستم یہ کہ دولت پاس نہیں۔ علم بھی واجبی سا۔ چھوٹا سا قد، ناک بیٹھی ہوئی ۔ جب ان مصیبتوں کا خیال آتا ہے تو اپنے گھٹیا پن کا احساس ہوتا ہے جس سے دل دُکھتا ہے۔ وہ اپنے گھٹیا پن کے خیال کو بھول جانا چاہتا ہے۔ آخرکار وہ خیال دبا دیا جاتا ہے۔ مگر وہی جنسی خواہشوں والا قصہ پیش آتا ہے۔ اپنے گھٹیا پن کا خیال اُجالے سے سرک کر دل کی اندھیری کوٹھڑی میں جا چھپتا ہے۔

آڈلر کا خیال ہے کہ یہ دل میں چھپا ہوا اپنے گھٹیا پن کا خیال ذہنی بیماریوں کی جڑ ہے نہ کہ جنسی خواہشیں جیسا کہ فرائڈ کہتا ہے۔

اب سنیے۔ صورت یہ ہوئی انسان بڑا بننا چاہتا ہے۔ بڑا بننے کی کوشش کرتا ہے مگر کامیاب نہیں ہوتا۔ اس ناکامی سے دل دُکھتا ہے۔ جس سے اپنے گھٹیا پن کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس خیال کو آخرکار انسان بھول جاتا ہے۔ مگر گھٹیا پن کا خیال مٹ نہیں جاتا بلکہ دل میں جا چھپتا ہے۔ اب ایک طرح سے وہی تڑانے والی پھوٹ پڑ جاتی ہے۔ اندر اپنے گھٹیا پن کا خیال اور باہر بڑا بننے کی خواہش۔

پھر اب کیا کیا جائے ؛ سیدھی طرح تو بڑا بننا مشکل ہے۔ اب دوسرے طریقوں سے اپنی تسلی کیجیے۔ جب سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا تو اُسے ٹیڑھا کرنا پڑتا ہے۔ بیوی کو ڈانٹا، بچوں کو پیٹا، مہترانی کی خبر لی۔ کمشنر صاحب کے دفتر کو جہاں آپ ملازم ہیں " میرا دفتر " کہا۔ فوجی قسم کی مونچھیں رکھیں۔ اس کے علاوہ ضلع کا حاکم سکول میں ساتھ پڑھتا رہا ہے۔ لاٹ صاحب کی طرف سے ٹی پارٹی کا دعوتی رقعہ بھی تو آیا ہے۔ اس شہادت کے بعد بڑا آدمی ہونے میں شبہ کی کیا گنجائش ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی بڑائی کی تہ میں وہی دل میں چھپا ہوا اپنے گھٹیا پن کا احساس ہے۔ یہ حرکات ایسے شخص سے سرزد نہیں ہو سکتیں جسے اپنی ذاتی بڑائی کا یقین ہو۔

کلبوں، خفیہ مجلسوں، فرقہ بندی، پارٹی بازی کی تہ میں بھی وہی اپنے گھٹیا پن کا احساس ہوتا ہے۔ کمزور دار گھٹیا انسان

ریوڑ اور گلّے کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ فرد پارٹی کا ممبر بن کر محفوظ ہو جاتا ہے۔ اور پارٹی کے ممبر آپس میں ایک دوسرے کی تعریف سے بڑے بھی بن جاتے ہیں۔

تمغے، خطابات، اعزازات بھی ان انسانوں کو بڑا بنا دیتے ہیں جن میں بڑا بننے کی صلاحیت موجود نہیں ہوتی۔

ایک طریقہ بڑا بننے کا یہ ہے کہ آپ لوگوں سے اُونچے ہو جائیں۔ اور دُوسرا یہ کہ آپ دوسروں کو نیچے لے آئیں۔ یہ نہایت سہل ہے۔ جب دو چار دوست اکٹھے ہوئے دُنیا بھر کو احمق، ذلیل، کمینہ بنا دیا۔ نتیجہ؛ آپ کے تیس مار خاں ہونے میں شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

ہم دوسروں کی نسبت سے بھی بڑے بن سکتے ہیں۔ "ان سے ملیے آپ فلاں خان بہادر کی سالی کے بیٹے ہیں"، "یہ فلاں ڈپٹی کمشنر صاحب کے داماد ہیں"، "وہ لاہور کے رئیس اعظم کے ہم زلف ہیں"۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ گھٹیا پن کا خیال چھپ کر کام بھی کرتا رہا اور بڑے بھی بن گئے۔ آپ کو جو لوگ شیخی باز، دوسروں کی عیب جوئی کرنے والے اور پارٹی باز نظر آتے ہیں وہ سب اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اندر اپنے گھٹیا پن کا احساس باہر بڑا بننے کی خواہش۔

اب شاید آپ یہ سوال کریں کہ اب فرائیڈ کی بات مانی جائے یا آڈلر کی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فرائیڈ اور آڈلر دونوں تقریباً ایک ہی بات کہتے ہیں۔ وہ یہ کہ ذہنی بیماریاں دل میں چھپی ہوئی خواہشوں کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ اور ان کے علاج کا طریقہ بھی دونوں کا ایک ہی سا ہے۔ یعنی چھپی ہوئی خواہشوں کو اندھیرے سے نکال کر اُجالے میں لانا۔ فرق اتنا ہے کہ فرائیڈ جنسی خواہشوں پر زیادہ زور دیتا ہے اور آڈلر بڑا بننے کی خواہش پر۔ مگر ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ فرائیڈ بڑا بننے کی خواہش کا منکر نہیں اور نہ آڈلر جنسی خواہشوں کا۔

نتیجہ اس ساری گفتگو کا یہ ہے کہ جو مشکلات ہمیں پیش آئیں اُنہیں ٹالنے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ ان کا مناسب حل سوچا جائے۔ اسی بات پر ہماری ذہنی صحت کا دارومدار ہے۔

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو)

سعید اللہ

راوی پر ایک رات

(کسی کے ساتھ)

اے حُسنِ دِل آرا تری چاہت کے سہارے آیا ہوں بہت دُور سے راوی کے کنارے

راوی کے کنارے

سرشار کئے دیتی ہیں سرشار ہوائیں جاں بخش ہیں کس درجہ یہ خاموش فضائیں

اور دل میں اُمنگیں ہیں کہ بھرتی ہیں طرارے

راوی کے کنارے

پُرکیف سماں ساری فضا جُھوم رہی ہے مستی ہے کہ شاعر کے قدم چُوم رہی ہے

بدمست کئے دیتے ہیں بدمست نظارے

راوی کے کنارے

دیتے ہیں بصد ناز جو موجوں کو سلامی فردوس کی حوروں کے ہیں شاید یہ پیامی

نوٹ :- یہ نظم میں نے لاہور کے دورانِ قیام میں کہی تھی ۔ نظر

سہمے ہوئے پانی میں چمکتے ہوئے تارے
راوی کے کنارے

وہ سامنے ہیں اُن کی نظر دیکھ رہا ہوں　　مَیں جذبِ محبّت کا اثر دیکھ رہا ہوں
پھر دِل میں بھڑکتے ہیں محبت کے شرارے
راوی کے کنارے

جذبات کے طوفاں میں بہے جاتے ہیں دونوں　　افسانہ محبّت کا کہے جاتے ہیں دونوں
اور ایسے میں اللہ یہ پُرکیف نظارے
راوی کے کنارے

یہ کیف میں ڈوبے ہوئے رنگین نظارے　　گودی میں فلک کی یہ جھپکتے ہوئے تارے
"کرتے ہیں مسافر کو محبّت سے اشارے"
راوی کے کنارے

نظر حیدرآبادی

ہندی اور اُردو کا مسئلہ

یہ مضمون پنڈت دشونا تھ درآہ جموی بی۔اے پریذیڈنٹ بزم اُردو جموں وکشمیر نے 'بزم' کے ایک جلسہ میں پڑھا جس کے صدر میاں بشیر احمد صاحب بیرسٹرایٹ لا۔ایڈیٹر رسالہ 'ہمایوں' لاہور تھے۔

اے قادر وخبیر لاثانی۔ اپنی قدرتِ کاملہ سے انسانی ضمیر کو نورانی بنا۔ تاکہ ہم معیارِ صداقت پر حالات اور واقعات کی تمیز کرسکیں اے سرچشمۂ نورِ حقیقت۔ میری تحریر میں صداقت کی وہ برقی رو پیدا کر جو روشنی میں تبدیل ہو کر میرے ہم وطنوں کے لئے مشعلِ ہدایت ثابت ہو۔

محترم صدر و دیگر حضرات! میں آپ پر بطور تمہید یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے اُردو زبان سے محبت بدرجۂ عشق ہے۔ نیز اس حقیقت کو چھپانا میں گناہِ عظیم خیال کرتا ہوں۔ اس سے میرا مفہوم یہ نہیں کہ ہندی یا سنسکرت سے مجھے نفرت ہے یا ان سے مغائرت۔ دیوبانی (Divine Language) سنسکرت سے مجھے مذہبًا محبت ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے مسلم بھائیوں کو عربی سے کیونکہ قرآن کریم عربی زبان میں ہے۔

اُردو زبان سے میری محبت اس امر سے بخوبی روشن ہے کہ میں بزمِ ادبِ اُردو کے خدام میں سے ہوں۔ آج نہیں پچیس تیس سال سے۔ یعنی جس دن سے ہوش سنبھالا۔ یہاں میں یہ بات صاف کردینا چاہتا ہوں کہ معزز سامعین ایک غلط نتیجہ اخذ کریں گے اگر وہ یہ سمجھیں کہ اُردو زبان کا میں اس لئے دلدادہ ہوں کہ میں اس بزم کا ایک خادم ہوں۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے یعنی اُردو زبان کو میں ہندوستان کی زبان خیال کرتا ہوں اس لئے مجھے اس سے اس قدر دلچسپی ہے کہ میں عرصۂ دراز سے اس کی خدمت کررہا ہوں۔

اس تشریح سے میرا مقصد یہ نہیں کہ میرے زاویۂ نگاہ پر آزادانہ اور دیانتدارانہ نکتہ چینی نہ کی جائے۔ میں اس نکتہ چینی کا خیر مقدم کرتا ہوں، جو علم کی سچی راہنما ہو۔ حضرات اب میں اصل مضمون کی طرف رجوع کرتا ہوں:۔

حالات جن میں اُردو زبان پیدا ہوئی

علت اور معلول کا قانون عالمِ موجودات پر حاوی ہے۔ جو چیز عالمِ وجود میں آئی اُس کا ظہور اسباب وعلل سے ہوا۔ یہ عالمگیر قانون زبانوں پر بھی اثر افگن ہے۔ زبانیں اس لئے معرضِ وجود میں آئیں کہ انسان اپنے خیالات کا اظہار کرسکے۔ خیالات کی

پیچیدگیوں کے ساتھ ہی ساتھ زبان بھی بتدریج نشو ونما پانے لگی - اسے خیالات کے ساتھ ساتھ ارتقائی منزلیں طے کرنی پڑیں - یہ ہے زبانوں کی ولادت کا قصہ - رہی اُردو زبان - اس کی تولید کی وجہ کچھ اور ہے - چند ہی صدیاں ہوئیں کہ یہ زبان عدم سے ہستی کے گلزار میں آئی - ایسا کیوں ہُوا یہ امر بحث طلب ہے :-

اسلام ایک جُداگانہ مذہبی اور تمدنی حیثیت رکھتا ہے - اگر ایسا نہ ہوتا تو ہندو دھرم کم از کم ہندوستان میں اسے بھی اپنے اندر جذب کر لیتا جس طرح ہندوستان میں اسلام کے وارد ہونے سے پہلے تقریباً تمام بیرونی فاتح قوموں کے مذہب، زبان اور تمدن کو ہندو دھرم نے فنا کا جامہ پہنایا - چونکہ اسلام ہندو دھرم میں جذب نہ ہُوا - یہ حقیقت ہی اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ اسلام نہ صرف جُداگانہ ہستی کا دعویٰ کرتا ہے بلکہ انصافاً اسلام اپنے مذہبی عقاید اور تمدنی نقطۂ نگاہ کو خیرباد نہیں کہہ سکتا - سیاسی طور پر یہ مطالبہ کیا جا سکتا ہے کہ میرے ہندو مسلم بھائی خالص ہندوستانی جذبہ سے سرشار رہیں - مذہباً ہم اس کے مجاز نہیں -

یہاں میں ایک دلچسپ حقیقت کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں - کچھ سال ہوئے ہندوستان میں ایک عجیب بحث چھڑی کہ ہندو مسلمان پہلے ہندوستانی ہیں یا پہلے ہندو اور مسلم یعنی پہلے قوم ہے یا پہلے مذہب - کاش میرے ہم وطنوں نے ذرا غور کیا ہوتا تو حقیقت واضح ہو جاتی - پہلے اور پیچھے کا سوال پیدا ہی نہ ہوتا -

جس گھر میں ہم پیدا ہوئے اُس کا مذہب ہمارا مذہب ہے - جس سرزمین میں ہم پیدا ہوئے، جہاں کے اناج پانی اور ہوا میں ہم نے پرورش پائی - وہی ہمارا وطن ہے - زندگی کی یاترا میں روح اور جسم لازم و ملزوم ہیں - ہماری روحانی ترقی کا راز ہمارے مذہب یعنی پرستشِ الٰہی میں مضمر ہے - ہماری ہستی جسم و جان کے تعلق سے قائم ہے - ولادت کے وقت بھی اور زندگی بھر بھی دونوں عمیق تعلقات سے وابستہ ہیں - اس لئے دین و دُنیا دونوں ہماری توجہ کے مستحق ہیں - بسا اوقات اگلے وقتوں کے لوگ پہاڑوں کے غاروں میں دُنیا سے بے تعلق ہو کر انفرادی روحانی ترقی میں کوشاں رہے - لیکن آج کل ہم اس کے قائل نہیں - مردانِ خدا نے اپنی تعلیم اور اپنی مثال سے اس کے خلاف ثابت کیا ہے - مثلاً گیتا اور قرآن پر ایک سرسری نظر بھی اس حقیقت کو روزِ روشن کی طرح عیاں کر دیتی ہے کہ سری کرشن اور حضرت محمدؐ نے دُنیا میں رہ کر ہستی کے کارزار میں فتح اور شکست کی پروا نہ کرتے ہوئے ایک ایسی دیانتدارانہ جد وجہد کی تعلیم دی ہے جس میں ہمارا ہر فعل خدائے ذوالجلال کی خدمت میں ہدیہ ہو - انسان نہ دین کو چھوڑے نہ دُنیا کو - یعنی عشقِ الٰہی کی روشنی میں دُنیائے عمل میں کُود پڑے :-

یقیں محکم - عمل پیہم - محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں (اقبال)

اگر عمل ایسا ہو گا تو اِنسان اُس اخلاقی اور رُوحانی شاعرِ اعظم کے زبردست اعتراض سے بچ سکتا ہے جس نے پُرزور الفاظ

میں انسان کو ہمیشہ کے لئے متنبہ کیا ہے ؎

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں　　　این خیال است و محال است و جنوں　　　(مولانا روم)

مختصراً صاف الفاظ میں کیوں نہ کہہ دوں کہ حبّ الوطنی عشقِ الٰہی کی ضد نہیں۔ اگر شک ہو تو مہاتما گاندھی اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کو تمثیلاً پیش کرتا ہوں۔ ذی فہم ناظرین کے لئے یہ اشارہ کافی ہے۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔
میں یہ بتا رہا تھا کہ اسلام کے پسِ پشت وہ مذہب اور تمدّن کارفرما ہیں جن کا سنگِ بنیاد تقریباً چودہ صدی پیشتر بانیٔ اسلام نے رکھا۔

اُردو زبان نے ہندی مسلم اور شمالی ہند کے ہندوؤں کے تمدّن و تہذیب کے گہوارہ میں پرورش پائی۔ ہندو ذہنیت اِس اہم کام میں ہمیشہ برادرانِ وطن کے دوش بدوش رہی۔ اور وہ اس لئے کہ اس زبان کو ہندو مسلم کا باہمی سمجھوتا یا مشترکہ ورثہ سمجھا گیا فسانۂ آزاد کے یگانۂ روزگار مصنف پنڈت رتن ناتھ درسرشار، زندہ جاوید مثنوی گلزارِ نسیم کے نوجوان شاعر پنڈت دیاشنکر کول نسیم اور پنڈت چکبست اُردو زبان کو اگر اپنی زبان نہ سمجھتے تو یقیناً اس کی خاطر لہو پسینہ ایک نہ کرسکتے۔ ہندو مسلم اتحاد کی بدیہی دلیل یہ ہے کہ ایک طرف گلزارِ نسیم اور امانت کی اندرسبھا میں ہندو دیومالا کی نوری مخلوق کو مسلم عقاید کے مطابق ناری مخلوق کے ساتھ عجیب طریق پر مخلوط کیا گیا۔ (میرا مطلب راجہ اندر اور پریوں سے ہے۔ ہندوؤں میں اندر کے ساتھ اپسرائیں یعنی حوریں والبتہ ہیں پریاں نہیں) تو دوسری طرف پنڈت رتن ناتھ در نے مسلم یو۔پی سوسائٹی کے نوابوں سے لے کر ادنےٰ طبقہ کے مسلمانوں تک تمام رنگ دکھا دیئے۔ دل اجازت نہیں دیتا کہ ان ہندو مسلم بزرگوں کی محنتِ شاقہ یوں برباد ہوتی نظر آئے اور ہم دیکھا کریں۔ اگر میری آواز میں طاقت ہوتی تو ان تمام سبھاؤں، سوسائٹیوں سے اتنا عرض کئے بغیر نہ رہتا کہ خدارا اس غریب بے زبان پر رحم کرو جس پر ہندو مسلم بزرگوں نے عظیم الشان شہنشاہِ اکبر کے جذبۂ قومی کی حکمتِ عملی کو مدّتِ دراز کے بعد سمجھ کر اور اس پر عمل پیرا ہو کر) ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد رکھی۔

اس تمام سمع خراشی سے آپ حضرات کو اس حقیقتِ نفس الامری کا بتانا مقصود ہے کہ ہند میں قدرتاً ایسے حالات پیدا ہوئے جو اُردو زبان کی تولید کا باعث بنے۔ ضرورتِ وقت نے اسے پیدا کیا۔ کسی خاص فرقہ کے فعلِ ارادی نے نہیں۔ یعنی جب مسلم حملہ آوروں نے ہندوستان میں بود و باش اختیار کی تو کچھ مدت گزرنے پر انہوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان اُن کا وطن ہے۔ اور ہندو اُن کے ہم وطن۔ فطرتاً یہ احساس بھی ہوا کہ اُس اجنبیت کو ہٹایا جائے جو فاتح اور مفتوح اقوام کی دُوری کا باعث ہوا کرتی ہے اس تحریک نے زندگی کی دو مختلف شاہراہوں پر اپنی جولانیاں دکھائیں:-

۱۔ زبان کے لحاظ سے دو رائج الوقت زبانوں (یعنی ہندی اور فارسی) کو ملانا شروع کیا۔ یہ جتانا اشد ضروری ہے کہ ہندوؤں

نے بھی اسے لبیک کہا۔ فارسی اور عربی الفاظ کا استعمال تلسی داس جی اور سور داس جی جیسی عالی شان مذہبی ہستیوں نے بھی روا رکھا۔

(۲) مذہباً ہندو مسلم فقیروں نے دونوں اقوام کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی بہت کوشش کی۔ (الف) رامانند جی۔ اُن کے بارہ چیلے (جن میں اچھوت بھی شامل تھے) اور بعد کے وشنو بھگت اس تحریک کے ہندو پیشرو تھے۔ پنجاب کے شہرۂ آفاق عاشقِ الٰہی گرونانک جی نے اِس تحریک میں اہم کام کیا۔ (ب) خاندانِ غلاماں کے عہدِ حکومت میں (تقریباً ۱۲۲۵ء میں) ایک بڑے مُسلم مہاتما نظام الدینؒ اولیاء کا ظہور ہُوا۔ شاید یہ پہلے مسلمان ہیں جن کا روشن دِل ہندو مُسلم اتحاد کی آماجگاہ تھا۔ اس کے بعد شمالی ہند میں بھگتی کے آسمان پر صوفیائے کرام کی ایک کہکشاں سی نظر آتی ہے۔ (نوٹ: حضرت خواجہ اجمیری اگرچہ نظام الدین اولیاء سے پہلے ہوگزرے ہیں، لیکن اُنھوں نے خصوصیت سے ہندو مسلم اتفاق کی طرف توجہ نہیں دی۔ ابھی آغاز ہی تھا) اِس میں شک نہیں کہ یہ بزرگ اولیاء (نظام الدین) مذہبی بلکہ روحانی شخصیت رکھتے تھے لیکن ان کے ایک پیارے مُرید یعنی شہرۂ آفاق شاعر امیر خسرو نے ان کے رُوحانی پیغام کو مسائلِ دُنیوی کے سانچہ میں بھی ڈھال دیا۔

عالی نسب ہندوستانی اور ترک والدین کے نجیب الطرفین نورِ نظر امیر خسرو نے فارسی اور ہندی زبانوں پر عبور کامل حاصل کیا۔ وُہ اصحاب جنھوں نے اس شاعرِ اعظم کے سوانح حیات کا مطالعہ فرمایا ہے، بخوبی جانتے ہیں کہ امیر خسرو رواداری کا مجسمہ تھے۔ اس عجیب و غریب ہستی نے اپنا اثر و رسُوخ اُن مسلمان بادشاہوں سے ہندو رعایا کو مراعات دلانے میں استعمال کیا جن کی قربت اِس وجہ سے شاعرِ خسرو کو حاصل تھی کہ یہ شہرہ آفاق شاعر بے پناہ قابلیت کا مالک تھا اور فنِ شاعری میں ماہرِ کامل۔

غیاث الدین بلبن کو فارسی شاعری سے عشق تھا۔ شروع میں امیر خسرو کو اسی سرپرست کی عنایاتِ خسروانہ کا فخر حاصل ہے۔ بلبن سے محمد تغلق تک سات فرمانرواؤں نے اِس شاعرِ اعظم کو اپنی مصاحبت سے نوازا۔ اس تمام عرصہ میں شاعرِ خسرو کی توجہ ایک نکتہ پر مرکوز رہی کہ ہندو مسلم منافقت کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکے۔ جو اصحاب خسرو کو فقط ایک جلیل القدر شاعر ہی جانتے ہیں یقیناً اس سے ناانصافی کرتے ہیں۔ یہ وہ برگزیدہ ہستی ہے جس نے بانگ دہل ہندو مسلم اتحاد کا اعلان کیا۔ محمد تغلق کو ہندی سکھائی۔ اس کے محل کا نام "سورگ دوار" رکھا۔ اسی مصاحبت کا اثر تھا کہ تغلق بادشاہ پانی بھی دریائے گنگا کا پیا کرتا۔ اس کے علاوہ امیر خسرو نے اپنے مرشدِ روحانی سے اجازت دِلوائی کہ بسنت کا تہوار تمام نظامیہ متعلقات میں منایا جائے۔ کیا یہ عرض کرنے کی ضرورت ہے کہ آج تک یہ تہوار منایا جاتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ بعض ہم عصروں نے شاعرِ خسرو کے مذہبی رجحان پر شک کیا۔ خسرو نے بھی سُنا۔ آتش کا پرکالہ بھڑک ہی تو

لہ بعض لوگ اس سے منکر ہیں۔ شاعرِ خسرو کے خراسانی والدین کے قایل ہیں۔ راقم الحروف کو اس سے قطعی انکار ہے۔ مگر یہ معاملہ ایک علیحدہ مضمون کا حامل ہو سکے گا۔

میں انسان کو ہمیشہ کے لئے متنبہ کیا ہے ؎

ہم خدا خواہی وہم دنیائے دوں ‌‌‌‌ ‌ ‌ این خیال است ومحال است وجنوں (مولانا روم)

مختصراً صاف الفاظ میں کیوں نہ کہہ دوں کہ حبّ الوطنی عشقِ الہٰی کی ضد نہیں۔ اگر شک ہو تو مہاتما گاندھی اور امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کو تمثیلاً پیش کرتا ہوں۔ ذی فہم ناظرین کے لئے یہ اشارہ کافی ہے۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔

میں یہ بتا رہا تھا کہ اسلام کے پسِ پشت وہ مذہب اور تمدّن کارفرما ہیں جن کا سنگِ بنیاد تقریباً چودہ صدی پیشتر بانیِ اسلام نے رکھا۔

اُردو زبان نے ہندی مسلم اور شمالی ہند کے ہندوؤں کے تمدّن وتہذیب کے گہوارہ میں پرورش پائی۔ ہندو ذہنیت اِس اہم کام میں ہمیشہ برادرانِ وطن کے دوش بدوش رہی۔ اور وہ اس لئے کہ اس زبان کو ہندو مسلم کا باہمی سمجھوتا یا مشترکہ ورثہ سمجھا گیا۔ فسانۂ آزاد کے یگانۂ روزگار مصنف پنڈت رتن ناتھ درسرشار، زندہ جاوید مثنوی گلزارِ نسیم کے نوجوان شاعر پنڈت دیاشنکر کول نسیم اور پنڈت چکبست اُردو زبان کو اگر اپنی زبان نہ سمجھتے تو یقیناً اس کی خاطر لہو پسینہ ایک نہ کر سکتے۔ ہندو مسلم اتحاد کی بدیہی دلیل یہ ہے کہ ایک طرف گلزارِ نسیم اور امانت کی اندر سبھا میں ہندو دیومالا کی نُوری مخلوق کو مسلم عقاید کے مطابق ناری مخلوق کے ساتھ عجیب طریق پر مخلوط کیا گیا۔ (میرا مطلب راجہ اندر اور پریوں سے ہے۔ ہندوؤں میں اندر کے ساتھ اپسرائیں یعنی حوریں وابستہ ہیں پریاں نہیں) تو دوسری طرف پنڈت رتن ناتھ درنے مسلم یو۔پی سوسائٹی کے نوابوں سے لے کر ادنےٰ طبقہ کے مسلمانوں تک تمام رنگ دکھا دیئے۔ دل اجازت نہیں دیتا کہ ان ہندو مسلم بزرگوں کی محنتِ شاقہ یوں برباد ہوتی نظر آئے اور ہم دیکھا کریں۔ اگر میری آواز میں طاقت ہوتی تو ان تمام سبھاؤں، سوسائیٹیوں سے اتنا عرض کئے بغیر نہ رہتا کہ خدارا اس غریب بے بان پر رحم کرو جس پر ہندو مُسلم بزرگوں نے عظیم الشان شہنشاہِ اکبر کے جذبۂ قومی کی حکمتِ عملی کو مدّتِ دراز کے بعد سمجھ کر اور اس پر عمل پیرا ہو کر) ہندو مُسلم اتحاد کی بنیاد رکھی۔

اس تمام سمع خراشی سے آپ حضرات کو اس حقیقتِ نفس الامری کا بتانا مقصود ہے کہ ہند میں قدرتاً ایسے حالات پیدا ہوئے جو اُردو زبان کی تولید کا باعث بنے۔ ضرورتِ وقت نے اسے پیدا کیا۔ کسی خاص فرقہ کے فعلِ ارادی نے نہیں۔ یعنی جب مسلم حملہ آوروں نے ہندوستان میں بود وباش اختیار کی تو کچھ مدت گزرنے پر انہوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان اُن کا وطن ہے۔ اور ہندو اُن کے ہم وطن۔ فطرتاً یہ احساس بھی ہوا کہ اُس اجنبیت کو ہٹایا جائے جو فاتح اور مفتوح اقوام کی دُوری کا باعث ہُوا کرتی ہے۔ اس تحریک نے زندگی کی دو مختلف شاہراہوں پر اپنی جولانیاں دکھائیں:۔

۱۔ زبان کے لحاظ سے دو رائج الوقت زبانوں (یعنی ہندی اور فارسی) کو ملانا شروع کیا۔ یہ جتانا اشد ضروری ہے کہ ہندوؤں

نے بھی اسے لبّیک کہا۔ فارسی اور عربی الفاظ کا استعمال تلسی داس جی اور سور داس جی جیسی عالی شان مذہبی ہستیوں نے بھی روا رکھا۔

(۲) مذہباً ہندو مسلم فقیروں نے دونوں اقوام کو ایک دُوسرے کے قریب لانے کی بہت کوشش کی۔ (الف) رامانند جی۔ اُن کے بارہ چیلے (جن میں اچھوت بھی شامل تھے) اور بعد کے وشنو بھگت اس تحریک کے ہندو پیشرو تھے۔ پنجاب کے شہرۂ آفاق عاشقِ الٰہی گرو نانک جی نے اِس تحریک میں اہم کام کیا۔ (ب) خاندانِ غلاماں کے عہدِ حکومت میں (تقریباً ۱۲۲۵ء میں) ایک بڑے مُسلم مہاتما نظام الدینؒ اولیاء کا ظہور ہوا۔ شاید یہ پہلے مسلمان ہیں جن کا روشن دِل ہندو مُسلم اتحاد کی آماجگاہ تھا۔ اس کے بعد شمالی ہند میں بھگتی کے آسمان پر صوفیائے کرام کی ایک کہکشاں سی نظر آتی ہے۔ (نوٹ:۔ حضرت خواجہ اجمیری اگرچہ نظام الدین اولیاء سے پہلے ہو گزرے ہیں، لیکن اُنہوں نے خصوصیت سے ہندو مسلم اتفاق کی طرف توجہ نہیں دی۔ ابھی آغاز ہی تھا) اِس میں شک نہیں کہ یہ بزرگ اولیاء (نظام الدین) مذہبی بلکہ روحانی شخصیت رکھتے تھے لیکن ان کے ایک پیارے مُرید یعنی شہرۂ آفاق شاعر امیر خسرو نے ان کے رُوحانی پیغام کو مسائلِ دُنیوی کے سانچہ میں بھی ڈھال دیا۔

عالی نسب ہندوستانی اور تُرک والدین کے نجیب الطرفین نورِ نظر امیر خسرو نے فارسی اور ہندی زبانوں پر عبورِ کامل حاصل کیا۔ وُہ اصحاب جنہوں نے اس شاعرِ اعظم کے سوانح حیات کا مطالعہ فرمایا ہے، بخوبی جانتے ہیں کہ امیر خسرو رواداری کا مجسمہ تھے۔ اس عجیب و غریب ہستی نے اپنا اثر و رسُوخ اُن مسلمان بادشاہوں سے ہندو رعایا کو مراعات دلانے میں استعمال کیا جن کی قربت اِس وجہ سے شاعر خسرو کو حاصل تھی کہ یہ شہرۂ آفاق شاعر بے پناہ قابلیت کا مالک تھا اور فنِ شاعری میں ماہرِ کامل۔

غیاث الدین بلبن کو فارسی شاعری سے عشق تھا۔ شروع میں امیر خسرو کو اسی سرپرست کی عنایاتِ خسروانہ کا فخر حاصل ہے بلبن سے محمد تغلق تک سات فرمانرواؤں نے اِس شاعرِ اعظم کو اپنی مصاحبت سے نوازا۔ اس تمام عرصہ میں شاعر خسرو کی توجہ ایک نکتہ پر مرکوز رہی کہ ہندو مسلم منافقت کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکے۔ جو اصحاب خسرو کو فقط ایک جلیل القدر شاعر ہی جانتے ہیں یقیناً اس سے ناانصافی کرتے ہیں۔ یہ وہ برگزیدہ ہستی ہے جس نے ببانگِ دہل ہندو مسلم اتحاد کا اعلان کیا۔ محمد تغلق کو ہندی سکھائی۔ اس کے محل کا نام "سورگ دوار" رکھا۔ اسی مصاحبت کا اثر تھا کہ تغلق بادشاہ پانی بھی دریائے گنگا کا پیا کرتا۔ اس کے علاوہ امیر خسرو نے اپنے مرشدِ روحانی سے اجازت دِلوائی کہ بسنت کا تہوار تمام نظامیہ متعلقات میں منایا جائے۔ کیا یہ عرض کرنے کی ضرورت ہے کہ آج تک یہ تہوار منایا جاتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ بعض ہم عصروں نے شاعر خسرو کے مذہبی رجحان پر شک کیا۔ خسرو نے بھی سُنا۔ آتش کا پرکالہ بھڑک ہی تو

---

[۱] بعض لوگ اس سے منکر ہیں۔ شاعر خسرو کے خراسانی والدین کے قایل ہیں۔ راقم الحروف کو اس سے قطعی انکار ہے۔ مگر یہ معاملہ ایک علیحدہ مضمون کا حامل ہو سکے گا۔

گیا۔ شاعر تو تھا ہی۔ مزید برآں نظام الدین اولیا، جیسے مرشدِ روحانی کا پیارا مُرید۔ علانیہ پکار اُٹھا ؎

کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست

ملاحظہ فرمائیں کس استغنائے کامل سے خسرو ہندو مسلم نفاق سے اونچا پرواز کر گیا۔

امیر خسرو نہ صرف فارسی اور ہندی کا صفِ اوّل کا شاعر تھا بلکہ فارسی اور ہندی کی ملی جُلی شاعری کا بھی پیشرو ؎

زحالِ مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں

یہ شاعری اُس دردِ دل کے طوفان کی ذراسی جھلک ہے جو شاعر کے سینے میں موجزن تھا۔ یعنی زبان کے ذریعے سے ہموطنوں کا ملاپ ہو جائے۔ یہ بات خواب و خیال میں بھی نہ تھی کہ چند صدیوں کے بعد مشترکہ زبان پیدا ہوگی۔ اُردو زبان کا بانی بھی اگر شاعر خسرو قرار دیا جائے تو میری رائے میں مبالغہ نہ ہوگا۔

اس صلح و آشتی کے پیغامبر نے نہ صرف قران السّعدین کہی بلکہ فاتح اور مفتوح اقوام میں مصالحت کی بے ریا کوشش کی۔ یہ تب ہُوا جب اسلامی حکومت کا آغاز محض تھا۔ مسلم بھائیوں نے جب تک ہندوستان کو اپنایا نہ تھا۔

کہا جاتا ہے کہ شعراء کو کبھی کبھی الہام سا ہوتا ہے۔ پھر صاحبِ دل شاعر پر ایک روشن حقیقت اگر جلوہ افگن ہوئی تو تعجب ہی کیا۔

قصہ مختصر یہ حق ہیں اور حق گو شاعر ہمارے بدبخت ملک کی سیاسی تاریخ کے بحرِ ظلمات میں ایک مینارِ روشنی ہے جس کا واحد مقصد یہ تھا کہ ہندی قومیت کے جہاز کو تعصب اور فرقہ وارانہ جنگ و جدل کی خوفناک پوشیدہ چٹانوں سے بچائے۔

امیر خسرو اکبرِ اعظم اور موجودہ ہندی کانگرس کا پیشرو اور پیشوا ہے۔ اگر مجھ پر ہرزہ سرائی کا اتہام نہ لگایا جائے تو میں اپنی تائید میں پنڈت گووند بلبھ پنتھ (وزیرِ اعظم یو۔پی) کے اُس پیغام کی طرف محترم سامعین کی توجہ مبذول کروں گا جو اُنہوں نے ۱۴ دسمبر ۱۹۳۷ء کو خواجہ حسن نظامی صاحب کے نام ارسال فرمایا یعنی :۔

"امیر خسرو ہندو مسلم اتحاد کا بانی ہے" (اخبار منادی)

حضرات! ہم دیکھ چکے ہیں :۔

(۱) مہاتماؤں اور فقیروں کی کوششیں یعنی ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد روحانیت پر۔

(۲) قومی یگانگت کی کوشش اتحادِ معاشرت اور اتحادِ زبان پر۔

(۳) اتحادِ روحانی۔ اتحادِ معاشرت اور اتحادِ زبان کا اجتماع شاعر خسرو میں۔

اب تاریخی بحث و تحمیص کا سلسلہ معزز سامعین کے گوشگزار کرتا ہوں۔

اُردو زبان کو جائے اتصال قرار دیا گیا یعنی :۔

فاتح قوم فارسی سے اُردو پر آئی۔ مفتوح قوم ہندی سے اُردو پر + اس سے میری مُراد یہ نہیں کہ اُردو زبان فارسی اور ہندی میں ان معنوں میں ایک درمیانی چیز تھی جس کی بانٹ فی صدی پچاس پچاس کے حصّے سے ہو۔ میں اس سے منکر ہوں۔ میں ہندی کو اُردو زبان کا حقیقی ماخذ سمجھتا ہوں۔ مجھ سے اگر استفسار کیا جائے کہ زبان کے مسئلہ میں کس نے زیادہ قربانی کی۔ ہندی والوں نے یا فارسی والوں نے؟ میں بے کھٹکے یہی کہوں گا کہ مؤخر الذکر یعنی مسلم فاتح نے + استدلال عقلی اور مشاہداتِ عملی کی روشنی میں مجھے صاف طور پر نظر آتا ہے کہ فارسی اور فقط فارسی جاننے والے کے لئے اُردو غیر مُلکی زبان ہے (آپ کسی نووارد ایرانی پر عملاً یہ تجربہ کرسکتے ہیں) برعکس اس کے ہندی اور فقط ہندی جاننے والے کے لئے اُردو زبان سیکھنے میں ہندی سے اتنی مشابہت اور مناسبت موجود ہے کہ اس ارتباط اور اختلاط سے کوئی ذی فہم انکار نہیں کرسکتا۔ اوّل الذکر کو ایک زبان سیکھنی پڑے گی۔ مؤخر الذکر کو فارسی کے الفاظ۔ اُس سے کم عربی۔ بہت کم تُرکی اور انگریزی الفاظ سیکھنے ہوں گے۔

اس حقیقت کو وضاحت سے بیان کرتا ہوں۔ اُردو زبان بنانے میں ہندی مُسلم نے یہ نہیں کیا کہ فارسی زبان اختیار کرتا اور اُس میں ہندی اور سنسکرت الفاظ داخل کرتا۔ اُس نے ہندی زبان کو ترجیح دی جس میں تمام فعل، اسم ضمیر، حروفِ ربط، تمام ہندی محاورات لے لئے۔ بلکہ فارسی محاورات کے ساتھ ہندی مصدر لگا کر انہیں ہندوستانی جامہ پہنا دیا۔ اُردو زبان کے اشتقاق عموماً ہندی ہیں۔ اسم ہندی زبان کے علاوہ فارسی، عربی، تُرکی زبانوں کے بھی ہیں + فارسی اور عربی الفاظ کسی انتقامی جذبہ کے زیرِ اثر اُردو زبان میں داخل نہیں کئے گئے بلکہ اس لئے کہ مسلم برادرانِ وطن کو اس میں ایک قدرتی سہولت نظر آئی۔ اظہارِ خیال کے لئے بہت سے فارسی اور عربی الفاظ مِل گئے جن سے اس وقت کے ہندو بھی آشنا ہو چکے تھے۔ یہ حقیقت فراموش نہیں کی جاسکتی کہ عربی مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ اس زبان سے اُنہیں بیگانہ دیکھنے کا متمنّی وہی ذی فہم ہوسکتا ہے جو ہندوؤں کو سنسکرت (دیوبانی) سے ناآشنا دیکھنے کا روادار ہو +

ممکن ہے بعض اصحاب کا یہ خیال ہو کہ فاتح قوم نے اِس میں اپنی سُبکی سمجھی کہ مفتوح قوم کی زبان کلیۃً اختیار کرے۔ یہ خیال نہ تو فیاضانہ پہلو رکھتا ہے، نہ دانشمندانہ۔ اسے واحد اعتراض سے رد کیا جاسکتا ہے۔ یعنی رسم الخط کی مشکلات کے علاوہ فارسی مسلمانوں کے لئے تاریخی اور تمدّنی درجہ رکھتی تھی (حکومت کی زبان بھی یہی تھی) اور عربی مذہبی حیثیت۔

مغلیہ خاندان بابر سے شاہجہان تک قومی جذبہ سے سرشار تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اکبرِ اعظم فیاض دلی اور عمیق قومی بصیرت میں سب پر سبقت لے گیا۔ اس شاہنشاہ کے عہدِ حکومت کے آخری بیس سال میں زبان اُردو کے اولیں نشانات ریختہ شاعری میں ملتے ہیں۔ اکبر کے قومی جذبات کی حکمتِ عملی کا تسلیم اور خرّم کے عہدِ حکومت میں جاری رہنے کا اثر ہوگا کہ شاہجہان کے عہد میں اُردو عدم سے وجود میں آئی۔ بالآخر شاعرِ اعظم امیر خسرو کے روشن خواب نے تعبیر پائی +

ایک اور نکتہ پیش کرتا ہوں۔ سامعین فیصلہ خود کریں۔ مگر انصاف شرط ہے۔ بات یہ ہے کہ ہندو دھرم اور ہندو بھیتا اُردو زبان کو اپنانے کی وجہ سے اُس وقت تو اسلام میں جذب نہ ہوئے جب مسلمان ہندوستان میں مطلق العنان شاہنشاہ تھے۔ اب تو معاملہ ہی اَور ہے، اب ہندو اپنی ہستی کو کیا کھوئیں گے جب ہندی مُسلم بھی محکوم حیثیت میں ہندوؤں کے دوش بدوش ہیں۔

یہ ہے برہنہ حقیقت۔ ہٹ دھرمی دوسری بات ہے۔ رہا وہم تو اس کے علاج سے لقمان بھی عاجز تھا۔

ہندی اور اُردو کا وطن ۔ ہندی اور اُردو کی ولادت ہند میں ہوئی۔ دونوں ہمارے وطن کی زبانیں ہیں۔ اُردو ایران و عرب میں پیدا نہ ہوئی۔ صرف ہندوستانی اسے بولتے ہیں۔ صرف ہندوستانی اسے لکھتے ہیں۔ اس زبان کی بعض ہندو بھائیوں کی طرف سے اتنی مخالفت کیوں ہو رہی ہے میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ اس کی وجہ کیا یہ ہے کہ بعض تنگ نظر مسلمان بھائیوں نے اس کا اجارہ لے رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ٹھیک جس طرح اسی قسم کے تنگ نظر ہندو ہندی زبان سے کر رہے ہیں۔ اس بڑھتی ہوئی اجنبیت بلکہ مخاصمت میں بعض اُن ہندوؤں اور مسلمانوں کو میں بری الذمہ نہیں کر سکتا جن کی حدِ نگاہ وسعت کا پہلو نہیں رکھتی یعنی وہ متعصب بھی ہیں اور قوم کے دشمن بھی۔ ان اصحاب کی شناخت یہ ہے کہ آئے دن مشکل سے مشکل اور غیر قدرتی ہندی اور اُردو ترکیبوں کو تشکیل دے رہے ہیں۔ میری ہمدردانہ نصیحت ان پیارے ہم وطنوں کو یہ ہے کہ اس کوشش کو خیرباد کہیں حقیقت تو یہ ہے کہ مشکل ثقیل اور ناآشنا ترکیبیں ہندی اور اُردو کی خوبصورتی کو خاک میں ملا دیں گی۔ اپنی قومی زبانوں کی مٹھاس، روانی، حُسن، سامع نوازی، قصّہ مختصر اس کی زندگی کو برباد نہ ہونے دیجئے۔ ان برادرانِ وطن کو میری نصیحت کڑوی معلوم ہوگی۔ سچائی تلخ ہوا کرتی ہے اور اُسے علانیہ بیان کرنا تلخ تر۔ لیکن مجھے اُمید ہے کہ صحیح الدّماغ اور قوم پرست ہندو مسلم بھائی میری اس التجا کو ہمدردانہ نگاہ سے دیکھیں گے۔ کیونکہ یہ ایک درد بھرے دل کی پکار ہے۔

ہندی اور اُردو کو اپنے قدرتی دَور سے گزرنے دو۔ تمثیلاً عرض کرتا ہوں کہ چند تنگ نظر مسلمان بھائی اُردو زبان کو جس قدر مشکل اور غیر قدرتی بنا کر اس کا اجارہ لینے کی کوشش کرتے جائیں گے اُسی قدر ہندو زاویۂ نگاہ اس سے بدظن ہوتا جائے گا۔ اور اُس تنگ نظر ہندو طبقہ کو (جس کا ذکر ابھی کر چکا ہوں) ایسی چیز ملتی رہے گی جس سے وُہ ہندو اکثریت کے دلوں کو اُردو کے خلاف مسموم کر سکے گا۔ اسی طرح مشکل ہندی یعنی ہندی نما سنسکرت کا زہر آلود اثر مسلمانوں پر ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح مسلم عوام کو ہندی سے قطعی نفرت ہو جائے۔ اس حقارت اور نفرت کی دو دھاری تلوار سے قومیت ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ فرقہ وارانہ مخاصمت جسے تباہ کرنے کی کوشش ہر ہندوستانی کا فرضِ اولیں ہے غیر قدرتی زبانوں سے پنپتی جائے گی اور ہماری پیاری زبانیں بھی اس ادبی مجادلہ کے ذریعہ سے ایک ایسی صورت پیدا کریں گی جس سے متحدہ قومیت کا پیدا ہونا دشوار ہو جائے گا۔ میں اپنے ہندو بھائیوں کو محسوس کرانا چاہتا ہوں کہ اُردو زبان ایک مشترکہ قومی زبان ہے جس کی بنیاد ہندی پر ہے اور اس کے زیرِ اثر ہندی مُسلم اور شمالی ہند کے

ہندو ہیں۔ جیسے ہندی زبان ہندوستان کے بعض صوبوں میں یقیناً قومی زبان ہے۔

ایرانیوں نے فارسی میں عربی الفاظ داخل کئے لیکن اُن کی قومیت فنا نہ ہوئی۔ انگریزوں کی اینگلو سیکسن زبان میں بھاری اکثریت (۷۵%) برّ اعظم یورپ کی زبانوں کے الفاظ کی ہے اور انگریزوں نے اپنی قومیت نہ کھوئی۔ میں کہتا ہوں اور برزور کہتا ہوں کہ اصل ہندی ترکیب میں چند فارسی، عربی اور ترکی الفاظ کا استعمال (جسے ہم نے اُردو کا نام دے رکھا ہے) ہندو دھرم اور ہندو سبھیتا کے ہزاروں برسوں کے مضبوط شجر کے لئے تبر ثابت نہیں ہو سکتا۔ نہ چند ہندی مانوس الفاظ (جملہ کی ترکیب تو اُردو کی ہندی بنیاد پر قائم ہے) کے استعمال سے مسلم بھائی ڈیڑھ ہزار سال کے مذہب اور تمدن کو کھو سکتے ہیں لیکن یہ سب کچھ تبھی ہو سکتا ہے اگر اپنے دلوں کو محبت کے رنگ میں رنگ دو۔ اُس باہمی اُلفت اور یگانگت کے ننھے پودے کی (جس کا بیج شاعر خسرو اور شاہنشاہ اکبر نے بویا تھا) از سر نو آبیاری کرو۔ اپنے دلوں کو نیکی اور رواداری کے چشمے بنا دو۔

پیارے ہندو مسلم بھائیو۔ یہ بخوبی جانتے ہو کہ خدا محبت ہے، محبت کا منبع ہے، محبت کے ذریعہ ہی سے محبت کے لامحدود چشمہ تک رسائی ہے ؎

محبت ہستی فانی میں رکھتی ہے نشاں اپنا — محبت لامکاں میں بھی بناتی ہے مکاں اپنا
محبت بن کے آتی ہے خدا کی رحمت باقی — محبت ہے وہ مے جس کا فقط اللہ ہے ساقی (ماہر)

رسم الخط کا مسئلہ

ہندی آریہ (Indo - Aryans) کہاں سے آئے۔ اس بارے میں تین خیال پیش کئے گئے ہیں۔ (۱) بعض ہندوستانیوں کی رائے ہے کہ آریہ شمالی ہند ہی کے باشندے تھے۔ (۲) انگریز مورخ عموماً یہ خیال پیش کرتے ہیں کہ آریہ وسط ایشیا یا سطح مرتفع تبت سے ہند میں داخل ہوئے (۳) وہ عالم جو بال گنگا دھر تلک کی رائے سے اتفاق رکھتے ہیں کہتے ہیں آریہ لوگ بحر منجمد شمالی کے گرد و نواح سے آ کر ہند میں آباد ہوئے۔

تلک نے اپنی یگانہ تصنیف (Arctic Home in the Vedas) میں دلائل سے ثابت کر دکھایا ہے کہ یہ نقطۂ خیال بالکل صحیح ہے۔ ۲ اور ۳ میں بہت کم اختلاف ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہندی آریہ بحر منجمد شمالی کے ممالک سے تبت یا وسط ایشیا میں پہلے آئے ہوں ہزاراں بعد ہند میں داخل ہوئے۔ یورپ کی تقریباً سب اقوام آریہ نسل سے ہیں۔ آریہ لوگوں کا بلحاظ عرض بلد شرقاً غرباً پھیلاؤ (یعنی ہند یا وسط ایشیا سے انگلستان اور فرانس تک) معقول نظر نہیں آتا۔ بلحاظ طول بلد یعنی شمالاً جنوباً صحیح خیال معلوم ہوتا ہے۔ شمالی ہند کو آریہ ہندوؤں کا اصلی وطن بتانے والے ہندو علماء پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ یہ خیال صرف اس لئے معرض وجود میں لایا گیا تا کہ ہندو آریہ پر یہ الزام عائد نہ ہو سکے کہ اُس نے اصلی باشندوں کو جنگلوں میں بھگا دیا۔ یا غلام بنا کر رکھا۔ آبا و اجداد کو اس الزام سے

بچانے کی فکر میں یہ محقق (اگر محقق کا نام انہیں دیا جا سکے) اس صداقت کو بھول جاتے ہیں کہ ورن دھرم یعنی ذات پات کی تقسیم کے لحاظ سے ان اقوام کے لئے آریوں نے شودروں کی جگہ مخصوص کر رکھی تھی۔ بعض قدیم باشندے آریہ فاتح کے آگے جھک گئے لیکن بعض نے اس غلامی کی نسبت آزادی کی ہوا میں سانس لینا بہتر خیال کیا۔ اگرچہ یہ آزادی نہایت مہنگے داموں ملی۔ دشت و جبل کی خاک چھاننی پڑی، پہاڑ اور جنگل اُن کے ایسے مسکن بنے کہ آج تک بچارے تہذیب و تمدن سے دُور اُفتادہ ہیں۔

مہرشی منوجی کی تقسیم ذات سے پہلے آریہ فاتح نے شمالی ہند میں صرف دو جماعتیں قائم کر رکھی تھیں۔ لفظ 'ورن' کا ذکر ویدوں میں آتا ہے اور تمام مؤرخ متفق الرائے ہیں کہ مہرشی منوجی سے پہلے صرف دو جماعتیں تھیں (۱) آریہ (۲) داسو۔

یہ تمہید بلاوجہ نہیں دی گئی۔ اس سے صریحاً یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ تلک جیسے عظیم الشان محقق کے تجسس اور تحقیق نے ہندوستانی تو کیا یورپین محققوں کے بھی دانت کھٹے کر دیئے۔ میرے مضمون کا تعلق اس تحقیق سے صرف اتنا ہے کہ یہ سنسکرت زبان اور اُس کے رسم الخط پر روشنی ڈال سکے۔ سنسکرت زبان اور رسم الخط یقیناً آرین ہیں مگر ان کے ہندوستانی ہونے میں شک ہے۔ وہ ہندی آریہ جو بحر منجمد شمالی کے قرب و جوار سے ہند میں آئے (براہِ راست یا وسطِ ایشیا میں ٹھہرتے ہوئے) سنسکرت زبان اور رسم الخط کو اپنے ساتھ لائے۔ سنسکرت زبان اُن کی اصلی زبان سے نکلی اور اُس کی ولادت ہند میں ہوئی ایک بحث طلب امر ہے۔ اس مسئلہ میں عمیق تجسس کی ضرورت ہے۔ اگر سنسکرت کی تولید ہند میں ہوئی تو معترض اس اعتراض میں حق بجانب ہے کہ آریہ لوگ ہند میں وارد ہونے کے وقت یا اس سے پہلے کونسی زبان بولتے تھے اور اُس کا رسم الخط کیا تھا۔ کسی ایسی زبان یا رسم الخط کا تاریخی ثبوت موجود نہیں جسے ہم سنسکرت کا ماخذ مان سکیں۔ سنسکرت زبان کے فاضلِ بے بدل محقق تلک کی تصنیف کا نام ہی (Arctic Home in the Vedas) اس صداقت کا فیصلہ کُن ثبوت ہے۔

ہندی آرین (خواہ شمال سے آئے یا وسطِ ایشیا اور تبت سے) سنسکرت زبان اپنے ساتھ لائے۔ حاصل کلام سنسکرت زبان اور رسم الخط ہندوستانی نہیں یعنی ہند میں پیدا نہیں ہوئے۔ میں مکرّر کہتا ہوں کہ سنسکرت رسم الخط بھی ہندوستانی نہیں (بے شک آرین ہے) اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ تمام آرین زبانیں بائیں سے دائیں طرف لکھی جاتی ہیں (سوائے ایرانی کے جس پر عبرانی اثر پڑا) ایسے رسم الخط کا رجحان یقیناً تمام آریوں کے اصلی شمالی وطن میں ظاہر ہُوا ہوگا۔ ورنہ تمام آریہ زبانوں کے رسم الخط کی ایسی یگانگت سمجھ میں نہیں آتی۔ بالخصوص جب ہم دیکھتے ہیں کہ عبرانی اقوام کا رسم الخط اس کے بالکل برعکس ہے اور بعض اور نسلوں کا رسم الخط اُوپر سے نیچے کی طرف۔

اب ہندی زبان کو لیجیئے۔ پچیس صدیوں کا ذکر ہے کہ ہند میں سنسکرت زبان سے پراکرت 'بولی' کا ظہور ہُوا۔ اس کے بعد ہندی کی ولادت اسی سرزمین ہند میں ہوئی۔ مگر ہندی کا رسم الخط سنسکرت ہے۔ یہ ظاہر کر چکا ہوں کہ سنسکرت زبان اور رسم الخط دونوں

آرین تو ہیں لیکن بدیشی۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ہندی زبان ہند میں پیدا ہوئی لیکن اس کا رسم الخط ہند میں پیدا نہیں ہوا۔ اگر ہمارے اخذ کردہ نتائج صحیح ہیں تو میں کہوں گا کہ ہندی اور اُردو میں اور بھی زیادہ مشابہت ہے۔ یعنی ہندی اور اُردو زبان کے لحاظ سے دونوں ہمارے پیارے وطن کی زبانیں ہیں لیکن رسم الخط کے لحاظ سے دونوں بدیشی۔ سوال صرف وقت کا ہے۔ اُردو رسم الخط کا ظہور دورِ جدید میں ہوا اور ہندی کا پراچین وقتوں میں۔ دوسرے الفاظ میں ہندی اور اُردو قومی زبانیں ہیں لیکن ان کے رسم الخط قومی نہیں۔ پھر قومی نقطۂ خیال سے میں اس استفسار میں حق بجانب ہوں کہ ہندستان جیسے وسیع ملک میں اگر دونوں رسم الخط رائج رہیں تو نقصان کیا۔ خاصکر جب ایک تو جنوبی اور وسطی ہند کے لئے ضروری ہے اور دوسرا شمالی ہند کے لئے۔ شاید شمالی راجپوتانہ بھی ان حدود میں شامل ہے۔

مہاتماجی کا حل۔ ٹریبیون ۱۹۳۸ء آخر کے مہینے "ہندوستانی زبان ہماری قومی زبان ہونی چاہئے بعض صوبوں میں فارسی اور عربی الفاظ کا ذرا زیادہ استعمال ہوگا اور بعض میں ہندی اور سنسکرت کا" عمیق نظر سے اگر دیکھا جائے تو ہندی اور اُردو دونوں کی ہستی اس نئی "ہندوستانی" زبان میں مہاتماجی برقرار رکھتے ہیں۔ گو اس میں شک نہیں کہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے اس طرح کی ایک مشترکہ زبان ایک دل پسند حل ہے جو سنسکرت رسم الخط میں ہندی معلوم ہو اور فارسی رسم الخط میں اُردو۔ ہندی میں مستند ہندی شعرا نے بہت فارسی، عربی الفاظ استعمال کئے اسی طرح اُردو بلکہ کہیں کہیں فارسی شاعری میں بھی ہند کے فارسی شعرا نے ہندی سے اجتناب نہیں کیا۔

یو۔پی گورنمنٹ کا حل۔ یو۔پی صوبہ والوں کی جدت بھی قابلِ تعریف ہے۔ اُنہوں نے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ تمام صوبہ کے ہندو اور مسلم دونوں رسم الخط سیکھیں۔ ہندو نقطۂ خیال ہندوؤں کے اُردو رسم الخط سیکھنے سے مسلم ہم وطنوں کے تمدن و تہذیب سے رواداری کا سلوک پیدا کرے گا اور مسلم زاویۂ نگاہ مسلمانوں کے ہندی سیکھنے سے ایسا ہی روادار بن جائے گا۔ نتیجہ وہ باہمی رواداری ہوگی جو متحدہ قومیت کے لئے ضروری ہی نہیں بلکہ ہم وطنی کی جان ہے۔ جس کے بغیر مادرِ ہند تڑپ رہی ہے۔ تکلیف تھوڑی سی اور وہ بھی ابتدا میں ضرور ہوگی۔ لیکن فائدہ عظیم ہوگا۔

ایک اَور نقطۂ خیال۔ بعض جدت پسندوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ سنسکرت اور فارسی رسم الخط دونوں کو خیرباد کہی جائے اور رومن کیریکٹر کو رواج دیا جائے۔ ان ہم وطنوں کی سمجھ کے قربان۔ مشکلات کا حل بھی سوچا تو نرالا۔ جدت بھی سوجھی تو نرالی۔ یہ اور بات ہے کہ قومیت کے سراسر منافی ہو اور عقل سے بالکل خارج۔

نتیجہ

ہندی بے شک دیش کی زبان ہے لیکن میری بحث نے یہ ثابت کیا ہے کہ اُردو ہندی کی بیٹی ہے اور ایسی جو ہند سے باہر نہیں بیاہی گئی۔ یہ بھی ہمارے وطن کی قومی زبان ہے جو اکبر کے قومی رجحان اور جہانگیر اور شاہجہان کے ہندو مُسلم اتحاد کی وجہ سے معرضِ وجود میں آئی۔ ہندوؤں نے اس جدت کو اپنایا۔ اُردو سے تغافل نہیں برتا۔ مُسلم بھائیوں کے دوش بدوش ہمیشہ اس کی نشو ونما میں کوشاں

سے ہے جس کا نتیجہ محترم حضرات کے سامنے رکھ چکا ہوں یعنی اُردو زبان نے علم ادب کا بلند رُتبہ حاصل کیا۔

میں ہندوؤں کے برہمن فرقہ میں صرف اپنی یعنی کشمیری پنڈت برادری کو تمثیلاً لیتا ہوں جو ۳۵ کروڑ آبادی میں صرف پانچ چھ ہزار کی تعداد میں تمام برطانوی ہندوستان از کشمیر میں پھیلی ہے اوران میں پنڈت رتن ناتھ در سرشار جیسے فصیح و بلیغ فسانہ نگار، پنڈت دیا شنکر کول جیسے مختصر نویس مثنوی کہنے والے (دیکھو تذکرہ آبحیات صفحہ ۲۵۶ سطور ۲ تا ۱۷)، ۲۱ سال کے بچے پنڈت مہتاب رائے تاباں جس نے میر درد (بقول رسالہ بہارِ کشمیر اکتوبر ۱۹۲۴ء) کے مشاعرہ میں جب یہ مطلع پڑھا ؎

دل کے پھپھولے جل اُٹھے سینے کے داغ سے اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

تو گرمیٔ کلام سے بوڑھے ملک الشعراء سودا بھی چونک اُٹھے۔ کئی مرتبہ مطلع پڑھوایا۔ آخر فرمایا "برخوردار زندہ رہتے نظر نہیں آتے" اسی سال بیچارہ تاباں جاں بحق ہوا۔ (تذکرہ آبحیات صفحہ ۱۷۲ سطور ۲ تا ۶)

کشمیری پنڈتوں کے ماہانہ رسالے "بہارِ کشمیر" میں اسی مشاعرہ کا تذکرہ یوں درج ہے۔ کسی صاحب نے تاباں سے کہا "برخوردار اس طوقِ گلو (تاباں نے ہنسلی گلے میں پہنی تھی) پر بھی کبھی طبع آزمائی کی ہے" (غالباً امتحان مقصود ہوگا) شرمیلے بچے نے کہنہ مشق اُستادانِ باکمال کے سامنے گردن جھکا کر کہا "نہیں حضرت۔ اس کا کبھی خیال نہیں آیا۔ اجازت بخشیں۔ شاید کچھ کہہ سکوں" تھوڑے ہی وقفہ کے بعد یوں نوا سنج ہوا ؎

اسیریٔ عشق کو منظور تھی میری لڑکپن میں پنھایا طوقِ منّت کے بہانے میری گردن میں

حاضرین پر سناٹا چھا گیا۔ (عمر بارہ سال درج ہے۔ رسالہ بہارِ کشمیر لاہور۔ اکتوبر ۱۹۲۴ء صفحہ ۲۰ سطور ۲ سے ۸ تک)

پنڈت برج نرائن چکبست جیسے نکتہ چین اور نظم گو، پنڈت امرناتھ ساحر جیسے صوفی جادو بیاں، اس خاکسار کے فنِ شاعری میں اُستاد علامہ پنڈت کیفی جیسے بے مثل نکتہ سنج اور شاعر۔ دیوان پنڈت شونا تھ منتظر، پنڈت بشن نراین در آبر (صدر کانگرس)، پنڈت آذر، پنڈت پریشاں، پنڈت بےخود، پنڈت شعلہ، پنڈت دریا، پنڈت فگار، پنڈت مہجور، پنڈت ناظم، پنڈت یکتا، پنڈت یاس اور پنڈت فرحت (مؤخر الذکر کا ایک شعر یاد آگیا ہے تفنن طبع کے لئے درج کرتا ہوں ؎

کچھ ایسی دریا سے آشنائی بڑھی ہے صدقہ میں چشمِ تر کے کہ موج ہم سے لپٹ رہی ہے۔ حباب ٹوپی بدل رہے ہیں

کس کس کا ذکر کروں "تذکرہ بہارِ گلشنِ کشمیر" میں سینکڑوں نام خود ملاحظہ فرمائیں۔

آمدم برسرِ مطلب۔ یہ غلط ہے کہ اُردو اسلامی زبان ہے۔ مرزا سودا فرماتے ہیں ؎

ترکش اُلبنڈ سینہ عالم کا چھان مارا مژگاں نے پیارے تیرے ارجن کا بان مارا

محبت کے کروں کچھ بل کی میں تعریف کیا یارو ستم پربت ہو تو اُس کو اُٹھا لیتا ہے جوں رائی

نہیں ہے گھر کوئی ایسا جہاں اُس کو نہ دیکھا ہو کنہیا سے نہیں کچھ کم صنم میرا وہ ہرجائی

دو بدیشی نہیں۔ ہندوستانی زبان ہے جسے ہندو مسلم برادرانِ وطن نے اپنے خون سے سینچا۔ بقول سر تیج بہادر سپرو "مشترکہ قومی ورثہ ہے۔"

ہندی اور اُردو میں تضاد نہیں۔ مفروضہ تضاد اُن تنگ نظر ہندو مسلم بھائیوں کی ایجاد ہے جو چھچھوندر کے جمع کئے ہوئے مٹی کے ڈھیر کو کوہستانِ ہمالہ بنانا چاہتے ہیں۔

میری ناچیز رائے ہے کہ ہندی اور اُردو ایک دوسری کی ممد و معاون رہی ہیں۔ اب بھی ان کی ترقی کا دارومدار اسی پر ہے۔ باہمی عنادی مشترکہ قومی مفاد کے حق میں زہر قاتل ثابت ہوگی اور ان زبانوں کی باہمی رواداری اس بدنصیب ملک اور قوم کے لئے آبِ حیات۔

نوٹ:۔ اقتباسات از "بہارِ کشمیر" لاہور۔ جون ۱۹۳۹ء۔ صفحات ۳۸ و ۳۹ و ۸۹:۔

لاہور۔ تمام ہندوستان میں گزشتہ ماہِ دسمبر میں "اُردو ڈے" بڑی کامیابی سے منایا گیا۔ لاہور کے جلسے میں راجہ نرندر ناتھ صاحب نے فرمایا۔ کہ "اُردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے۔ اسے مٹانے کی کوشش کرنا پرلے درجے کی ہٹ دھرمی ہے۔" آپ نے یہ بھی کہا کہ "میری مادری زبان اُردو ہے اور ہمارے تمام خاندان میں بولی جاتی ہے۔"

الہ آباد میں سر تیج بہادر سپرو صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ "اُردو زبان ہم ہندو مسلمان دونوں کو اپنے آبا و اجداد سے ایک مشترکہ اور مقدس ترکے کی حیثیت سے ملی ہے جو قطعاً ناقابلِ تقسیم ہے اور یہی وہ زبان ہے جو قریب قریب ہر صوبہ میں کم و بیش بولی جاتی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا قلق ہوتا ہے کہ تقریباً چالیس پچاس سال سے یہ کوششیں ہو رہی ہیں کہ عوام غیر فطری طور پر ایک بناوٹی زبان سیکھیں اور اس زبان سے کنارہ کشی اختیار کر لیں جو فطری طور پر ہندو مسلمان کے میل جول سے پیدا ہوئی۔ اور آپس کی رواداریوں اور قربانیوں کا نتیجہ ہے۔" سر تیج نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ "اُردو جو قطعاً وقت کی فطری ضرورت سے پیدا ہوئی ہے مٹائی نہیں جا سکتی۔ اگر چند مٹھی بھر آدمی فرقہ دارانہ سوال پیدا کر کے اکثریت کے زعم میں اسے مٹانا چاہتے ہیں تو یہ سودائے خام ہے۔ ... اگر مسلمانوں نے اُردو کی اشاعت میں بہت کچھ کیا ہے تو ہندوؤں نے بھی کسی حالت میں اُردو کو ترقی دینے میں کمی نہیں کی۔"

آگرہ کے مشہور کنزرو خاندان کے ایک رکن پنڈت راج ناتھ صاحب کنزرو نے فرمایا کہ "کوئی زبان کسی کے مٹانے سے مٹ نہیں سکتی۔ موجودہ مخالفت سے اُردو کو بجائے نقصان کے فائدہ ہوگا۔ ..."

لکھنؤ میں پنڈت کرشن پرشاد صاحب کول نے فرمایا کہ "میری مادری زبان اُردو ہے اور میری تمام برادری (جسے کشمیری پنڈت کہا جاتا ہے) کی پیدائشی زبان بھی یہی ہے۔ ہمارے گھروں میں مستورات یہی زبان بولتی ہیں جو اس وقت میں بول رہا ہوں۔ ممکن ہے کچھ ہندو ایسے بھی ہوں جن کے یہاں یہ زبان نہ بولی جاتی ہو لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ ہمارے یہاں کی عورتیں جب دوسری برادری کی خواتین سے ملتی ہیں تو اپنے مفہوم و مطلب کو اسی زبان میں ادا کرتی ہیں اور تمام ہندو عورتیں اسے بخوبی سمجھ لیتی ہیں۔"

وشوناتھ درماہ

حدیثِ عشق

مری حیات کا مقصد طلوعِ روزِ جزا
مرے طفیل رواں کاروانِ لیل و نہار

مرے بیان میں غلطاں روانیٔ دریا
مری نوا میں جنوں خیز قلزمِ زخّار

مرے خیال کی وسعت میں غرق کون و مکاں
مری نگاہ میں پامال دورِ لیل و نہار

مرے نکات کی موجوں میں گم حواسِ خرد
مرے مسائلِ رنگیں ہیں زیست کے اسرار

مرے قدم پہ مصائب کا سَیل سر بہ سجود
مرے جلال سے مرعوب حادثوں کا وقار

مرے گناہوں پہ حوروں کی پاک دامانی
بصد گداز فدا اور بصد نیاز نثار

مرے جنوں کے تلاطم میں لرزہ بر اندام
سفینۂ غمِ دوراں برنگِ کاہِ نزار

مرے دماغ کے شیشے میں عکسِ عرشِ بریں
مہ و نجوم سے تابندہ تر مرے افکار

مرے غرور پہ نازاں بہارِ دیر و حرم
مری خودی میں خدا اور اہرمن کا دیار

مری فسردہ دلی پر مسرّتیں قرباں
مری خزاں کے گریباں میں جلوہائے بہار

بساطِ ظلمتِ راہِ حیات کیا معنی؛
مری نگاہ ہے تاریکیوں کو اذنِ فرار

نشانِ منزلِ مقصود گمرہی میری
محیط عالمِ امکاں پہ میرا گرد و غبار

مرا کمال ہے دنیا میں زندۂ جاوید
اجل پہ طنز ہے باقیؔ مری حیاتِ نزار

باقیؔ صدیقی

جرمنی کا طریقۂ تعلیم

جولائی کے "ہمایوں" میں ایک فاضلانہ مقالہ جرمن اسکولوں کے متعلق شایع ہُوا ہے۔ تصویر کا دوسرا رُخ دکھانے کے لئے ایک مختصر مضمون خدمتِ عالی میں روانہ کرتا ہوں۔

طالبؔ صفوی

جرمن قوم کی زندگی کو سمجھنے کے لئے ہرہٹلر کا ایک فقرہ سمجھنا نہایت ضروری ہے وہ کہتا ہے کہ قوم کی تقدیر کا مالک ایک فردِ واحد کو بنا دینا عظیم ترین سیاسی معجزہ ہے اور اسی معجزے میں قوت و شوکت مضمر ہے[۱]۔

جدید جرمنی کے ہر فرد کی تقدیر مہد سے لے کر لحد تک ایک زبردست آمر کی جنبشِ ابرو کی محتاج رہتی ہے۔ بچے کے ماں باپ مجبور ہوتے ہیں کہ وہ کوئی غیر جرمن نام نہ رکھیں ورنہ کوئی غیر آرین نرس مقرر کریں۔ چھ برس کے سن میں بچے کو لازمی طور سے اسکول میں داخل ہونا پڑتا ہے اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ پھر اس کے ماں باپ کی کوئی دسترس اس پر باقی نہیں رہتی۔ دس برس کے سن میں بچے کو (Deutsches Jungvolk) میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ چودہ برس کی عمر میں (Hitler Jugend) بوائے سکاوٹ کا ممبر بنا پڑتا ہے اور اُنیسویں برس فوجی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ اسکول کی تعلیم کی نوعیت اور کیفیت کا صحیح اندازہ ایک متعدد نازی ماہرِ تعلیم کے بیان سے ہو سکتا ہے۔ ہرا سٹرم اپنی قابلِ قدر تصنیف میں فرماتے ہیں کہ ہم جرمن بچوں کو تاریخ کے صحیح واقعات بتانے کے بجائے ایسے غلط واقعات بتانا پسند کرتے ہیں جن کو سُن کر وہ پکّے نازی بن جائیں[۲]۔

تاریخ ہو یا سائنس، علم الاخلاق ہو یا مذہب جرمن بچوں کے لئے اس کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہیں ہے کہ وہ حکومت کی منظور کردہ ترمیم شدہ کتابوں پر اکتفا کریں۔ اس ترمیم و تنسیخ کی ایک نہایت دلچسپ مثال جرمنی کی نئی انجیل میں نظر آتی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کا ارشاد ہے "مبارک ہیں وہ جو عاجزی کرتے ہیں کیونکہ وہی زمین کے وارث ہوں گے"۔ بشپ میولر ترمیم شدہ انجیل میں اس قول کے بجائے تحریر فرماتے ہیں "مبارک ہیں وہ جو اچھے کامریڈ (Comrade) ہیں اور وہی کامیاب زندگی بسر کریں گے"[۳]۔

اخلاق کے متعلق روزن برگ کی مشہور کتاب مائی تھس (Mythus by Rosenberg) کا مندرجۂ ذیل اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا "رحم و انسانیت سے آزادی برابری اور اخوت کا سودا پیدا ہُوا اور اسی خللِ دماغ کا نتیجہ جمہوریت ہے"۔ یہ واضح رہے کہ مائی تھس کا ہر جرمن میٹرک اسکول کی لائبریری میں موجود ہونا حکماً ضروری ہے۔ حساب کے گھنٹے میں اس قسم کے سوال ضرور پوچھے جاتے ہیں "اگر سو بمبار طیارے اتنے بم گرا سکتے ہیں تو ایک طیارہ کتنے بم گرا سکے گا؟" مذہب کے بارے میں ہر کرل وزیرِ مذہب یہ ذہن نشین کرنے کی سعی فرماتے ہیں کہ عیسائیت کو سمجھنے والا صرف اڈولف ہٹلر ہے اور وہی حقیقی روح القدس ہے۔

حقیقتِ امر یہ ہے کہ جرمنی میں مذہبی یا دُنیاوی تعلیم کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی اور بچوں کو بتایا جاتا ہے کہ میدانِ جنگ میں جان دینا حاصلِ زندگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امتحان میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ لڑکے نے ریاضی جغرافیہ سائنس وغیرہ میں کتنے نمبر حاصل کئے بلکہ درجہ چڑھانے کے لئے اس کا پارٹی ریکارڈ دیکھا جاتا ہے۔ اکثر اوقات لڑکے مشکل سوال حل کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور بعض اوقات تو سادہ کاپی چھوڑ کر چلے آتے ہیں[۴]۔

ممکن ہے کہ جدید طریقِ تعلیم سے جرمنی میں متعدد بسمارک پیدا ہو جائیں لیکن یہ امر یقینی ہے کہ مستقبل قریب میں کوئی شوپنہار یا گوئٹے پیدا نہیں ہو سکتا۔

طالبؔ صفوی

۱۔ Inside Europe by John Gunther.

۲۔ History Teaching in the Elementary Schools of the Nazi State by K. F. Sturm.

۳۔ The Germanisation of the New Testament by H. C. Robbins.

۴۔ One Man Against Europe.

کلامِ محسن

عزمِ بلند

زندگانی کی شان پیدا کر — ہمتِ امتحان پیدا کر
جو حقائق سے آشنا کر دے — پھر وہ طرزِ بیان پیدا کر
عہدِ ماضی کا واسطہ تجھ کو — عہدِ ماضی کی شان پیدا کر
پھر اُنہیں عظمتوں کا چرچا ہو — پھر وہی آن بان پیدا کر
آسماں جس کے سامنے ہو زمیں — وہ بلند آسمان پیدا کر
اس جہاں سے نکل خدا کے لئے — اَور کوئی جہان پیدا کر
خاک میں مِل کے خاک بن محسنؔ — ذرّے ذرّے میں جان پیدا کر

غزل

زمیں ملنے لگی، لو آسماں بھی تھرتھراتا ہے — کہاں کا حشر شاید ہوش میں دیوانہ آتا ہے
یہ دیوانہ بڑا ہشیار ہے سجدے نہیں کرتا — بالفاظِ دگر تقدیر کا لکھا مٹاتا ہے
تبسم کھیلتا ہے اس طرح سے اُن کے ہونٹوں پر — سحر کی گود میں جس طرح غنچہ مُسکراتا ہے
شریکِ امتحاں دونوں ہیں محسنؔ فرق اتنا ہے
مَیں قسمت آزماتا ہوں وہ خنجر آزماتا ہے

محسن اعظم گڑھی

سگنل نہ ملنے کی وجہ سے گاڑی انبالے کے سٹیشن سے دُور کھڑی تھی۔ ایک تیسرے درجے کے ڈبے میں کسی کالج کے چھ طلبہ آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے اور ڈبے کے دوسرے مسافر اُن کی پُرلطف باتوں پر ہنس رہے تھے۔

یکایک اُن میں سے ایک نے اپنے پاس والے ساتھی کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اُنگلی سے سامنے میدان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "حامد وُہ دیکھو"۔

سارے مسافر میدان کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک گنوار کندھے پر رکھے ہوئے لٹھ سے ایک گٹھڑی لٹکائے بھاگا چلا آ رہا تھا۔

حامد نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔ "بھئی ظہیر، آج عقل کے پیچھے لٹھ لے کر پھرنے کے معنی سمجھ میں آ گئے۔ آخر یہ شخص بھلے مانسوں کی طرح سٹیشن سے کیوں سوار نہیں ہوتا؟"

ایک مسافر نے کہا "شاید اس کے پاس ٹکٹ نہیں ہے"۔

ظہیر سر ہلاتے ہوئے بولا "ضرور یہی بات ہے۔ ارے یہ تو سیدھا ہماری ہی طرف آ رہا ہے۔ بھئی میں اسے اپنے ڈبے میں بیٹھنے نہ دوں گا۔ جس وقت ٹکٹ چیکر ان لوگوں سے بازپرس کرتا ہے تو مجھ سے تو دیکھا نہیں جاتا"۔

اِن ہی باتوں میں گنوار بھی آ پہنچا اور جلدی سے اپنا سامان کھڑکی سے اندر پھینک دروازے سے زورآزمائی کرنے لگا

حامد نے کہا "ارے دیکھتا نہیں یہ ڈیوڑھا درجہ ہے۔ چل دے یہاں سے"۔

وُہ خوشامد کرنے لگا "بابوجی، بڑی کرپا ہو گی۔ بڑا جروری کام ہے۔ میں آگے سے کہیں اور بیٹھ جاؤں گا"۔

"بدمعاش بے ٹکٹ کے جانا چاہتا ہے۔ اپنے ساتھ ہمیں بھی پھنسائے گا"۔

دیہاتی نے گھبرا کر شلوکے کی جیب میں ہاتھ چلاتے ہوئے کہا "بابوجی مو پہ ٹکس ہے۔ یہ دیکھو، بڑی دیا ہو گی"۔

مگر ایک دفعہ سختی سے منع کرنے کے بعد اجازت دینا کچھ اچھا نہ معلوم ہوتا تھا۔ حامد نے جھڑک کر کہا "چل ہٹ۔ نہیں تو ابھی زنجیر کھینچ کر گاڑی چلوا دوں گا"۔

گنوار کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا۔ ڈر کر نیچے اُتر گیا۔ "بابوجی، میری گٹھڑی۔ تمہارے پاؤں پڑوں۔ وُہ دیکھو، سیٹی ہو گئی"۔

ظہیر دونوں چیزیں نیچے پھینکنا ہی چاہتا تھا کہ حامد نے اُسے روک دیا۔ "کیا کرتے ہو! آئی چیز کو پھینکنا کہاں کی عقلمندی ہے"؛

"واہ! تمہارے کس کام کی ہیں یہ ؟"

حامد نے گٹھڑی پر بیٹھتے ہوئے کہا" ذرا ٹھہر جاؤ ابھی بتا دوں گا۔"

گنوار برابر خوشامد کئے جا رہا تھا۔ گاڑی آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ اُس نے ایک آخری کوشش کرنے کے لئے وہیں ٹرین کے سامنے زمین پر ماتھا ٹیک کر دونوں ہاتھ سر کے آگے جوڑ لئے " بابوجی، دیا کرو۔"

حامد کے ساتھی اُسے ملامت کرنے لگے۔ ظہیر چلّا کر بولا" حامد بعض دفعہ تو تم بالکل حیوان بن جاتے ہو۔ آخر یہ گٹھڑی چھین کر تمہارے ہاتھ کیا آیا ؟"

حامد نے مسکرا کر جواب دیا" اس گٹھڑی کی چیزیں۔ پھر جلدی سے اپنے بٹوے سے ایک پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر بولا۔" ارے یہ لے!"

حامد کے ساتھی حامد کی تعریف کرنے لگے۔ اُن کا خیال تھا کہ گنوار ابھی تک ٹرین کو سجدہ کر رہا ہے۔ مگر وُہ اُچک کر ایک دُوسرے ڈبے کے فٹ بورڈ پر چڑھ چکا تھا اور وہاں کے مسافر اُسے بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ ہوا سے نوٹ حامد کے ہاتھ سے نکل گیا۔ گنوار نے حامد کی آواز بھی سُن لی اور اُڑتے ہوئے نوٹ کو بھی دیکھا۔ کچھ بوکھلا سا گیا۔ ٹرین سے کُود پڑا اور نوٹ کے پیچھے بھاگا مگر اُس کی ٹانگ میں چوٹ آگئی تھی۔ اس لئے بھاگتا بھی جاتا تھا اور اپنا گھٹنہ بھی دباتا جاتا تھا۔ آخر زمین پر بیٹھ گیا۔

ظہیر غصّے سے حامد کو اس طرح گھُورنے لگا کہ بس چلے تو خُون پی لے۔ حامد بھی ذرا نادِم تھا۔ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بولا" دوستو، تم ہی بتاؤ اِس میں میری کیا خطا ہے ؟ میں تو سیدھے سبھاؤ یہ میلی کچیلی گٹھڑی اور یہ لاٹھی پانچ روپے میں خرید رہا تھا مجھے کیا خبر تھی کہ وہ بھلا آدمی ٹرین میں سوار ہو رہا ہے۔ پھر شیطان نے پھُونک مار کر نوٹ میرے ہاتھ سے اُڑا دیا اور اُس گنوار کی شامت نے ایسا دھکا دیا کہ شاید ٹانگ ٹوٹ گئی۔"

ظہیر نے جھنجھلا کر کہا" مگر تم نے سرے سے اُس کی گٹھڑی ہی کیوں لی تھی ؟"

حامد گٹھڑی کھولتے ہوئے بولا" اس میں چند پھٹے پرانے کپڑوں کے علاوہ ایک گدگدی بھی معلوم ہوتی ہے۔ میں اِسے پہننا چاہتا ہوں۔"

ذرا سی دیر کے لئے مسافر گنوار کو بھول گئے اور حامد کے گرد جمع ہو گئے۔ صرف ظہیر کھڑکی کے قریب رونی صُورت بنائے کھڑا رہا۔ گٹھڑی میں گدگدی تو ضرور تھی مگر اس کے علاوہ ایک لہنگا، ایک چولی، اور ایک چُندری بھی تھی۔ تینوں چیزیں بالکل نئی تھیں اور نہایت شوخ نیلے اور سُرخ رنگ کی۔

دوستوں نے زور سے قہقہہ لگایا" بھئی حامد، سامان تو تم نے لیس کر لیا۔ اب جلدی سے ایک دیہاتی دُلہن بھی تلاش کر لو۔"

کپڑوں کی تہ میں سے ایک خط بھی نکلا۔ حامد نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں دعوے سے کہتا ہوں کہ یہ خط اِس معاملے پر روشنی ڈال سکتا ہے مگر "چشمۂ آفتاب راچہ گناہ"۔ یہ جناتی زبان میں ہے جسے پڑھنے سے یہ خاکسار قاصر ہے۔ لو بھئی نند کشور یہ کام تم کرو"۔

نند کشور تھوڑی دیر تک خاموشی سے خط پڑھتا رہا۔ پھر بولا "حرف بحرف سناؤں گا تو دیر لگے گی۔ یوں سمجھو کہ یہ خط مسمّات برجی سکنہ نارگوڑی کی طرف سے مسمّی جے چند سکنہ حال انبالہ کے نام ہے۔ مسمّات برجی ایک شادی میں شریک ہونا چاہتی ہے اور مسمّی جے چند سے جو صاف ظاہر ہے کہ اُس کا خاوند ہے ان چیزوں کی فرمائش کرتی ہے۔ خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن دونوں کی شادی ابھی حال ہی میں ہوئی ہے — اور دونوں میں بڑی محبت ہے"۔

حامد نے غور کرتے ہوئے کہا۔ "ہوں، یہ بات ہے"۔

ظہیر کھڑکی سے ہٹ کر حامد کے قریب آیا اور نہایت سنجیدگی سے کہا "حامد! جانتے ہو آج تم نے ایسا گناہ کیا ہے کہ تمام عمر اس کا کفارہ ادا کرتے رہو تو بھی نجات ناممکن ہے۔ مذاق کی ایک حد ہے۔ اگر یہ اتنا بڑھ جائے کہ اس سے کسی کے جذبات مجروح ہوں تو ظلم بن جاتا ہے۔ ذرا اس معاملے کو جے چند کے جامے میں جا کر دیکھو اور سوچو کہ اگر تمہاری بیوی ہوتی اور وہ تم سے کوئی فرمائش کرتی جسے پورا کرنے سے تمہیں یوں روک دیا جاتا تو تمہاری اور اُس کی کیا حالت ہوتی"۔

حامد نے ذرا آزردہ ہو کر کہا "اچھا اب اس وعظ و نصیحت کو ختم کیجئے۔ ہم لوگ گھر سے اس لئے نکلے ہیں کہ اپنا جی خوش کریں، دماغ پر بوجھ ڈالنے کے لئے کالج سلامت ہے۔ آخر میں نے کیا غضب کیا، چوری نہیں کی، ڈاکا نہیں ڈالا۔ جے چند دوسری گاڑی سے نارگوڑی پہنچ سکتا ہے اور آپ ایسے ہی دیالو ہیں تو اُس کی بیوی کا سُوٹ اُس کے گھر پہنچا سکتے ہیں۔ پتہ نند کشور بتا دیں گے"۔ پھر دوسرے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا "دوستو، مُرغی تو اپنی جان سے جا چکی۔ کھانے والوں کو کچھ تو سواد آنا چاہئے۔ اچھا تم لوگوں نے کبھی دیہاتی ناچ دیکھا ہے"۔

سب نے نفی میں جواب دیا۔

"تو آج دیکھ لو"۔ یہ کہہ کر حامد نے گٹھڑی کے سارے کپڑے پہن لئے اور چندری کا لمبا سا گھونگھٹ نکال لجاتا ہُوا اُن کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

نند کشور نے دیہاتی سوانگ کے راجہ اندر کی نقل اُتارتے ہوئے کہا "ناچ میری سُندر ناری ناچ"۔

مسافر بنچوں پر پاؤں رکھ کر بیٹھ گئے اور حامد ناچنے لگا۔ ظہیر کے سوا سب داد دے رہے تھے اور وہ نہایت بے ترتیبی سے جھائیں مائیں کر رہا تھا۔ آخر مسکرا کر بیٹھ گیا۔ دوست تالیاں بجا بجا کر پھر ناچنے کی فرمائش کرنے لگے۔ حامد نے ہانپتے ہوئے معذرت کی "بس بھئی، اب معاف کرو۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ مارے چکروں کے سر پھٹ جائے گا"۔

ظہیر نے تلخی سے کہا "حامد کے مُنہ میں گھی شکر"۔

نندکشور بولا "آخر اس ناچ کا نام کیا ہے۔ یہ دیہاتی تو ہے نہیں"۔

حامد نے ہنستے ہوئے جواب دیا "رقصِ غولِ بیابانی"۔

ظہیر نے معنی خیز انداز میں جواب دیا "بے شک"۔

حامد تنک کر بولا "بڑے بدمذاق ہو ظہیر، ہم تمہیں خوش کرنے کے لئے اپنا تماشا بنا رہے ہیں اور تمہاری سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ جانتے ہو یہ ناچ نادر شاہ کو ایسا پسند تھا کہ خاص اس کے لئے وُہ انا بانی کو ایران لے جا رہا تھا۔"

ظہیر نے پھر اُسی انداز سے کہا "نادر شاہ کو، ظہیر کو نہیں۔ اچھا، اب اِس لباس کو اُتار دو۔ کہیں کوئی دیہاتی نادر شا تمہیں اغوا کر کے لے گیا تو اَور دِقّت ہو گی"۔

باتوں باتوں میں رات آ گئی۔ ظہیر دیر تک اپنے ساتھیوں کو لعنت ملامت کرنے کے بعد تھک کر خاموش ہو گیا تھا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ ٹرین نارگوڑی کے سٹیشن پر رُکی۔ تھوڑی دیر کے بعد ان لوگوں نے دیکھا کہ ایک معمر دیہاتی گھبرایا ہؤا پلیٹ فارم پر بھاگا بھاگا پھر رہا ہے اور جے چند، جے چند کی صدا لگا رہا ہے۔ دوستوں کے کان کھڑے ہوئے۔ ظہیر بولا "دیکھو حامد، یہ شخص جے چند کا باپ معلوم ہوتا ہے۔ شاید یہ سمجھ رہا ہے کہ اس کا بیٹا کسی ڈبے میں پڑا سو رہا ہے۔ تمہیں اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کا اس سے بہتر موقعہ نہ ملے گا۔ تم جا کر یہ سامان بڈھے کو دے دو اور کہہ دو کہ جے چند دوسری گاڑی سے آنے والا ہے"۔

ایک لڑکا بولا "ارے برجی بھی آئی ہے۔ دیکھو بڈھا اب ایک عورت سے بات کر رہا ہے۔ ضرور یہ گھونگٹ والی جے چند کی بیوی ہے"۔

ظہیر نے بے تابی سے کہا "تو بس اب جلدی کرو۔ اس وقت تمہارے مذاق نے تین انسانوں کو بلاوجہ پریشان کیا۔ نندکشور، تم حامد کے ساتھ جاؤ، کہیں یہ اَور کوئی شرارت نہ کر گزرے"۔

نندکشور نے انکار کر دیا "اگر ایسی ہی بے اعتباری ہے تو تم خود ہی کیوں نہیں چلے جاتے۔ مجھے تو شرم آتی ہے۔ آخر ہم لوگ جے چند کے نہ آنے کی وجہ کیا بتائیں گے"۔

ظہیر نے جھنک کر جواب دیا "اِسی لئے تو میں نہیں جاتا۔ حامد کی شرارت کی تعریف بھی تو تم ہی کر رہے تھے۔ اب تم ہی جا کر اپنی خطا کا اعتراف بھی کرو"۔

حامد کچھ اَور ہی سوچ رہا تھا۔ وہ ظہیر کی باتوں پر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اور ایک ایسی تدبیر پر غور کر رہا تھا جو اُس کے دوست کو چراغ پا کر دے۔ اُس نے آہستہ سے 'اچھا' کہتے ہوئے گٹھڑی خود اُٹھا اور لاٹھی نندکشور کو دے کر کہا "یہ لو نندکشور، یہ خُدا کی لاٹھی ہے جس میں آواز نہیں۔ اور یہ میرے باپ کی گٹھڑی۔ چلو حساب چُکا آئیں"۔

نندکشور ہنستا ہؤا حامد کے ساتھ ہو لیا۔ حامد کے لبوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اُس نے سہج سہج پلیٹ فارم

پر چلتے ہوئے کہا" دیکھو نند کشور، میں ان دونوں سے یہ کہوں گا کہ جے چند انبالے کے سٹیشن پر ٹرین سے کٹ کر مر گیا۔"
نند کشور چونک کر بولا" آخر اس سے فائدہ؟"
" یونہی ذرا لطف رہے گا۔ یہ دونوں ابھی رو رو کر سٹیشن کو سر پر اُٹھائیں گے۔ میرے پاس ثبوت ایسا زبردست ہے کہ انہیں فوراً یقین آجائے گا۔ اور یہ بھی تو سوچو کہ اس طرح جھوٹ بول کر ہم لقبولِ ظہیر اعترافِ گناہ سے بچ جائیں گے۔" پھر گرد ان جھٹک کر حقارت سے کہا" ہونہہ! اعترافِ گناہ! یہ شخص رائی کا پربت بنا دیتا ہے۔"
نند کشور نے مخالفت کی" نہیں حامد، کسی کے جذبات سے کھیلنا ٹھیک نہیں۔ یہ دیہاتی بڑے حسّاس ہوتے ہیں۔ ذرا سی خوشی میں آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور ذرا سے رنج میں . . . . . ."
حامد نے بات کاٹ کر فلسفیانہ انداز سے کہا" بھائی جذبات سے کھیلے بغیر تو تم کوئی کھیل بھی نہیں کھیل سکتے۔ تم تو کرکٹ کے بڑے اچھے کھلاڑی ہو تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ کرکٹ گیند بلّے سے نہیں جذبات سے کھیلی جاتی ہے۔ میچ کے ختم ہونے پر وکٹ نہیں ٹوٹتے، دل ٹوٹتے ہیں۔ پھر کیوں جیتنے کی کوشش کرتے ہو۔ ہار جایا کرو۔"
نند کشور نے جواب دینے کے لئے لب وا کئے۔ حامد جلدی سے بولا" پھر یہ بھی تو سوچو کہ جب دو تین گھنٹے بعد جے چند جیتا جاگتا ان کے سامنے آموجود ہو گا تو یہ دونوں کیسے خوش ہوں گے۔ مرنے والوں کا رنج کس نے نہیں دیکھا، مگر یہ جب جے چند کو زندہ دیکھیں گے تو انہیں ایسی مسرّت ہو گی گویا وہ عرش سے واپس آیا ہے۔"
یہ بات نند کشور کی سمجھ میں آگئی۔ اظہارِ پسندیدگی کے انداز سے سر ہلانے لگا۔
پاس جا کر حامد نہایت غمزدہ آواز میں بڈھے سے بولا" چوہدری، تم جے چند کو لینے آئے تھے نا؟"
بڈھے کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے گھٹنوں گھٹنوں پانی سے نکال کر بیچ دریا میں ڈبو دیا ہو۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔
" ہاں بابوجی! کیا تم اُسے جانتے ہو؟"
حامد نے آہِ سرد بھر کر کہا" ہاں، یہ کیا برچھی تمہارے ساتھ آئی ہے؟"
ذرا سی دیر کے لئے بڈھے کی حیرت کسی نامعلوم اندیشے پر غالب آگئی۔" بابوجی، تم نے کیسے جانا؟"
حامد نے کمر کے پیچھے سے گٹھڑی اور لاٹھی نکال کر بڈھے کو دیتے ہوئے کہا" خوب جانتا ہوں۔ یہ چیزیں اُس نے تمہارے پاس پہنچانے کے لئے دی تھیں۔"
" بابوجی، کیا بات ہے، جے چند ہے تو راجی!" آخری لفظ ایک طویل چیخ کی طرح اُس کے مُنہ سے نکلا اور جھریاں پڑے ہوئے رخسار سے کڑ کر آنکھوں سے جا ملے۔

حامد کے چہرے پر ایک سایہ سا آیا اور گزر گیا۔ بولا "چوہدری، مرتے وقت جے چند کی زبان پر برجی ہی کا نام تھا۔"

بڈھا کوئی سوال کرنا چاہتا تھا مگر آواز حلق میں اٹک گئی۔ حامد نے پھر کہا "ہاں، مر گیا۔ انبالے کے اسٹیشن پر گاڑی سے کٹ گیا۔"

بڈھے کے منہ سے اُف تک نہ نکلی۔ حامد کی دی ہوئی چیزیں ہاتھ سے چھوٹ گئیں۔ لڑکھڑا کر اپنی بہو کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور برجی اس طرح زمین پر بیٹھ گئی جیسے زمین نیچے سے پولی تھی اور بڈھے کے زور سے وُہ اُس میں دھنس گئی۔

حامد اور نندکشور اپنے ساتھیوں کی جانب آنے لگے۔ حامد نے چپکے سے کہا "نندکشور، یہ بھی اچھا ہُوا کہ یہ دونوں روئے نہیں۔ ورنہ ظہیر آ کر ابھی ان کو اصل واقعہ بتا دیتا اور سارا کھیل بگڑ جاتا۔ اب گاڑی چلنے کے بعد میں اُسے بتاؤں گا کہ میں نے بڈھے سے کیا کہا ہے تو غصے سے دیوانہ ہو جائے گا۔"

نندکشور خاموش تھا۔ حامد نے ایک خشک قہقہہ لگایا۔ اُس کا دِل بیٹھا جا رہا تھا اور لب پھڑک رہے تھے۔ "اچھا تماشا ہُوا، ہائیں نندکشور؟"

نندکشور نے کہا "حامد، تم نے بہت بُرا کیا۔ سُنتے ہو، بہت بُرا۔ یہ دونوں رو نہیں رہے۔ مگر ان کے سینوں میں طوفان بپا ہے۔ جے چند کے آتے آتے تو یہ مرے سے پرے ہو جائیں گے۔ مَیں ابھی انہیں سارا واقعہ سچ سچ بتا دیتا ہوں۔ اگر انہیں یقین نہ آیا تو جے چند کے آنے تک میں اِنہیں کے پاس رہوں گا۔" اتنا کہہ کر وہ تیزی سے واپس ہُوا۔ حامد نے مرے ہوئے دل سے "ٹھیرو بھی" کہہ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا، پھر فوراً ہی گرفت ڈھیلی چھوڑ دی۔ اور اُس کے ساتھ جانے لگا۔

یہ دونوں ابھی راستے ہی میں تھے کہ برجی، تیر کی طرح ان کے قریب سے نکلتی ہوئی پانی لے کر آتے ہوئے انجن کے سامنے کُود پڑی۔ ایک دلخراش چیخ کی آواز آئی، اور کھیل ختم ہو گیا۔

احترام اللہ

محفلِ ادب

شکوۂ عبث

ہم محو رہے، بیخود سے رہے، وُہ دادِ محبت دے بھی گئے
کیفیتِ غم کا شکوہ عبث، جو دے گئے مجھے وہ لے بھی گئے

(۱)

یہ آرزو اب تک دل میں رہی
آنکھوں سے لگاتے قدموں کو
اور اشکِ رواں سے جی بھر کے
اے کاش دُھلاتے قدموں کو
اس دل کی تمنا کر کے سوا، وہ آئے بھی اور چلے بھی گئے
ہم محو رہے، بیخود سے رہے، وُہ دادِ محبت دے بھی گئے

(۲)

اے بادِ سحر پھولوں کی قسم
اُس منزلِ پاک سے ہو جو گزر
کہنا کہ بہت اب خوار ہیں ہم
ایسے کہ نہیں کچھ اپنی خبر
تھا سعیٔ عمل جو شعار کبھی، افسوس کہ اب اس سے بھی گئے
ہم محو رہے، بیخود سے رہے، وہ دادِ محبت دے بھی گئے

(۳)

خاموش ہوں اب کیا منہ سے کہوں
وہ طاقتِ گویائی ہی نہیں
دکھلاؤں کسے یہ حالِ زبوں
وُہ جذبِ مسیحائی ہی نہیں
یاں شرمِ عبودیت نہ رہی، وہ اپنی امانت لے بھی گئے
ہم محو رہے، بیخود سے رہے، وہ دادِ محبت دے بھی گئے

مقبول احمد پوری — "ادبِ لطیف"

اصلاحِ ادب :- مصنفہ جناب غلام حیدر صاحب چشتی۔ اس تصنیف میں زبان اردو کی اغلاط کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اور ادیبوں شاعروں اور عام پڑھے لکھے اصحاب کو صحیح زبان استعمال کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ جابجا اشعار کا حوالہ دیا گیا ہے۔
فہرست مضامین میں چند موضوع یہ ہیں :- استعام سے عدم توجہی، زاید الفاظ، تلفظ، اعلانِ نون، اغلاطِ املا، متروک الفاظ، تذکیر و تانیث۔ کتاب بلاشبہ دلچسپ اور مفید ہے۔ قیمت ایک روپیہ ہے ملنے کا پتہ: ایشیاٹک بک ڈپو، گنپت روڈ۔ لاہور۔

اتالیقِ عربی :- مصنفہ مولانا زاہد القادری صاحب۔ یہ کتاب دین دنیا پبلشنگ کمپنی دہلی نے عربی زبان کے طلبہ کے فائدے کے لئے شائع کی ہے۔ اس میں عربی بول چال اور تحریر پر قدرت حاصل کرنے کے لئے نہایت آسان طریقے بتائے گئے ہیں۔ کتاب کی ترتیب میں جدید تعلیمی اصول مدِ نظر رکھے گئے ہیں اور یہ کوشش کی گئی ہے کہ زبان سیکھنے والوں کے دماغ پر کم سے کم بار پڑے۔

اس کتاب میں جدید و قدیم الفاظ کا ذخیرہ نہایت قابلیت سے جمع کیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ قواعدِ زبان کے سمجھانے کا خیال بھی رکھا گیا ہے۔ آخر میں عربی زبان کی گرامر کے اصول اور ضروری ذخیرۂ الفاظ مع اردو معانی کے درج کیا گیا ہے۔ عربی زبان سیکھنے کے لئے یہ کتاب نہایت مفید ہے۔ قیمت عہ۔ پتہ :- منیجر صاحب دین دنیا پبلشنگ کمپنی دہلی۔

روحِ غالب :- یہ مرزا غالب کی زندگی اور ان کے کارناموں کی ایک مجمل لیکن پُر از معلومات سرگزشت ہے۔ ابتدا میں نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم۔ اے نے مقدمہ لکھا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں ان سوانح عمریوں اور شرحوں کا تذکرہ ہے جو غالب اور اس کے دیوان کے متعلق شائع ہوئیں۔ دوسرا باب حیاتِ غالب سے متعلق ہے۔ اس میں ان کے خاندان، تعلیم و تربیت، ملازمت اور دیگر حالاتِ زندگی درج ہیں۔ تیسرے باب میں غالب کے ادبی کارناموں کا ذکر ہے۔ اور ان کی تصانیف کی مفصل فہرست پیش کی گئی ہے۔ چوتھے باب میں غالب کے اعزہ و احباب کا ذکر ہے۔ اور پانچویں باب میں ان کے خطوط کے ادبی حصوں کا اقتباس ہے۔ یہ کتاب غالب کے متعلق شائع شدہ کتابوں میں ایک مفید اضافہ ہے۔ قیمت ۱۲؎۔ پتہ :- ادارۂ ادبیاتِ اردو، رفعت منزل، خیریت آباد، حیدر آباد (دکن)۔

پیامِ ایمن :- مؤلفہ مولانا محمد عبد اللہ صاحب منہاس۔ اس کتاب کا بیشتر حصہ قرآن مجید کے متعلق مغربی فضلاء کی قابل قدر آرا پر مشتمل ہے۔ منہاس صاحب نے ان آراء کو ایک جگہ جمع کر کے مطالعہ اور سند کے لئے قابلِ قدر مواد فراہم کر دیا ہے۔ کتاب کے

بعض ابتدائی عنوان یہ ہیں: اشاعت قرآن کی منصوبہ اسکیم، حفاظ قرآن، کتابت قرآن، قرآن کی سب سے پہلی مجلد، قرآن چینی ترکستان میں، قرآن طغارسیہ میں وغیرہ۔ یہ کتاب ہر مسلمان اور غیر مسلم محقق کے مطالعہ کے قابل ہے۔ حجم ۲۰۰ صفحات قیمت مجلد عہ علاوہ محصول۔ پتہ: شرکت ادبیہ۔ شریف گنج۔ امرتسر۔

ہندوستانی اے پولیٹیکو لنگوسٹک کیچ ورڈ:۔ مصنفہ مسٹر دین محمد۔ تقریباً ساٹھ صفحہ کا یہ انگریزی رسالہ زبان کے مسئلہ پر لکھا گیا ہے۔ فاضل مصنف نے فارسی اور سنسکرت کی تاریخی حیثیت پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ سنسکرت بھی ایسی ہی غیر ملکی زبان ہے جیسی فارسی۔ اس کے بعد اُردو اور ہندی کے مسئلہ کو نہایت قابلیت سے پیش کیا ہے اور دلائل و براہین سے ہندی والوں کے غلط طرزِ عمل کی تشریح کی ہے۔ اس رسالہ کا سب سے اہم موضوع یہ دکھانا ہے کہ کانگریس اُردو کے بجائے ہندوستانی کا نام اختیار کر کے در پردہ ہندی زبان رائج کرنا چاہتی ہے۔ اس کے لئے مصنف نے بڑی کاوش سے دلائل اور حوالے پیش کئے ہیں۔ یہ کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔ قیمت ۱۲ار مصنف سے "الریاض" ہال بازار امرتسر کے پتے سے طلب فرمائیے۔

تصویرِ احساس:۔ یہ پنجاب کے ایک نوجوان شاعر الطاف مشہدی صاحب کا مجموعۂ کلام ہے جسے اُردو اکیڈیمی لاہور نے حسنِ اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ کتاب کا مقدمہ حضرتِ کیفی دہلوی نے تحریر فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ مسٹر کرشن چندر ایم اے کا ایک دیباچہ شامل ہے۔ الطاف صاحب نوجوان اور نو فکر شاعر ہیں۔ اُن کے تخیل میں ندرت اور انداز میں جدت ہے۔ یہ مجموعہ پڑھنے کے قابل ہے۔ حجم ۲۹۶ صفحات۔ قیمت عہ۔ پتہ اوپر مذکور ہے۔

دیہاتی گیت:۔ دیہاتی گیتوں کی اہمیت مسلم ہے، یہ ملک کے عوام کے دل کا آئینہ ہوتے ہیں۔ ان میں ہمیں اپنی قدیم معاشرت کے معائب و محاسن کی جھلک نظر آتی ہے۔ پیشِ نظر کتاب میں ہندوستانی کھڑی بولی کے گیت جمع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کے مؤلف ڈاکٹر اعظم کریوی ہیں جنہیں گیتوں کے انتخاب کا بہت اچھا ذوق ملا ہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ دیہاتی گیتوں کے شائقین کے ملاحظہ سے گزرے۔ حجم ۸۲ صفحات قیمت ۸ر۔ پتہ: عصمت بک ڈپو دہلی۔

ہلال و صلیب:۔ یہ سلطان صلاح الدین ایوبی کی ایک مختصر اور جامع سوانحعمری ہے جو پنجاب کے مشہور ادیب حضرت ایم اسلم نے مرتب کی ہے۔ کتاب دلچسپ اور پُراز معلومات ہے اور اندازِ بیان دلکش ہے۔ ابتدا میں حضرت حفیظ جالندھری کی ایک نظم ہے جو انہوں نے اپنے خاص انداز میں لکھی ہے۔ کتاب میں سلطان صلاح الدین اور اُن کے حریف شاہ رچرڈ کی تصویر بھی دی گئی ہے۔ حجم ۲۵۰ صفحات۔ قیمت درج نہیں۔ پتہ: میاں محمد حنیف پروپرائٹر اُردو اکیڈیمی بیرون لوہاری دروازہ۔ لاہور

تسلیم:۔ یہ چھ صفحہ کا ایک المیہ ڈراما ہے جس کے مصنف سید مظہر گیلانی اور ناشر اردو اکیڈیمی پنجاب لوہاری دروازہ لاہور ہے۔ افسانہ فن اور زبان کے لحاظ سے خاصا ہے اور دلچسپی سے پڑھا جا سکتا ہے۔ قیمت ۶ر۔ پتہ اوپر درج ہے۔

اصلاحِ ادب :- مصنفہ جناب غلام حیدر صاحب چشتی۔ اس تصنیف میں زبانِ اردو کی اغلاط کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اور ادیبوں شاعروں اور عام پڑھے لکھے اصحاب کو صحیح زبان استعمال کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ جابجا اشعار کا حوالہ دیا گیا ہے۔ فہرستِ مضامین میں چند موضوع یہ ہیں :- استعام سے عدم توجہی، زاید الفاظ، تلفظ، اعلانِ نون، اغلاطِ املا، متروک الفاظ، تذکیر و تانیث۔ کتاب بلاشبہ دلچسپ اور مفید ہے۔ قیمت ایک روپیہ ہے۔ ملنے کا پتہ: ایشیاٹک بک ڈپو، گنپت روڈ۔ لاہور۔

اتالیقِ عربی :- مصنفہ مولانا زاہد القادری صاحب۔ یہ کتاب دین دُنیا پبلشنگ کمپنی دہلی نے عربی زبان کے طلبہ کے فائدے کے لئے شائع کی ہے۔ اس میں عربی بول چال اور تحریر پر قدرت حاصل کرنے کے لئے نہایت آسان طریقے بتائے گئے ہیں۔ کتاب کی ترتیب میں جدید تعلیمی اصول مدِ نظر رکھے گئے ہیں اور یہ کوشش کی گئی ہے کہ زبان سیکھنے والوں کے دماغ پر کم سے کم بار پڑے۔

اس کتاب میں جدید و قدیم الفاظ کا ذخیرہ نہایت قابلیت سے جمع کیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ قواعدِ زبان کے سمجھانے کا خیال بھی رکھا گیا ہے۔ آخر میں عربی زبان کی گرامر کے اصول اور ضروری ذخیرۂ الفاظ مع اردو معانی کے درج کیا گیا ہے۔ عربی زبان سیکھنے کے لئے یہ کتاب نہایت مفید ہے۔ قیمت عہ۔ پتہ :- منیجر صاحب دین دنیا پبلشنگ کمپنی دہلی۔

روحِ غالب :- یہ مرزا غالب کی زندگی اور اُن کے کارناموں کی ایک مجمل لیکن پُر از معلومات سرگزشت ہے۔ ابتدا میں نواب مہدی یار جنگ بہادر ایم۔ اے نے مقدمہ لکھا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں اُن سوانح عمریوں اور شرحوں کا تذکرہ ہے جو غالب اور اس کے دیوان کے متعلق شائع ہوئیں۔ دُوسرا باب حیاتِ غالب سے متعلق ہے۔ اِس میں اُن کے خاندان، تعلیم و تربیت، ملازمت اور دیگر حالاتِ زندگی درج ہیں۔ تیسرے باب میں غالب کے ادبی کارناموں کا ذکر ہے۔ اور اُن کی تصانیف کی مفصل فہرست پیش کی گئی ہے۔ چوتھے باب میں غالب کے اعزہ و احباب کا ذکر ہے۔ اور پانچویں باب میں اُن کے خطوط کے ادبی حصّوں کا اقتباس ہے۔ یہ کتاب غالب کے متعلق شائع شدہ کتابوں میں ایک مفید اضافہ ہے۔ قیمت ۸؍۔ پتہ :- ادارۂ ادبیاتِ اُردو، رفعت منزل، خیرت آباد، حیدر آباد (دکن)۔

پیامِ ایمن :- مؤلفہ مولانا محمد عبد اللہ صاحب منہاس۔ اس کتاب کا بیشتر حصّہ قرآنِ مجید کے متعلق مغربی فضلاء کی قابلِ قدر آراء پر مشتمل ہے۔ منہاس صاحب نے ان آراء کو ایک جگہ جمع کر کے مطالعہ اور سند کے لئے قابلِ قدر مواد فراہم کر دیا ہے۔ کتاب کے

بعض ابتدائی عنوان یہ ہیں، اشاعت قرآن کی مختصر داستان، حفاظ قرآن، کتابت قرآن۔ قرآن کی سب سے پہلی مجلد۔ قرآن چینی
ترکستان میں، قرآن بلغاریہ میں وغیرہ۔ یہ کتاب ہر مسلمان اور غیر مسلم محقق کے مطالعہ کے قابل ہے۔ حجم ۲۰۰ صفحات قیمت مجلد عہ علاوہ
محصول۔ پتہ: شرکت ادبیہ، شریف گنج۔ امرت سر*

ہندوستانی اے پولیٹیکو لنگوسٹک کیچ ورڈ :۔ مصنفہ مسٹر دین محمد۔ تقریباً ساٹھ صفحہ کا یہ انگریزی رسالہ زبان کے مسئلہ پر لکھا گیا ہے۔ فاضل مصنف نے فارسی اور سنسکرت کی تاریخی حیثیت پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ سنسکرت بھی ایسی ہی غیر ملکی زبان ہے جیسی فارسی۔ اس کے بعد اُردو اور ہندی کے مسئلہ کو نہایت قابلیت سے پیش کیا ہے اور دلائل و براہین سے ہندی والوں کے غلط طرزِ عمل کی تشریح کی ہے۔ اس رسالہ کا سب سے اہم موضوع یہ دکھانا ہے کہ کانگریس اُردو کے بجائے ہندوستانی کا نام اختیار کرکے درپردہ ہندی زبان رائج کرنا چاہتی ہے۔ اس کے لئے مصنف نے بڑی کاوش سے دلائل اور حوالے پیش کئے ہیں۔ یہ کتاب پڑھنے کے قابل ہے۔ قیمت ۱۲ار مصنف سے "الرّیاض" ہال بازار امرتسر کے پتے سے طلب فرمائیے۔

سویرا احساس :۔ یہ پنجاب کے ایک نوجوان شاعر الطاف مشہدی صاحب کا مجموعۂ کلام ہے جسے اُردو اکیڈیمی لاہور نے حسنِ اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ کتاب کا مقدمہ حضرت کیفی دہلوی نے تحریر فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ مسٹر کرشن چندر ایم اے کا ایک دیباچہ شامل ہے۔ الطاف صاحب نوجوان اور نوفکر شاعر ہیں۔ اُن کے تخیل میں ندرت اور انداز میں جدت ہے۔ یہ مجموعہ پڑھنے کے قابل ہے۔ حجم ۲۹۶ صفحات۔ قیمت عہ۔ پتہ اوپر مذکور ہے۔

دیہاتی گیت :۔ دیہاتی گیتوں کی اہمیت مسلّم ہے یہ ملک کے عوام کے دل کا آئینہ ہوتے ہیں۔ ان میں ہمیں اپنی قدیم معاشرت کے معائب و محاسن کی جھلک نظر آتی ہے۔ پیشِ نظر کتاب میں ہندوستانی کھڑی بولی کے گیت جمع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کے مؤلف ڈاکٹر اعظم کریوی ہیں جنہیں گیتوں کے انتخاب کا بہت اچھا ذوق ملا ہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ دیہاتی گیتوں کے شائقین کے ملاحظہ سے گزرے۔ حجم ۸۲ صفحات قیمت ۸ر۔ پتہ :۔ عصمت بک ڈپو دہلی۔

ہلال و صلیب :۔ یہ سلطان صلاح الدین ایوبی کی ایک مختصر اور جامع سوانحعمری ہے جو پنجاب کے مشہور ادیب حضرت ایم اسلم نے مرتب کی ہے۔ کتاب دلچسپ اور پُر از معلومات ہے اور اندازِ بیان دلکش ہے۔ ابتدا میں حضرت حفیظ جالندھری کی ایک نظم ہے جو اُنہوں نے اپنے خاص انداز میں لکھی ہے۔ کتاب میں سلطان صلاح الدین اور اُن کے حریف شاہ رچرڈ کی تصویر بھی دی گئی ہے۔ حجم ۲۵۰ صفحات۔ قیمت درج نہیں۔ پتہ: میاں محمد حنیف پروپرائٹر اُردو اکیڈیمی بیرون لوہاری دروازہ۔ لاہور

تسلیم :۔ یہ چونسٹھ صفحہ کا ایک المیہ ڈراما ہے جس کے مصنف سید مظہر گیلانی اور ناشر اردو اکیڈیمی پنجاب لوہاری دروازہ لاہور ہے۔ افسانہ فن اور زبان کے لحاظ سے خاصا ہے اور دلچسپی سے پڑھا جا سکتا ہے۔ قیمت ۶ر۔ پتہ اوپر درج ہے *

اُردو کی دو زندہ جاوید کتابیں

۱۔ انار کلی

سید امتیاز علی صاحب تاج بی اے کا وہ معرکۃ الآرا المیہ تاریخی ڈراما جسکے محاسن کی بنا پر :۔

۱۔ گورنمنٹ پنجاب نے مصنف کو ادبیات کا بیش بہا انعام دیا۔

۲۔ اُردو کے طالب علم جاپانیوں نے جاپان میں اسٹیج کیا۔

۳۔ اخبارات و رسائل اور ریڈیو پر اتنے بہت مضامین نکلے جو موجودہ عہد کی کسی دوسری کتاب پر نہیں نکلے۔

۴۔ نقادوں اور ایکٹروں اور ڈائرکٹروں نے مصنف کو ڈراما کے ایک عہدِ نو کا بانی قرار دیا۔

۵۔ مرزا محمد سعید ایم اے دہلوی تحریر فرماتے ہیں "انار کلی کی اشاعت ایک تاریخی اہمیت رکھتی ہے"

۶۔ سید سجاد حیدر یلدرم بی اے "ایک کتاب جس سے آنکھوں میں نور اور دل میں ہمدردیٔ عاشق مہجور پیدا ہوتی ہے"

۷۔ اے۔ ایس بخاری ایم اے (پطرس) ڈپٹی کنٹرولر براڈکاسٹنگ دہلی :۔ "انار کلی اُردو ڈراما کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا"

۸۔ منشی پریم چند مرحوم "مجھے جتنی کشش انار کلی میں ہوئی اور کسی ڈرامے میں نہیں ہوئی"

۹۔ عنایت اللہ خاں صاحب مہتمم تالیف و ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن :۔ "یہ اُن کتابوں میں سے ہے اور ایسی کتابیں شاذ و نادر ہیں جن کو دیکھ کر پڑھ کر اور اپنے پاس رکھ کر ہمیشہ دل خوش ہوتا ہے اور ان کو ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی مرتبہ پڑھنے کو دل چاہتا ہے"

ہر عمر اور ہر مذاق کا شخص اسے پڑھتا اور بے اختیار سر دُھنتا ہے۔ کتابت طباعت اور کاغذ نہایت اعلےٰ، آرٹ کی رنگین تصاویر اور تزئینی نقش۔ تیسرا اڈیشن قریب الختم قیمت فی جلد عہ ۱۲ ؍ پُرتکلف ایڈیشن دستخط شدہ مصنف عـــہ

۲۔ چچا چھکن

سید امتیاز علی صاحب تاج کے ظرافت نگار قلم کا وہ کامیاب کردار :۔

۱۔ جس کے نام سے تعلیم یافتہ ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔

۲۔ جس کی کامیابی سے متاثر ہو کر اکثر ادیب اسی موضوع پر خامہ فرسائی کر رہے ہیں۔

۳۔ جس کے متعلق ایک اصلی یا نقلی مضمون شائع کر دینا اکثر ادبی رسائل کے نزدیک ان کے خاص نمبروں کی کامیابی کا ضامن ہے۔

۴۔ شستہ ظرافت جسے پڑھ کر بچے بوڑھے، عورت، مرد، لڑکے لڑکیاں قہقہے لگا سکتے ہیں۔ قیمت (عہ ۱)

مِلنے کا پتہ :۔ دارالاشاعت پنجاب لاہور

گراموفون کے پُرانے ریکارڈ
اگر آپ کے پاس ہوں تو انہیں مت پھینکئے سائنسدانوں نے حال میں ایک مصالحہ دریافت کیا ہے جس کو
ZED زیڈ
کہتے ہیں۔ اس کے لگانے سے ریکارڈوں میں گھسی ہوئی لکیریں گہری ہو جاتی ہیں اور آواز بہت تیز ہو جاتی ہے۔ وہی دلکش نغمے جو بہت پہلے لگتے تھے پھر نو
عود کر آتے ہیں۔ مگر گھڑگھڑاہٹ بالکل مٹ جاتی ہے۔ نئے ریکارڈوں پر زیڈ لگانے سے عمر بڑھ جاتی ہے اور وہ عرصہ تک نہیں گھستے۔ خوب بک رہا ہے۔
آپ بھی خرید کیجئے۔ قیمت فی شیشی
گرین فیلڈز (انڈیا) کمپنی ہنڈری۔ یو۔ پی

ایک سو ۱۰۰

برس کی عمر کا راز

جو سنہ ۱۸۳۹ء سے سنہ ۱۹۳۹ء تک پہنچکر

کارخانہ

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ

نے حاصل کی

مال کی عمدگی، دیانت داری اور خوش معاملگی

سید عبداللطیف پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ "ہمایوں" ۳ ہسلادنس روڈ لاہور سے شائع کیا۔

قواعد

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پہ پورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ۱؍ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتہً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱؍ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصولڈاک) فی پرچہ ۸؍

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجئے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ۔ لاہور

The Title Page and Picture Printed at the Half-Tone Press,
Langley Road, Ram Nagar Lahore

اٹھو ورنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

یادگارِ علامہ فضیلت مآب آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن)، بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر حامد علی خاں، بی۔ اے

جلد (۳۶)
نمبر (۴)

فہرست مضامین

ہمایوں بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۹ء

تصویر:- محبت
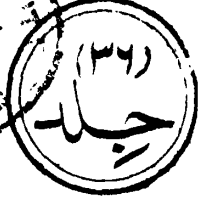
شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۱	جہاں نما	حامد علی خاں	۶۹۳
۲	عبداللہ بیگم	جناب خان بہادر میاں عبدالعزیز صاحب ایم۔ اے وزیر مالیات جے پور	۷۰۰
۳	آسماں اُس کی لحد پر شبنم افشانی کرے (نظم)	جناب شیخ عطاءاللہ صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی	۷۰۱
۴	گناہ کا احساس	جناب پروفیسر معتضد ولی الرحمٰن صاحب ایم۔ اے	۷۰۲
۵	شملہ نے شاعر سے کہا (نظم)	حضرت جلال ملیح آبادی	۷۱۱
۶	نجات (افسانہ)	جناب حسن عزیز صاحب جاوید	۷۱۳
۷	تنہائی (نظم)	مسٹر دیس راج شرما بی سی ڈی (فرنچ)	۷۲۲
۸	خیالات	محترمہ اے ایف سلطان صاحبہ۔ حضرات محمد ایوب و راحل	۷۲۳
۹	غالب کی قدر	جناب نور الحسن صاحب ہاشمی ایم۔ اے	۷۲۴
۱۰	غزل	جناب پیرزادہ احمد ندیم صاحب قاسمی بی۔ اے	۷۳۸
۱۱	گورکن کا ہیرو (افسانہ)	جناب مسعود حسن صاحب شمسی دانا پوری	۷۳۹
۱۲	غزل	حضرت سیفی ٹونکوی	۷۴۷
۱۳	میری کتاب (افسانہ)	جناب مشتاق احمد ہاشمی	۷۴۸
۱۴	قطعات	حضرت اختر انصاری	۷۵۰
۱۵	تخیلات	"ابن مریم"	۷۵۱
۱۶	محفل ادب		۷۵۲
	مطبوعات		۷۶۵

"ہمایوں" آپ کے خیالات کا ترجمان ہے تو اپنے دوستوں کو اس کی خریداری کی طرف توجہ دلائیے۔

جہاں نما

جرمنی کی مفسدانہ جنگ اور برطانیہ کا جہادِ امن

۱۳ مارچ ۱۹۳۸ء کو جرمنی نے آسٹریا کا الحاق کیا۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۳۸ء کو سڈیٹن لینڈ بھی جرمنی کے علاقے میں شامل کر لیا گیا۔ ۱۵ مارچ ۱۹۳۹ء کو سلوویکیا، ۱۶ مارچ ۱۹۳۹ء کو بوہیمیا اور موریویا اور ۲۲ مارچ ۱۹۳۹ء کو میمل پر بھی جرمنی کا قبضہ ہو گیا۔

اس کے نو دن بعد (۳۱ مارچ کو) برطانیہ اور فرانس نے پولینڈ کی آزادی برقرار رکھنے کا ذمہ لیا اور دو ہفتے کے بعد (۱۳ اپریل کو) رومانیہ اور یونان کی آزادی برقرار رکھنے کا ذمہ بھی لے لیا۔ مزید دو ہفتے کے بعد (۲۷ اپریل کو) برطانیہ کے دارالعوام نے جبری فوجی تعلیم کا قانون منظور کیا۔ تقریباً اور دو ہفتے گزرنے کے بعد (۱۲ مئی کو) برطانیہ اور فرانس نے ٹرکی سے معاہدۂ اتحاد استوار کیا۔ اسی سلسلے میں برطانیہ روس سے بھی معاہدہ کرنا چاہتا تھا لیکن شاید برطانی وزرا کی سوداگرانہ ذہنیت نے نفع و نقصان کی جانچ تول میں اتنا وقت ضائع کر دیا کہ روس بدظن ہو گیا اور ۲۳ اگست ۱۹۳۹ء کو اپنی عظیم الشان طاقت کے ساتھ جرمنی سے جا ملا۔

یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا اور اب تک (۱۶ ستمبر) اس کا خاصا علاقہ فتح کر چکا ہے۔

ہٹلر کے اقدامات پر پہلے تو انگریزی اور فرانسیسی حکومتوں نے بڑا راہبانہ صبر دکھایا لیکن جب اس کے حد سے بڑھتے ہوئے اقتدار نے خود برطانیہ اور فرانس کے شہنشاہانہ مفاد کو خطرے میں ڈال دیا تو اپنے بچاؤ کے لئے ان دونوں حلیفوں کو بھی بادلِ ناخواستہ آتشِ جنگ میں کودنا پڑا۔ کہتے ہیں کہ اس جنگ میں شامل ہونے سے ان کا کوئی خود غرضانہ مدعا وابستہ نہیں بلکہ ان کا مقصد تو محض یہ ہے کہ پولینڈ اور دوسری چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کی آزادی کے لئے فی سبیل اللہ جہاد کر کے ثوابِ دارین حاصل کیا جائے کیونکہ ان چھوٹی سلطنتوں کے غلام بن جانے سے دنیا کی تہذیب کو سخت گزند پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ مگر یہ اندیشہ جو بچارے برطانیہ اور فرانس کے دل میں محض اپنی نیکی اور سادگی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے غلط معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ہندوستان کی غلامی سے تو دنیا کی تہذیب کو اب تک غالباً کسی قسم کا گزند نہیں پہنچا۔

ہندوستان کے چند دیسی شرفا بھی اس اعلان پر اپنے اسرافیلی گلوں کی پوری طاقت صرف کر رہے ہیں کہ یہ جنگ جمہوریت اور آزادیٔ اقوام کی خاطر لڑی جا رہی ہے۔ برطانیہ اور فرانس بالکل بے غرض و معصوم ہیں اور محض ہمدردیٔ بنی نوعِ انسان کی خاطر پرائی آفت اپنے سر لے

رہے ہیں۔ اس لئے ہندوستان کو بھی مادرانہ ایثار سے کام لے کر دل وجان سے ان کی مدد کرنی چاہئے۔ بعض دیسی امراء عوام سے کہہ رہے ہیں کہ خبردار اس وقت انگریزوں کے سامنے اپنی آزادی وغیرہ کی کوئی شرط پیش کرنے کا خیال تک دل میں نہ لانا، کیونکہ ایسا کرنا "سوداگرانہ ذہنیت" کا ثبوت دینا ہے جس سے انگریزوں نے کبھی کچھ سروکار ہی نہیں رکھا۔ تم اللہ کا نام لے کر لوپلینٹ کی راہ میں جان ومال قربان کردو اور ضرورت پڑے تو چھ ہزار میل کا سفر طے کر کے دیارِ غیر میں دوسروں کی آزادی کی سلامتی کے لئے فنا ہو جاؤ۔ اللہ تعالےٰ اجر دے گا۔ غیر سوداگرانہ ذہنیت اسی روش کی متقاضی ہے۔ ﷲ مشرق کی روایتی شرافت کی شرم رکھ لو۔

لیکن انگلستان کا اخبار "مارننگ پوسٹ" ہندوستان کے دیسی اُمراء کے ان شریفانہ خیالات کا کچھ زیادہ قائل معلوم نہیں ہوتا اُس نے برطانیہ کو صاف الفاظ میں متنبہ کر دیا ہے کہ:۔

"اب وقت آگیا ہے کہ ہندوستان کو سلطنتِ برطانیہ میں ایک مساوی حیثیت کے رُکن کا درجہ دے دیا جائے۔ اگر ہندوستان کو یہ احساس ہو چکا ہے کہ موجودہ جنگ میں جرمنی کی فتح اُس کے لئے باعثِ نقصان ہوگی تو اُسے یہ اطمینان بھی دلا دینا چاہیئے کہ اس جنگ میں برطانیہ کی فتح سے اُسے فائدہ پہنچے گا۔"

ہندوستان کے لئے دیسی شرفاء کی شریفانہ ذہنیت کے مقابلے میں "مارننگ پوسٹ" کی یہ غیر شریفانہ اور سوداگرانہ لیکن قابلِ فہم اور ہمدردانہ ذہنیت زیادہ مفید معلوم ہوتی ہے جس کے لئے ہندوستان اُس کا شکر گزار ہے۔

جو خود "آزاد" اور "مہذب" نہ ہو اُس کا دوسروں کی "آزادی" اور "تہذیب" کی حفاظت کے لئے لڑنا بڑی پُر لطف شرافت ہے۔ پہلے کسی کو آزادی دو۔ پھر اُس سے اپنی اور دوسروں کی آزادی کی خاطر لڑنے مرنے کی توقع رکھو۔

ایشیا کے چند بڑے آدمی

"اِنسائیڈ یورپ" کے مصنف جان گنتھر نے ایک اور کتاب "اِنسائیڈ ایشیا" لکھی ہے۔ اس کتاب میں اُس نے ایشیا کے اکثر مشاہیر کے دلچسپ مرقعے پیش کئے ہیں۔ ذیل کے اقتباسات قابلِ ملاحظہ ہیں:۔

جنرل چیانگ کائی شیک

"چیانگ کائی شیک کوئی بہت عظیم الشان تاریخی شخصیت نہیں۔ نہ وُہ کوئی لنکن ہے نہ سکندرِ اعظم۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ تیسری صدی قبل مسیح کے زمانے سے جب دیوارِ عظیم تعمیر ہوئی تھی اب تک چین نے اُس سے زیادہ زبردست اور کوئی فرد پیدا نہیں کیا کیونکہ وہ اب ایک اور "دیوارِ عظیم" کی تعمیر میں مصروف ہے جو چین کو جاپانیوں کے حملوں سے محفوظ رکھ سکے گی۔"

مہاتما گاندھی

"مہاتما بدھ کے زمانے کے بعد اب تک گاندھی سے بڑا کوئی ہندوستانی پیدا نہیں ہوا۔ لیکن اُس کی سیرت سے زیادہ مشکل سے سمجھ میں آنے والی اور پُرپیچ سیرت کا تصور کرنا مشکل ہے۔ اُس میں بڑا تلوّن ہے۔ میری نیت اہانت کی نہیں لیکن ذرا اِن اضداد پر نظر ڈالیئے۔

"گاندھی خالص اخلاقی وجوہ کی بنا پر روزے رکھتا تھا لیکن یہ روزے کافی عملی سہولت پیدا کرنے کا باعث ہوتے کیونکہ اگر وہ جیل میں روزہ رکھتا تو انگریز اُسے رہا کرنے پر مجبور ہو جاتے . . . . وہی گاندھی جو اس سے پہلے ہندوستان میں برطانی سلطنت کا زبردست حریف رہ چکا ہے ۱۹۳۹ء میں انگریزوں کا اس ملک میں تقریباً بہترین دوست ہے . . . . . گاندھی جدید سائنس کو ایک لعنت سمجھتا ہے لیکن وہ تھرمامیٹر استعمال کرتا ہے اور عینک لگاتا ہے۔"

شاہ رضا پہلوی

"تمام ایران رضا شاہ کے جوشیلے مزاج سے لرزہ براندام رہتا ہے۔ حکومت کی مجالس میں وہ وزرا کو اپنے غیظ و غضب کا نشانہ بناتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی طرح اُن کے دل و دماغ میں بھی اپنی ہی سی قوتِ عمل پیدا کر دے تاکہ وہ کام کرنا سیکھیں کام کرنے پر فخر کرنا سیکھیں اور اپنے ملک کو قابلِ فخر بنا ڈالیں۔"

سُلطان ابن سعود

"ابنِ سعود کی سوسوا سو بیبیاں اور بیسیوں بیٹے اور بے شمار بیٹیاں ہیں۔ شادی اس کے نزدیک "اتحادِ عرب کا ایک ذریعہ" ہے۔ کچھ عرصہ قبل اُس نے کہا تھا کہ "میں نے اپنے لڑکپن اور جوانی کے زمانے میں ایک قوم بنائی۔ اب میں اپنے زمانۂ کہولت میں اُس کے لئے آدمی بنا رہا ہوں۔"

ہندوستان میں تعلیمِ عوام کی تحریکیں

ہندوستان کے بعض صُوبوں میں بالغوں کی تعلیم کے لئے جو منصوبہ بندیاں کی گئی ہیں وہ قابلِ مبارکباد ہیں صوبجاتِ متحدہ میں اصلاحِ دیہات کے محکمہ نے یہ کام بھی اپنے ذمہ لیا ہے کہ اشتہاروں کے ذریعہ سے اُن پڑھے لکھے بالغوں کو جنہیں حال میں کانگریسی حکومت نے تعلیم دلوائی ہے اور کتابیں پڑھنے کی طرف متوجہ کیا جائے۔ ان اشتہاروں کے ذریعہ سے یہ کوشش بھی کی جائے گی کہ عوام میں تعلیم کا زیادہ سے زیادہ چرچا کیا جائے یہاں تک کہ اَن پڑھ نا پید ہو جائیں۔ عوام کے لئے ادبی کتابیں مہیا کرنے کے لئے بہترین کتابیں لکھنے والوں کو ایک ہزار روپے سالانہ کے انعامات بھی دیئے جایا کریں گے۔ انعامات

کی تقسیم سال میں چار مرتبہ یعنی ہر سہ ماہی کے بعد ہوا کرے گی۔ یہ کتابیں مضامین افسانوں ڈراموں اور نظموں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اس خیال سے کہ نوتعلیم یافتہ بالغ پڑھا لکھا بھول نہ جائیں اُن کے لئے ایک نیم ماہی رسالہ بھی جاری کر دیا گیا ہے۔ ہندی اور اردو کی نظموں کے دو مجموعے بھی ان لوگوں میں مفت تقسیم کرنے کے لئے زیرِ ترتیب ہیں۔ یو پی کے امرا بھی اس سلسلے میں مدد دے رہے ہیں۔ راجہ صاحب تملوئی نے وعدہ کیا ہے کہ وہ دس سال تک رامائن کے ایک ہزار نسخے عوام میں تقسیم کرنے کے لئے ہر سال دیتے رہیں گے۔ مسٹر جی ڈی برلا اور نواب صاحب چھتاری نے بھی مدد کا وعدہ کیا ہے۔

صوبۂ بہار بالغوں کی تعلیم کے لئے جو کوشش کر رہا ہے اس کا کچھ ذکر گزشتہ مہینے کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں اربابِ تحریک کو سب سے بڑی دِقت یہ پیش آتی ہے کہ عوام کو پڑھانے کے بعد اُن کو پڑھنے لکھنے کی عادت کس طرح ڈالی جائے تاکہ وہ پڑھا لکھا بھول نہ جائیں۔ اس غرض کو پیشِ نظر رکھ کر ڈاکٹر سید محمود وزیرِ تعلیم بہار نے فیصلہ کیا ہے کہ صوبے میں عوام کے لئے چار ہزار چھوٹے چھوٹے کتب خانے کھول دیئے جائیں۔ ہر کتب خانے میں ہندی اور اُردو کی سو سو کتابیں۔ دو کچھ اخبار رکھے جائیں گے۔ دو اکتوبر کو یہ کتب خانے بہار کے چار ہزار منتخب دیہات میں بیک وقت کھل جائیں گے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سید محمود نے عوام کے نام ایک پیغام لکھا ہے جو درجِ ذیل ہے:۔

پڑھو اور پڑھاؤ

"پڑھنے لکھنے سے آدمی کی عقل بڑھتی ہے اور اس کی کمائی میں بھی ترقی ہوتی ہے۔ ایک پڑھا لکھا مزدور زیادہ مزدوری پاتا ہے۔ ایک پڑھا لکھا کسان کھیتی کی نئی نئی باتیں جان کر زیادہ پیسہ کما سکتا ہے۔ ایک پڑھا لکھا کاریگر اپنے کام کو زیادہ اچھی طرح کرے گا اور اس طرح زیادہ پیسہ کمائے گا۔ ایک پڑھا لکھا غریب آدمی پڑھ لکھ کر جب قرض لے گا تو وہ مہاجن کے سادہ کاغذ پر انگوٹھے کا نشان نہ دے گا اور اس طرح دھوکے سے بچے گا۔ ایک پڑھا لکھا گاڑیبان جب اپنی اوکھ لے کر مِل میں جائے گا تو مل والے اُسے کم تول کر دھوکا نہیں دے سکتے۔ ایک پڑھا لکھا آدمی بیماریوں کی بہت سی باتیں جان کر اپنے بال بچوں کو طرح طرح کی بیماریوں سے بچا سکتا ہے۔

"تم کو نا اُمید نہ ہونا چاہئے کہ اب تمہاری عمر بہت ہو گئی ہے اور تم پڑھ نہیں سکتے۔ اگر تم روزانہ ایک گھنٹہ بھی شام کے وقت چھ مہینے تک پڑھ لو گے تو تم کو زندگی بھر اُن لکھی ہوئی باتوں کا فائدہ پہنچتا رہے گا۔ لوگ تمہاری عزت کریں گے۔ پڑھ لکھ کر تم مزے سے اخبار پڑھ لیا کرو گے اور اس طرح اپنے گاؤں میں بیٹھے ہی بیٹھے ساری دنیا کی خبریں تمہیں ملتی رہیں گی۔

"کانگریس سرکار نے یہ طے کیا ہے کہ اس صوبہ میں چند برسوں کے اندر ہر بالغ آدمی پڑھا لکھا ہو جائے۔ اس کام میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ بس تم اتنی مدد کرو کہ چھ مہینے تک ہر روز ایک گھنٹہ پڑھ لیا کرو۔ اس کے بعد یہ کتابیں جو کانگریس سرکار کی طرف سے تمہارے گاؤں میں رکھی گئی ہیں۔ اُن کو پڑھو۔ تمہیں پڑھتے لکھتے دیکھ کر تمہارے بچوں کو بھی پڑھنے لکھنے کا شوق ہوگا۔ اگر تم ایسا کرو گے تو اُونچی نیچی ذات کا فرق

بٹ جائے گا اور تمہاری گنتی انسانوں میں ہوگی۔"

یہ پیغام جس طرح دردِ دل سے لکھا گیا ہے اُمید ہے کہ اسی طرح اس کا اثر ہوگا۔ کاش ہندوستان کے ہر صوبے کو اس انسانی (قو)می اور ملکی خدمت کی توفیق ہو۔

سادگی و پُرکاری

"انڈین ریویو" نے "نسیم کی عجیب و غریب خواہش" کے عنوان سے ایک نوٹ لکھا ہے جس میں ہندوستان کی ایک فلمی اداکارہ مس نسیم کے اس اعلان پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ "خوبصورت ہونا اداکاروں کی ترقی کے راستے میں ایک رُکاوٹ ہے اور میں چاہتی ہوں کہ میں اتنی خوبصورت نہ ہوتی۔"

مس نسیم لکھتی ہیں:-

"اخبارات اور میرے دیگر مدّاح میری بہت تعریف کرتے رہتے ہیں۔ لیکن میں نے اِس مدح و ثنا کا تجزیہ کر کے دیکھا ہے کہ اس کی محرک میرے اداکارانہ کمال سے زیادہ میری خوبصورتی ہے۔

"میری ظاہری دلکشی میری اس خواہش کی تکمیل کے راستے میں ایک رُکاوٹ ثابت ہو رہی ہے کہ میں ایک حقیقی باکمال فلمی اداکار تسلیم کی جاؤں۔

"میں نے اداکاری کا پیشہ کسی قسم کی مجبوری یا جذباتی اشتعال کی وجہ سے نہیں اختیار کیا تھا بلکہ اس کی بنا میری یہ فطری خواہش تھی کہ میں ایک کامیاب اداکار کی حیثیت سے ترقی کر سکوں۔

"میں ابھی کوئی پختہ کار ایکٹریس نہیں ہوں۔ میرا تجربہ ہی کتنے سال کا ہے لیکن اس کے باوجود میں یہ ضرور کہوں گی کہ مجھے اپنے اداکارانہ کمالات کو تسلیم کرانے میں بہت دقت پیش آرہی ہے کیونکہ میرے مدّاحوں کی بھوکی آنکھیں میری اداکاری کے بجائے برابر میری فضول دلربائیوں کا جائزہ لیتی رہتی ہیں۔

"شاید کچھ معمّر ہو جانے کے بعد جب میرے چہرے اور قد و قامت کی دلکشی میں کمی پیدا ہو جائے گی میرے مدّاحوں کو آخر کار میرے فنی کمال کا احساس ہونے لگے۔ لیکن اِس طرح کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لئے ابھی سالہا سال درکار ہیں اُس وقت تک میں بجز اِس خواہش کے اور کیا کر سکتی ہوں کہ کاش میں خوبصورت نہ ہوتی۔"

وٹامنز کے متعلق ایک جدید تحقیق

برسوں سے یہ خیال عام ہو چکا تھا کہ غذا میں وٹامنز (حیاتین) کی کمی یا غیر موجودگی جسمانی صحت کے لئے تباہ کن ہے اور

لٹرلوگ یہ بھی سمجھتے تھے کہ وٹامنز کی کوئی زیادہ سے زیادہ مقدار بھی صحت کے لئے زاید از ضرورت نہیں قرار دی جا سکتی۔ لیکن اب ڈاکٹر جیکو یز سپیناڈیل نے یہ انکشاف کیا ہے کہ وٹامنز کی زیادتی بھی خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ اس ڈاکٹر نے اپنے اس دعوے کی تصدیق میں بہت قوی دلیلیں پیش کی ہیں۔

ڈاکٹر سپیناڈیل اے، بی، سی، ڈی چاروں وٹامنز کو زیر بحث لایا ہے۔

یہ بات تو عام طور پر معلوم ہے کہ وٹامن اے کی کمی سے جسمانی نشو ونما رُک جاتی ہے اور جسم دُبلا ہو جاتا ہے اس کے علاوہ جلدی بیماریاں بھی لاحق ہو جاتی ہیں اور بال بھی گرنے لگتے ہیں لیکن لوگ عموماً یہ نہیں جانتے کہ وٹامن اے کی زیادتی بھی ایسی ہی شکایات پیدا کر دیتی ہے۔

باقی تمام وٹامنز کی زیادتی بھی اسی طرح تکلیف دِہ نتائج پیدا کرتی ہے مثلاً وٹامن بی کی زیادتی خون میں شکر کے اجزا کو گھٹا دیتی ہے اور یہ ایک عجیب حیرت انگیز بات ہے کہ اس سے پدرانہ اور مادرانہ احساس میں بھی کمی پیدا ہو جاتی ہے۔

موجودہ ہندوستانی طلبہ

پبلک سروس کمیشن کے ایک رُکن نے حال ہی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مجھے ہندستانی طلبہ سے عموماً سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں طلبہ کی حالت اُمید افزا نہیں۔ عام ہندوستانی طلبہ معمولی سوالات کا صحیح جواب بھی نہیں دے سکتے۔ سب سے زیادہ دُہرایا ہُوا جواب یہ ہے کہ "یہ ہمارے مقررہ نصاب کی کتاب میں درج نہیں" یا "یہ میرا خاص مضمون نہیں"۔ آجکل کے طلبہ کتابوں کے غلام ہیں، اُن کے لئے علم حاصل کرنے کا ذریعہ محض کتابیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی واقفیت بہت محدود اور تنگ نظرانہ ہوتی ہے۔ اس کے برعکس مغربی ممالک کے طلبہ اپنے معلّموں، اپنے ماں باپ اور اپنے ہم جماعتوں سے گفتگو اور سوالات کر کے بھی معلومات حاصل کرتے رہتے ہیں۔

مقرر نے کہا کہ میرے زمانۂ تعلیم میں بی، اے تک پہنچنے سے پہلے طلبہ کے لئے کسی ایک مضمون کی "تخصیص" ضروری نہ سمجھی جاتی تھی۔ کتابوں پر ضرورت سے زیادہ انحصار اور مضامین کے اختصاص نے طلبہ کی معلوماتِ عامہ کا دائرہ نہایت محدود کر دیا ہے۔ تاریخ کا طالب علم سائنس سے ناواقف ہوتا ہے اور سائنس کے طالب علم کو تاریخ کے معمولی واقعات سے بھی واقفیت نہیں ہوتی۔ ایسی تعلیم جو طلبہ کی دماغی ترقی کی ضامن نہیں اور جو اُن کے خیالات میں وسعت پیدا نہیں کر سکتی بیکار ہے۔ آجکل کے نوجوان تعلیم یافتہ نہیں، وہ زیادہ سے زیادہ نیم تعلیم یافتہ کہلانے کے مستحق ہیں۔ طلبہ کو چاہئے کہ ہر بات سے کچھ نہ کچھ واقفیت ضرور پیدا کریں اور حد سے زیادہ "اختصاصیت" کے عیوب سے بچ کر کم از کم ایک شعبۂ علم میں پوری پوری مہارت بھی حاصل کریں۔

ریاست بڑودہ میں تعلیمی اصلاحات

ہندوستان کی دیسی ریاستوں میں کہیں کہیں ترقی کے جو آثار نظر آرہے ہیں وہ اگرچہ وطن پرست ہندوستانیوں کے لئے موجب اطمینان ہونے چاہئیں لیکن افسوس کہ اس ترقی کی رفتار بہت سست ہے بہرحال جو ریاستیں اپنی رعایا کی فلاح وبہبود کا کوئی کام کر رہی ہیں قابلِ مبارک باد ہیں۔ بڑودہ کی ریاست بھی ہندوستان کی ترقی یافتہ ریاستوں میں سے ہے۔ حال ہی میں اس ریاست کے حکام نے فیصلہ کیا ہے کہ ریاست کا کوئی فرد پڑھنے لکھنے کی صلاحیت سے عاری نہ رہنا چاہئے۔ چنانچہ اس سلسلے میں منظم منصوبہ بندی ہو رہی ہے اور فیصلہ کیا گیا ہے کہ ریاست کے ادنیٰ طبقوں کی تعلیم کی طرف خاص توجہ صرف کی جائے گی۔

پروہتوں کی تعلیم

اس سلسلے میں حکامِ بڑودہ نے ایک اور قابلِ تعریف قدم اٹھایا ہے یعنی یکم اگست ۱۹۳۹ء سے انہوں نے ریاست کے مختلف شہروں میں ہندو پروہتوں کے لئے تعلیم گاہیں کھول دی ہیں۔ ریاست نے "ہندو پروہت ایکٹ" کے نام سے ایک قانون نافذ کیا ہے جس کا منشا یہ ہے کہ ریاست میں صرف سند یافتہ پروہتوں ہی کو ہندوؤں کے مذہبی امور کی سربراہی کا اختیار رہے گا۔ پروہتوں کی تعلیم گاہیں اسی قانون کا منشا پورا کرنے کے لئے کھولی گئی ہیں۔ ہندوستان میں عوام کی ترقی کے لئے یہ بات اشد ضروری ہے کہ انہیں توہمات پھیلانے والے جاہل اور گمراہ کن مذہبی پیشواؤں کے پھندے سے نجات دلائی جائے۔ اس مقصد کی اہمیت مبالغے کی ہر انتہا کی متحمل ہو سکتی ہے۔ ریاست بڑودہ نے اس قانون سے رعایا کی سچی بہی خواہی کی جو مثال قائم کی ہے اس کی تقلید دیگر ہندو اور مسلمان ریاستوں کے علاوہ برطانی ہندوستان کے صوبوں کی حکومتوں کو بھی کرنی چاہئے۔ ملک کی عام جہالت کے باعث ہر مذہب و ملت کے جاہل عیار یا خود غرض پیشوا عوام کی سادگی سے جس قدر ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں اس کی حد نہیں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ عوام کی ذہنی ترقی اور آزاد خیالی کی راہ میں ایک سنگلاخ چٹان کی طرح حائل ہیں۔ ان لوگوں نے عوام کو اپنے من مانے مقاصد کے لئے جس نفرت انگیز ذہنی غلامی اور غلط مذہبی تعصب میں مبتلا کر رکھا ہے اس کی وجہ سے یہ ملک مہذب دنیا کی نظروں میں بے انتہا ذلیل ہو چکا ہے۔

پونا کی نسوانی یونیورسٹی

یہ ہندوستان کی خوش قسمتی ہے کہ رفتہ رفتہ اس کی عورتوں کی بیداری کے سامان بھی پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ پونا میں ایک نسوانی یونیورسٹی قائم تھی لیکن اب تک حکومت نے اس کی ڈگریوں کو تسلیم نہ کیا تھا۔ یہ اطلاع باعثِ مسرت ہے کہ اب صوبۂ بمبئی اور صوبجاتِ متوسط کی حکومتوں نے اس یونیورسٹی کی ڈگریاں بھی تسلیم کر لی ہیں۔ گویا ان صوبوں کی حکومتوں کے نزدیک اس یونیورسٹی کی گریجوایٹ لڑکیوں کی بھی ملازمت وغیرہ کے سلسلے میں وہی حیثیت ہے جو دوسری ہندوستانی یونیورسٹیوں کی گریجویٹوں کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ "انڈین ومنز یونیورسٹی" پونا میں تعلیم حاصل کرنے پر اب تک جو اعتراض عائد ہوتا تھا وہ رفع ہو چکا ہے۔ اس یونیورسٹی کا نصابِ تعلیم ہندوستانی عورتوں کی ضروریات اور مشکلات کو پیش نظر رکھ کر مقرر کیا گیا ہے، اس لئے یہاں کی فارغ التحصیل طالبات سوسائٹی کے لئے زیادہ مفید کام کر سکتی ہیں۔

حامد علی خاں

عبداللہ بیگم

۸ر اگست ۱۹۳۹ء تین بجے بعد دوپہر علی گڑھ سے دنیا کو رخصت کر گئیں۔ پیدائش دہلی کی تھی۔ ماں باپ نے نام وحید جہاں بیگم رکھا تھا۔ ایک تُتلانے والی بھانجی خالہ کہنے کے بجائے

اعلےٰ

کہتی تھی۔ تھی واقعی اعلےٰ۔ بڑی بہنیں، شوہر، خود اپنے بچے یہی کہنے لگے اور اسی نام سے مشہور ہو گئیں۔ علی گڑھ مسلم گرلز کالج اور اس کے متعلق سکول کی ہزارہا لڑکیوں میں

اعلےٰ بی

وہ کام کر گئیں جو لڑکوں کے لئے سر سید احمد خاں نے کیا تھا۔ مسلم گرلز سکول (جو اب کالج ہے) خان بہادر شیخ عبداللہ کی محنت سے بنا۔ اعلےٰ بی کی محبت سے پلا، بڑھا اور کامیاب ہوا۔

عبداللہ بیگم کو نمود اور شہرت سے دلچسپی نہ تھی، کام کا شوق تھا۔ اگر مفید کام عظمت کا معیار ہے تو عبداللہ بیگم کی عظیم الشان خدمات کی قوم جتنی قدر کرے کم ہے۔ سینکڑوں سے زیادہ لڑکیاں ہوں گی، جن کو عبداللہ بیگم کی شفقت نے خود اپنے گھروں کی آرام کی زندگی کو بھلا دیا۔ کام میں اَن تھک تھیں خلوص میں اس سے زیادہ اَن تھک تھیں۔ پرائے بچوں کو اپنے بچوں سے بڑھ چڑھ کر پالتی تھیں۔ عبداللہ لاج سے بورڈنگ ہاؤس تک روزانہ بیسیوں چکر کر ڈالتیں اور کبھی احسان نہ دھرتیں۔ نہ یہ جتلاتیں کہ کام زیادہ ہے وقت کم ہے۔ سبک خرام اس بلا کی تھیں کہ جو فاصلہ اور بیویاں دس منٹ میں طے نہ کر سکیں اعلےٰ اسے تین منٹ میں بغیر ہانپے ختم کر دیتیں۔

لکھنے کو انسان بہت کچھ لکھ سکتا ہے مگر کم سے کم جو کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس بلند مرتبہ عالی ہمت خاتون کی زندگی ایک

مقدس سفر

تھی۔ سفر ختم ہو گیا۔ اب وہ آرام فرما رہی ہیں۔

عبدالعزیز

آسماں اُس کی لحد پر شبنم افشانی کرے

(اقبالؒ)

(عزیزہ[1] خورشید جہاں مرحومہ کی یاد میں)

ابھی کل تک تو اُس کے قہقہوں کی گُونج سنتے تھے
وہ بلبل تھی ہم اُس کے چہچہوں کی گونج سنتے تھے

ابھی کل تک تو اُس کی نیک گفتاری کے چرچے تھے
محبت، خندہ پیشانی، حیاداری کے چرچے تھے

ابھی کل تک حریمِ زندگی میں تھا قیام اُس کا
ابھی کل تک کتابِ ہست میں لکھا تھا نام اُس کا

ابھی تک ہے لباسِ نوعروسی عطر بیز اُس کا
وہ رکھا ہے قرینے سے ابھی سارا جہیز اُس کا

پڑا ہے وہ پلنگ، یہ کرسیاں ہیں اور وہ صوفے ہیں
اور اس صندوق میں ہیں اُس کے گہنے اس میں کپڑے ہیں

یہ وہ گلدان ہیں جن کو وہ پھُولوں سے سجاتی تھی
خود اپنے ہاتھ سے رنگین گلدستے بناتی تھی

انگیٹھی پر پڑا ہے جو غلاف اُس نے بنایا تھا
لگا کر موتیوں کی جھالریں سب کو دکھایا تھا

مگر یہ کیا کہ ماتم کر رہی ہے کائنات اُس کا
نظر آتے ہی ڈوبا ہائے خورشیدِ حیات اُس کا

وہ اُس کے ہونٹ جن پہ برگِ گُل کو رشک آتا تھا
تبسّم بن کے جن پر کیفِ ہستی پھیل جاتا تھا

وہ ہونٹ اب اس طرح ہیں جس طرح مرمر کے ٹکڑے ہوں
کسی ٹوٹے ہوئے بے آب سے خنجر کے ٹکڑے ہوں

نہ اُن میں زندگی باقی، نہ اُن میں تازگی باقی
اُڑا سب رنگ اور اِک ماتمی زردی رہی باقی

وُہ آنکھیں جن میں احساسِ مروّت مسکراتا تھا
وہ آنکھیں جن میں نُورِ پاکبازی جگمگاتا تھا

وہ آنکھیں اُس کے چہرے پر برائے نام باقی ہیں
مے گلرنگِ ہستی بہ گئی ہے جام باقی ہیں

جھکا ہے اُس کے ابا جان کا سر شدّتِ غم سے
وہ اُس کا بھائی روتا ہے درو دیوار سے لگ کے

کسی کو کب وُہ یوں افسردہ خاطر دیکھ سکتی تھی
وہ اپنوں اور بیگانوں کے درد و غم کی ساجھی تھی

مگر اب نالہ و فریاد کی پروا نہیں اُس کو
عزیزوں کے دلِ ناشاد کی پروا نہیں اُس کو

اُسے لمسِ فنا نے کر دیا احساس سے خالی
وہ ہے اس پھول کی صُورت جو ہو بُوباس سے خالی

جگایا[2] تھا جہاں کے شور نے پھر سوگئی ہے وُہ
عدم کی وادیٔ پُرخواب میں پھر کھوگئی ہے وُہ

عطاء اللہ سجاد

[1] میری بنتِ عم جو گزشتہ فروری میں اپنی شادی کے دس ماہ بعد تئیس سال کی عمر میں وفات پاگئیں [2] شورے شد و از خوابِ عدم چشم کشودیم - دیدیم کہ باقی ست شبِ فتنہ غنودیم (علی حزیں)

گناہ کا احساس

گناہ کی ایک روایتی مذہبی نفسیات ہے، لیکن زمانۂ حال کا کوئی ماہرِ نفسیات اس کو قبول نہیں کرسکتا۔ عام عیسائیوں اور خصوصاً
ڈسٹنٹوں کا خیال یہ تھا کہ ہمارا ضمیر بتلاتا ہے کہ جو کام ہم کرنا چاہتے ہیں، وہ بُرا ہے اور یہ کہ اس کام کے کرنے کے بعد اس کو
دردناک حسیات میں سے ایک کا تجربہ ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک تو تأسف کہلاتی ہے، اور اس میں کوئی چیز قابلِ تعریف نہیں،
سری کو توبہ کہتے ہیں، اور اس کی وجہ سے گناہ دُھل جاسکتا ہے۔ جن ملکوں کے باشندے پروٹسٹنٹ ہیں، اُن میں وہ لوگ
ی ہیں، جو بہت آزاد خیال ہونے کی وجہ سے مذہبی قیدوں کے پابند نہیں رہے ہیں، لیکن یہ لوگ بھی عرصے تک گناہ کے
ی عقیدے کو کم وبیش ترمیم کے ساتھ مانتے رہے۔ لیکن خود ہمارے زمانے میں گناہ کا جو عقیدہ مقبول ہے، وہ اوپر بیان کیے ہوئے
قیدے کے بالکل خلاف ہے۔ یہ نیا عقیدہ ایک حد تک نفسی تحلیل کے اثر سے پیدا ہوا ہے۔ اب نہ صرف آزاد خیال لوگوں نے
ناہ کے پُرانے عقیدے کو ترک کردیا ہے، بلکہ جو لوگ کہ اپنے آپ کو کٹا سمجھتے ہیں، وہ بھی اس سے کنارہ کررہے ہیں۔ اب
میر وہ پُراسرار چیز نہیں رہا، جو پُراسرار ہونے کی وجہ سے، خدا کی آواز سمجھا جاتا تھا۔ ہم کو معلوم ہے کہ مختلف ملکوں میں ضمیر کا حکم
مختلف ہوتا ہے، اور یہ کہ عام طور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ ہر جگہ قبائلی قانون کی پیروی کرتا ہے۔ لہٰذا اب سوال یہ ہے کہ جب کسی کا
ضمیر چٹکیاں لیتا ہے، تو حقیقت میں کیا ہوتا ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ لفظ "ضمیر" بہت سی مختلف حسیات کے لئے استعمال ہوتا ہے، اور پکڑے جانے کا خوف ان میں سے سب سے
زیادہ سادہ ہے۔ ایک شخص ایسا کام کرتا ہے کہ اگر وہ پکڑا جائے، تو بہت سخت سزا کا مستوجب قرار دیا جائے۔ ایسے شخص سے اگر دریافت
لیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ جب اس کو یقین ہوجاتا ہے کہ وہ ضرور پکڑا جائے گا، تو وہ اپنی حرکت پر نادم ہوتا ہے، اور اس سے توبہ کرتا ہے
یکن اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ میرا یہ بیان اس پیشہ ور چور کے لئے بھی صحیح ہے، جو ہر وقت قید خانے جانے کا منتظر رہتا ہے
لیکن یہ ایک عزت دار مجرم، مثلاً کسی بنک کے اُس منیجر کے لئے تو ضرور صحیح ہے جس نے تنگ دستی کے وقت روپیہ غبن کیا ہے،
اور اس پادری کے لئے بھی صحیح ہے، جو گرمی کے وقت کسی جنسی بے قاعدگی کا مرتکب ہوا ہے۔ ایسے لوگوں کو اگر پکڑے جانے کا
اندیشہ نہیں ہوتا، تو پھر یہ اپنے گناہ بہت جلد بھول جاتے ہیں۔ لیکن جب یہ پکڑ لئے جاتے ہیں، یا ان کو پکڑے جانے کا اندیشہ
ہوتا ہے تو یہ سوچتے ہیں کہ ان کو ایسا نہ کرنا چاہئے تھا۔ اسی خواہش سے ان کو اپنے گناہ کی بُرائی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ پھر

"ذات باہر" کئے جانے کا خوف بھی اسی احساس سے قریب کا تعلق رکھتا ہے۔ ایک شخص تاش کی بازی میں بے ایمانی کرتا ہے، یا اپنا قرضِ حسنہ ادا نہیں کرتا۔ خود اس شخص میں کوئی چیز ایسی نہیں ہوتی، جس سے وہ، پکڑے جانے کی صورت میں، اپنے قبیلے کا مقابلہ کرے۔ اس کا حال مذہبی بدعتی، سیاسی فسادی اور باغی سے مختلف ہے۔ ان لوگوں کو معلوم رہتا ہے کہ خود ان کے ہم عصر اُن کے ساتھ کیسا بھی سلوک کریں، اگلی نسل اُن کا ساتھ دے گی، اور اُن کی اتنی ہی عزت کرے گی، جتنا کہ ہم عصر نسل ان کی بے عزتی کر رہی ہے۔ قبیلے کی مخالفت اور دشمنی کے باوجود یہ لوگ اپنے آپ کو گناہ گار نہیں سمجھتے لیکن جو شخص کہ اپنے قبیلے کے اخلاقی ضابطے کو پوری طرح تسلیم کر چکا ہے، وہ، اس کی خلاف ورزی کرنے کی صورت میں، جب "ذات باہر" کر دیا جاتا ہے تو اُس کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ اب وہ "ذات باہر" کئے جانے کے خوف، اور "ذات باہر" ہو جانے کے بعد اس کے دُکھ کی وجہ سے اپنے کاموں کو گناہ گارانہ سمجھنے لگتا ہے۔

لیکن گناہ کے احساس کی بعض اہم صُورتیں اس سے بھی زیادہ گہری جاتی ہیں۔ ان کی جڑیں لاشعور میں ہوتی ہیں، اور یہ دوسرے لوگوں کی ناپسندیدگی کی شکل میں شعور میں نمودار نہیں ہوتیں۔ شعور میں بعض کاموں کو گناہ قرار دیا جاتا ہے، لیکن مطالعۂ باطن اس کی کوئی وجہ مہیا نہیں کر سکتا۔ جب کوئی شخص یہ کام کرتا ہے، تو وہ مضطرب ہو جاتا ہے، لیکن خود اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس اضطراب کی وجہ کیا ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اُن لوگوں میں سے ہوتا، جو اُس چیز سے بچ سکتے ہیں، جس کو وہ گناہ سمجھتا ہے۔ وہ اخلاقی حیثیت سے قابلِ تعریف صرف اس شخص کو قرار دیتا ہے، جو دل کا صاف ہو۔ وہ کم و بیش افسوس کے ساتھ یقین کر لیتا ہے کہ ولی بننا اس کی تقدیر میں نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ولی کا جو نقشہ اس کے ذہن میں ہوتا ہے، اُس کے مقابلے کا روزمرہ زندگی میں کوئی شخص نہیں ملتا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ اس کی تمام عمر گناہ کے احساس ہی میں ختم ہو جاتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ دُنیا کی بہترین چیزیں اس کے لئے نہیں ہیں، اور یہ کہ اس کی زندگی کے بہترین لمحے وہ ہیں، جو وہ توبہ استغفار میں گزارتا ہے۔

قریب قریب ہر مثال میں اُس کے اِس وہم کی ابتدا اُس اخلاقی تعلیم سے ہوتی ہے، جو اُس کے ماں باپ نے اُس کی چھ برس کی عمر سے پہلے اُس کو دی تھی۔ اس عمر پر پہنچنے سے پہلے اس کو بتایا گیا تھا کہ گالی دینا بُری بات ہے، اور شریفوں کی سی گفتگو کے علاوہ ہر بات چیت اچھی نہیں۔ صرف بُرے آدمی شراب پیتے ہیں، اور تمبا کو بہترین نیکیوں کے لئے زہر ہے۔ اس کو سکھایا گیا تھا کہ اس کو کسی حالت میں بھی جھوٹ نہ بولنا چاہئے، اور آلاتِ تناسل کے ساتھ دلچسپی کا اظہار سب سے بڑی بُری بات ہے۔ اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام عقیدے اس کی ماں کے ہیں، لہٰذا وہ گویا خدائی احکام ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خوشی یہ ہوتی ہے کہ اُس کی ماں اُس سے محبت کرے، اور اِس کو حاصل کرنے کی صرف ایک ہی ترکیب ہے کہ وہ اِن اخلاقی ضابطوں کی

خلاف ورزی نہ کرے۔ اس طرح پر وہ کام جو اس کی ماں کو ناپسند ہے بے انتہا خوفناک بن گیا۔ جوں جوں وہ بڑا ہوتا جاتا ہے وُہ یہ تو بُھولتا جاتا ہے کہ ان اخلاقی احکام کا سرچشمہ کہاں ہے، اور ان کی خلاف ورزی کی اصلی سزا کیا تھی۔ لیکن وہ نہ تو ان اخلاقی احکام کو بھولتا ہے، نہ اس کا یہ احساس مٹتا ہے کہ ان کی خلاف ورزی کی صورت میں اس کو بدترین سزا ملنے والی ہے۔

بچپن کی اس اخلاقی تعلیم کا بہت بڑا حصّہ عقلی حیثیت سے بے بنیاد ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک معمولی آدمی اپنی معمولی زندگی میں اس کو استعمال بھی نہیں کر سکتا۔ ایک شخص مثلاً بدزبانی کرتا ہے، عقلی لحاظ سے وہ اس شخص سے بُرا نہیں، جو ایسا نہیں کرتا۔ تاہم گالیوں سے بچنا ولی کے تخیل کا لازمی جزو ہے۔ عقل کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ خیال لغو ہے۔ یہی حال شراب پینے اور تمباکو استعمال کرنے کا ہے، واقعہ یہ ہے کہ جنوبی ملکوں میں شراب پینے کو نہیں، بلکہ نہ پینے کو بُرا سمجھا جاتا ہے، کیونکہ حضرت عیسےٰ اور ان کے حواریوں نے شراب پی تھی۔ رہ گیا تمباکو، سو اس کے متعلق آسانی کے ساتھ سلبی نقطۂ نظر اختیار کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ تمام بڑے بڑے اولیا اس وقت گزرے ہیں جب تمباکو کا نام بھی سننے میں نہ آتا تھا۔ لیکن یہاں بھی کوئی عقلی اعتراض سُجھائی نہیں دیتا، یہ خیال کہ کوئی ولی تمباکو استعمال نہ کرے گا، آخر کار اس خیال پر مبنی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ولی کوئی کام بھی، محض لذت حاصل کرنے کی خاطر نہ کرے گا۔ معمولی روزمرہ اخلاق کا یہ زاہدانہ حصّہ تقریباً لاشعوری ہو چکا ہے، لیکن یہ ان تمام طریقوں میں عمل کرتا ہے، جن سے ہمارا اخلاقی ضابطہ غیر اخلاقی ہو جاتا ہے۔ عقلی اخلاقیات میں دوسرے لوگوں، بلکہ خود اپنے آپ کو بھی، خوش کرنا قابلِ تعریف کہا جائے گا۔ بہ شرطیکہ اس کے بعد پھر اتنی ہی تکلیف نہ پہنچے۔ اگر ہم اپنے زہد کو چھوڑ دیں، تو مثالی نیک شخص وہ ہو گا، جو اچھی چیزوں سے لذّت حاصل کرنے سے منع نہیں کرتا، بہ شرطیکہ اس کے بعد کوئی ایسے بُرے اثرات پیدا نہ ہوں، جن سے یہ لذّت ملیا میٹ ہو جائے۔ جھُوٹ بولنے کے مسئلہ پر پھر غور کرو۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ دُنیا میں بہت جھُوٹ بولا جا رہا ہے، اور یہ کہ اگر دُنیا میں اتنا ہی سچ بولا جاتا، تو ہم سب کے لئے اچھا ہوتا۔ لیکن مجھے اس سے یقیناً انکار ہے اور میرا خیال ہے کہ ہر معقول آدمی میرے ساتھ اتفاق کرے گا، کہ جھُوٹ بولنا ہر حالت میں ناجائز ہے۔ ایک دفعہ میں جنگل کی طرف سیر کرنے گیا۔ راستے میں میری نظر ایک لومڑی پر پڑی جو تکان کے مارے بے دم ہو رہی تھی، لیکن پھر بھی برابر بھاگی چلی جا رہی تھی۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد شکاری دکھائی دیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا "کیا تم نے لومڑی دیکھی ہے؟" میں نے کہا "ہاں"۔ جب اُس نے پوچھا کہ وہ کس طرف گئی ہے، تو میں نے جھُوٹ بول دیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں سچ بول دیتا، تو میں دُنیا کا سب سے بُرا آدمی ہوتا۔

لیکن بچپن کی اخلاقی تعلیم کا بدترین اثر جنسی معاملات پر پڑتا ہے۔ اگر کسی بچے کی رسمی تعلیم کسی سخت گیر ماں باپ، یا آیا کے ہاتھوں ہوئی ہے تو چھ برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے گناہ اور آلاتِ تناسل کا تعلق اس قدر مضبوط ہو جاتا ہے کہ وہ تمام عمر توڑا نہیں

جا سکتا۔ پھر اوڈی پس مؤلف[1] سے اس احساس کی اور تقویت ہوتی ہے، کیونکہ بچپن میں سب سے زیادہ محبوب وہ عورت ہوتی ہے جس سے ہم جنسی حیثیت سے آزادی کے ساتھ مل جُل نہیں سکتے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر جوان آدمی عورت کو صرف اس لئے ذلیل سمجھتے ہیں کہ وہ عورت ہے، اور یہ اپنی بیویوں کی اس وقت تک عزت نہیں کرتے، جب تک کہ وہ وظیفۂ جنسی سے نفرت نہ کریں۔ لیکن جس مرد کی بیوی میں نفسانی خواہشات نہیں ہوتیں، وہ کسی دُوسری جگہ جا کر اپنی جبلّی خواہشات پوری کر لیتا ہے۔ لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے بھی اس کی خواہشات کی تشفّی ہو جاتی ہے، تب بھی گناہ کا احساس اس تشفّی کو زہر آلود کر دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ شخص کسی عورت کے ساتھ بھی خوش نہیں رہ سکتا، یہ عورت منکوحہ بیوی ہو یا غیر منکوحہ داشتہ، دوسری طرف اگر عورت کو" باعصمت" رہنے کی سختی کے ساتھ تعلیم دی جائے۔ تو اس کا بھی یہی حشر ہوتا ہے۔ یہ عورت اپنے خاوند کے ساتھ جنسی تعلقات پیدا کرنے سے کتراتی ہے اور ان تعلقات سے خوشی حاصل کرنے سے ڈرتی ہے۔ لیکن اب ہمارے زمانے میں عورت کا وہ حال نہیں، جو پچاس برس پہلے تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت مرد کی جنسی زندگی کے مقابلے میں عورت کی جنسی زندگی گناہ کے احساس کی زہر آلودگی کی وجہ سے بہت کم بدلی ہے[2]۔

اب عام طور پر یہ احساس ہونا شروع ہو گیا ہے کہ بچوں کو جو روایتی جنسی تعلیم دی جاتی رہی ہے، وہ اچھی نہیں، گو یہ احساس ابھی تک ان لوگوں کو نہیں ہوا، جو عوام کی ہر طرح کی صحت کے ذمہ دار ہیں۔ جنسی تعلیم کا صحیح اصُول بالکل سادہ ہے، یعنی یہ کہ جب تک کہ بچہ یا بچی جوان ہونے کے قریب نہ ہو، اُس وقت تک اس کو کسی قسم کی جنسی تعلیم نہ دی جائے اور اس کے دل میں یہ خیال جمنے نہ دیا جائے کہ طبعی جسمانی وظیفوں میں کوئی چیز نفرت کے قابل ہے۔ جس عُمر میں اخلاقی تعلیم بالکل لازمی ہو جائے تو کوشش ہونی چاہیئے کہ یہ تعلیم معقول اور عقلی ہو، اور قدم قدم پر اخلاقی احکام کی بنا واضح کی جائے۔ لیکن اس وقت میں تعلیمات کے متعلق کچھ لکھنا نہیں چاہتا، یہاں میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ایک جوان شخص گناہ کے غیر معقول احساس کو پیدا کرنے میں غیر عاقلانہ تعلیم کے بُرے اثرات کو کس طرح کم کر سکتا ہے۔

یہاں زیر بحث مسئلہ یہ ہے کہ لاشعور کو اُن معقول عقیدوں کا خیال رکھنے پر مجبور کیا جائے، جو ہمارے شعوری فکر پر مسلّط ہیں۔ آدمی کو چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے جذبات کے ہاتھوں میں نہ دے، اور ایک وقت ایک عقیدہ اور دوسرے وقت دوسرا عقیدہ نہ رکھے۔ گناہ کا احساس اس وقت خاص طور پر بہت اُجاگر ہو جاتا ہے، جب تکان، بیماری، نشے، یا کسی اَور وجہ سے شعوری ارادہ کمزور ہو جاتا ہے۔ ایسے وقتوں میں جو خیال بھی کسی کے دل میں آتا ہے (بہ شرطیکہ یہ نشے کی وجہ سے نہ آئے) وہ کسی برتر ذات

---

[1] Oedipus Complex "لڑکے کی (عموماً لاشعوری) خواہش کہ باپ کو قتل کر کے ماں کو اپنی بیوی بنالے" یا بقول بعض "ماں کے ساتھ بیٹے کی حد سے زیادہ محبت جس کے ساتھ شہوانی عنصر بھی ہو"۔ (مترجم)

[2] مترجم کے لئے مصنف کا ہم خیال ہونا ضروری نہیں۔

کی طرف سے الہام سمجھا جاتا ہے۔ "شیطان بیمار تھا" اور شیطان ولی بن گیا"۔ لیکن یہ فرض کرنا ہی بے معنی ہے کہ جتنی بصیرت کمزوری کے لمحوں سے حاصل ہوتی ہے، وہ قوت کے لمحوں سے حاصل نہیں ہوتی۔ کمزوری کے لمحوں میں بچپن کے خیالات کو روکنا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن ان کو ایک صحیح اور تندرست قویٰ والے جوان آدمی کے عقیدوں کے مقابلے میں بہتر سمجھنے کی کوئی وجہ موجود نہیں۔ برخلاف اس کے ہونا یہ چاہئے کہ قوت کے لمحوں میں جو خیالات اور عقیدے بھی کوئی شخص اپنے ارادے سے اور پختہ دلیلوں کی بنا پر قائم کرے، وہ اُن خیالات اور عقیدوں کا معیار بن جائیں، جن پر ہر وقت اس کا یقین ہونا چاہئے۔ صحیح قسم کے طریقِ عمل سے دودھ پینے کے زمانے کے لاشعوری خیالات کو زیر کر لینا، بلکہ لاشعور کی ترکیب ہی کو بدل دینا بالکل ممکن ہے۔ جب کبھی تم کو اپنے کسی ایسے کام پر افسوس ہو، جس کے متعلق تمہاری عقل کہتی ہے کہ وُہ بُرا نہیں، تو تم کو چاہئے کہ اپنے افسوس کے احساس کے وجوہ پر غور کرو اور اس کی لغویت کا اپنے آپ کو اطمینان دلا دو۔ تمہارے شعوری عقیدے اتنے واضح اور زور دار ہونے چاہئیں کہ تمہارے لاشعور پر ان کا ایسا اثر پڑے کہ بچپن کے زمانے میں تمہاری ماں یا آیا نے جو خیالات تمہارے دل میں ڈالے تھے، وہ دب جائیں۔ معقولیت اور عدمِ معقولیت کے لمحوں کے درمیان ڈانواں ڈول ہونے پر قناعت مت کرو۔ عدمِ معقولیت پر گہری نظر ڈالو اور پکا ارادہ کر لو کہ تم اس کا احترام نہ کروگے، اور نہ اس کو اپنے اوپر غالب آنے دوگے۔ جب کبھی یہ احمقانہ خیالات اور حسیات تمہارا شعور تم میں ٹھونسے، تو اِن خیالات وحسیات کو جڑ سے اُکھاڑ دو، ان پر غور کرو، اور ان کو دُور پھینک دو۔ اپنے آپ کو ایسا ڈانواں ڈول ہونے والا جانور مت بننے دو جس کو کبھی عقل ایک طرف جھکاتی ہے، اور کبھی بچپن کی بے وقوفی دوسری طرف۔ جو لوگ تمہارے بچپن میں تمہیں راستہ بتانے والے تھے، اُن کو تحقیر کے ساتھ یاد کرنے سے مت ڈرو۔ اُس زمانے میں وہ تمہارے نزدیک زور دار اور عقلمند اس لئے تھے کہ تم کمزور اور بے وقوف تھے۔ اب تم نہ کمزور ہو، نہ بے وقوف، لہٰذا اب تمہارا کام یہ ہونا چاہئے کہ تم اُن کی ظاہری قوت اور عقل کو پرکھو، اور سوچو کہ واقعی وہ اس عزت کے مستحق ہیں، جو تم محض عادت کی وجہ سے، ان کی کرتے ہو؟ اپنے آپ سے پوچھو کہ جو اخلاقی تعلیم رسمی طور پر بچوں کو دی جاتی ہے، اس سے دنیا کا واقعی کوئی بھلا ہُوا۔ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ جس شخص کو رسمی طور پر نیک کہا جاتا ہے، اس کی بناوٹ میں کس قدر خالص توہمات شامل ہیں۔ اس بات پر غور کرو کہ احمقانہ روک تھام نے اخلاق کے وہمی خطروں کی روک تھام کے لئے ہر قسم کا بندوبست کیا لیکن جن حقیقی اخلاقی خطروں سے جوان آدمی کو سابقہ پڑتا ہے، ان کا نام کبھی نہ لیا گیا۔ وہ کون سے نقصان پہنچانے والے کام ہیں، جن کے کرنے کا ہر جوان میں میلان پایا جاتا ہے؛ تجارتی کاروبار میں وہ تمام بے قاعدگیاں جن کے لئے قانون میں کوئی سزا نہیں، ملازموں کے ساتھ سختی، بیوی بچوں کے ساتھ بے رحمی، اپنے آپ سے مقابلہ کرنے والوں سے دشمنی، ملک کے جھگڑوں میں تیزی اور تندی ــــــ یہی وہ گناہ ہیں، جو سچ مچ نقصان پہنچانے والے ہیں، اور جو اُن لوگوں میں بہت عام ہیں، جو عزت کے قابل ہیں، اور جن کی عزت

کی جاتی ہے۔ ان گناہوں کی وجہ سے ایک شخص اپنے ملنے جلنے والوں میں مصیبت پھیلاتا ہے، اور تہذیب و تمدن کو تباہ کرنے میں مدد دیتا ہے، لیکن جب یہ شخص بیمار پڑتا ہے، تو ان گناہوں کی وجہ سے اپنے آپ کو خدا کی نعمتوں سے محروم رہنے کا مستحق نہیں سمجھتا یہ وہ باتیں ہیں، جن کی وجہ سے وہ ڈراؤنے خوابوں میں یہ نہیں دیکھتا کہ اس کی ماں ملامت کی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اس کے تحت شعوری اخلاق عقل سے بیگانہ کیوں ہو جاتے ہیں؛ صرف اس سبب سے کہ بچپن میں اس کے نگہداشت کرنے والے جن اخلاق کے قائل تھے، وہ احمقانہ اور بے معنی تھے، اور اس وجہ سے کہ یہ اخلاق فرد پر قوم کے فرائض کے مطالعے کا نتیجہ نہ تھے، بلکہ یہ غیر معقول طور پر منع کی ہوئی باتوں کے فرسودہ ٹکڑوں کا مجموعہ تھے، اور یہ کہ خود ان میں اُس خرابی اور فساد کے چھپے پائے جاتے تھے، جو روما کی دم توڑنے والی سلطنت کی روحانی بیماری کا نتیجہ تھے۔ ہماری نام کی اخلاقیات پادریوں اور ذہنی حیثیت سے غلام عورتوں کی بنائی ہوئی ہے۔ دُنیا کی معمولی زندگی میں مرد کو حصّہ لینا پڑتا ہے، لہٰذا اب وہ وقت آ گیا ہے کہ وہ اس بیماری پیدا کرنے والی لغویت کے خلاف بغاوت کرنا سیکھے۔

لیکن فرد کی خوشی کو پیدا کرنے، اور آدمی کو دو مختلف معیاروں کے درمیان ٹھوکریں کھانے کی بجائے ایک ہی معیار کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل بنانے میں اس بغاوت کو اگر کامیابی ہو سکتی ہے، تو صرف اس طرح کہ وہ اُن باتوں کو سوچے اور پرکھے جو اس کی عقل اس کے دل میں ڈالتی ہے۔ اکثر لوگ اپنے بچپن کے توہمات کو بظاہر ترک کر دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کی مہم سر ہو گئی۔ ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ان کی ظاہری زندگی کی تہ میں یہ توہمات اب بھی زندہ ہیں جب تم کسی معقول عقیدے تک پہنچ جاؤ، تو ضروری بات یہ ہے کہ اس پر غور کرو، اس کے نتیجوں کو سمجھو، اور اُن عقیدوں کا کھوج لگاؤ، جو اس نئے عقیدے کے بعد بھی باقی رہنے والے ہیں۔ پھر اگر کسی وقت گناہ کا احساس زور دار ہو جائے، اور یقین مانو کہ یہ کبھی کبھی زور دار ضرور ہو گا، تو اس کو نہ الہام سمجھو، اور نہ برتر چیزوں کی طرف بلاوا مانو۔ اگر یہ کسی ایسے کام کا نتیجہ نہ ہو جس کو معقول اخلاقیات بُرا کہتی ہو، تو اس کو ایک بیماری اور ایک کمزوری خیال کرو۔ اس تمام گفتگو سے میرا یہ مطلب نہیں کہ انسان اخلاقیات کو بالکل چھوڑ بیٹھے میرا مطلب صرف یہ ہے کہ اس کو متوہمانہ اخلاق سے بچنا چاہئے۔ ان دونوں باتوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص خود اپنے معقول اخلاقی ضابطے کی خلاف ورزی بھی کرے، تب بھی میرے نزدیک زندگی کو بہتر بنانے کے لئے گناہ کو محسوس کرنا کوئی اچھا طریقہ نہیں، گناہ کے احساس میں ایک طرح کی ذلت ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم خود اپنی عزت کرنے کے قابل نہیں۔ اس بات سے آج تک کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ معقول آدمی خود اپنے ناپسندیدہ کاموں کے متعلق بالکل وہی رائے رکھتا ہے، جو وہ اوروں کے ایسے ہی کاموں کے متعلق رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ ایسے کام ہیں جو بعض خاص حالات کا نتیجہ ہوتے ہیں، اور اس قابل ہیں کہ ان کی ناپسندیدگی روشن ہو جانے کے بعد ان سے بچا جائے، یا اگر

ہر تو ان حالات سے کنارہ کیا جائے، جن میں یہ پیدا ہوتے ہیں ۔

واقعہ یہ ہے کہ گناہ کا احساس بہتر زندگی کو پیدا کرنے کی بجائے آدمی سے اس کی خوشی کو چھین لیتا ہے، اور وہ خود اپنے کو ذلیل سمجھنے لگتا ہے۔ اس طرح ناخوش ہو جانے کے بعد وہ اور لوگوں سے بہت زیادہ باتوں کی اُمید رکھتا ہے، اور اس کی یداروں کے ساتھ اس کے تعلقات کو خوش آیند نہیں بننے دیتی۔ جب وہ اپنے آپ کو ذلیل اور کمتر سمجھنے لگتا ہے، تو اس کو شخص سے شکایت پیدا ہو جاتی ہے، جس کو وہ اپنے آپ سے برتر سمجھتا ہے۔ تعریف کرنا اُس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے اور حسد آسان۔ اس کو ہمیشہ وہ شخص ملتا ہے، جس کو وہ پسند نہیں کرتا، لہٰذا وہ ہمیشہ تنہا رہ جاتا ہے۔ دوسروں سے کھلے دل اور ں کے ساتھ ملنے سے نہ صرف دوسروں کو خوشی حاصل ہوتی ہے، بلکہ اس طرح ملنے والا بھی خوش رہتا ہے، کیونکہ دوسرے لوگ سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن جس شخص کے سر پر گناہ کے احساس کا بھوت سوار رہتا ہے، اس کے لئے دوسروں سے اس ح ملنا بہ مشکل ممکن ہوتا ہے۔ اس طرح ملنے کے لئے خود اپنی ذات پر اعتماد اور ذہنی تکمیل ہونا چاہئے۔ ذہنی تکمیل سے میری مُراد یہ کہ انسانی فطرت کی تمام پرتیں، یعنی شعوری، تحت شعوری اور لاشعوری مل کر کام کریں، نہ یہ کہ یہ ہمیشہ آپس میں لڑتی رہیں۔ اکثر زتوں میں تو یہ حالت معقول تعلیم سے پیدا کی جا سکتی ہے، لیکن تعلیم اگر غیر معقول ہو، تو اس کو پیدا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تحلیل کے ماہر اسی حالت کو پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ اکثر مثالوں میں تو مریض یہ کام خود کر تے ہیں۔ ہاں معاملہ جب بہت ہی بگڑ جاتا ہے تو ماہر علاج کرنے والے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہم کو یہ نہ کہنا چاہئے کہ ہمارے ں اتنا وقت نہیں کہ ہم یہ نفسیاتی محنت کریں۔ ہمیں اپنی زندگی میں بہت مصروفیت رہتی ہے۔ ہمارا لاشعور جو کچھ چاہتا ہے لے! جو ذات کہ خود اپنے آپ سے لڑتی رہتی ہے، اس کی نہ صرف خوشی کم ہو جاتی ہے، بلکہ اس کے کام کرنے کی طاقت ی کمزور پڑ جاتی ہے۔ اپنی ذات کے مختلف حصّوں میں اتحاد پیدا کرنے میں جو وقت ہم صرف کرتے ہیں، وہ بے کار نہیں جاتا ں یہ نہیں کہتا کہ ہمیں اپنی ذات کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے ہر روز کوئی وقت، مثلاً ایک گھنٹہ مقرر کر لینا چاہئے۔ میرے دیک یہ طریقہ اچھا نہیں، کیونکہ اس کی وجہ سے ہم اپنے آپ میں بہت زیادہ محو ہو جاتے ہیں، اور اس طرح محو ہو جانا اُس بیماری ا ایک حصّہ ہے، جس کا ہم علاج تجویز کر رہے ہیں، جس ذات کے تمام حصّے مل کر کام کرتے ہیں، وہ خود اپنے اندر کی طرف نہیں لکہ باہر کی طرف دیکھتی ہے۔ میرا مطلب صرف اس قدر ہے کہ ہم کو قطعی طور پر یہ فیصلہ کر لینا چاہئے کہ ہم کن کن باتوں پر معقولیت کے ساتھ یقین رکھ سکتے ہیں۔ ہمارے ان عقیدوں کے خلاف کوئی ایسا غیر معقول خیال ہمارے دل میں نہ آنا چاہئے جس کی ہم جانچ پڑتال نہ کر لیں۔ ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ یہ غیر معقول خیال ہم پر قبضہ نہ جمالے، یہ قبضہ خواہ کتنی ہی تھوڑی دیر کے لئے ہو۔ یہ اُن موقعوں پر خود اپنے آپ سے سوال کرنے کا مسئلہ ہے، جب ہم بچّہ بن جانے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اگر یہ

تمام سوال وجواب کافی زور دار ہیں تو پھر یہ بہت مختصر ہوتے ہیں، لہٰذا ان میں جو وقت صرف ہوتا ہے، وہ قابلِ لحاظ نہیں۔

اکثر لوگ عقلیت کو پسند نہیں کرتے، لہٰذا جو کچھ کہ میں نے اب تک کہا ہے، وہ ان لوگوں کو نامناسب اور غیر ضروری معلوم ہوگا۔ ایک خیال یہ ہے کہ عقلیت کو آزاد چھوڑ دینے سے تمام گہرے جذبات ختم ہو جاتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ عقیدہ انسانی زندگی میں عقل کے وظیفے کے متعلق بالکل غلط عقیدے کا نتیجہ ہے، جذبات کو پیدا کرنا عقل کا کام نہیں، گو ان جذبات کو روکنے کے طریقوں کو دریافت کرنا اس کے کام میں شامل ہو سکتا ہے، جو انسانی خوش حالی میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ نفرت اور حسد کو کمترین بنانے کے طریقوں کو معلوم کرنا عقلی نفسیات کے کاموں میں سے ایک کام ہے لیکن یہ فرض کر لینا غلط ہے کہ ان جذبات کو کمترین کرنے سے ہم اُن جذبات کی قوت کو بھی کم کر دیں گے، جو عقل کے نزدیک بُرے نہیں۔ عشق، والدین کی محبت، دوستی، سخاوت اور علم یا فن میں محویت، میں کوئی ایسی چیز نہیں، جس کو عقل کم کرنا چاہے گی۔ عقل مند آدمی جب ان جذبات کو محسوس کرتا ہے تو اس کو خوشی ہوتی ہے کہ وہ انہیں محسوس کر رہا ہے۔ وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کرتا جس سے ان کا زور ٹوٹ جائے، کیونکہ یہ تمام جذبات اچھی زندگی کا حصہ ہیں۔ اچھی زندگی سے مراد وہ زندگی ہے جو خود ہم میں اور اوروں میں خوشی کو پیدا کرتی ہے۔ خود ان جذبات میں کوئی چیز غیر معقول نہیں، اور اکثر غیر معقول آدمی صرف خفیف ترین جذبات کو محسوس کرتے ہیں۔ کسی شخص کو یہ اندیشہ نہ ہونا چاہئے کہ اگر وہ معقول آدمی بن جائے گا تو اس کی زندگی بے لطف ہو جائے گی۔ معقولیت بہت بڑی حد تک اس بات کا دوسرا نام ہے کہ ذات کے تمام حصے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کریں۔ لہٰذا جس شخص کی ذات کو یہ بات نصیب ہے یعنی جو شخص معقول ہے، وہ دنیا پر غور و فکر اور بیرونی عقیدوں کو پورا کرنے کی خاطر اپنی قوتوں کے استعمال میں اُس شخص کی بہ نسبت زیادہ آزاد ہے، جس کی ذات کی اندرونی لڑائیاں قدم قدم پر روڑے اٹکاتی ہیں۔ خود اپنی ذات کے ساتھ لپٹے رہنے سے زیادہ کوئی اور چیز دُنیا میں بے لُطف نہیں۔ اور اپنی قوت اور توجہ کو باہر کی طرف پھیلانے سے زیادہ کوئی اور چیز خوشی اور لطف کو پیدا کرنے والی نہیں۔

ہماری رسمی اخلاقیات کو ذات کے ساتھ ضرورت سے زیادہ تعلق ہے، اور گناہ کا خیال ذات کی طرف اس غیر عاقلانہ توجہ کا ایک حصہ ہے۔ جن لوگوں کو اس ناقص اخلاقیات کی پیدا کی ہوئی ذاتی حالتوں سے سابقہ نہیں پڑا، اُن کو عقل غیر ضروری معلوم ہوگی۔ لیکن جن لوگوں کو یہ روگ لگ چکا ہے، اُن کے علاج کے لئے عقل ضروری ہے اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ذہنی ترقی میں یہ بیماری ضرور پیدا ہوتی ہے۔ میرا خیال تو کچھ ایسا ہے کہ جو شخص عقل کی مدد سے اس بیماری کے درجے سے آگے بڑھ گیا ہے، وہ ذہنی ترقی میں اس شخص کے مقابلے میں اعلےٰ رتبے پر ہے، جس کو نہ تو کبھی یہ بیماری ہوئی، اور نہ جس نے عقل سے اس بیماری کا علاج کیا۔ ہمارے زمانے میں لوگ عام طور پر عقل سے نفرت کرتے ہیں۔ بڑی حد تک اس کی

وجہ یہ ہے کہ عقل کے کاموں کا کسی بنیادی طریقے سے خیال قائم نہیں کیا جاتا۔ جس شخص کی ذات کے مختلف حصے آپس میں ہی لڑمرتے ہیں، وہ جوش اور ہنگامے کی تلاش کرتا ہے، اور چاہتا ہے کہ خود اپنے آپ سے الگ ہو جائے۔ وہ زوردار جذبات کو کسی مضبوط دلیل کی بنا پر پسند نہیں کرتا، وہ ان کو صرف اس لئے پسند کرتا ہے کہ ان کی بدولت وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنے آپ سے باہر ہو جاتا ہے، اور اس کو سوچنے کے تکلیف دہ عمل سے نجات مل جاتی ہے۔ اس کے لئے ہر جذبہ ایک نشہ بن جاتا ہے اور چونکہ وہ بنیادی خوشی کا کوئی خیال قائم نہیں کر سکتا، لہٰذا وہ سمجھتا ہے کہ تکلیف صرف نشے ہی سے رفع کی جا سکتی ہے لیکن اس کا یہ خیال ایک بہت بڑی بیماری کی علامت ہے۔ جس شخص کو یہ بیماری نہیں ہوتی، اس کو سب سے بڑی خوشی اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ وہ اپنی قوتوں کا پوری طرح مالک ہو۔ جن لمحوں میں ذہن بہت زیادہ کام کرتا ہے اور بہت کم چیزیں ذہن سے مٹتی ہیں، انہیں لمحوں میں سب سے زیادہ زوردار خوشیاں محسوس ہوتی ہیں۔ یہی خوشی کی سب سے اچھی کسوٹی ہے جس خوشی کو نشے کی ضرورت ہوتی ہے، یہ نشہ کسی قسم کا ہو، وہ بے کار ہوتی ہے، اور اس سے تسلی نہیں ہو سکتی۔ جس خوشی سے واقعی ہماری تسلی ہو سکتی ہے، وہ ہماری قوتوں کے پورے عمل، اور جس دُنیا میں ہم رہتے ہیں، اس کے پورے پورے علم کے ساتھ ساتھ آتی ہے۔

(برٹرینڈ رسل) ———— معتضد ولی الرحمٰن

شملہ نے شاعر سے کہا

گھلے تھے سرمدی نغمے یہاں کی آبشاروں میں — چٹانوں پر یہاں پھرتے تھے نغمے رقص فرماتے
یہاں رنگین و سیمیں مچھلیاں تھیں جوئباروں میں — ہوا کی موج پر بہتے تھے طائر جھومتے گاتے

یہاں چشموں پہ کنواری لڑکیاں آ کر نہاتی تھیں — بدن کی چاندنی باریک کپڑوں سے جھلکتی تھی
یہاں رنگیں ہوائیں وادیوں میں گنگناتی تھیں — گلستاں جھومنے لگتے تھے جب پُروا سنکتی تھی

چھڑکتی تھیں جب افشاں چوٹیوں پر چاندنی راتیں — ہر اک دوشیزہ رشکِ حُوریاں معلوم ہوتی تھی
لٹاتی تھیں گُہر جب بوندیوں کے مست برساتیں — یہاں ہر راہ موجِ کہکشاں معلوم ہوتی تھی

انہیں پگڈنڈیوں پر چھاگلیں اکثر جھنکتی تھیں — چٹانوں پر جب آ کر لڑکیاں دھومیں مچاتی تھیں
حسیں باہوں کی رنگیں چوڑیاں باہم کھنکتی تھیں — جو مل کر سبزۂ گل ریز پر وہ لڑکھڑاتی تھیں

یہاں پتھر تھے یاقوتی چٹانیں ارغوانی تھیں — گلابی دامنِ صحرا تھا ندیاں آسمانی تھیں

یہاں کے پھُول تھے زرپوش کلیاں زعفرانی تھیں ... یہاں کی وادیاں سبزے کے قالینوں سے دھانی تھیں

یہاں پگھلی ہوئی چاندی سے بڑھ کر صاف تھا پانی ... ندی کی تہ میں افشاں کی طرح ذرّے دمکتے تھے
حسیں موجوں میں ہر اک سیپ تھی لعلِ بدخشانی ... سحر کی ضَو میں تاروں کی طرح پتھر چمکتے تھے

کلی کی شام کو جب نیند سے پلکیں جھپکتی تھیں ... ہوائیں شام کی آکر اُسے لوری سُناتی تھیں
محبت سے اُسے کُنجِ گلستاں میں تھپکتی تھیں ... تھپک کر رات کو شاخوں کے جھُولوں میں سُلاتی تھیں

یہاں جب بانسری کی تان چرواہے سناتے تھے ... یہاں کی کہکشاں سی چھُوٹتی تھیں شب کو پھلجھڑیاں
چراگاہوں سے چرواہے جب آ کر گیت گاتے تھے ... فلک پر ناچتی تھیں شب کو تاروں کی سُبک لڑیاں

مگر سنگیں تمدّن نے مِرے شیشے کُچل ڈالے ... مجھے، آکر یہاں انسان نے، آباد کر ڈالا
فضا کا خون کر کے سینکڑوں منظر بدل ڈالے ... اسی خونی درندے نے مجھے برباد کر ڈالا

جلال ملیح آبادی

نجات

"گناہ سے توبہ کرنے والا اُس کی مانند ہو جاتا ہے جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو۔"

(قرآن مجید)

عرس ہو رہا تھا۔ دور دراز کی طوائفیں قوالی گانے اور عرس میں شریک ہونے آئی تھیں۔ ہزاروں آدمیوں کا جمِ غفیر تھا، ان میں وہ صوفیا بھی تھے جو ہر عشقیہ شعر کو اپنے محبوبِ حقیقی کی جانب منسوب کر کے عالمِ وجد میں رقص کرنے لگتے، اور وہ دنیا دار بھی تھے جو پیاری صورتوں، خوبصورت لباس اور جادو بھری آوازمیں موسیقی کا مظاہرہ کرنے والیوں پر فریفتہ ہو جاتے تھے۔

مزار کو پہلے ہی گلاب اور کیوڑے کے عرق سے غسل دیا جا چکا تھا۔ سبز حریر کے مملوں سے ڈھانک دیا گیا تھا، برقی قمقموں سے جو مختلف اللون نورانی شعاعیں نکل رہی تھیں ان سے پورا قوالی خانہ جگمگا رہا تھا۔ وسط میں جو تخت رکھا تھا اُس پر سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ یہی تخت اسٹیج کا کام دیتا تھا۔ جس کی باری آتی وہی طوائف مع اپنے سازندوں کے آتی اہلِ مجلس کو جھک کر آداب بجالاتی، اور پھر مزار کی جانب رُخ کر کے اس تخت پر جلوہ افروز ہوتی، گاتی اور ناچتی تھی۔ جتنا وقت دیا جاتا اسی میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتی۔ خراجِ تحسین کے ساتھ ساتھ برسنے والے روپے بھی اُٹھا لیتی، پھر اپنی جگہ جا کر بیٹھ جاتی۔

سب کی نگاہیں زیادہ تر آفتاب کی جانب مرکوز ہوتی تھیں۔ کیونکہ وہ اپنی ہم عصروں میں سب سے کم عمر اور سب سے حسین تھی اس کی ریشمی ساری سب سے قیمتی تھی۔ اس کی کلائی میں گھڑی بھی بندھی تھی۔ گلے میں جڑاؤ چندن ہار تھا اور سفید اور عریاں بازوؤں میں جو بازو بند بندھے تھے ان میں بڑے بڑے چمکدار زمرد جڑے تھے جن کی چمک کے سبب نگاہیں کام نہیں کرتی تھیں۔ آفتاب کا ننھا بچہ بھی ہمراہ تھا۔ جس کے گلے میں درجنوں تعویذ پڑے ہوئے تھے، شاید بڑی منتوں مرادوں کی اولاد ہو گی۔ آفتاب جان کی بوڑھی ماں جس کے گالوں پر دونوں جانب پانچ پانچ جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ اپنی بیٹی کو تمام جلسے کی توجہات کا مرکز دیکھ کر شاید خوشی کے مارے پھولے نہ سماتی ہو گی۔ کیونکہ بار بار وہ پہلے تمام مجمع پر غلط انداز نگاہ ڈال کر اپنی بیٹی آفتاب جان کی ایک نہ ایک خدمت انجام دے دیتی تھی۔ اگر بچہ روئے تو اسے اپنے ہاتھوں میں چت لٹا کر "نہیں نہیں" کا ترانہ گاتے ہوئے اپنی بیٹی آفتاب جان کو دے کر کہتی تھی — "ذری دودھ پلا لو بیٹا!" اور پھر ایک سفید چادر لے کر دوڑی آتی اور دودھ پیتے بچے اور اس کی ماں کے گرد اسے اس وقت تک لپیٹے کھڑی رہتی کہ بچہ پوری طرح دودھ نہ پی لیتا، کبھی دم بدم گلوریاں بنا کر چاندی کی تھالی میں رکھ کر اپنی خوبصورت

بیٹی آفتاب جان کو پیش کرتی، کبھی عرس کے منتظم اصحاب کو بآوازِ بلند متوجہ کرتی "حضرات! بچی کا مُنہ خشک ہو رہا ہے۔ از برائے خدا سوڈا اور برف اور صاف گلاس منگائیے!" اس کے رویے پر شاید آفتاب جان کڑھتی ہوگی، کیونکہ وہ ملامت آمیز لہجے میں اپنی اماں کو "اماں!" کہہ کر گھورتی تھی، اور پھر نگاہیں زمین کی طرف گرا دیتی تھی۔ لیکن اس کی ماں کا جی بھلا کیسے مان سکتا تھا۔ ماں کی چاہیتی جائی کو تکلیف ہو اور بوڑھی اماں مُنہ باندھے کیسے بیٹھی رہیں؟

آفتاب کے بازو سے موتی جان لکھنؤ والی بیٹھی ہوئی تھی۔ موتی آفتاب کا مقابلہ تو نہیں کر سکتی تھی۔ البتہ وہ بھی ہزاروں میں ایک تھی۔ موتی کا حسن پختگی کے حدود سے بھی تجاوز کرتا جا رہا تھا، جبکہ آفتاب ہنوز ایک ایسی کلی تھی جس نے ابھی عالم شگفتگی میں قدم رکھا ہو، جس نے بہار کی صرف چند صبحیں دیکھی ہوں، جس نے نسیم چمن کے ساتھ ابھی ابھی اٹکھیلیاں شروع کی ہوں۔ موتی جان ایسا کھِلا ہُوا پھُول تھی، جو کئی بہاریں دیکھنے کے بعد خزاں کے مرجھا دینے والے جھونکوں کا منتظر ہو۔

موتی جان بجز ایک حبابی ساری کے کچھ نہیں پہنے تھی۔ اس کے کان میں آویزے بھی نہیں تھے گلے میں کچھ بھی نہیں تھا، پیروں میں وہ گھنگرو بھی نہ تھے جو ہر ایک رقاصہ کو اپنے کمال فن کی داد حاصل کرنے کے لئے ضرور باندھنے پڑتے ہیں البتہ صرف دو پتلی طلدار طلائی چوڑیاں، ایک ایک ہاتھ میں ایک ایک، وہ پہنے تھی۔ حالت بتا رہی تھی کہ زمانے کی گرم وسرد چشیدہ عورت یعنی اس موتی جان کا اب کوئی ولولہ، کوئی شوق، اور کوئی ارمان ایسا نہ تھا جو اسے زندہ رہنے کے لئے ترغیب دلائے۔

یکے بعد دیگرے طوائفیں گاتی رہیں۔ دو بجے کا عمل تھا جب آفتاب کی باری آئی۔ سب کا خیال تھا کہ خوبصورت اور فیشن ایبل مغنیہ کا گانا ہمیشہ اچھا نہیں ہوتا۔ لیکن آفتاب کی وجد آفریں آواز اور بہترین موسیقی نے تمام مجلس پر اپنا سکہ جما لیا۔ گو اسے پندرہ منٹ کا وقت دیا ہی گیا تھا، تاہم لوگوں کے اصرار پر کامل دو گھنٹے تک اسے گانا پڑا۔ صوفیا آپے سے باہر ہوئے جاتے تھے "ہَل مِن مَّزِید! ہَل مِن مَّزِید! واہ! ہائے!" کے نعروں میں بڑی بڑی کلاہوں اور دستاروں کے ساتھ، عباؤں اور قباؤں کے ساتھ سرِ محفل رقص کرنے لگتے تھے۔ روپوں کی بھی خاصی بارش ہوئی، جو آفتاب کی اماں جان جلدی جلدی سمیٹتی جاتی تھیں۔

آفتاب کا گانا بجائے خود ایک پیغام ہوتا، سرور و نشاط کا اور عشرت و انبساط کا، اور یہی پیغام سامعین کو اسے بار بار اسٹیج پر طلب کرنے کا محرک ہوتا تھا۔

اس کے بعد اجودھیا، الہ آباد، بمبئی، بیجاپور اور احمد نگر کی طوائفیں گاتی رہیں۔ پھر موتی جان کی باری آئی۔

جب موتی جان نے اپنی پُرسوز لے میں:۔

مَیں وہ شامِ غریبی ہوں کہ غربت مجھ پہ روتی ہے   وہ صبحِ دشتِ وحشت ہوں کہ وحشت مجھ پہ روتی ہے

لایا تو ایک سماں بندھ گیا۔ صورتوں پر سیاہی چھا گئی۔ سناٹا طاری ہو گیا۔ قنوطیت نے رجائیت کی جگہ چھین لی۔ سننے والوں کی روحیں کانپ اٹھیں۔ یہی محسوس ہونے لگا کہ تمام مجمع تیرہ و تار غار میں دھکیل دیا گیا ہے اور ہر شخص ہاتھ آگے بڑھا بڑھا کر غار میں اپنا رستہ ٹٹول رہا ہے۔

یاس انگیزی کا سماں بندھ جانے کے بعد پھر اور بھی کئی گانے والیاں اسٹیج پر آئیں لیکن ان تاثرات کو نہ مٹایا جا سکا جو موتی جان کی المیہ موسیقی نے پیدا کئے تھے۔

جب وہ دوبارہ آفتاب کے پہلو میں آ کر بیٹھی تو آفتاب نے سب سے پہلی بار کھلائے ہوئے منہ سے موتی کو دیکھا اور کہا —— "تشریف لایئے" —— پھر کہا —— "بہن! آج میں مانتی ہوں کہ آپ جیسی باکمال گانے والیاں بہت کم ہوں گی، کیا میں اعزاز حاصل کر سکتی ہوں کہ آپ سے چند گھنٹے فرصت کے وقت بات چیت کر سکوں۔ آج آپ نے میرے دل کو غمگین دل، اور میری روح کو بچپن روح بنا کے چھوڑا ہے۔"

موتی جان نے مسکرا کر جواب دیا (لیکن اس کی مسکراہٹ میں تلخی تھی) —— "بسر و چشم حاضر ہوں۔"

پھر آفتاب نے پوچھا —— "احمد آباد میں کب تک قیام رہے گا؟"

موتی نے کہا —— "یہی ایک دو ہفتے۔"

(۲)

سورج کی کرنیں آدھے کھلے ہوئے دریچے میں سے گزر کر آفتاب جان کے دلفریب گالوں کو مس کر رہی تھی۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو ان میں سرخی تھی اور خمار تھا۔ پھر اس نے پلنگ پر لیٹے لیٹے انگڑائی لی۔ دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ "اوہ!" کہتی ہوئی اٹھی اور غسل خانہ کی جانب چلی گئی۔

اس نے اپنے تمام زیور اتار کر صندوقچے میں رکھ دیئے۔ قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ گیلے بالوں میں بغیر خوشبودار تیل لگائے کنگھی کی، بال کانوں پر لا کر نہیں جمائے۔ سیدھی کھڑی مانگ نکالی۔ سادہ چوٹی اپنے ہاتھوں سے گوندھ لی۔ ہلکے بادامی رنگ کی ساری پہنی، بادامی جمپر پہنا۔ ساری میں کوئی چمکدار جڑاؤ پن نہ لگایا۔ بالوں میں بھی پن نہیں لگائے۔ ریشمی رومال بھی تہ کر کے رکھ دیا۔ صرف ایک سفید سوتی رومال ہاتھ میں لے لیا۔ ذرا سا سینٹ البتہ لگایا لیکن منہ پر نہ غازہ ملا، نہ سرخی لگائی، اور پھر بغیر ناشتہ کئے، بغیر کچھ کھائے پئے کوٹھے سے نیچے اتر گئی۔

اس کی ماں نے دروازے تک تعاقب کیا تھا۔ لیکن وہ نہ لوٹی تو بڑبڑاتی ہوئی واپس آ کر ہانپتے ہانپتے سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اب استاد جی کے آنے کا وقت ہے۔ یہ کم بخت نصیبوں جلی تھوڑا سا ریاض اور بڑھا لے تو اس کا کیا بگڑ جائے۔ ہزار کہتی ہوں، بیٹا ریاض کر، پھر دیکھ جانکی بائی اور گوہر جان کا نام بھی کوئی بھولے سے نہ لیگا۔ مگر وہ ادھر بھی دھیان نہیں دیتی۔ روز بروز اپنی مرضی کی مختار

جا رہی ہے۔ نا بی یہ ٹھیک بات نہیں ہے۔" اس نے اپنے آپ سے یہ بھی کہا — "وہ کم بخت مردار موتی جان کو خدا غارت کر دے۔ جیسی وہ بڑھی ہوتی جاتی ہے ایسا ہی میری بچی کو بنا رہی ہے۔ نہ جانے کیا کرنے والی ہے۔ لکھنو والوں نے منہ پر تھوک دیا اب یہاں آئی ہیں، نہ جانے کیا کرنے والی ہیں، اب میری بچی کے درپے ہیں۔ خوب بہکا رہی ہیں آج دس بارہ دن ہونے کو ہیں، دن نکلا اور یہ ناشدنی اسی کی ڈیوڑھی کی طرف چلی۔ آخر یہ ہے کیا، ہمیں بھی تو پیٹ لگا ہے۔ کل نواب وزیرالدولہ کا بیٹا آیا۔ اس کی طرف بھی مطلق التفات نہیں کیا۔ وہ بمبئی والا سیٹھ شام کو کتنا گھورتا ہوا نکلا تھا، اس نے اپنا موٹر کتنا آہستہ کر دیا تھا ذرا بھی ہوتی ذرا مسکرا دیتی، وہ فوراً آ جاتا، کچھ مل ہی رہتا۔ دے کے جاتا، لے کے تھوڑا ہی جاتا، مردار کو کس قدر سمجھاتی ہوں کہ میرا بیٹا! پہاڑ سی زندگی پڑی ہے۔ کاٹنا ہی پڑے گا۔ خدا نے ہمیں بیسوا بنایا ہے، یہ تو ہمارا پیشہ ہی ہے کہ کسی کو بہلائیں کسی کو پھسلائیں، کسی کو منہ لگائیں، کسی سے غیر ملتفت ہو جائیں۔"

جب سازندے آئے ان سے بھی بڑھیا نے شکوے کئے، امامن میراثن کے کان سے کان لگا کر سرگوشیاں کرتی رہی، آفتاب کے ننھے بچے جمیل کو کھلانے لگی۔

(۳)

وہ دونوں سابرمتی ندی کے کنارے ریت اور سنگریزوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔

موتی جان نے جواب دیا — میری خوبصورت چھوٹی بہن، تم غلط سمجھ رہی ہو۔ دُنیا کا ہر ایک گنہگار اپنے ضمیر کی تسکین کا سامان بہم پہنچانے کے لئے ایسے اسباب تلاش کرتا ہے جو گناہ کو ثواب ثابت کر سکیں۔ چنانچہ پرانی کہاوت ہے کہ ہم بُرے فعل خود کرتے ہیں مگر لعنت شیطان پر بھیجتے ہیں۔ اگر میں اپنے نفس پر قابو نہیں رکھ سکتی اور قابو نہ رکھ سکنے کی صُورت میں کوئی جائز سبیل نہیں نکالنا چاہتی تو لامحالہ موردِ الزام قرار دوں گی سماج کو، اور کہوں گی کہ بازاری کسی کی زندگی بسر کرنے پر مجھے سماج ہی نے مجبور کیا ہے، حالانکہ نہ کبھی سماج مجبور کرتا ہے نہ سماج کی خاطر کوئی طوائف کا ذلیل ترین پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ دراصل سماج کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ قصور خود اپنے نفس کا ہوتا ہے لیکن چونکہ لوگوں کا تکیہ کلام سماج اور اس کی بندشیں ہو گئی ہیں اس لئے ہم لوگ بھی ایسا ہی کہہ کر اپنا من سمجھانے کی سعی کرتے ہیں۔ درحقیقت اس ناگفتنی حالت تک پہنچنے میں ہماری رہبری کرتا ہے ہمارا نفس خبیث اور ہماری آرزوئے انبساط و نشاط۔ نوجوانوں سے ہمکنار ہونے کا شوق، اور عمرانی بندشوں سے ہمیشہ آزاد رہنے کی آرزو۔ اچھا آفتاب مان لو کہ ایک دھرم یا ایک ذات بیوہ عورتوں کی شادی کو خلافِ دستور قرار دے کر چاہتی ہے کہ ایسی ہزاروں لاکھوں بیچاریاں زندہ درگور بیٹھی رہیں اور مُنہ سے اُف نہ کریں۔ اور وہ ایسا نہیں کر سکتیں تو وہ کیوں نہ اس برادری، اس ذات، اس دھرم سے الگ ہٹ جائیں اور دوسرے سماج میں جا کر اپنا عقد کرالیں۔ کیا دُوسرا سماج انہیں قبول نہیں کرے گا؛ ضرور کریگا۔

اور کیا اس طرح شریفانہ اور باعصمت زندگی بسر کرنے کو ہماری جیسی بدترین اور ندامت انگیز زندگی پر لاکھ درجہ برتری اور فضیلت حاصل نہیں ہے؟" ـــــ (وہ پھر خاموش رہ کر کہنے لگی) "یہ میں اُور مذاہب کا ذکر کر رہی ہوں، جن کے ہاں سماج کی سخت گیری ہے، ورنہ ہمارے دین میں نہ کوئی سماج ہے، نہ یہ کہ گنہگار ہونے کے بعد وہ چاہے کچھ کرے انسان گنہگار ہی رہے گا، اس دن مَیں قرآن مجید کی تفسیر پڑھ رہی تھی۔ ایک آیت ہے، اس کا ترجمہ ہے کہ "گنہگار توبہ کرلے تو ایسا ہوجاتا ہے گویا وہ بالکل معصوم ہو اور اس نے کبھی کوئی گناہ کیا ہی نہ ہو"۔ دیکھو کتنا فطری مذہب ہے ہمارا۔ کیوں آفتاب تم نے قرآن مجید بھی پڑھا ہے؟"

اس کے جواب میں آفتاب نے شرمندگی کے ساتھ نفی میں سرہلا دیا، اور آہِ سرد بھرنے لگی۔

موتی نے کہا ـــــ "نہیں تم ضرور قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرو، پھر اس کے معانی پر غور کرو۔"

آفتاب نے کہا ـــــ "انشاءاللہ میں ضرور ایسا کروں گی۔"

موتی کہنے لگی ـــــ "اگر تم بھی میرے ساتھ تیار ہو تو آؤ ایک دن ہم جامع مسجد میں چلیں۔ تائب ہوجائیں، پھر اپنی زندگی کسی ایسے کام کے لئے وقف کردیں، جو ہماری تمام بداعمالیوں کا کفّارہ ہوجائے۔"

آفتاب بولی ـــــ "پیاری اور عزیز موتی بہن، مَیں نے تو پہلے ہی اپنا ارادہ ظاہر کردیا ہے۔ میں کس طرح یقین دلاؤں کہ جس پگڈنڈی پر تم مجھے چلاؤگی میں کمال ثابت قدمی سے چلوں گی۔ تم نے مجھے نیند سے جگادیا ہے۔ تم میری محسن ہو، اب مجھے اپنے آپ سے گھِن آنے لگی ہے۔ اماں جان اگرچہ خلاف جائیں گی۔ لیکن مَیں ان سے بھی بالکل قطع تعلق کرلوں گی۔"

اتنے میں آفتاب کا ننھا بچہ جمیل جو ایک طرف محوِ خواب تھا جاگ اُٹھا اور چِلّا چِلّا کر رونے لگا۔ آفتاب نے دوڑ کر اسے اُٹھا لیا اور سینے سے لگالیا، دودھ پلانے لگی اور کہا ـــــ "جی میں تو ایسی بدی آتی ہے کہ اسے سابرمتی ماں کی لہروں میں جھونک دوں تاکہ میری معصیت اور سیہ کاریوں کی یادگار ہمیشہ کے لئے نابُود ہوجائے!"

موتی جان نے چونک کر کہا ـــــ "ہائیں! یہ کیا بُزدلانہ خیال ہے! نہیں جانتی ہو کہ اس بچاری ننھی سی جان نے کسی کا کیا بگاڑا ہے، وہ معصوم ہے اور خدا کی نظروں میں بھی بے جرم ہے۔ کیونکہ ماں اور باپ کی خطاؤں کا ذمہ دار بچّہ نہیں ہوسکتا۔ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ آفتاب پیاری مَیں تمہیں بصد منت کہتی ہوں کہ یہ جذبات اب اپنے جی میں نہ آنے دینا۔ لو! میرے سامنے اس کا بوسہ لو ـــــ جمیل! میاں جمیل! خدا کرے ماں کے کلیجے کی ٹھنڈک بنو تم!"

آفتاب نے جُھک کر جمیل کا مُنہ چوم لیا۔ اور اپنے دو گرم آنسوؤں کی بوندیں بھی اس کے معصوم رخساروں پر ٹپکا دیں۔

(۴)

کپڑا بننے والے ملوں کے مزدوروں کی ہڑتال کی آگ بمبئی سے سلگنی شروع ہوئی۔ اس کے شعلے احمد آباد تک پہنچ گئے، یکے بعد

یگرے تمام مِل بند ہو گئے۔ صرف اِکّا دُکا مِل جاری تھے۔ مزدور چاہتے تھے کہ ہماری شرح اُجرت بڑھا دی جائے، اور کام کے اوقات کم کئے جائیں۔ کارخانوں کے مالک رضامند نہیں ہوتے تھے، چنانچہ محنت اور سرمائے کی رسّہ کشی بڑے زور شور سے ہو رہی تھی۔

کوئی دن ناغہ نہیں جاتا تھا جب میلے کچیلے اور خوش وضع اور خوش تراش ہر قسم کے لباسوں میں ملبوس مزدور جماعتوں کا جلوس نہ نکلتا ہو۔ ان کے ساتھ عَلَم رہتے تھے جن پر ہتھوڑی، کُدال، پھاوڑے اور درانتی کے نقشے بنے رہتے تھے اور "مزدور آزاد! سرمایہ برباد! انقلاب زندہ باد!" کے نعرے لگائے جاتے تھے۔ ہر ایک چالاک مزدور ماہر خطابیات اور بلند بانگ مقرر بن گیا تھا۔ جا بجا جلسے منعقد ہوتے اور تقریریں کی جاتیں۔ پندرہ دن ہونے کو آئے، مزدوروں کی زبردست جماعت جو ہزاروں پر مشتمل تھی محض بیکار تھی۔ ان کا نظام اوقات یہ تھا کہ صبح گھر سے آنا اور تمام دن سڑکوں پر، میدانوں میں، اور ہوٹلوں میں بیٹھ کر محنت و سرمایہ سے متعلق بحث کرنا اور بحث سُننا اور آوازے کسنا اور شام کو گھر چلے جانا۔

لیکن خرابی ان بیچاریوں کی تھی، جو چھوٹی چھوٹی تاریک اور کثیف کوٹھڑیوں میں دھوا زے کپڑے اور مَل گجے کپڑے پہنے ہوئے، سر کو ہاتھ لگائے بیٹھی رہتی تھیں۔ ان میں سے کسی کے ہاں مسور کی دال نہیں ہوتی تھی تو کسی کے ہاں نمک منگانے کے لئے ایک پیسہ تک نہ ہوتا تھا۔ کوئی پان، سپاری، چائے، شکر اور دودھ پیسہ نہ ہونے کے باعث مول نہیں منگا سکتی تھی اور اُدھار مانگتی پھرتی تھی۔ ان میں کی ہر ایک عورت یہی مناتی تھی کہ ہڑتال جلدی ختم ہو جائے۔ وہ اس لئے مناتی تھیں کہ ہڑتال کے سبب ہاتھ میں پیسہ بالکل نہیں تھا۔ میاں باہر سے جب شام کو آتے ہیں تو کھانا مانگتے ہیں۔ چائے، شکر، دودھ اور پان سپاری، اور بیڑی ماچس مانگتے ہیں، پھر جب ذرا سی کمی ہوتی ہے تو تمام کوٹھڑی سر پر اُٹھا لیتے ہیں، پورا محلہ جگاتے ہیں۔ ڈنڈے، جوتے، لاتیں اپنی عورت کو، اپنی بہن کو، اور اپنی بوڑھی ماں تک کو مارتے ہیں۔ کیونکہ وہ ان سے زبان درازی کرتی تھیں!

دُوسری جانب کارخانوں کے مالک اور مہتمم اور گورنمنٹ کے اعلیٰ حکام گفت و شنید کر رہے تھے۔ ٹریڈ یونین کے عمّال مصالحت کی سعی میں مصروف تھے۔ لیکن مصالحت ہوتی نظر نہیں آتی تھی، کیونکہ مزدوروں کی طرح کارخانے دار بھی سوچتے تھے "اچھا ہے، دیکھیں کب تک اپنے مطالبات پر مصر رہتے ہیں، جب کھانے کو نہیں ملے گا، جب بھوکے مریں گے خود ہی جھک جائیں گے۔"

افلاس اور بدنصیبی کے دردناک مناظر کی جب انتہا ہو چکی تو ٹریڈ یونین کے کارکن موٹر لاریوں میں آٹا، چاول، دال، دودھ اور دوسری اشیائے خوردنی و نوشیدنی لے کر مزدوروں کے احاطے میں جاتے اور روزمرہ کوئلہ، جلانے کی لکڑی اور یہ سب سامان تھوڑا تھوڑا ہر ایک کے گھر میں بانٹ آتے۔ اس طرزِ عمل سے ہڑتال کو اور تقویت پہنچی، اور انجام کار سرمایہ داروں کو صلح کرنے کے لئے خود اقدام کرنا پڑا۔

* * * * * * * * * * *

پھر ایک روشن اور تابناک صبح آئی جب تمام کارخانوں کی چمنیوں سے دھوئیں کے کالے کالے بادل اُٹھ کر فضائے شہر پر چھا گئے۔ انجن بائلروں کی سیٹیاں اندھا دھند بجنے اور گونجنے لگیں۔ لوگوں نے انہی سیٹیوں کے حساب سے اپنی کلائی اور جیب کی گھڑیوں کا وقت درست کرنا شروع کیا۔ اور مزدوروں کے جتھے جن میں عورتیں بھی شامل تھیں جوق در جوق اپنے دھوائے میلے اور اُترے ہوئے پُرانے کپڑوں کے پھاڑ کر بنائے ہوئے دسترخوانوں میں روٹیاں باندھ باندھ کر کارخانوں کا رُخ کرنے لگے مزدوروں کی فاتحانہ گفتگو، اپنے افسروں کا لحاظ کئے بغیر ایک ساتھ مل کر گیت گانا، بے باکانہ جواب دے دینا، سرمایہ دار انسانوں کے لئے ضرور زہر کے گھونٹ پی جانے سے کم نہ تھا۔ وہ اگرچہ بظاہر مسکراتے تھے، لیکن ان کا دل نہیں مسکراتا تھا، اس پر توانتقامی جذبہ طاری تھا۔ وہ سوچتے تھے کاش آج ٹریڈ یونین نہ ہوتی، توان کی فتح اور مزدور جماعت کی ہار بدیہی امر تھا۔ لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ دنیا کے زبردست کارخانے کے اندر جس میں وہ اپنے کارخانے لئے بیٹھے تھے، ہمیشہ زمانہ منقلب ہوتا رہتا ہے۔ مگر سرمایہ اپنی جیت اور محنت کی ہار کے سوا کبھی کچھ اور جاننا نہیں چاہتا۔

پھر ٹریڈ یونین کی طرف سے بڑے بڑے پوسٹر شائع کئے گئے کہ اس کے زیرِ اہتمام اتوار کی شام کو زبردست جلسہ سابرمتی کے کنارے منعقد ہوگا۔ چنانچہ وہ منعقد ہوا۔ حاضرین کی تعداد پچاس ہزار سے متجاوز تھی۔ اس میں سرکاری حکام بھی تھے۔ غریب مزدور بھی تھے، عام شہری بھی تھے، اور سرمایہ دار جماعت کے ارکان بھی تھے۔

صدارت کے لئے مسٹر احمد ٹریڈ یونین کانگرس کے صدر کی تجویز باتفاق رائے منظور ہوئی۔ درجنوں مقررین نے ہڑتال اور اس کے اسباب پر بحث کی۔

اس کے بعد مسٹر احمد نے ایک پُرمغز اور پُرجوش تقریر کی جس کے دوران میں بتایا کہ ابتلا اور آزمائش کے وہ پندرہ دن ہماری جیت اور سرمایہ داروں کی ہار کا باعث ہوئے ہیں جن میں ہمارے قدم ڈگمگا رہے تھے، ہمیں کھانے کے لئے روٹی اور پینے کے واسطے ایک پیالی چائے بھی میسر نہ آسکتی تھی لیکن دو فیاض، اور نیکدل خاتونیں اُٹھیں اور ٹریڈ یونین کی آڑ لے کر اپنی متاعِ عزیز جو ساٹھ ہزار روپے کے قریب تھی اس جدوجہد کی راہ میں قربان کر دی۔ چالیس پچاس ہزار مزدور، ان کے بال بچے پندرہ دن تک انہی کے عطیے کی بدولت روٹی کے ٹکڑوں سے محروم نہ رہ سکے، ورنہ آج ہماری شکست اتنی شرمناک اتنی ذلت انگیز اور اتنی بری ہوتی کہ تمام ہندوستان اور ماورائے ہندوستان کے سرمایہ داروں کے لئے وجہِ فخر و مباہات ہوتی، تمام ہندوستان اور ماورائے ہندوستان کا میں اس لئے ذکر کر رہا ہوں کہ ہمارے تمام کارخانوں میں جو سرمایہ لگا ہے اس کے لگانے والے ایشیا اور یورپ اور امریکہ کے تمام اقطاع میں پھیلے ہوئے ہیں، اور ان سب کی نگاہیں ہماری طرف لگی ہوئی تھیں۔ اس واسطے میں آپ

لوگوں سے استدعا کرتا ہوں کہ ان دو خاتونوں کا شکریہ ادا کرنے اور ہدیۂ تہنیت پیش کرنے اور ان کی بہت بڑی قربانی کے لئے بصد خلوص اظہارِ عقیدت کرنے کا ریزولیوشن باتفاق رائے منظور فرمایئے ــــــ"

لوگوں نے مسٹر احمد کو آگے تقریر نہ کرنے دی اور مجمع میں ہر جانب سے صدائیں آنے لگیں کہ وہ دونوں شریف فیاض طبیعت خاتونیں کون ہیں۔ بیان کیجئے اور انہیں ہمیں بتایئے۔

موتی بیگم اور آفتاب بیگم کو ڈائس پر بٹھایا گیا تھا۔ وہ کھڑا نہیں ہونا چاہتی تھیں۔ لیکن مسٹر احمد اور دوسرے کارکنوں کے اصرار پر دونوں کھڑی ہو گئیں۔ موتی بیگم سفید موٹی ساری پہنے تھیں اور آفتاب بھی اسی قسم کی ساری میں ملبوس تھیں۔ آفتاب کی گود میں ان کا بچہ جمیل بھی تھا جو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تمام مجمع کو دیکھ رہا تھا۔ پُرجوش نعرہائے مسرت اور "زندہ باد" کی آوازوں اور جوش کے ساتھ مسلسل کئی منٹ تک بجنے والی تالیوں کے شور کے مابین ان دونوں کا خیر مقدم کیا گیا۔

مسٹر احمد کی استدعا پر حاضرینِ جلسہ نے باتفاقِ رائے یہ ریزولیوشن منظور کیا اور فوراً ایک تھیلی جس میں دو سو اشرفیاں تھیں جنہیں پہلے ہی چندے کے ذریعہ فراہم کر لیا گیا تھا، ان دونوں کو پیش کرتے ہوئے مسٹر احمد کہنے لگے ــــــ " اے غیور اور نیک دل خواتین! آپ نے پچاس ہزار انسانوں کی زندگی کو خوشگوار بنانے کی جو سعادت حاصل کی ہے اس پر ہر شخص کو رشک ہوگا۔ آج اس جلسے میں شریک ہونے والا بچہ بچہ آپ کو متشکرانہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ آپ دونوں کا نام مزدور اور سرمایہ دار کی تاریخ لکھنے والے مورخ اور ہماری آئندہ نسلیں کبھی فراموش نہیں کریں گی۔ میں اہلِ جلسہ کی جانب سے یہ ناچیز ہدیہ آپ کی خدمت میں پیش کرنے کا اعزاز حاصل کر رہا ہوں۔ اور یہ جان کر میں فخر محسوس کرتا ہوں کہ ہماری خاکستر میں ابھی ایسی چنگاریاں بھی موجود ہیں۔"

مسلسل تالیاں بجنے لگیں۔ آفتاب بیگم نے اشارہ کیا کہ موتی بیگم تم تھیلی لے لو۔ موتی نے آفتاب کو اشارہ کیا کہ نہیں تم لو۔ مسٹر احمد اتنی دیر تک تھیلی دونوں ہاتھوں میں لئے کھڑے رہے۔ انجام کار آفتاب بیگم نے تھیلی لے لی۔ اور بھرّائی ہوئی آواز میں شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد وہ دونوں بیٹھ کر کچھ سرگوشیاں کرتی رہیں۔ پھر آفتاب بیگم نے کھڑے ہو کر مجمع کو مخاطب کر کے کہا ــــــ "ہم دونوں آپ سے ایک درخواست کرتے ہیں۔"

مجمع میں سے آوازیں آئیں ــــــ " فرمایئے۔ ضرور کہیئے۔"

آفتاب بیگم نے کہا ــــــ " ہم نے بچارے مزدوروں کے گھر اندر سے دیکھے ہیں۔ ان کا نقشہ تو نہیں کھینچ سکتے لیکن یہ کہہ سکتے ہیں کہ اصول حفظانِ صحت سے گھر کی عورتیں بالکل بے بہرہ ہیں۔ بچوں کا رکھ رکھاؤ نہیں جانتیں، کپڑے اس قدر میلے اور بدبودار پہنتی ہیں جو مضر صحت ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہم آپ کی ایسوسی ایشن کو اپنی جانب سے یہ سب اشرفیاں دیتی ہیں کہ اصول حفظانِ صحت اور صفائی کی تعلیم میں یہ خرچ کی جائیں اور اگر سینما کی مشین منگا کر عینی مشاہدات کے ذریعہ سے یہ تعلیم دی جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔

اس تجویز پر حاضرینِ جلسہ نے پُرجوش نعرہ ہائے مسرت بلند کئے۔ ان دونوں خواتین کے مخلصانہ جذبات کی قدر کی گئی۔

ٹریڈ یونین کانگرس کے عمال کو معلوم تھا کہ موتی اور آفتاب نے اپنا تمام اندوختہ مزدوروں کی نجات کی خاطر قربان کر دیا ہے۔ لہٰذا اسی جلسے میں پھر یہ تجویز پیش ہوئی کہ انہی دونوں کو اس کام پر مامور کیا جائے کہ وہ ہفتے میں ایک بار مزدور احاطے میں عورتوں کو جمع کر کے میجک لالٹین کے ذریعہ حفظانِ صحت پر لکچر دیا کریں۔ مقامی ہیلتھ آفیسر مسٹر مکرجی نے اسی جلسے میں وعدہ کیا کہ وہ ان دونوں کو صحت کے سائنس کی تربیت دیں گے۔ اور ریڈ کراس سوسائٹی کے سکریٹری مسٹر نیگسے کہہ کر ان کے لئے بہترین فلم سلائیڈ اور ضروری سامان مہیا کرا دیں گے اور کچھ الاؤنس کا بھی میونسپلٹی کی جانب سے بندوبست کر دیں گے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ مقامی میونسپلٹی کی جانب سے ان دونوں مخیّر عورتوں کو ایڈریس دیا جائے۔ لیکن موتی اور آفتاب نے ان کا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ انہیں نام و نمود کی مطلق خواہش نہیں ہے۔ وہ ایڈریس کی تجویز کو ناپسند کرتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ انہیں صرف انسانیت کی دو خادمائیں تصور کیا جائے۔ انہوں نے میونسپلٹی سے الاؤنس لینے کی تجویز کی بھی مخالفت کی اور کہا کہ ہم گراموفون کمپنی لمیٹڈ کو جو دو تین گیت ہر ماہ دے دیتے ہیں اس سے ہمیں اپنی ضرورت کے مطابق مل جاتا ہے۔ اب ہمیں زیادہ کی آرزو نہیں ہے۔

پرجوش مجمع نے ان کی سادہ تقریر کو بہت غور سے سُنا، خوب تالیاں بجائیں اور "زندہ باد" کے نعرے لگائے۔

جب جلسہ برخاست ہو گیا اور ہزاروں پھولوں کے ہاروں سے لدی ہوئی ان دونوں عورتوں کو زبردستی موٹر میں سوار کرا کے ایک جلوس نکالا گیا تو بے شمار گجراتی خواتین ان کے گرد و پیش تھیں۔ ان کے بعد مرد تھے، لڑکے تھے۔ سب ان کی "جے" کے نعرے لگاتے جا رہے تھے۔ مسز جمنا مزدور عورتوں کی مشہور کارکن ان کے ساتھ موٹر میں سوار تھیں۔ اس وقت نہ جانے کیا بات تھی کہ ان دونوں کی آنکھیں بار بار گرم آنسوؤں سے تر ہو جاتی تھیں۔ شاید ان کے جذبات میں تلاطم برپا ہو رہا تھا، یہ خیال کر کے کہ ان کی زندگی کا ایک دَور وہ بھی تھا جب شریف انسان ان کے کوٹھے کے سائے میں سے نکل جانا بھی باعثِ ننگ و عار سمجھتے تھے، یا شاید وہ اپنے خدا سے التجا کر رہی ہوں کہ "ہمارے اگلے دنوں کی یاد ہمیں نہ آنے دے!"

شاید مسز جمنا نے رات کے باعث ان کی بھرّائی ہوئی آواز اور جوشِ گریہ کا مطلق خیال نہ کیا ہوگا اسی لئے وہ اپنی صنف کی دو ہستیوں کی عزت افزائی پر اظہارِ مسرت کر رہی تھیں اور بار بار انہیں مبارکباد دیتی تھیں۔ کبھی جمیل کو محبت آلود نگاہوں سے دیکھ کر چمکارتی تھیں اور کہتی تھیں "بتاؤ جمیل تم بڑے ہو کر کیا بنو گے؟ اپنی اماں کے نقشِ قدم پر چلو گے کہ نہیں؟"

بچہ مسز جمنا کی تقریر نہیں سمجھ سکتا تھا۔ لیکن "غوں غوں" کر کے کھلکھلا کر ہنس دیتا تھا۔ اور لوگ نعرے لگا رہے تھے کہ

"بولو آفتاب بائی کی جے!"

حسن عزیز جاوید

تنہائی

تعلقاتِ جہاں میں مصیبتیں ہیں ہزار ہر ایک ذرۂ ہستی ہے صد بلا بکنار
نہ عافیت کا پتہ ہے نہ ہے نشانِ سکوں نہ روح کو ہے مسرت نہ دل کو صبر و قرار
تُو میرے گوشۂ خلوت کی قدر کیا جانے کہ میرا گوشۂ خلوت ہے محفلِ افکار
مرے خیال کی دُنیا الگ ہے اے واعظ نہ اُس میں علم کا فتویٰ نہ جہل کی تلوار
نہ احتساب کا ڈر ہے نہ خوفِ رُسوائی
ہزار انجمنیں، میری ایک تنہائی

تضمین

(برشعر حامد علی خاں)

مت پوچھ مجھ سے ہمنشیں وجہِ سکوتِ دائمی مَیں نوحہ خوانِ مرگ ہوں مَیں نوحہ خوانِ زندگی
گزرا وہ سیلِ بے پنہ اُتری وہ موجِ خودسری "اب جوئبارِ زندگی چُپ چاپ سی ہے، ہاں کبھی
اُٹھی صدائے درد جب کوئی کنارہ گر گیا" (حامد)

دیس راج شرما

بی۔بی۔ڈی (فرنچ)

خیالات

وقت!

وقت بھی کتنا تیز رفتار ہے!

خوشی کے لمحے ایک ہلکے سے لطیف و معطر جھونکے کی طرح فوراً گزر جاتے ہیں۔

لیکن غم اور پریشانی کی گھڑیاں؛ اُف!

وقت بھی کتنا سست رفتار ہے!

بالکل چیونٹی کی طرح رینگتا معلوم ہوتا ہے نہ ختم ہونے والا! دائمی!!

یوں ہی قہقہہ فوراً ختم ہوجاتا ہے

مگر آنسو آہستہ آہستہ بہتے ہیں اور بہتے رہتے ہیں!!

(اے۔ ایف سلطان)

دِیاسلائی

کمرہ بالکل تاریک تھا۔ اُس نے جیب سے دیاسلائی کی ڈبیا نکالی۔ کچھ کھٹ پٹ سنائی دی اَور پھر کھُس کی سی آواز کے ساتھ ایک چھوٹا سا شعلہ بھڑکا۔

کمرہ زرد اور تھرتھراتی ہوئی روشنی سے منور ہوگیا۔

اس کے بعد پھر وہی گہری تاریکی تھی۔

کیا یہی ہے زندگی؟ بے ساختہ میرے مُنہ سے نکل گیا۔

(محمّد ایوب)

مِعیار

مخفی نماند کہ وقتے در لکھنو شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی با من گفتند کہ خواجہ حالی امروز در ہندوستان دسخن سنجی نظیر خود نمیدانند داکثر الاتفاق اُفتادہ کہ شعرِ استادے کہ خوبی و حُسنِ آں دل نشینِ من بودہ، چوں بر مولانا حالی خواندم و ایشاں متوجّہ نشدند ہماں ساعت آں شعر از نظرم اُفتاد۔

(مولوی محمد احسن اللہ خاں ثاقب اکبرآبادی)

غالب بہ فنِ گفتگو نازد بایں زورش کہ اُو   ننوشت در دیواں غزل تا مصطفےٰ خاں[1] خوش نکرد

(مرزا اسداللہ خاں غالب)

رحل

[1] نواب مصطفےٰ خاں حسرتی و شیفتہ مرحوم

غالب کی قدر

ماضی، حال اور مستقبل میں

شکایت کسی کو کب پیدا ہوتی ہے؟ اس وقت جب آدمی کسی بات کی اُمید رکھے اور وہ نہ ہو یا نہ ہو سکے۔ مرزا نے اپنے زمانے کی ناقدری کی شکایت کی ہے اور بیشتر جگہ

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ — کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں

ہے اب اس معمورہ میں قحط غم اُلفت اسدؔ — ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہے کھائیں گے کیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل — دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

کیا وجہ؟ مرزا ایک سپاہی پیشہ آدمی تھے۔ گھر اور ننھیال دونوں خوش حال۔ طبیعت کی موزونی سے شاعری اختیار کی۔ لیکن وہ عزم و ہمت اور حوصلہ مندی جو سپاہی زادوں اور زور آزماؤں میں ہُوا کرتی ہے اُسے کہاں رکھ آتے چنانچہ ان کی طبیعت ان کے ساتھ آئی۔ موزونی طبع ندرتوں پر تھی، عزم و ہمت نے راستہ بتایا کہ تم اس راہ پر چل کر یکتائے روزگار ہو گے اور اس قدر بلند جیسے فردوسی، انوری اور اس قدر تمہاری قدردانی ہو گی جیسی محمود، جہانگیر اور خانخاناں کیا کرتے تھے۔ دولت، شہرت اور عزت حوصلہ مند کو اور کیا چاہیئے۔ چنانچہ غالب نہایت جوش و خروش اور اُمیدوں کے ساتھ اس کوچہ میں آ گئے اور تھوڑے ہی دنوں میں انہیں سرد آہیں بھرنا پڑیں اور اپنی قسمت اور زمانہ کی ناقدری کی شکایت کرنا پڑی۔ کیوں؟

ایک تو وہ زمانہ ہی بدل گیا تھا۔ نہ اکبر تھا نہ جہانگیر اور نہ ان درباروں کے سے اُمراء۔ فیضی یا ابوالفضل، عرفی یا نظیری بھی اس زمانے میں ہوتے تو اپنی بےکسی، بیچارگی اور بےقدری کا غالب ہی کی طرح رونا روتے۔ کیا اکبر شاہ ثانی اور کیا ظفر دونوں محض شاہِ شطرنج تھے ان کی عملداری محض قلعہ تک محدود تھی۔ بادشاہ نام کے تھے۔ انگریزوں سے وظیفہ پاتے تھے اور اُسی میں زندگی بسر کرتے تھے۔ اُمراء الگ مفلوک الحال جس کے پاس کچھ تھا بھی وہ اُسی کو دانتوں سے پکڑ کے گوشہ نشین ہو گیا تھا۔ سرکار انگریزی کو شاعری اور مداحی سے دلچسپی نہیں اور نہ وہ آئندہ شہرت کے لالچ میں شاعروں کو مُنہ لگاتی تھی۔ غرضکہ شاعروں کی قدر کون کرتا۔ نفسی نفسی پڑی ہوئی تھی۔ اپنا ہی پورا نہ ہوتا تھا تو دوسرے کا کون پورا کرتا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ غالب جنہوں نے بڑی امیدوں سے یہ

پیشہ اختیار کیا تھا سخت مایوس اور ناکام ہوئے۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ خود مرزا کے لئے زندگی اتنی آسان اور "بازیچۂ اطفال" ثابت نہ ہوئی جتنی ان کے شاعرانہ دماغ نے شاید سمجھ رکھی تھی۔ پانچ برس کے تھے کہ باپ کا انتقال ہوا۔ نو برس کے ہوئے تو چچا سدھارے۔ سسرال کے ناز و نعم پھر اس کے بعد جائداد کے جھگڑے، قرض کا مقدمہ، چوسر والا واقعہ، غدر کی تکالیف، بھائی کی موت غرضکہ اس اس طور سے قسمت اُن کو الٹتی پلٹتی رہی کہ اُن کو رونے کو آنکھ میں آنسو بھی نہ رہے، اس لئے اگر انہوں نے مقدر، قسمت یا خدا کا گلہ کیا تو بے جا نہ تھا ؎

ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے　　بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

اور غالباً یہی سبب تھا کہ ان کے دماغ نے فلسفیانہ طور پر اُس کا رو پیدا کیا اور اس طرح اُن کی روح کو تسکین دی۔ "ورنہ جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے" کا مفہوم معلوم

اور غالباً یہی وجہ تھی کہ ان کی زود حسی اور بھی زیادہ زود حس ہوگئی اور انہیں ہر طرف غم کے سیاہ سیاہ بادل ہی نظر آنے لگے

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا　　وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

ہفت آسماں بگردش و ما در میانِ او　　غالب دگر مپرس کہ بر ما چہ می رود

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ　　جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

اور وہ اب اگر کوئی اُمید بھی کرتے ہیں تو ڈر ڈر کے اور سہم سہم کے ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے　　بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

نامرادم دارد ایں افزونیِ خواہش بہ دہر　　آب بر من بستہ اند آرے ز استسقائے من

. . . .

ہر گونہ حسرتے کہ ز ایام می کشم　　دُردِ تہ پیالہ امید بودہ است

نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانے میں　　حریف رازِ محبت مگر در و دیوار

غرضکہ روئے اور خوب خوب روئے اور جی بھر کے زمانے اور اپنے زمانے والوں کی بے حسی اور بیقدری کا گلہ کیا گئے۔ چنانچہ اکثر اُن کے خطوط میں بھی یہ چشمہ پھوٹ بہا ہے۔

ایک اور وجہ اُن کی شکایت کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کے کہنے کا طریقہ دوسرا اور لوگوں کا سمجھنے کا طریقہ دوسرا۔ سخن ہائی کا رنگ الگ، سخن فہمی کا ڈھنگ جُدا۔ غرضکہ جب غالب نے شاعری شروع کی تو ایک طوفان تھا کہ ان کے خلاف کھڑا ہو گیا۔

پہلے تو روغنِ گل بھینس کے انڈے سے نکال　　پھر دوا جتنی ہے گل بھینس کے انڈے سے نکال

والا معاملہ۔ یا پھر کھلے مشاعروں میں ان پر چوٹیں

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

زبانِ میر سمجھے اور کلامِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

یا پھر آزردہ کے مکان پر کے مشاعرہ والا واقعہ

تو اے کہ محو سخن گسترانِ پیشینی
مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

غرضکہ ایک تو شاعر یونہی زود حِس ہوتا ہے اس پر یہ دل آزار تنقیدیں، شروع ہی میں دل بجھ گیا۔ وہ ان کے لئے بہت مبارک دن ہوتا تھا کہ جب کبھی ان کی تعریف ہو جاتی یا کوئی ان کے کلام کی صحیح معنوں میں تعریف کرنے والا مل جاتا چنانچہ یہی وجہ تھی کہ انہیں ان دنوں مُنہ بسور کر کہنا پڑتا تھا۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

یا

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

مختصر یہ کہ زمانہ الگ برا لگا ہوا، زندگی کی تکالیف اور مصیبتیں الگ، طبیعت میں زود حسی الگ بڑھی ہوئی اور پھر اس پر قدر دانوں کی یہ قدر دانی، مرزا کے لئے سوائے اس کے اور کیا رہا تھا کہ اپنے نقادوں اور اپنے زمانے کا گلہ کرتے ہوئے اپنے فن پر شہید ہو جاتے (جیسا کیٹس نے کیا) یا پھر اپنا طرزِ عمل بدل دیتے جیسا کہ مرزا نے کیا اور جسے ہم لوگ کہتے ہیں کہ مرزا نے ٹھیک کیا اور یہی چیز مرزا کے بقائے دوام کا باعث ہوئی۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا واقعی جیسا کہ حالی نے لکھا ہے مرزا اپنی ناقدری پر اسی قدر نالاں تھے جیسا کہ یادگار میں درج ہے اور اگر تھے تو کیا اپنی اس شکایت میں حق بجانب تھے؛ یہ بات کہ "نالاں تھے" اوپر کے داخلی و خارجی شواہد سے عیاں ہو گئی، لیکن یہ کہنا کہ اس میں وہ حق بجانب تھے صحیح نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ بات ذہن سے نکال دی جائے کہ حرص کی کوئی حد نہیں ہے یا ایک شاعر کبھی مطمئن نہیں ہوتا تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب کی ان کے زمانے نے اتنی قدر کی جتنی کہ وہ کر سکتا تھا۔ غالب خود مطمئن نہ ہوں یہ اور بات ہے، لیکن ان کے عہد نے ان کا پورا پورا حق ادا کر دیا خصوصاً ان کی آخر عمر میں جب تیس سال سے کچھ اوپر ہی کے تھے تو صاحبِ گلشنِ بے خار نے ان کی اتنی تعریف کر دی کہ گارساں دتاسی متعجب ہو گیا کہ شیفتہ اور پھر اس قدر تعریف کرے۔ دلّی کے متعلق ایک کتاب آثار الصنادید لکھی جاتی ہے اُس میں جس غلو کے ساتھ ان کی مدح کی گئی ہے اُس پر بھی یہ ناقدری کی شکایت کرتے ہیں۔ دلّی کو چھوڑیئے، دلّی کے باہر ان کے ماننے والے دوسرے بہت سے لوگ ہیں جن میں سے اکثر سے تو خط و کتابت

ہے۔ اکثر ان سے خاص کر ملنے آتے ہیں۔ غلام غوث بےخبر۔ نساخ۔ ناسخ آنے والوں میں عزیز لکھنوی، صفیر بلگرامی اور سید غوث علی شاہ قلندر۔ اس کے علاوہ مراعات بھی دوستوں کی طرف سے ہوتی رہتی ہیں۔ غدر میں اُن کو آسودہ اُن کے ہندو دوستوں ہی نے رکھا۔ قید فرنگ میں ہر طرح کا آرام پہنچانے والا شیفتہ اُن کا دوست ہی تھا۔ انگریزی مدرسہ کے لئے فارسی کے لیکچرر کی ضرورت ہے اُن کا نام دِلّی کے بہترین فارسی دانوں میں لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مومن، آزردہ، شیفتہ، مولوی فضل حق و دیگر عمائد و اکابر شہر ان کے ماننے اور جاننے والوں میں ہیں۔ آخر میں ذوق سے بھی میل ہو گیا ہے۔ بادشاہِ وقت ان کا شاگرد ہے۔ دِلّی میں انہیں اور کیا چاہئے۔ باہر سے قاضی القضا مولوی ولایت حسین، نواب میر غلام بابا خاں سورت سے ان کا کلام منگا کر دیکھتے ہیں اور انہیں تحفے تحائف بھیجتے رہتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ نواب رامپور شاگرد ہو جاتے ہیں اور سو روپیہ ماہوار مقرر کر دینے کے علاوہ اکثر ان کا قرضہ بھی ادا کرا دیا کرتے ہیں اور ان کی پنشن اور خلعت کے لئے کوشش کرتے ہیں۔ مہاراجہ الور اور راجہ بڑودہ الگ ان پر نظرِ شفقت رکھتے ہیں۔ بادشاہانِ اودھ کے وہاں بھی ان کا شہرہ کافی ہے اور جب انہوں نے قصائد بھیجے تب وہاں سے انعام ملا (یہ اور بات کہ ان تک نہ پہنچا) آخر میں وہاں سے پانچ سو سالانہ بھی مقرر ہونا طے ہو جاتے ہیں۔ خود بہادر شاہ ظفر حالانکہ ابھی ان کے شاگرد نہیں ہوئے ہیں لیکن ان کی رہائی کے لئے حکومتِ انگریزی میں سفارش کرتے ہیں۔ سرکارِ انگریزی کی طرف سے ان کو 'خان صاحب بسیار مہربانِ دوستان' لکھا جاتا ہے۔ پنشن اور خلعت دربار میں اس کے علاوہ۔ اب بھی اگر کوئی اپنے مقدر کی شکایت کرے تو ع "ایسے شکوہ کو تو بس شکوۂ بے جا کہئے"۔ ان کے خطوط چھپتے ہیں اور ان کی مانگ خصوصاً پنجاب میں اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ ان کو بار بار اپنے دوستوں کو لکھنا پڑتا ہے کہ جلدی اور چھپوا دیئے جائیں۔ ہندوستان کے کیا اعلےٰ اور کیا ادنےٰ سب لوگ اس طرح ان کو مانتے ہیں مگر ان کی روح خوش نہیں ہوتی اور وہ خوش نہ ہوں گے جب تک کہ انہیں ملکۂ وکٹوریا اپنا درباری خاص شاعر نہ بنا لیں۔ اور اگر غدر کی وجہ سے ان کی یہ اسکیم ناکام ہو جائے تو یہ شخص ہر ایک کی مدح و ستائش اور قدر دانی کو ناکافی سمجھ کر خود اپنی تعریف کرنے پر اُتر آئے گا۔ گویا اگر زمانہ بھی اس قدر تعریف کرے اور ان کے کلام کو اتنا مانے جتنا کہ یہ سمجھتے ہیں تب ان کی پیاس بُجھ سکے گی۔ کہتے ہیں ؎

گر شعر و سخن بدہر آئیں بودے   دیوانِ مرا شہرتِ پرویں بودے

غالب اگر ایں فنِ سخن دیں بودے   آں دین را ایزدی کتاب ایں بودے

اور اپنی اس قدر افزائی کے لئے کیا کیا کوششیں نہیں کرتے اور کیا کیا جوڑ توڑ نہیں لگاتے۔ تقریباً ہر ریزیڈنٹ اور ہر گورنر جنرل کی تعریف میں قصیدہ لکھتے ہیں اس کے علاوہ گورنر جنرل کے پرائیویٹ سکرٹری یا اور کسی عہدہ دار انگریز سے دوستی ہو جاتی ہے تو اُس کی مدح کرنے میں بند نہیں رہتے۔ بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے یہاں جوڑ توڑ لگا کر پہنچ جاتے ہیں۔ رامپور کے یہاں الگ

سکہ جما لیتے ہیں۔ بادشاہ اودھ کے یہاں الگ زور لگاتے ہیں۔ حیدرآباد دکن الگ قصیدے بھیجتے ہیں لیکن وہاں سے کوئی جواب نہ ملنے پر خاموش رہ جاتے ہیں۔ لیکن ان تمام ہند کے نوابوں اور بادشاہوں پر ان کی حوصلہ مندی مطمئن اور مجبور ہو جانا پسند نہیں کرتی اور جبتک یہ ملکۂ وکٹوریا کے خاص شاعر مقرر نہ ہو جائیں۔ انہیں چین نہیں آسکتا۔ غرضکہ مرزا نے ہر ممکن طریقے سے کوشش کی کہ وہ اپنے زمانہ سے بہترین قدر لے لیں اور اس میں شک نہیں کہ ان کے زمانے نے ان کی کافی قدر کی یعنی جتنی کر سکتا تھا اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی لیکن اس کو کیا جائے اگر پھر بھی کوئی یہی کہتا رہے "بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے"۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ کیا وہ اس قدر طلب شہرت و عزت میں حق بجانب تھے؟ جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے مرزا نے فن شعر میں کوئی نیا راستہ نہیں نکالا تھا۔ یہ صحیح کہ انہوں نے فقط اپنے طبعی جوہر سے پرانی روش میں جان ڈال دی تھی اور اپنے کمالِ شاعری سے غزل کو انتہائی عروج تک پہنچا دیا تھا لیکن اس کامیابی پر انہیں اپنے معترضین کا شکر گزار ہونا چاہیے نہ کہ ان کا شکوہ سنج کیونکہ یہ انہیں حضرات کی بدولت تھا کہ مرزا صحیح راستے پر پڑ گئے اور فنِ شعر میں اس قدر مقبولیت اور شہرت حاصل کی۔ اس بات کو خود مرزا نے بھی آخر مان لیا ہے چنانچہ ان کا منتخب اردو دیوان چھپتا ہے تو اس میں لکھتے ہیں "منتخب دیوان سے باہر جو میرے اشعار ملیں انہیں میرا نہ سمجھا جائے"۔

بخلاف اس کے جہاں تک ان کی فارسی شاعری کا تعلق ہے خود اُن کے معاصرین اُن کو نہیں مانتے تھے۔ وہ اپنے کو عرفی سے بڑھ کر سمجھتے رہیں "عرفی کیست لیک نہ چوں من دریں چہ بحث"۔ یا تھوڑا بہت شیفتہ مان لیں کہ ان کے شاگرد تھے لیکن صدر الدین آزردہ وغیرہ اُن کو کبھی شعرائے عجم کے برابر نہ مانیں گے۔ رہی مرزا کی خود کی غلط فہمی تو باوجودیکہ ان کی مے قحط خریداری سے کہن ہو گئی پھر بھی ابھی تک کسی نے اس کی تعریف و توصیف نہیں کی بلکہ اردو جس کو وہ اپنے لئے ننگ سمجھتے تھے ان کے لئے باعثِ عزت بن گئی۔ اور اصل یہ ہے کہ اُن کا حقیقی رنگ انہیں اردو غزلوں میں نِکھر سکا ہے نہ ان کی فارسی میں — اگر مرزا کی اس غلط فہمی کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو بھی صاف ظاہر ہے کہ انسان کی جب کسی میدان میں قدر کم ہوتی ہے تو وہ ایسے میدان ڈھونڈتا ہے جس کے مردِ میدان کم یا معدودے چند ہوں تاکہ وہاں اُس کو اپنی بہتری اور برتری دکھانے کا موقع مل سکے۔ چنانچہ اسی قسم کا واقعہ مرزا کے ساتھ پیش آیا۔ اُردو کا بازار ذوق کے ہاتھوں میں تھا، مشاعرے شاہ نصیر و ذوق وغیرہ کے طرزِ سخن سے گرم ہوتے رہتے تھے۔ ان کے طرز کی وہاں کہاں گنجائش۔ چنانچہ شروع شروع میں انہوں نے اردو میں بیدل کا رنگ اختیار کر کے جو رعب ساڈالنا چاہا تھا وہ جب نہ جما تو یہ اُس طرف سے فرار ہو کے میدانِ فارسی میں آ گئے کہ اس کے جاننے والے بہت زیادہ نہ تھے اور اس لئے فارسی ایک طرۂ امتیاز سمجھی جاتی تھی۔ یہ صحیح کہ فارسی سے مناسبت اُن کو بچپن سے تھی لیکن بالکل اُردو چھوڑ کر فارسی کا اختیار کر لینا

ضرور اس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ ان کے اشعار پر بڑی تنقیدیں ہوتی تھیں۔ اور اس لئے یہ مکدر ہو کر فارسی کے میدان میں چلے گئے اس کے علاوہ ان کی پُر پیچ طرز ادا کا اظہار متاخرین شعراء فارسی کے انداز ہی میں ہو سکتا تھا لیکن موجودہ زمانے نے جس قدر ان کی قدر کی اُس سے اگر مرزا زندہ ہوتے تو اُن کے آنسو ضرور پنچھ جاتے۔ کسی شاعر یا شخص کی قدر اس لئے ہوتی ہے اور اُسی وقت ہوتی ہے جب زمانہ اس کے خیال کے مطابق چلنے اور سوچنے لگے۔ مرزا کے خود کے زمانے کا معیار لفظی صنعت گری اور ظاہری روایاتِ شاعری کا برتنا تھا۔ خیالات کی وہاں نہ کوئی قدر تھی نہ کوئی جگہ۔ خیالات کا دائرہ محدود اور مقرر تھا اور اشہب شعری کو محض اُسی دائرے میں جولانی دکھانا منظور۔ جن اشعار کی تعریف ہوتی وہ ایسے ہوتے جن میں یا تو قافیے اور ردیف کی سخت دقتیں ہوں یا پھر ان میں کوئی رعایتِ لفظی ہو یا کسی قسم کا حسنِ تعلیل یا کوئی اور تمثیل یا ثبوت یا پھر کوئی لفظی یا معنوی صنعت۔ لیکن مرزا کی خوش قسمتی (حالانکہ بعد از مرگ) کہ زمانے کا معیارِ شعری بہت جلد بدل گیا۔ انگریزوں کی آمد آمد نے تصورات کے حلقوں کو ڈھا دیا۔ غلو اور مبالغہ کی سر بہ فلک دیواریں مسمار ہوگئیں اور لوگوں کے تخیل نے واقعات اور موجودات سے زیادہ قریب رہنا شروع کر دیا۔ محض ظاہری صورت ایک بیکار بے معنی سی چیز ہوگئی۔ خیالات و محسوسات یا جذبات اصل شے قرار دیئے گئے۔ تخیل بغیر صداقت کے ناکافی سمجھا گیا۔ چنانچہ مرزا کی شاعری کا ستارہ چمکا۔ اور اس طرح وہ مئے کہنہ آخر رنگ لائی۔ مختصراً یہ کہ بجائے لفظی صنعت گری کے معنوی ندرتِ خیال کی طرف زمانے کا رُجحان ہونے لگا۔ آورد شعریت کے لئے بدمذاقی قرار دی گئی اور محض قوافی و ردیف کا نظم کر دینا ہی شاعری نہیں سمجھا گیا۔ آمد شعریت کا جزوِ اعظم قرار دی گئی۔ مدح اور مدحیہ قصائد کا ستارہ گردش میں آگیا کیونکہ وہ ایک چیز تھی تمام تر آورد۔ خیالات و جذبات لازمۂ شاعری قرار دیئے گئے۔ اس میں کچھ تو مغربی طرزِ تہذیب دوسرے کچھ انگریزی ادب کا اثر جس نے یہ کایا پلٹ دی۔ لوگ جو واقعات تھے ان کی طرف دوڑے، اصلی اور حقیقی محاکات کا اثر زیادہ ہونے لگا بہ نسبت خالی محاکات کے۔ جذبات و محسوسات کی دُنیا گرم ہوئی، خیالات افسوں ہو چلے۔ قدرتی مناظر اور ان کی رنگینی نے دامن پکڑنا شروع کیا۔ شاعری اب محض ایک پیشہ یا ہُنر نہیں رہ گئی بلکہ ایک ذوقی اور وجدانی چیز جس پر ہنر صرف چلا کرتا ہے۔ اب شاعری شاگردی یا ذریعۂ استادی نہیں رہی بلکہ ایک ذاتی چیز۔ ایک ذاتی عطیۂ فطرت۔

اس ذوقِ شعری اور معیارِ شعری کے بدل جانے کے علاوہ کچھ خیالات اور اعتقادات بھی ایسے بدلے کہ تقریباً وہی ہوگئے جو مرزا کے تھے۔ اظہارِ خیال میں طرح طرح کی جدتیں، نئے نئے اسلوب۔ طرفگیٔ ادا، تقدیر و مذہب کا مضحکہ۔ جنت و دوزخ پر ہنسنا، آزادیٔ خیال، تقلید سے کوسوں دُور بھاگنا، بہت اعلیٰ معیار کی ظرافت۔ اسی زندگی کو اصلی اور کُل زندگی ماننا عشقِ مجازی یعنی معاملہ بندی کی بہت اعلےٰ مثالیں۔ زندگی کا ایک فلسفیانہ نظریہ۔ حیات بعد الممات اور عبرت وغیرہ مضامین سے پرہیز۔ مادی دُنیا سے بہ مقابلہ روحانی دنیا کے زیادہ الفت۔ غرضکہ تمام تر جو اعتقادات مرزا کے تھے کچھ ایسا اتفاق ہُوا کہ انگریزی تعلیم کے اثر سے

تقریباً اسی قسم کے خیالات رونما ہو گئے ہیں چنانچہ یہی وجہ تھی کہ اُنیسویں صدی کا کروٹ بدلنا تھا کہ مرزا کی قدر و منزلت میں جو نمایاں اضافہ ہونا شروع ہُوا اُس نے آخری تان یہاں آکر توڑی کہ "ہندوستان کا دیدوں کے بعد دوسرا الہامی کلام" اُن کا دیوان ہو گیا اور اس طرح سے آخرش مرزا کی وہ پیشینگوئی تو پوری ہو گئی کہ میرے کلام کی شہرت میرے بعد ہو گی۔ "شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن"۔ مرزا کا زمانہ ایک ایسا زمانہ تھا کہ گویا ایک جدید کروٹ لے رہا تھا۔ پُرانے ٹمٹماتے چراغ باقی تھے، اسی میں مرزا بھی پیدا ہو گئے۔ یعنی گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ فطرت نے مرزا کو کوئی سو سال پیشتر پیدا کر دیا تھا۔ ظاہر ہے مرزا کے زمانے والے مرزا کو سمجھ نہیں سکتے تھے، چنانچہ نہ سمجھے۔ وہ جدید طرز کے آدمی، آزاد روش، تقلید سے نفرت "زلہ بردار کس چرا باشم۔ من ہمایم مگس چرا باشم"۔ میں یقین رکھنے والے۔ خودی اور خودداری کو سراہنے والے وہ بھلا خاکساران زمانۂ ظفر شاہی کے ساتھ کیونکر بسر کر سکتے۔

دوسری وجہ یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ مرزا کے کلام میں جو کچھ ہے اُسے واقعہ اور واقعیت سے بہت تعلق ہے، محض خیالی طوطا مینا نہیں بنایا گیا ہے۔ محض سُنی سنائی باتوں کا بیان نہیں ہے بلکہ قلبِ غالب کے مشاہدات کا آئینہ ہے۔ اس رباب پر دستِ قدرت نے ایک ایک کر کے سارے سُر بجائے ہیں اور دیوانِ غالب انہیں سُروں کی صدائے بازگشت ہے ۔

زخمہ بر تارِ رگِ جاں میزنم   کس چہ داند تا چہ دستاں میزنم

اور یہی وجہ ہے کہ چونکہ دل سے نکلی ہوئی ہے دلوں پر اثر کر رہی ہے۔

کلامِ غالب کی مقبولیت کی تیسری اور سب سے بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ غالب نے کسی خاص خیال، کسی خاص جذبہ کا اظہار اپنا مقصد نہیں بنا لیا۔ اگر یہ صورت ہوتی تو وہ صرف اسی حلقہ میں مقبول ہو سکتے جو اُس خاص خیال یا نظریہ میں اعتقاد رکھتا۔ مثال کے طور پر میر صرف قنوطیت کے بادشاہ ہیں لامحالہ اُن اشخاص کو ان سے زیادہ اُلفت ہو گی جن کی فطرت اور طینت میں قنوطیت کو زیادہ دخل ہو گا۔ لیکن مرزا بحیثیت ایک شاعرِ اعظم کے فطرتِ انسانی کے ہر جذبہ سے اسی قدر متاثر ہوئے ہیں جتنا کہ حد سے زیادہ زود حِس آدمی اُس سے ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہر جذبہ کا اظہار نہایت بلند معیار پر کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر قسم کی طبیعت کا آدمی اُن کے کلام سے دلچسپی لیتا ہے۔ کسی کو اُن کے دیوان میں فلسفۂ تفاول نظر آتا ہے تو کسی کو ان کا فلسفۂ غم بھاتا ہے، کوئی سمجھتا ہے کہ غالب کا نظریہ زندگی کے متعلق بس یہی تھا کہ "دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دُنیا و چہ دیں" اور "اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے"۔ کوئی اُن کو متشکک سمجھتا ہے کہ "بیخودی بے سبب نہیں غالب، کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے"۔ غرضکہ جو جس افتادِ مزاج کا آدمی ہے اُسے ویسی ہی تصویر دیوانِ غالب میں نظر آتی ہے۔ گویا ایک آئینہ ہے جس میں خود دیکھنے والے کو اپنی شکل نظر آ جاتی ہے، اور یہ خصوصیت دراصل ایک شاعر کی عظمت پر دلالت کرتی ہے۔ اس قدر حیرت انگیز تنوع صرف دُنیا کے بڑے بڑے شاعروں ہی میں مل سکتا ہے، ان کے اشعار کے پیچھے ہمیں ایک

ایسی پُرمعنی شخصیت چھپی ہوئی ملتی ہے جس کے جاننے کے لئے ہم بیقرار رہتے ہیں۔ بقول بجنوری" لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں۔ کون سا نغمہ ہے جو اس ساز کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں"۔

غالب کی مقبولیت کی بہت کچھ ذمہ دار "یادگار غالب" بھی ہے۔ اس سے پیشتر اگر غالب مقبول بھی تھے تو ایک محدود حلقے میں اور اُس محدود حلقے کے بھی خواص میں۔ نہ کہ عام طور پر، یادگار نے اس کمی کو بڑی حد تک دُور کر دیا۔ عموماً مشکل چیزوں کی قدر ان کی تشریح سے ہوتی ہے۔ دیوان غالب اور خود غالب کی قدر حالی کے پُر اعتقاد قلم نے عوام میں بے حد جلب بڑھا دی کچھ تو اُن کے اشعار کی تشریح، کچھ خود اُن کے متعلق حالات جنہوں نے غالب کو ایک اعلے آدمی کی صُورت میں پیش کیا۔ یہ سب باتیں ایسی تھیں کہ اثر کئے بغیر نہ رہ سکیں۔ زمانہ موافق تھا، حالی کی آگ نے بغیر جلائے نہ چھوڑا۔ چنانچہ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ان کے دیوان کی شرحیں، اُن کے کلام کے مختلف اڈیشن، انکے کلام پر تنقیدیں، ان کی زندگی کے حالات، ان کے مکتوبات رسائل میں ان پر بے انتہا مضامین بے حد تحقیق تدقیق اور کاوش سے لکھے جانے لگے۔ چنانچہ آج جس قدر شرحیں، اڈیشن اور تنقیدی مضامین غالب پر ملیں گے اتنے کسی اور اُردو کے شاعر پر نہ مل سکیں گے۔ چند نام مندرجہ ذیل ہیں:۔

شرحیں:۔ شرح کلامِ غالب (آسی) + شرح دیوانِ غالب (قاضی سعید احمد، بیخود دہلوی) نظامی بدایونی، سہا، طبا طبائی، مولانا حسرت موہانی) + گنجینۂ تحقیق (بیخود موہانی) وغیرہ

اڈیشن:۔ نولکشور اڈیشن ــ نسخۂ حمیدیہ ــ جرمنی اڈیشن ــ طاہر اڈیشن ــ مصوّر نقش چغتائی اڈیشن ــ مصوّر مرقع چغتائی اڈیشن ــ معمولی لائبریری اڈیشن ــ ترجمہ بزبانِ جرمنی وغیرہ

سوانح عمریاں:۔ یادگارِ غالب (حالی) + غالب (غلام رسول مہر) + غالب نامہ (اکرام) + ذکر غالب (مالک رام) نکاتِ غالب (خود نوشت۔ از مکاتیب) وغیرہ

تبصرہ جات:۔ محاسن کلامِ غالب۔ (بجنوری) + غالب (عبداللطیف) + غالب کی شاعری۔ (مرزا محمد عسکری) روحِ کلامِ غالب (مرزا عزیز بیگ) + غالب (عارف ہسوی) + لطائفِ غالب وغیرہ +

رسائل میں تبصرے ان کے علاوہ ہیں غرضکہ جس قدر تنقیدی مواد غالب پر موجود ہے اتنا ابھی تک کسی دوسرے اُردو شاعر پر نہ مل سکے گا۔ تعلیم کے رواج نے پڑھنے والے اور تشریحوں نے غالب کے سمجھنے والے بہت پیدا کر دیئے اور وہی غالب جو کبھی صرف قلعۂ معلےٰ کے اکابر کی تفریح طبع کے لئے مخصوص تھا آج گھر گھر ہر ایک کو خوش کرتا نظر آئے گا۔ اگر پہلے صرف ذوق کی غزلیں ارباب نشاط گاتے تھے اور غالب کو کوئی پوچھتا نہ تھا تو آج مشاق گویے، گراموفون ریکارڈ، فلمی گانے اور ریڈیو پر ہر طرف صرف غالب کی غزلیں بجتی اور گائی جاتی ہوئی ملیں گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ کلام غالب نہ صرف خواص میں بلکہ عوام میں بھی اب کافی مقبول ہو گیا ہے۔ غرضکہ غالب کی قدر و منزلت

ہ دہ دور میں درجۂ کمال پر پہنچی ہوئی ہے۔ اور وہ غرابت جو بیدل کے رنگ کی وجہ سے نامانوس تھی اب حل ہو کر مقبولِ خلائق ہو گئی ہے۔
لامحالہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ باقی رہے گی۔ کیا صدیاں گزر جانے پر بھی غالب اتنا ہی اور اسی قدر مقبول اور منظور رہے گا۔
ضی کا ہم نہ دیکھ چکے ہوتے تو ممکن تھا ہمارا ذوقِ اعتقاد یہ کہنے پر مائل کر دیتا کہ شاید ہی کوئی ایسا زمانہ آسکے جس میں غالب مقبول نہ
یکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہاں ایسا زمانہ بھی گزرا ہے اور پھر آسکتا ہے جب غالب کا سا شاعر بھی غیر مقبول اور غیر معروف ہے۔ لہٰذا یہ
ہے کہ زمانہ بدلتے دیر نہیں لگتی اور تغیرِ زمانہ کے آبِ گِل میں ہے۔ اب بھی بہت سے پرانے حضرات ایسے باقی ہیں جنہیں غالب کے
عار میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی اور وہ ناسخ کے کلام پر سر دُھنتے ہیں۔ لہٰذا کیا یہ حکم لگایا جاسکتا ہے کہ کلامِ غالب ہمیشہ
ہمیشہ اسی شد و مد کے ساتھ قائم رہے گا۔ یا اس کی موجودہ قدر و منزلت قائم رہے گی۔ اور اگر قائم رہے گی تو کس حد تک ؛

اگر زمانہ اُلٹی گردش نہیں کرتا اور لوگ پھر ایک دم جاہل نہیں ہو جاتے یا پھر یہ دیکھنے نہیں لگ جاتے کہ کس طرح کہا ہے
جائے اس کے کہ کیا کہا ہے۔ حالانکہ ادب میں 'کس طرح' کو اتنی ہی اہمیت ہے جتنی 'کیا' کو ہے لیکن کسی ایک نقطۂ نظر کو حقیقت سے
وسوں دُور نہیں ٹالا جاسکتا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ دیکھنے کے لئے کہ اشعارِ غالب اتنے ہی مقبول رہیں گے کہ نہیں ہمیں یہ
یکھنا پڑے گا کہ غالب نے کیا کہا ہے اور کس طرح کہا ہے ؛ آیا جو کچھ کہا ہے وہ باقی رہنے والی چیز ہے یا فنا ہو جانے والی۔ آیا جس
طرح کہا ہے کیا وہ چیز اس سے بہتر طریقہ پر بھی کہی جاسکتی ہے یا کہی جاسکے گی ؛ ان سوالات کا جواب دینا کوئی آسان کام نہیں
پھر بھی اتنا کہا جاسکتا ہے کہ جب تک انسان کے پہلو میں دل ہے اور دل میں محبت۔ تب تک مشکل ہے کہ ذیل کے اشعار اُس
کے دلی جذبات کی ترجمانی کر کے اُسے لُطف و تسکین نہ دے سکیں۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے / کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نیند اُس کا ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اس کی ہیں / جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے / تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنہ پر رونق / وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا / لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے / میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو / کاشکے تم مرے لئے ہوتے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب / وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

بوئے گل نالۂ دل دُودِ چراغِ محفل / جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

سادگی و پرکاری، بیخودی و ہشیاری
حُسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے

حُسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد (والی غزل)

کس مُنہ سے شکر کیجئے اس لطفِ خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

یا جب تک دماغ میں سوچنے کی اور دل میں رازِ حقیقت کے سمجھنے کی کاوش موجود ہے (یا جب تک کوئی باخبر آکر ان سب رازوں کو آشکارا نہیں کردیتا) اس وقت تک غالب کے ذیل کے اشعار ہر مفکّر کے دماغ میں کبھی نہ کبھی جگہ نہ پالیں۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

جلّاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے جس رنگ میں جو آئے

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

چلتا ہوں تھوڑی دیر ہر اک تیز رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ق

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہِ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے؟

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے۔ نہیں ہے

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ہے تجلی تری سامانِ وجود ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یا جب تک انسان کے خمیر میں ظرافت اور شوخی کا مادہ موجود ہے اور ایسی باتوں سے اس کے دل میں گدگدی پیدا کی جا سکتی ہے اس وقت تک غالب کے یہ اشعار اس کو مسکرا دینے پر مجبور نہ کر دیں۔

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے تم نے کیوں سونپی ہے اپنے گھر کی دربانی مجھے

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

. . . .

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

یا جب تک غم کو انسان سے اور انسان کو غم سے تعلق ہے اس وقت تک غالب کے مندرجۂ ذیل اشعار کبھی نہ کبھی زبان سے نکلے بغیر نہیں رہ سکتے۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غمکدہ جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

بیگانگیٔ خلق سے بیدل نہ ہو غالب
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

یا جب تک انسان کو دوسروں کے تجربوں سے فائدہ ہوتا ہے اور وہ ان سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے تب تک وہ غالب کے سرمایۂ عمر کو کبھی بھول جائیں۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

رنج سے خوگر ہُوا انساں تو مِٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

اَور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے تو مرا جامِ سفال اچھا ہے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیئے

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

یا جب تک انسان میں کبھی کبھی لا اُبالی پن، رندی اور آزادہ روی کے خیالات موجزن ہوکر اُسے دُنیا و مافیہا سے بلند کرسکتے ہیں اُس وقت تک یہ رنگینیاں فراموش ہوسکیں:۔

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اِک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو
اِک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

پلادے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

یا جب تک تشبیہ و استعارات میں اثر لازمی ہے اور بات شیشہ و ساغر کہے بغیر نہیں بنتی یا جب تک طرزِ ادا کی ندرت دلوں کو لبھا سکتی ہے اس وقت تک ذیل کے اشعار فراموش ہوسکیں:۔

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

بجلی اک کوندگئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نااُمیدی اس کی دیکھا چاہیئے

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو | یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں
ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے | دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے | مرے بُت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو
طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ | دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو
دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا | میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا | جامِ جم سے تو مرا جامِ سفال اچھا ہے
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد | یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
دریائے معاصی تنک آبی سے ہُوا خشک | میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہُوا تھا

یا جب تک تقلیل الفاظ بلا اختلال معنی، رواں افتاں وخیزاں بحروں، آواز کی ترتیل سے موسیقیت پیدا کرسکتی ہیں اس وقت تک ارباب نشاط ذیل کی غزلوں سے محفل بچانا چھوڑ دیں:۔

دردمنّت کشِ دوا نہ ہُوا | مَیں نہ اچھا ہُوا بُرا نہ ہُوا
آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک | کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
سب کہاں کچھ لالہ و گُل میں نمایاں ہوگئیں | خاک میں کیا صُورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں
دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں | روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو | نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر مُنہ میں زباں کیوں ہو
رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو | ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
کوئی اُمید بر نہیں آتی | کوئی صُورت نظر نہیں آتی
نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سُنائے نہ بنے | کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے
ابنِ مریم ہُوا کرے کوئی | میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

یہ امر کہ مندرجہ بالا اشعار باقی رہیں گے یا ان میں سے چند باقی رہیں گے اس بات سے ثابت ہے کہ ابھی سے وہ لوگوں کی زبانوں پر چڑھ گئے ہیں اور جو اشعار ضرب المثل کی طرح رواج پا گئے اُن کو گویا بقائے دوام حاصل ہوگئی نہ صرف ان کے اشعار بلکہ اکثر ان کی تراکیب بھی جو انھوں نے خود اپنی قوتِ اختراع سے ایجاد کی تھیں مثلاً فردوسِ گوش، جنّتِ نگاہ وغیرہ۔ رہی یہ بات کہ انہیں باتوں کو کوئی ان سے بہتر کہہ سکتا ہے یا نہیں یا غالب اس طرز کے خاتم ہو گئے اس کا کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا۔ اِسلئے

غالب کی بقائے دوام کے لئے صرف دو رکاوٹیں رہ گئیں۔ ایک تو موجودہ رجحان اور پروپگینڈا جو غزل کے خلاف ہو رہا ہے دوسرا زبان کا مسئلہ۔ اوّل الذکر تو خیر ایسا نہیں کہ کامیاب ہو سکے۔ اس لئے کہ غزل میں جو اس کی خاص سہولتیں اور خصوصیتیں ہیں ان کی بنا پر اس کی ہر دلعزیزی کبھی کم نہ ہو گی۔ رہا زبان کا سوال تو یہ واقعی اہم مسئلہ ہے اور اس کے متعلق کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ ممکن ہے کہ آئندہ ہندوستان کی زبان ایسی نہ رہے جس میں فارسی اضافتیں یا عطف یا الفاظ اس قدر شدت و کثرت سے ہوں جیسی کہ دیوان غالب میں ہیں۔ اس لئے ہم بالکل یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتے کہ غالب ہمیشہ ہمیشہ اسی شد و مد اور زور شور کے ساتھ مقبول رہیں گے۔ ہاں اتنا البتہ کہا جا سکتا ہے کہ جب تک اُردو زبان اور اس کے سمجھنے والے قائم ہیں (اور جب تک غزل گوئی میں کوئی ان سے بڑھ کر شاعر پیدا نہیں ہوتا) غالب شاعرِ غالب رہیں گے۔ ورنہ ایسے ان کی تاریخی حیثیت تو خیر بالکل مسلّم ہے۔ غالب کی شاعری کا اُردو نظم میں درجہ اور ان کا اثر دوسروں پر یہ چند ایسی حقیقتیں ہیں کہ غالب کو تاریخ ادب میں اعلےٰ جگہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ مناسب فارسی الفاظ کو فارسی تراکیب میں جوڑنا، الفاظ کے مراتب پہچاننا، استعاروں اور تشبیہوں میں حُسن اور معنی پیدا کرنا، اختصار و بلاغت سے زورِ کلام بہم پہنچانا، سادگی میں پُرکاری سمونا، فطرتِ انسانی کے رازوں کو بے تکان اور بڑی لاپروائی سے آشکارا کرنا غرضکہ یہ سب باتیں آنے والے شاعروں پر ضرور اپنا اثر کرتی رہیں گی چنانچہ زمانۂ موجودہ میں بھی اقبال، فانی، عزیز اور ثاقب کے کلام میں کچھ فرق کے ساتھ اسی رنگ کی جھلک پائی جاتی ہے اور آئندہ بھی نہ جانے کتنے یہ اسی طرح کے معنوی شاگرد پیدا کرلے۔ مذاقِ سخن کا لفظی صنائع اور ظاہری خوبیوں کی طرف سے معنوی خوبیوں اور خیال بندیوں کی طرف دھارا پھیر دینا اِس اجتہاد میں غالب کی حیثیت الگ مسلّم۔ ایک اور امر جس کی وجہ سے ممکن ہے اُن کی شہرت آئندہ ہو وہ رموزِ فطرتِ انسانی ہیں جو ابھی حل نہیں ہوئے ہیں اور جو ممکن ہے علمِ نفسیات کی ترقی کے ساتھ آئندہ واضح ہوں۔ مثلاً

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیمِ بلا ست قعرِ دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے یہ دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

نورالحسن ہاشمی

غزل

تم بھی میری لاش پر ہو نوحہ خواں — شمع پروانے کو روئے! الاماں

روز و شب پچھتا رہی یارب فرشِ گل — منتظر کس کی ہے چشمِ خوں فشاں

کہکشاں سے دُور، کون اُڑتا پھرے — کھینچ لاؤں گا مکاں میں لامکاں

اس طرف آ، اے اسیرِ مرگ و زیست — یہ مری مُٹھی میں ہیں دونوں جہاں

یہ ترے پندار کی توہین ہے — کون کہتا ہے تجھے آرامِ جاں

دو جہاں ٹکرا کے غائب ہو گئے — اُف مری رندی، مری مے نوشیاں

یہ محبت، یہ عذابِ زندگی، — مَیں اُٹھا لیتا ہوں ہر بارِ گراں

قعرِ دریا سے اُٹھی اور مٹ گئی — زندگی ہے موجۂ آبِ رواں

فصلِ گل آئی، نشیمن جل گئے — ہائے دیوانوں کی دُور اندیشیاں

تُو ہے شمعِ محفلِ خواب و خیال — تُو چراغِ مجلسِ رُوحانیاں

تیری چشمِ ناز کی مرہُون ہیں — میرے رخشِ فکر کی جولانیاں

تیری ٹھوکر سے ہے مدارِ زندگی — تیرے ٹھکرائے ہوئے جائیں کہاں

میرے درد انگیز نغموں سے ندیمؔ
گونجتا ہے کشورِ ہندوستاں

احمد ندیم قاسمی

گورکن کا ہیرو

سہ پہر کا وقت تھا آفتاب اپنی چمکیلی خوبصورت شعاعیں گرجا کے صحن پر ڈال رہا تھا۔ بڑے بڑے درختوں کے سائے جن میں ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے لمحہ بہ لمحہ گھنے ہو رہے تھے، اور موسم گرما کے بیشمار کیڑے مکوڑے اپنی ختم نہ ہونے والی بھنبھناہٹ سے لوری دے رہے تھے۔

نگاہ کے سامنے جو دلکش منظر تھا اُس کی تصویر کھینچنا میرے لئے ناممکن ہے۔ سامنے فاختئی رنگ کے پتھر کی ایک دیوار تھی جس میں جابجا کائی جمی ہوئی تھی اور جس پر ہلکے سبز اور گہرے سُرخ رنگ کے ننھے ننھے پودے اُگے ہوئے تھے۔ دیوار کے اوپر انگور کی نازک بیل اور پھول سے لدے ہوئے گلاب کے درخت کی شاخیں مستانہ وار حرکت کر رہی تھیں۔ دُور کچھ فاصلے پر ایک سبزہ زار تھا اور بھورے رنگ کا ایک پہاڑ، پھر ذرا اور فاصلے پر نیلے رنگ کی ایک ندی چمک رہی تھی۔

کچھ دیر ہم لوگ منظر کی دلکشی اور آواز کے ترنم میں کھوئے ہوئے خاموش رہے۔ پھر جرمی نے گفتگو کا سلسلہ وہاں سے شروع کیا جہاں ہم لوگ تھک کر سایہ دار بیٹھنے کی جگہ دیکھتے ہی پندرہ منٹ ہوئے چپ ہو گئے تھے۔

غور و فکر کے لئے فرصت کے دن کتنے قیمتی ہوتے ہیں، کیونکہ خیالات اور جذبات زندگی کی روزانہ مصروفیتوں اور اس کے ہنگاموں سے متاثر نہیں ہوتے اور زبان سے جو بات نکلتی ہے پختہ ہو کر نکلتی ہے۔

میں نے دریافت کیا۔ "تو تمہارے نزدیک ہیرو کی کیا تعریف ہو گی؟"

جواب ملنے میں طویل وقفہ ہوا، اور میں اس درمیان میں دُور پہاڑی پر بادل کے متحرک سائے کو دیکھنے میں اپنا سوال تقریباً بھول گیا۔ اتنے میں جرمی نے جواب دیا:-

"میرے خیال میں ہیرو وہ شخص ہے جو اپنے اُس فرض کی انجام دہی کے لئے جسے اس نے اپنی اہلیت کے مطابق اپنے اوپر عائد کیا ہے خواہ اسے کتنی ہی بڑی قربانی کرنی پڑے اپنی انتہائی کوشش صرف کر دے۔ اس تعریف کی رو سے ہم ہر قسم کے کیرکٹر کو اس میں شامل کر سکتے ہیں حتٰے کہ عہدِ قدیم کے ان بہادروں کو بھی جن کی بہادری کا تعلق صرف جسمانی طاقت سے تھا۔"

مَیں نے پوچھا "تو تم فوج کے سپاہیوں کو بھی ہیرو کی تعریف میں شامل کرو گے؟"

"ہاں ضرور، یہ اور بات ہے کہ میں ان کی حالت پر افسوس کروں گا کہ ضرورتِ حالات نے انہیں اپنے لئے اس سے بہتر

رض انتخاب کرنے کا موقع نہ دیا۔ تاہم اگر ان لوگوں نے ایک ایسے مقصد کے لئے جسے وہ حق تصور کرتے تھے اپنی جانیں قربان
ہیں تو میں کسی طرح بھی ہیرو کے لقب سے انہیں محروم نہ کروں گا۔"
"بہادری کی یہ قسم جس کا اظہار صرف اس طرح ہوتا ہے کہ دوسروں کو نقصان پہنچایا جائے حد درجہ معیوب اور مذہب کے
آئین کے خلاف ہے۔"
ایک تیسری آواز نے ہم لوگوں کو گھبرا دیا۔
"اگر بے ادبی معاف کیجئے حضور" ـــــ اور پھر بولنے والا خاموش ہو گیا۔
یہ گورکن تھا جسے ہم لوگوں نے قبرستان میں داخل ہوتے ہی دیکھا تھا مگر جسے کائی سے ڈھکے ہوئے پتھر کی چٹانوں کی
طرح ایک بے جان چیز سمجھ کر ہم لوگ بھول گئے تھے۔
"اگر بے ادبی معاف کیجئے"۔ اس نے پھر کہا اور بولنے کی اجازت حاصل کرنے کے لئے ٹھہر گیا۔ جرمی اس کے
کھلے ہوئے سفید سر کا احترام کرتے ہوئے جھک گیا۔ اسے ذرا ہمت ہوئی تو اس نے میری آخری گفتگو کی طرف اشارہ کرتے
ہوئے کہنا شروع کیا:۔
"ان صاحب نے ابھی جو کچھ فرمایا اس نے میرے دل میں ایک ایسے شخص کی یاد تازہ کر دی جو کئی سال ہوئے اس دنیا سے
رخصت ہو چکا ہے۔ حضور! ممکن ہے میں نے آپ لوگوں کی گفتگو کا مطلب نہ سمجھا ہو۔ لیکن جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں آپ
دونوں صاحبوں کو گلبرٹ ڈاسن کے ہیرو ہونے میں اتفاق ہوگا۔" اس نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اسے ایسا
سمجھنے کی وجہ بھی ہے۔"
جرمی نے کھڑے ہو کر اس سے کہا۔ "مہربانی کرکے بیٹھ جائیے اور اس کے حالات ہم لوگوں کو سنائیے"۔ اور جب تک گورکن
بیٹھ نہ گیا وہ کھڑا رہا۔ میں خود بھی سننے کے لئے بیتاب تھا۔
گورکن ہم لوگوں کے سامنے گھاس سے ڈھکے ہوئے ایک ٹیلے پر بیٹھ گیا اور اس نے کہنا شروع کیا۔
"آئندہ نومبر کی گیارھویں کو پورے ۴۵ سال ہوں گے جب میں نے کام سیکھنا ختم کیا اور لنڈل میں مستقل طور پر رہنے لگا۔ آپ
لوگ یہاں کھڑے ہو کر ندی کے اس پار لنڈل کو دیکھ سکتے ہیں، گرجے سے ذرا داہنی طرف۔ کم از کم میں تو اپنی بینائی میں فرق آنے سے
پہلے اسے اکثر یہاں سے دیکھا کرتا تھا" اور نہ معلوم میں نے کتنے گھنٹے اس پر نظر جمائے ہوئے ان گزرے ہوئے دنوں کی یاد میں جب
میں وہاں رہتا تھا صرف کئے ہیں۔ یہاں تک کہ میری آنکھیں اشک آلود ہو جاتیں اور پھر میں کچھ نہ دیکھ سکتا تھا میں اس کی
طرف پھر کبھی نہیں دیکھوں گا، نہ قریب سے اور نہ دور سے۔ لیکن آپ لوگ دیکھ سکتے ہیں۔ یہ ایک بہت خوبصورت گاؤں ہے۔

اپنی جوانی کے دنوں میں جب میں وہاں رہتا تھا، یہ آوارہ بدمعاش نوجوانوں سے بھرا ہُوا تھا جن کے لئے لڑنے جھگڑنے، دوسروں کے گھر میں گھس جانے اور اسی طرح کی دوسری شرارتوں کے سوا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ ان لوگوں کی صحبت میں اپنے آپ کو پا کر پہلے پہل میری طبیعت بہت گھبرائی۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد میں ان کے کاموں میں شریک ہو گیا اور انہی لوگوں کی طرح پکا بدمعاش بن گیا۔ دو سال کے بعد جب میں اپنی نوجوان پارٹی کا لیڈر شمار کیا جانے لگا تھا تو گلبرٹ جن کا میں تذکرہ کرنا چاہتا ہوں لنڈل میں رہنے کے لئے آیا۔ وہ مجھی سا تندرست اور قد آور جوان تھا۔ ہم لوگوں کا پیشہ بھی ایک تھا، اس لئے گلبرٹ سے میری گہری دوستی ہو گئی۔ مَیں گلبرٹ سے برابری کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے کچھ تعلیم بھی حاصل کی تھی گو لنڈل میں آ کر ساری اچھی باتیں میں نے بُھلا دی تھیں۔ کچھ دنوں تک میں اپنے بُرے اخلاق و عادات پر پردہ ڈالے رہا۔ مجھے اس خیال سے کہ یہ باتیں گلبرٹ پر ظاہر ہو جائیں گی، بڑی شرمندگی ہوتی۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ اُسے اس لڑکی سے محبت ہو گئی جس پر مَیں دل و جان سے فدا تھا اور جو مجھ سے ہمیشہ دُور رہتی تھی۔ اُف، اُن دنوں وہ بڑی حسین تھی۔ اب اس کی طرح خوبصورت لڑکی وہاں کوئی نہیں ہے مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے میں دیکھ رہا ہوں وہ سڑک کے کنارے اٹھلاتی ہوئی چل رہی ہے اور اس کے گھنگریالے بال ہوا میں حرکت کر رہے ہیں۔ جب مجھے معلوم ہُوا کہ لٹی خود بھی اس سے محبت کرتی ہے تو میرا خون کھولنے لگا۔ مَیں گلبرٹ کی ہر بات سے نفرت کرنے لگا۔ پہلے میں اس کے بغل میں کھڑے ہو کر اسے کودتے ہوئے، یا کشتی لڑتے ہوئے یا کرکٹ کھیلتے ہوئے دیکھتا تو اس کی بہت تعریف کرتا۔ مگر اب جب کبھی اسے کوئی ایسی بات کرتے دیکھتا جسے لٹی دیکھ کر خوش ہوتی تو میں دانت پیسنے لگتا۔ وہ اور لوگوں کی طرح گلبرٹ کو بھی بظاہر حقیر سمجھتی لیکن اس کی نگاہ یہ کہتی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ الٰہی توبہ۔ میں کیا کہوں مجھے اُس شخص سے کتنی نفرت تھی۔"

وہ اس طرح بول رہا تھا جیسے یہ سب کل کی باتیں ہوں۔ ایامِ جوانی کے جذبات اور حرکات اس کے دماغ میں بالکل محفوظ تھے۔ اس کی آواز پست ہو گئی اور اُس نے کہا:۔

"ہاں تو میں اس سے لڑنے کے لئے کوئی بہانہ تلاش کرنے لگا۔ میں ان دنوں بہت اچھا پہلوان تھا۔ میں نے سوچا اگر میں اسے شکست دے دوں گا تو لٹی اس سے محبت کرنا ترک کر دے گی۔ چنانچہ ایک دن شام کے وقت اکھاڑے میں نہیں معلوم کس طرح اور کیوں اس سے جھگڑا پڑا! اور اسے کشتی کا چیلنج دے دیا۔ میں نے دیکھا غصہ سے اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک رنگ جا رہا تھا۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ وہ بہت تندرست اور طاقتور جوان تھا مگر دفعتہً اس نے اپنے آپ پر قابو پایا اور کہا کہ میں نہیں لڑوں گا۔ اس پر لنڈل کے لونڈوں نے قیامت کا شور برپا کر دیا۔ یہ آواز اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ اس طرح ذلیل ہوتے ہوئے دیکھ کر مجھے اس پر رحم آ گیا۔ میں نے خیال کیا کہ شاید اس نے میرا مطلب نہیں سمجھا اس لئے مَیں اسے ایک بار اور موقع دوں گا۔ جہاں تک ممکن تھا، میں نے صاف صاف الفاظ میں اسے پھر کشتی کا چیلنج دیا۔ اس پر اس نے کہا کہ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ رہا یہ کہ میں نے

نہیں کوئی تکلیف دی ہے تو مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ اگر واقعی مجھ سے تم کو کچھ رنج پہنچا ہے تو میں تم سے معافی مانگتا ہوں لیکن بس لڑنے کے لئے کسی طرح بھی تیار نہیں ہوں۔

اس کی اس بزدلی پر مجھے اس سے بہت نفرت ہوگئی۔ مجھے افسوس ہُوا کہ میں نے خواہ مخواہ اسے دوبارہ موقع دیا۔ میں خود بھی ان لوگوں کے ساتھ ہوگیا جو اس پر آوازے کس رہے تھے بلکہ میں ان سے دُگنی بلند آواز میں چیخنے لگا۔ وہ مُنہ بند کئے ہوئے چُپ چاپ سب کچھ سنتا رہا۔ اس کا رنگ بالکل سفید ہوگیا تھا۔ جب ہم لوگ سانس لینے کے لئے رُکے تو اس نے بلند لیکن بھرّائی ہوئی غیر مانوس آواز میں کہا۔

"میں نہیں لڑ سکتا ہوں اس لئے کہ لڑائی جھگڑے کو میں گناہ سمجھتا ہوں"۔

پھر وہ جانے کے لئے مُڑا۔ میں نفرت اور حقارت کے جذبات سے بھرا ہُوا آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ میں نے اسے پکار کر کہا:۔

"کم از کم سچ بولنے کی کوشش کرو میاں! اگر تم میں لڑنے کی ہمت نہیں ہے تو جھوٹ کیوں بولتے ہو؟ اور جا کیوں رہے ہو؟"

لوگ ہنسنے لگے مگر میں نہ ہنس سکا۔ ایسے طاقتور جوان کے لئے لڑنے سے ڈر جانا اور بُزدل کہلانا میرے لئے بڑی تعجب خیز بات تھی۔

آفتاب غروب ہونے سے پہلے پورے لنڈل میں یہ خبر پھیل گئی۔ ہر جگہ یہ چرچا ہو رہا تھا کہ میں نے گلبرٹ کو لڑنے کا چیلنج دیا اور اس نے لڑنے سے انکار کر دیا۔ جب وہ اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا لوگ اپنے اپنے دروازے پر کھڑے ہوئے اس کی طرف تعجب سے دیکھ رہے تھے جیسے وہ بندر سے ملتا جُلتا کوئی جانور تھا یا کوئی دور دراز ملک کا باشندہ! لڑنے سے انکار کر دینا لنڈل میں ایک نئی بات تھی۔ دوسرے دن مردا سے سُنا سُنا کر "نامرد" کہہ رہے تھے۔ عورتیں اسے قریب سے گزرتے ہوئے دیکھتیں تو کھلکھلا کر ہنس دیتیں۔ شوخ و شریر لڑکیاں اور لڑکے اسے مخاطب کر کے کہتے "صوفی کب سے ہو گئے ہو؟" "ملاجی سلام"۔

اسی دن شام کے وقت میں نے لٹی کو گلبرٹ کے ساتھ ندی کے کنارے سے واپس آتے ہوئے دیکھا۔ گلی کے موڑ پر پہنچ کر میں نے اس کی طرف دیکھا۔ قریب تھا کہ وہ رو دے۔ وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے کچھ مانگ رہی ہو۔ واقعہ بھی یہی تھا جیسا کہ بعد میں اس نے مجھ سے کہا، حقیقت میں اسے گلبرٹ سے بڑی محبت تھی۔ اسے کسی طرح یہ گوارا نہ تھا کہ لوگ گلبرٹ کو نامرد اور بزدل کہہ کر رُسوا کریں۔ وہ بڑی شرمیلی تھی لیکن اس کے باوجود اس نے اس رات اپنی زبان سے کہہ دیا کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ اس نے گلبرٹ کی بڑی خوشامد کی کہ وہ کسی طرح میرا چیلنج قبول کر لے۔ جب وہ اپنے ارادے پر سختی سے قائم رہا تو اسے بڑی ندامت ہوئی۔ اس نے گلبرٹ کی پست ہمتی پر اس قدر تکلیف دہ الفاظ استعمال کئے کہ پوری بستی نے مل کر بھی نہ کئے ہوں گے۔ پھر یہ کہہ کر خاموش ہوگئی کہ آئندہ میں عمر بھر کبھی تم سے بات نہ کروں گی۔ ہاں ایک بار اور اس نے اس سے گفتگو کی مگر یہ مرنے سے پہلے آخری انسانی آواز تھی جو گلبرٹ کے کانوں میں اس وقت پہنچی جب وہ موت کے خلاف جنگ کر رہا تھا۔

اس حادثہ سے پہلے اور بہت سی قابلِ ذکر باتیں پیش آئیں جس روز میں نے لِلّی اور گلبرٹ کو آخری مرتبہ ساتھ ٹہلتے ہوئے دیکھا تھا اسی روز سے وہ میری طرف مائل ہوگئی۔ میں جانتا تھا کہ لِلّی میں یہ اچانک تبدیلی زیادہ تر گلبرٹ سے انتقام لینے کے لئے ہوئی تھی کیونکہ میں نے دیکھا جب وہ ہم لوگوں کے قریب ہوتا یا اتنے فاصلہ پر ہوتا کہ ہم لوگوں کی گفتگو سن سکے تو وہ مجھ پر اور زیادہ مہربان ہوجاتی۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ مجھ سے واقعی محبت کرنے لگی اور آخر ہم لوگوں کی شادی طے پاگئی۔ گلبرٹ بستی کے سب لوگوں سے علیحدہ رہنے لگا۔ وُہ بہت غمگین اور افسردہ نظر آتا۔ حتےٰ کہ اس کی رفتار میں بھی فرق آگیا تھا۔ وہ تیز تیز چلنے کا عادی تھا لیکن اب اس کے قدم بوجھل ہوگئے تھے۔ وہ بہت آہستہ آہستہ چلتا۔ میں ہمیشہ اُسے تیکھی نگاہوں سے دیکھنے کی کوشش کرتا لیکن وہ بیچارہ ہمیشہ اس کا جواب خاموشی سے دیتا کیونکہ اب اُس کی دُنیا بدل چکی تھی۔ لنڈل کے نوجوانوں نے اس کے ساتھ کھیلنا موقوف کردیا۔ وہ جب کبھی اکھاڑے یا کرکٹ کے میدان میں جاتا لوگ اسے حقارت سے دیکھتے اس لئے اس نے یہاں آنا یک قلم ترک کردیا۔

جب لِلّی سے میری شادی ہوگئی تو میں نے گلبرٹ سے نفرت کرنا ترک کردیا ــــ بلکہ اب مجھے اس پر رحم آنے لگا۔ مگر اس قدر ذلیل اور رسوا ہونے کے باوجود اس نے کبھی اپنا سر نیچا نہیں کیا۔ اُسے اپنے کئے پر ذرا بھی ندامت نہ تھی البتہ وہ روز بروز سوکھتا جارہا تھا۔ دوستوں اور عزیزوں سے الگ رہنا کس قدر سوہانِ روح ہوتا ہے۔ غریب گلبرٹ نے اسے بُری طرح محسوس کیا۔ اس نے اپنا دل بہلانے کے لئے ایک دوسری صورت اختیار کی۔ اب چھوٹے چھوٹے بچے شہد کی مکھیوں کی طرح اس سے لپٹے رہتے۔ وہ بیچارے کیا جانیں کہ "بزدل" کس کو کہتے ہیں۔ ان کو صرف یہ معلوم تھا کہ گلبرٹ ہمیشہ ان لوگوں کو پیار کرنے اور ان لوگوں کو مدد دینے کے لئے تیار رہتا ہے اور وہ لوگ کتنی ہی شرارت کریں وہ نہ خفا ہوتا ہے اور نہ اُن کی شکایت کرتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد لِلّی کے ایک بچہ پیدا ہوا یہ ہم لوگوں کے لئے ایک رحمت تھا۔ ہم دونوں اس سے بڑی محبت کرتے تھے۔ لِلّی جو پہلے اکثر کھوئی ہوئی سی رہتی تھی اب بچے کی پرورش اور دیکھ بھال میں مصروف نظر آنے لگی۔

میرے سب رشتہ دار ندی کے اس پار کلات میں رہا کرتے تھے۔ جین جس کی قبر اس سفید گلاب کے درخت کے قریب دکھائی دے رہی ہے اس کی شادی ہونے والی تھی۔ اس کا اصرار تھا کہ میں اور لِلّی اس تقریب میں ضرور شرکت کریں۔ نہ معلوم لِلّی میں کیا خوبی تھی کہ میری سب بہنیں اسے چاہتی تھیں۔ لِلّی اپنے بچے کو چھوڑ کر جانا پسند نہیں کرتی تھی اور میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسے لے کر جائے۔ آخر یہ طے پایا، کہ ایک دن کے لئے بچے کو لِلّی کی ماں کے پاس چھوڑ دیا جائے۔ اس نے اب تک کبھی اپنے بچے کو تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ اس لئے اُسے دلی صدمہ ہوا۔ میں نے ایک تانگہ عاریتاً لیا، اپنی بوڑھی گھوڑی کو اس میں جوتا اور تین بجے کے قریب ہم دونوں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ روانہ ہوگئے۔ راستے میں جو ندی پڑتی تھی اس کا پانی رات اور دن میں بارہ بجے بہت بڑھ جاتا تھا اور دوسرے وقتوں میں بہت کم ہوجاتا تھا۔ ارادہ تھا کہ بارہ بجے باڑھ آنے سے پہلے ہی ہم لوگ واپس آجائیں گے۔ کیونکہ لِلّی زیادہ دیر تک ننھے سے جُدا رہنا گوارا نہیں کرسکتی تھی۔ یہ بڑی دلکش شام تھی۔ میں نے یہاں آخری بار لِلّی کو دل سے ہنستے ہوئے دیکھا اور اسی بنا پر خود بھی آخری مرتبہ دل سے ہنس سکا۔ ندی پار ہونے کے لئے

ہی وقت ۹ بجے کا تھا مگر ہم لوگوں کو بہن کے ہاں سے رخصت ہونے میں بڑی دیر ہوگئی۔ اتفاق سے گھڑی غلط تھی۔ ابا نے ایک کتا لٹی کے
تھ کردیا۔ اس نے الگ بھونک بھونک کر شور مچانا شروع کیا۔ غرض راستے ہی میں آفتاب غروب ہوگیا میں نے غریب گھوڑی کو چابک سے مارنا شروع
لیکن وہ بہت تھک گئی تھی۔ کلات اور ندی کے درمیان جو بیشمار ٹیلے تھے ان پر یہ نہ چڑھ سکتی تھی اور نہ اتر سکتی تھی۔ ریت میں پہنچنے کے
تو اس کی حالت اور خراب ہوگئی۔ اللہ اللہ میں کس بیدردی سے اس غریب جانور کو تیز چلنے کے لئے مار رہا تھا۔ ندی کے اس پار ہونے
و بڑے بڑے نالے ملتے تھے۔ پہلے نالے سے گزر کر دو میل بھی ہم لوگ چلنے نہ پائے تھے کہ ہر چہار طرف تاریکی پھیل گئی۔ صرف پہاڑ کے اوپر اب تک
خ روشنی کی ایک لکیر نظر آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم نے دیکھا ایک خوفناک سیلاب بڑی تیزی کے ساتھ ہم لوگوں کی طرف آ رہا ہے۔
ایک میل سے بھی کم فاصلے پر تھا۔ ہوا بہت تیز چل رہی تھی۔ اور ایسی حالت میں آن کی آن میں اس کا پہنچ جانا یقینی
ا۔ میری زبان سے بے اختیار نکل گیا" خداوندا ہم لوگوں کی مدد کر"۔ بعد میں مجھے افسوس ہوا کہ میں نے یہ کہہ کر لٹی کو اور خوفزدہ کردیا۔ وہ میرا کوٹ تھامے
ئے اور مجھ سے چمٹے ہوئے کانپ رہی تھی۔ اب گھوڑی پسینہ سے شرابور ہوگئی تھی۔ وہ ڈر کے مارے تھر تھر کر کانپ رہی تھی اور لمبی لمبی سانسیں لے
ہی تھی۔ دوسرے نالہ پر پہنچ کر وہ بالکل بے حس و حرکت کھڑی ہوگئی۔ میں نے ہزار کوشش کی کہ وہ آگے چلے لیکن اس نے ذرا بھی حرکت نہیں
۔ اب تک لٹی میرے کوٹ کا دامن مضبوطی سے تھامے ہوئے بالکل چپ چاپ تھی۔ اب وہ ضبط نہ کرسکی اور اس نے کہا۔

"خیال ہے ناپ ـــــ میرا خیال ہے کہ میں ننھے کو اب نہیں دیکھ سکوں گی"۔

پھر اس نے اتنے زور سے اور ایسی دردناک چیخ ماری کہ میں بدحواس ہوگیا۔ میں نے ایک چاقو نکال کر گھوڑی کو مارنا چاہا کہ یا تو یہ یہیں ڈھیر
ہو جائے یا تیز چل کر کنارے تک پہنچا دے کیونکہ اب پانی تانگے کے چکے تک پہنچ چکا تھا۔ سیلاب برابر بڑھتا چلا آ رہا تھا اور سفید جھاگ سے بھری
ہوئی موجیں تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ حضور یہ مختصر لمحے میری ساری زندگی سے بھی زیادہ طویل معلوم ہو رہے تھے۔

میں نے اپنا چاقو نکالا ہی تھا کہ پانی کی گڑگڑاہٹ اور گرج میں ملی ہوئی ایک آواز ہم لوگوں کے کان میں آئی۔ ہم لوگ پہچان نہیں سکے
لیکن ہم لوگوں نے دیکھا کوئی سیاہ چیز سیاہ رنگ کی موجوں، بادل اور آسمان کے درمیان حرکت کر رہی تھی۔ یہ لحظہ بہ لحظہ ہم لوگوں سے قریب ہوتی
جا رہی تھی اور آہستہ مگر بڑی مستعدی کے ساتھ نالے کو پار کرکے ہم لوگوں کی طرف چلی آ رہی تھی ـــــ "میرے اللہ! یہ اپنے مضبوط بادامی رنگ
کے گھوڑے پر سوار گلبرٹ ڈاسن تھا"۔

گلبرٹ سے کوئی گفتگو نہیں ہوئی اور اس کا وقت بھی نہ تھا۔ اس وقت مجھے نہ ماضی کی خبر تھی اور نہ مستقبل کی فکر۔ مجھے صرف ایک خیال
تھا حال کا ـــــ یعنی کسی طرح لٹی کو ڈوبنے سے بچایا جائے اور اگر ممکن ہو تو اپنے آپ کو بھی۔ مجھے بعد میں یاد آیا کہ گلبرٹ نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ
کتے کے بھونکنے کی آواز نے میری رہنمائی کی ورنہ مجھے بڑی دقت ہوتی۔ اس کے مرنے کے بعد میں نے سنا کہ جب اسے ندی میں وقت سے پہلے سیلاب
آنے کی خبر ملی تو اسے ہم لوگوں کی واپسی کے متعلق بڑی فکر ہوئی۔ اس نے عورتوں کے لئے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھنے کی ایک گدی اپنے کسی دوست
سے عاریتاً لی، اور اسے اپنے گھوڑے پر کس کر وہ شام ہی سے ندی کے کنارے ہم لوگوں کا انتظار کرنے لگا۔ اگر کوئی حادثہ پیش نہ آتا تو یہ سب باتیں مجھے

معلوم نہ ہوتیں۔ اس کا پرانا دوست جونز جب یہ بیان کر رہا تھا تو اس کے زرد رخسار پر آنسوؤں کے قطرے بہ رہے تھے۔

ہم دونوں نے مل کر لٹی کو گدی پر بٹھایا۔ پانی ہر لحظہ بڑھتا جا رہا تھا، اور تانگہ قریب قریب ڈوب چکا تھا۔ لٹی گھوڑے کی زین میں جو دستہ لگا ہوا تھا اس سے چمٹ گئی۔ وہ سر جھکائے ہوئے بالکل خاموش تھی۔ اسے اب تک اپنی زیست کی کوئی امید نہ تھی۔

گلبرٹ بغیر کچھ سوچے ہوئے تانگہ پر بیٹھ گیا۔ حالانکہ اسے یہ سوچنے کا کافی موقع تھا کہ اگر وہ لٹی کو اپنے گھوڑے پر بٹھا کر خود چلا جائے تو وہ ضرور زندہ رہے گا اور میں مر جاؤں گا۔ اس نے بغیر کسی پس و پیش کے بلند آواز سے کہا "جلدی کرو، لٹی کے آگے بیٹھ جاؤ اور اسے سنبھالے رہو۔ گھوڑا اطمینان سے تیر سکتا ہے۔ خدا نے مدد کی تو میں تمہارے پیچھے آتا ہوں۔ میں اس تسمہ کو کاٹنے کی کوشش کروں گا جس کے ذریعہ گھوڑی تانگے سے بندھی ہوئی ہے۔ ممکن ہے یہ تانگے کے بوجھ سے ہلکی ہو کر مجھے بحفاظت تمام کنارے تک پہنچا دے۔ بہر حال تمہاری زندگی زیادہ قیمتی ہے کیونکہ تم ایک عورت کے شوہر ہو اور ایک بچے کے باپ۔ میرا دنیا میں کون ہے؟"

میری اس خود غرضی پر لعنت نہ کیجئے حضور! میں نے بارہا آرزو کی کہ یہ رات ایک خواب ہوتی۔ گو اس واقعہ نے ایک خوفناک خواب کی طرح نہ معلوم کتنی راتیں مجھ پر نیند حرام کر دی ہے لیکن درحقیقت یہ خواب نہیں ہے۔ میں گلبرٹ کی جگہ گھوڑے پر بیٹھ گیا اور میں نے لٹی کے دونوں ہاتھوں کو اپنے بدن پر رکھ لیا۔ وہ میرے کندھے سے چمٹ گئی۔ خدا کی قسم میں نے گلبرٹ کو مخاطب کر کے شکریہ کے چند الفاظ ادا کئے لیکن مجھے یاد نہیں میں نے کیا کہا۔ ہاں یہ یاد ہے کہ لٹی نے اپنا سر اٹھایا اور بلند آواز میں بولی:۔

"گلبرٹ ڈاسن! آج کی رات میرے لال کو یتیم ہونے سے بچا لینے پر خدا تمہیں اجر دے۔"

اتنا کہہ کر وہ نیم بیہوشی کی حالت میں پھر مجھ پر گر گئی۔

میں اسے سنبھالے ہوئے کنارے تک لے آیا یا یوں کہئے کہ مضبوط گھوڑا ہم دونوں کو لے کر خوفناک موجوں کے درمیان تیرتا ہوا ندی کے پار ہوا۔ ہم لوگ جب کنارے پہنچے تو بالکل بھیگ گئے تھے لیکن بس صرف ایک خیال تھا ـــ گلبرٹ کہاں ہے؟ بڑی بڑی موجیں اور گہرے بادل حدِ نظر تک پھیلے ہوئے تھے۔ آخر گلبرٹ کہاں رہا؟ ہم لوگوں نے چلانا شروع کیا کہ شاید وہ ہم لوگوں کی آواز سن کر کچھ بولے۔ لٹی کا دل بیٹھا جا رہا تھا مگر پھر بھی وہ بلند آواز سے چلا رہی تھی۔ ندی کے شور کے سوا کوئی آواز سنائی نہ دی۔ میں چوکیدار کے کمرے میں گیا وہ بے خبر سویا ہوا تھا اور اصرار کے باوجود نہ اٹھا۔ میں نے اسے اپنی حیثیت سے بہت زیادہ انعام دینے کا وعدہ کیا لیکن وہ اس پر بھی نہ جاگا۔ اس نے کہا کہ اگر تم چاہو تو میرا بگل لے کر بجا سکتے ہو اور اسے بلا سکتے ہو۔ ناچار میں نے بگل لیا اور اسے خود بجانے لگا۔ میں نے اسے اپنی پوری طاقت سے بجایا لیکن اس تاریک رات میں میرے باجے کی صدائے بازگشت کے سوا اور کوئی انسانی آواز سنائی نہ دی۔ آہ، وہ بگل ایک مردہ کو بیدار نہ کر سکا۔

میں لٹی کو ساتھ لے کر مکان میں واپس آیا جہاں وہ اپنے بچے کے قریب بیٹھ کر ساری رات روتی رہی۔ میں خود پھر ندی کے کنارے واپس چلا آیا اور گلبرٹ کی تلاش میں ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ میں نے تھوڑے تھوڑے وقفہ پر چلا چلا کر اسے بلانے کی ناکام کوشش کی۔ پانی کم ہو گیا لیکن اس پر بھی اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ دو دن کے بعد دو تین میل کے فاصلے پر ندی کے کنارے اس کی لاش پڑی ہوئی ملی جھ

کچھ اور فاصلے پر میری گھوڑی اور میرا تانگہ نصف سے زیادہ ریت میں دفن پڑا ہوا ملا۔ معلوم ہوتا ہے کہ گلبرٹ تانگے کا تسمہ ابھی کاٹنے نہ پایا تھا کہ چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور پھر اس کی زندگی کی ساری اُمید جاتی رہی۔

اس کے دوستوں نے جو ایک دوسرے گاؤں میں رہتے تھے اس کی تجہیز و تکفین کا سامان کیا۔ میری دلی خواہش تھی کہ اس کے ماتم کے تمام فرائض میں انجام دوں مگر میری یہ آرزو پوری نہ ہو سکی گو میں آج تک ایک دن بھی اس کے ماتم سے غافل نہیں رہا ہوں۔ جب اس کی بہن اُس کی پسماندہ چیزوں کو ایک جگہ رکھ رہی تھی تو میں نے اس کی بہت خوشامد کی کہ وہ گلبرٹ کی کوئی چیز مجھے یادگار کے لئے دے دے۔ وہ بڑی منتظم عورت تھی اس نے مجھے اس کا کوئی کپڑا نہیں دیا' اس کا خیال تھا کہ جب اس کے بچے بڑے ہوں گے تو اسے پہنیں گے۔ البتہ اُس نے ایک بوسیدہ بائبل میری طرف پھینک دی۔ چونکہ یہ گلبرٹ کی تھی اس لئے میں نے اس کی بڑی قدر کی۔ اس پر چمڑے کی سیاہ جلد تھی جس کے دونوں طرف پرانے طرز کی جیب لگی ہوئی تھی۔ ایک جیب میں مجھے چند بکھرے ہوئے زرد پھول ملے۔ لِٹی نے یقین کے ساتھ کہا کہ یہ پھول عرصہ ہوا اسی نے اس کو دیئے تھے۔

میں نے دیکھا اس بائبل کی بہت سی ایسی آیتوں پر پنسل کے نشانات لگے ہوئے تھے جن سے گلبرٹ کے اس خیال کی تائید ہوتی تھی کہ لڑنا جھگڑنا بہت بُری بات ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ لڑنے کے لئے بڑی بہادری کی ضرورت ہے لیکن گلبرٹ کی بے مثل قربانی نے مجھے بتایا کہ لڑنے کے تمام اسباب پیدا ہو جانے کے باوجود لڑائی سے باز رہنا بڑے بہادر اور سورما کا کام ہے۔

میری طویل داستان کو آپ لوگوں نے غور سے سُنا، اس کا شکریہ۔ آپ لوگوں کی گفتگو نے گلبرٹ کی یاد تازہ کر دی، اور میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں اس شہیدِ محبت کی کہانی آپ لوگوں کو سُنا دوں۔ معاف کیجئے گا میں نے آپ لوگوں کا بہت سا وقت ضائع کیا۔ اس وقت مجھے ایک کمسن بچے کی قبر کھودنا ہے جو کل صبح ٹھیک اس وقت جب اس کے ساتھ کھیلنے والے بچے تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے اپنے اپنے اسکول کی طرف جا رہے ہوں گے یہاں دفن کیا جائے گا، اس لئے اب رخصت ہوتا ہوں''۔

جرمی نے کہا ''لیکن لِٹی کے متعلق کچھ کہتے جایئے، کیا وہ اب تک زندہ ہے؟''

بوڑھے گورکن نے اپنا سر ہلایا' پھر اس نے ایک سرد آہ کو روکنے کی کوشش کی اور ایک منٹ کے وقفہ کے بعد بولا:۔

''اُس یادگار رات کے بعد وہ دو سال بھی زندہ نہ رہ سکی اور اس کا انتقال ہو گیا۔ اس میں حیرت انگیز تبدیلی ہو گئی تھی۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ ہمیشہ گلبرٹ کی یاد میں بیٹھی ہوئی کچھ سوچتی رہتی۔ میں اس پر کچھ اعتراض نہیں کرتا تھا۔ اس کے دو بچے ہوئے۔ ایک لڑکا، جس کا نام ہم دونوں نے گلبرٹ ڈاسن نائپ رکھا، وہ آج کل لندن ریلوے میں فائرمین کا کام کرتا ہے۔ اور ایک لڑکی جو دانت نکلنے میں فوت ہو گئی۔ اس کے بعد چھ ہفتے کے اندر ہی لِٹی مجھے ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گئی۔ یہ ماں اور بیٹی دونوں یہیں اسی قبرستان میں دفن ہوئی ہیں۔ میں اس خیال سے کہ ان لوگوں کے قریب ہوں گا لنڈل کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر یہاں رہنے لگا۔ آہ، لنڈل میں جہاں سے لِٹی رخصت ہو چکی ہے میرے لئے رہنا ناممکن تھا''۔

یہ کہہ کر گورکن اپنے کام کی طرف چلا گیا۔ ہم لوگ بھی چونکہ کافی آرام کر چکے تھے اس لئے وہاں سے روانہ ہو گئے۔

(الزابتھ گیب ہارن گاسکل)
مترجمہ
مسعود حسن شمسی
دانا پوری

غزل

عیاں دیکھتا ہوں نہاں دیکھتا ہوں
تجھے دیکھتا ہوں جہاں دیکھتا ہوں

جو دیدار سے تیرے رشکِ جناں تھیں
اُن آنکھوں کو اب خونچکاں دیکھتا ہوں

نہیں مطمئن دو جہاں سے چھڑا کر
مَیں اب بھی نئے امتحاں دیکھتا ہوں

ارادہ کیا اُس نے شاید وفا کا
زمانے کو پھر بدگماں دیکھتا ہوں

گیا وقت آزاد تھیں جب نگاہیں
نگاہوں کو اب پاسباں دیکھتا ہوں

اجازت اب اے ذوقِ نغمہ طرازی
بہت دن سے محمل گراں دیکھتا ہوں

نہ جا میرے ظاہر پہ نادان واعظ
میں رازِ حقیقت عیاں دیکھتا ہوں

جہاں تیری تحقیق کی انتہا ہے
مَیں اُس سے پرے اِک جہاں دیکھتا ہوں

کہاں وہ طبیعت، پہ سیفی کو اب بھی
غبارِ رہِ کارواں دیکھتا ہوں

سیفی نوگانوی

میری کتاب

میں اس وقت سات سال کا تھا۔

میرے پڑوس میں ایک لڑکی رہتی تھی اُس کا نام نیلوفر تھا۔ مارپیٹ، کھیل کود اور شرارت میں وہ میری شریک ہوتی تھی۔ نیلوفر خوبصورت بھی تھی۔

عمر میں اس سے دو سال بڑا ہونے کے باعث میں اس پر رُعب بھی گانٹھتا تھا۔ اپنی قابلیت جتانے کی غرض سے میں اس کے سامنے اپنی انگریزی کی تیسری کتاب پڑھا کرتا تھا۔ کیونکہ وہ تو سمجھ ہی نہیں سکتی تھی کہ میں غلط پڑھتا ہوں یا صحیح میں ہمیشہ اس سے کہا کرتا تھا کہ اسکول میں میری اتنی عزت ہوتی ہے۔ ماسٹر صاحب مجھے ایسا چاہتے ہیں۔ لڑکوں پر میرا ایسا رُعب ہے۔

نیلوفر اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی اور میری باتیں بڑے غور سے سنتی۔

ہاں تو اُس روز میں جغرافیہ کی کتاب لایا تھا اور دل میں یہ طے کرکے آیا تھا کہ اسے نئی نئی تصاویر اور نقشے دکھا کر چڑاؤں گا۔ اُسے کبھی نہیں دکھاؤں گا۔ وہ میری خوشامدیں کرے گی لیکن میں ایک نہیں سنوں گا۔

مجھے آج بھی وہ شام یاد ہے۔

نیلوفر نے کتاب دیکھی

میری طرف پرشوق نگاہوں سے دیکھ کر کہنے لگی۔

"مجھے بھی دکھاؤ نا!"

میں نے ڈانٹ کر جواب دیا "نہیں خراب ہو جائے گی"۔

نیلوفر کی آنکھیں بھر آئیں، میری جیت ہوئی نا آخر؟

اس دن شام کو میں جلد ہی ہاکی کھیل کر لوٹ آیا سب سے پہلے جا کر کتاب کو دیکھا۔ وہ موجود نہ تھی۔ میں سمجھ گیا۔ ایک کونے میں بیٹھ کر نیلوفر کتاب کی تصاویر بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ آہٹ پا کر اس نے میری جانب چونک کر دیکھا اور خوف سے کانپ اُٹھی۔

مجھے بے حد غصہ آیا کہ باوجود میرے انکار کے اُس نے کتاب دیکھ ہی لی۔

میں نے اسے پیٹ ڈالا اور چُپ چاپ وہ پٹ گئی۔

برسوں گزر گئے

کھیل کود کر، لڑ جھگڑ کر۔ نیلوفر پردے میں بٹھادی گئی۔ بچپن کی شرارتیں ختم ہوگئیں۔

ایک رات میں کالج کی کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ اس وقت میری طبیعت پڑھنے کو نہیں چاہتی تھی لیکن پھر بھی ورق گردانی کر رہا تھا۔

آہستہ سے دبے پاؤں کوئی کمرے میں داخل ہوا۔

نیلوفر— لیکن وہ پہلی نیلوفر نہیں بلکہ مجسم شباب نیلوفر

حسن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی معصوم نیلوفر۔
میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میری عمر اس وقت ۱۹ سال کی تھی اور نیلوفر کی ۱۷ سال کی۔
گھبراہٹ کی وجہ سے میری پیشانی پر پسینہ کے قطرات نمودار ہو گئے۔
اُف وہ کتنی خوبصورت تھی۔
شرم سے اس کی نگاہیں نیچی ہو گئیں۔ ڈرتے ڈرتے اُس نے کہا۔ "کیا آپ کے پاس مسدس حالی ہے؟"
"جی ہاں!" یہ دو الفاظ میری زبان سے بمشکل ادا ہوئے۔
کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے اسے مسدس حالی کی جلد دی۔
وہ چلی گئی۔ میں اس رات کچھ نہ پڑھ سکا۔ بلکہ سو بھی نہ سکا۔ رات بھر نیلوفر کی تصویر میری آنکھوں میں پھرتی رہی۔
ان دنوں گھر میں میری شادی کا ذکر ہو رہا تھا۔ شاید نیلوفر کی شادی کا مسئلہ بھی اُن کے ہاں درپیش ہو۔
زندگی کے چند سال اور گزر گئے۔
دور و نزدیک میری ادبی قابلیت کا چرچا ہونے لگا تھا۔
میں کمرے میں بیٹھا ہوا کسی مسئلہ کو حل کر رہا تھا۔ دانتوں میں قلم دبایا، سر کے تمام بال بکھیر ڈالے۔ سگریٹوں کے کئی پیکٹ ختم کر ڈالے۔ مگر بے سود۔ میں پریشان سا ہو گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔
آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی داخل ہوا۔
میں نے جھنجھلا کر دیکھا۔ اوہ نیلوفر، میری نیلوفر، سامنے کھڑی میری اس حالت کو دیکھ کر ہنس رہی تھی۔
میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ نیلوفر اب میری شریکِ حیات بن چکی تھی۔
"ذرا دیوانِ غالب تو دیجئے۔"
میں نے غصہ سے جواب دیا "اسی وقت تمہیں ضرورت محسوس ہوئی۔ اس الماری میں رکھا ہے۔"
اس نے کتاب نکال لی اور چپ چاپ وہیں کھڑی ہو گئی۔ نیلوفر اب بھی مسکرا رہی تھی۔
میں نے دریافت کیا "جاتیں کیوں نہیں۔ اور کیا چاہئے؟"
"یاد ہے وہ جغرافیہ کی کتاب؟" میرا غصہ ہنسی میں تبدیل ہو گیا۔
میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا "ہاں یاد ہے۔"
پھر اُس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اور وہ مسدس حالی، کہاں گئے وہ دن!"
"کیا پھر پٹنے کا ارادہ ہے؟"
نیلوفر محبت بھری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

شاہد الہاشمی ناگپور

قطعات

نشاطِ عشق

ہو کے بے فکر تان اُڑائے جا
راگنی اپنے من کی گائے جا
غم نہ کر روزگار کا پیارے
عشق کی بانسری بجائے جا

دل کی آگ

جیسے شعلوں سے کوئی کھیلے پھاگ
جیسے گاتا ہو کوئی دیپک راگ
جل رہا ہوں تمہاری جان سے دور
بھڑک اُٹھی ہے میرے دل کی آگ

رقاصہ

حُسن کی داستاں بنا ڈالا
عشق کا ترجماں بنا ڈالا
بھر کے اعضا میں رقص کا جادو
تو نے ان کو زباں بنا ڈالا

چاندنی رات

اُف کہ تھوڑی سی رات باقی ہے
چاندنی مے ہے، چاند ساقی ہے
ایسے لمحوں کو نیند میں کھونا
ارے نادان! بدمذاقی ہے

اختر انصاری

تخیلات

تم سے محبت نہ سہی،
اُس چاہت کی یاد میں جو تم مجھ سے چھپا نہ سکیں،
تمہاری موت سے روح ماتم میں ہے
وہ مسکراتی آنکھیں، حیا کی سُرخ سُرخ لہریں، دبی ہوئی مگر بے تابانہ ہنسی،
زہرہ ٹوٹ کر موہوم فضاؤں میں تحلیل ہو جائے ———

وہ لمحہ

اُن شبنم سے بھیگی ہوئی نرم و نازک گلابی پتّیوں کو شرمانے والی آنکھوں نے ایک ہلکی سی آرزو کا پیغام دیا
شاید وہ مَوج طوفان بن جاتی
میری آنکھیں اُسے بتا نہ سکیں کہ وہ برسوں سے انتظار میں تھیں

آنسو

"تم نہ جاؤ"
"مجھے بھی ساتھ لے چلو"
"اور جانا ہی ہے، تو آج کیوں جاتے ہو؟ کل چلے جانا"
پہلی عورت جس نے میرے لئے آنسو بہائے گیارہ برس کی ایک کالی سی لڑکی تھی
سارے کشمیر کی رنگینیاں اُس پر نثار ہوں!

توبہ

مَیں نے اُس کے ہونٹوں کو چُوم چُوم لیا
اُس کے سینہ کی لرزشیں میرے بدن میں جذب ہو کے رہ گئیں
وہ بات جو روح کی ایک سادہ نگاہ میں تھی گناہ کی گہرائیوں میں نظر نہ آئی
میں نے توبہ کر لی۔

"ابنِ مریم"

محفلِ ادب

شکستِ نایاب

کیرم کی ایک بازی کے دلچسپ تأثرات

سچ ہے کہ بہت رات گئی بج چکے بارا — کیا کیجئے کیرم کا، ہے کچھ کھیل ہی پیارا

تم کھیل میں ہو، کچھ سے ہے کچھ حال ہمارا — خیرہ نگۂ شوق ہے حیراں ہے نظارا

رکھوں نہ اگر پاؤں زمیں پر تو بجا ہے — ذرّے کو ہے مہتاب نے کرنوں سے سنوارا

رہ رہ کے ہمیں تہنیتِ عشق و وفا میں — پرویز نے آواز دی، زہرہ نے پکارا

کس بات میں ہم کم ہیں فلک سر نہ اُٹھائے — اک چاند ہے اُس کا، تو ہے اک چاند ہمارا

لیکن یہ قیامت ہے کہ پہلو میں بٹھا کر — دشوار نگاہوں کو ہے نظارہ تمہارا

اب تک تو بڑے ضبط سے ہم کھیلے ہیں لیکن — کیا کہئے کہ اب کھیل کی ہمت ہے نہ یارا

مہروں کی جگہ گرتا ہے ہر ہاتھ میں ضارب — بیتاب ہے جب دل ہی تو کیا کھیل ہمارا

اُف تم ہو کہ ہر وار میں پہلے سے بھی ہشیار — ملتا ہے تمہیں میری شکستوں کا سہارا

جس جیب کی جانب اُٹھی انگشتِ حنائی — اُس جیب میں آہستہ سے اِک مہرہ اُتارا

رُخ کھیل کا بدلا ہے عجب لطف سے تم نے — جو چال ہے اِک سحر ہے جو ہاتھ ہے پیارا

ہر آن میں ضربوں کا نیا رنگ ہے کیا خوب — ہر لحظہ میں ہے کھیل ترقی پہ تمہارا

جس جیب کو دیکھا وہی پھولی نہ سمائی — اِک آن میں بازی کا ہُوا وارا نیارا

افلاک کی گردش بھی اگر سچ ہے تو ہے جھوٹ — اعجاز ہے مہروں کا یہ رقصِ نظر آرا

اُڑتے ہوئے مہروں کا یہ اُٹھنا ہُوا طوفاں — جیبوں کی طرف میرا یہ حسرت سے نظارا

سچ پوچھو تو یہ بات کی اک بات ہے ورنہ — بچتا ہے کہیں ہار سے بھی عشق کا مارا

کیرم ہی پہ موقوف ہے کیا میری تباہی — سچ یہ ہے کہ تم سے تو میں ہر کھیل میں ہارا

اس ہار پہ بھی دِل کو بہت ناز ہے فطرت
یہ ہار بھی شاید ہی، ہو قسمت کو گوارا

(فطرت واسطی) "نگار"

ہندوستانی کیا ہے؟

حال ہی میں آل انڈیا ریڈیو دہلی سے "ہندوستانی کیا ہے؟" کے موضوع پر چھ تقریریں نشر ہوئیں۔ ان چھ حضرات میں سے تین ہندو تھے یعنی ڈاکٹر تارا چند صاحب، بابو راجندر پرشاد صاحب اور پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی اور تین مسلمان تھے یعنی مولوی عبدالحق صاحب، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور مسٹر آصف علی۔

پہلی تقریر ڈاکٹر تارا چند صاحب کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس بات کا تو ابتدا ہی میں اعتراف کرلیا ہے، کہ:۔

"ہندوستانی سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے"۔ اور "ہندوستانی کوئی من گھڑت بھاشا نہیں"۔

پھر اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ:۔ "ہندوستانی آدھے ہندوستان کے سینے پر کھیلتی ہے"۔

لیکن وہ کونسی ہندوستانی ہے؟ اس کا نہ تو ڈاکٹر تارا چند نے کوئی جواب دیا ہے اور نہ کوئی مثال ہی پیش کی ہے۔ پھر آگے چل کر کہتے ہیں کہ:۔ "یہ جدید ہندوستانی ہندی اور اُردو کے درمیان پُل بنا چاہتی ہے"۔

لیکن عرض یہ ہے کہ اگر یہ پُل بنانے والی وہی ہندوستانی ہے جس میں ڈاکٹر صاحب نے تقریر کی ہے تو پھر میرا خیال ہے کہ اس پُل پر سے گزرنے والوں میں سے ۸۰ فی صدی کو دوسرا کنارہ دیکھنا کبھی نصیب نہ ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب نے جس زبان میں تقریر کی ہے اُسے ہندوستانی کہنا ہندوستانی کی توہین ہے۔ اور یہ غالباً وہی زبان ہے جس کی جھلکیاں ہمیں وقتاً فوقتاً بعض مقامات سے نظر آنے لگتی ہیں۔ اگر جدید ہندوستانی اسی زبان کا نام ہے جس میں ہندی اور سنسکرت کے ناقابل فہم الفاظ کی بھرمار ہو تو یہ زبان ہندو دوستوں کو ہی مبارک ہو۔ اُردو بولنے والوں میں سے شاید پانچ فیصدی بھی اسے قبول نہ کریں۔

ڈاکٹر صاحب کی جدید ہندوستانی کی فصاحت اور سلاست کی تو داد نہیں دی جاسکتی۔ "بازارو بولی"، "گوتا ہو رہی ہے"، "یورپ کی ودیائیں"، "ودیاؤں کی پری بھاشائیں"، "کھوج کرنے والے"، "ودیا اور ساہت"، "اُدھار لئے شبد"، "امت سنگھٹن"۔ اور ایسے ہی کم از کم چالیس فیصدی ہندی کے اور الفاظ آپ کی تقریر کی زیب زینت بنے ہوئے ہیں جنہیں مسلمان تو رہے ایک طرف ہندوؤں کی اکثریت بھی نہ سمجھ سکتی ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب سے کوئی اتنا تو پُوچھے کہ محقق کے لئے "کھوجو"، اصطلاح کے لئے "پری بھاشا"، فقرے کے لئے "شبد" اور ایسے ہی سینکڑوں ہندی کے الفاظ مسلمانوں کو کیا پڑی ہے کہ قبول کرلیں۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

"ہمیں سوراج کی یاد ستاتی ہے"

اور میرے خیال میں سوراج حاصل کرنے کے لئے ہی آپنے جدید ہندوستانی کا یہ نسخہ تجویز فرمایا ہے کہ جہاں تک بن آئے عربی
رسی کے عام فہم اور شگفتہ الفاظ نکال کر ایک ایسی کھچڑی تیار کرلو جسے ہضم کرنا تو رہا ایک طرف حلق سے اُتارنا بھی مشکل ہو جائے۔
دوسری تقریر مولوی عبدالحق صاحب کی ہے۔ مولوی صاحب قبلہ اس بات کے حامی ہیں کہ زبان ایسی ہونی چاہئے جو پیچیدہ اور
بھی ہوئی نہ ہو۔ یعنی جسے عوام الناس سمجھ سکیں۔ آپ کو ان اُردو والے حضرات سے بھی شکایت ہے جنہوں نے محض جدت نوازی کے طور پر
یسی زبان "گھڑنی اور ڈھالنی" شروع کی ہے جسے عوام الناس سمجھ نہیں سکتے۔ اس زبان سے مولوی صاحب کا مطلب وہ اُردو ہوگی،
بس میں بعض لکھنے والے عربی اور فارسی کے الفاظ ضرورت سے زیادہ ٹھونس دیتے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس قسم کی اُردو نہ تو
دلپذیر ہو سکتی ہے اور نہ عام فہم کہلا سکتی ہے۔ مولوی صاحب چاہتے ہیں کہ "زبان سادہ ہو اور اس میں لطافت بھی ہو"۔ لیکن اس کے ساتھ
آپ کا یہ ارشاد ہے کہ :- "ہم کسی کو مجبور نہیں کر سکتے کہ یوں نہیں یوں لکھو"۔
اور " آسان اور مشکل کی کوئی حد مقرر نہیں ہو سکتی۔ یہ ذوق کی بات ہے، اور ادب میں یہی منزل کٹھن ہے"۔
اور حقیقت میں ہے بھی اسی طرح نہ تو ہم کوئی حد مقرر کر سکتے ہیں، نہ کسی کا مذاق بدل سکتے ہیں۔ ہر شخص کا اپنا اپنا رنگ ہوتا ہے
کوشش سب کی یہی ہوتی ہے کہ زبان شگفتہ اور دلپذیر ہو۔ کوئی سادہ الفاظ میں لطافت پیدا کرتا ہے، کوئی دوسری زبان کے الفاظ لے
کر اُسے مرصع بناتا ہے لیکن اگر مطلب اور معنی سمجھنے میں کسی کو دقت محسوس نہ ہو تو اعتراض کی گنجائش نہیں رہتی۔
ایک مقام پر مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ :-
"گاندھی اور بابو راجندر پرشاد صاحب نے اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ ہندی میں سنسکرت الفاظ ملانے کی بنگال والوں کیلئے ضرورت ہے۔
بنگال والوں کی ضرورت تو سر آنکھوں پر۔ لیکن پنجاب اور سرحد والوں کی ضرورت کا بھی آپ نے کوئی علاج سوچا ہے جس ہندوستانی کا
ہمارے ہندو دوست پرچار کر رہے ہیں، ہندوستان کی اکثریت کے لئے یہ بھی ایک چیستاں سے کم نہیں۔ اگر گاندھی اور بابو صاحب محض بنگال
والوں کو خوش کرنے کے لئے ایسی زبان بنانا چاہتے ہیں تو پھر اسے ہندوستان کی مشترکہ زبان کون کہے گا اور زبان بھی جس سے بقول مولوی صاحب
"کانوں کے پردے پھٹنے لگیں"
مولوی صاحب کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ ہندوستان کی زبان وہ ہے" جسے اُردو والا بھی سمجھتا ہے اور ہندی والا بھی"۔
اور اگر تعصب کا پردہ اُٹھا کر دیکھا جائے تو موجودہ اُردو میں یہ صفت بدرجہ اتم موجود ہے۔ ایک مقام پر مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ :-
"غیر زبان کے ایسے محاورے جو ہماری زبان میں کھپ سکیں اس سے زبان کی وسعت ہوتی ہے"۔
لیکن یہ مشورہ تو صرف وہ لوگ قبول کریں گے جنہیں اُردو زبان سے محبت ہے، جن کے دل میں اُردو کی عزت ہے، اور جو اُردو

کی وسعت کے لئے کوشاں ہیں۔ جو اُردو کو ملک کی مشترکہ زبان سمجھتے ہیں۔

مولوی صاحب کا یہ ارشاد بھی بالکل صحیح ہے کہ:۔

"اگر ہماری زبان زندہ ہے تو اس میں نت نئے اور روز نئے نئے الفاظ آتے ہی رہیں گے"

لیکن عرض یہ ہے کہ اگر آپ کی زبان کو یارانِ وطن کو زندہ رکھنا ہوتا تو ودیا مندر سکیم کی ضرورت کیوں پیش آتی۔ ہندو تو اُس زبان کو رائج کرنا چاہتا ہے جس کی مثالیں آئے دن اخبارات میں دیکھنے میں آتی ہیں اور جس کا سمجھنا تو رہا درکنار پڑھنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔

مولوی صاحب نے یہ خوب پتے کی کہی کہ "سب سے پہلے ہمارے ملک کی زبان کو انگریزوں نے ہندوستانی کہا۔"

اور غالباً گاندھی جی نے محض اسی لئے ہندوستانی کے ساتھ ہندی کا لفظ بھی جوڑ دیا تھا، جو بقول مولوی صاحب مقبول نہ ہوا۔

اب رہا یہ کہ ہندوستانی کیا ہے؛ تو اس کا جواب مولوی عبدالحق صاحب نے یہ دیا ہے:۔

"ہندوستانی وہ زبان ہے جس میں میں تقریر کر رہا ہوں"۔

اور اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو یہی وہ زبان ہے جسے آج اُردو والا بھی سمجھتا ہے اور ہندی والا بھی۔

تیسری تقریر بابو راجندر پرشاد صاحب کی ہے۔ بابو صاحب فرماتے ہیں:۔

"فارسی، عربی اور سنسکرت الفاظ کی بھرمار کی وجہ سے ہندی اور اُردو ایک دوسری سے بھاگتی جا رہی ہیں۔ ہندوستانی بیچ کا راستہ لیتی ہے"

مجھے خوف ہے کہ بہت کم لوگ بابو صاحب کے اس بارے میں ہم خیال ہوں گے۔ کیونکہ اُردو زبان تو ابھی تک اسی جگہ کھڑی ہے جہاں اُسے دونوں قوموں کے بزرگوں نے کھڑا کر دیا تھا۔ لیکن ہندی ضرور اس سے دُور دُور ہو رہی ہے۔ اور اس کے بھاگنے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ایک تو اُسے پالنے پوسنے والے ہی اُسے ایک مدت تک بھولے رہے، دوسرے اس زبان میں نہ لطافت ہے نہ فصاحت، رہا ہندوستانی کا بیچ کا راستہ لینا تو عرض یہ ہے کہ وہ بیچ کا راستہ لینے والی ہندوستانی ہے کہاں۔ اگر یہ وہی ہندوستانی ہے جس میں ڈاکٹر تاراچند نے تقریر کی ہے تو پھر بیچ کا راستہ لینا تو رہا ایک طرف، دونوں کے درمیان ایک ایسی خلیج پیدا ہو جانے کا امکان ہے جس کا پاٹنا ناممکن ہو جائے گا۔

ایک مقام پر بابو صاحب فرماتے ہیں:۔

"کانگرس نے اس کو (جدید ہندوستانی کو) قومی زبان یا راشٹر بھاشا مان لیا ہے۔ اس لئے اس کی عزت اور بھی بڑھ گئی۔"

لیکن عرض یہ ہے کہ وہ لوگ جو سرے سے کانگرس سے ہی برگشتہ یا بیزار ہیں ان کے لئے کانگرس کا ماننا یا نہ ماننا کیا وقعت رکھتا ہے۔ وہ کانگرس جو ودیا مندر سکیم تیار کر رہی ہے اُسے کوئی حق نہیں کہ وہ ملک کی واحد نمائندہ کہلائے۔ وہ کانگرس جسے مسلمانوں کے جذبات اور احساسات کی پرواہ نہیں، اس کانگرس کی کوئی بات مسلمانوں کے لئے سند نہیں ہو سکتی۔ جس کانگرس کو مسلمانوں کا اعتماد ہی حاصل نہ ہو اُس کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی مسلمانوں کے لئے ایک مہمل چیز ہے۔

ہاں! کیا اچھا ہوتا جو بابو صاحب ذرا اس رچ کا راستہ لینے والی زبان کی ایک دو مثالیں بھی بیان فرمادیتے جسے کانگرس نے "ترپھاشا" مان لیا ہے۔

بابو صاحب فرماتے ہیں :-

"ہندوستانی کے دو رُوپ کہے جاتے ہیں ایک ہندی جس میں سنسکرت شبد بہت آتے ہیں، دوسرا اُردو جس میں فارسی اور عربی شبد آتے ہیں۔"

نہ جانے آپ کس ہندوستانی کا ذکر کر رہے ہیں۔ آج سے تھوڑا عرصہ پیشتر تو ہندوستانی یعنی اُردو کا ایک ہی رُوپ تھا۔ اور اس رُوپ میں عربی اور فارسی الفاظ کے ساتھ سنسکرت کے الفاظ بھی موجود ہیں اور اُردو لکھنے والوں نے خواہ وہ ہندو اہلِ قلم ہوں یا مسلمان اُسے دو رُوپوں میں کبھی تقسیم نہیں کیا۔ ہاں! یہ ٹھیک ہے کہ کانگرس نے اس میں ایک ناقابلِ معافی تفرقہ ڈال دیا ہے، اور اب اس کے واقعی دو رُوپ ہو گئے ہیں۔ ایک اس کا اصلی رُوپ جس سے مُلک کی ایک بہت بڑی اکثریت بخوبی واقف ہے، اور دوسرا کانگرسی رُوپ جس سے ایک نہایت قلیل اقلیت آشنا ہو رہی ہے۔

اُردو ہندی کا جھگڑا خالص کانگرسی تحریک کا نتیجہ ہے۔ اور اسی سے متاثر ہو کر اکثر ہندو اہلِ قلم کاوش سے ہندی اور سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ استعمال کرنے لگے ہیں۔ لیکن مسلمان لکھنے والے ابھی تک اس تنگ ظرفی کا شکار نہیں ہوئے کہ محض قومی یا مذہبی کاوش سے ہندی یا سنسکرت کے وہ مانوس اور عام فہم الفاظ جو ایک مدت سے اُردو میں رچ گئے ہیں لکھنا ترک کر دیں۔

بابو صاحب نے مثال کے طور پر انگریزی کے دو جملے لئے ہیں، ایک کا اُردو میں ترجمہ ہے، دوسرے کا ہندی میں۔ پہلا فقرہ ہے :-

The preliminary step to be taken in connection with the preparation of electoral rolls for the Federal Legislature were indicated by Sir Nripindra Nath Sirkar, the Law Member in the Central Assembly today.

اس کا چلتی اُردو میں یہ ترجمہ ہے :-

"فیڈرل لیجسلیچر کے لئے فہرست رائے دہندگان تیار کرنے کے سلسلہ میں جو ابتدائی کارروائی کی جائے گی، اس کے بارے میں سر این این سرکار لا ممبر نے آج اسمبلی میں روشنی ڈالی ہے۔"

دوسرا فقرہ ہے :-

Replying to a question in the United Provinces Legislative Assembly to-day, Dr. Katju, Minister for Justice, gave a list of the grants-in-aid which the Government had sanctioned for the purpose of experiments in new fields of manufacture.

اب اس کا ہندی ترجمہ ملاحظہ فرمایئے :-

"سنیکت پرانیہ کا پریشد میں ایک پرشن کا اُتّر دیتے ہوئے نیائے منتری ڈاکٹر کاٹجو نے ان اُدیوگ دھندوں کی سُوچی دی۔ جن کی اُنتی کے لئے سرکار نے سہایتا دینا سویکار کیا ہے"۔

بابو راجندر پرشاد صاحب کو اُردو کے ترجمے میں "رائے دہندگان" پر اعتراض ہے۔ ان کے خیال میں "رائے دینے والے" ہونا چاہئے، اسی طرح وہ "ابتدائی کارروائی" کو بھی قابلِ اعتراض قرار دیتے ہیں۔ لیکن ہندی ترجمے کے متعلق اُن کی رائے ایسی سخت ہرگز نہیں۔ اور غالباً یہ وہی ہندوستانی ہوگی جو بقول بابو صاحب "بیچ کا راستہ لیتی ہے"۔ اگر یہی وہ راشٹر بھاشا ہے جو کانگرس پسند کر چکی ہے تو اب آپ ہی ذرا انصاف سے کہہ دیں کہ وہ لوگ جو دل سے اُردو کے بہی خواہ ہیں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان اس زبان کو کبھی قبول کریں گے؛ اِس کے سمجھنے والے ملک میں مشکل سے بیس فیصدی یا اس سے بھی کچھ کم ہی ہوں گے۔

اپنی تقریر میں بابو صاحب نے اپنی فراخدلی کا یہ کہہ کر ثبوت دینا چاہا ہے کہ :-

"جتنے فارسی اور عربی لفظوں کو اچھا لکھنے والوں نے اختیار کیا ہے اور سنسکرت کے وہ الفاظ بھی جو ادیبوں نے استعمال کئے ہیں سب کو ہندوستانی میں لینا چاہئے"۔

لیکن عرض یہ ہے کہ اُردو تو اسی زبان کا نام ہے جس کو اچھا لکھنے والوں نے بنایا ہے اور اس مرحلہ پر پہنچایا ہے اور اس میں ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کے دوش بدوش محنت کرتے ہیں۔ آپ اسے ہی ہندوستانی کہہ لیجئے۔ اس میں فارسی عربی کے وہی الفاظ ہیں جنہیں اچھا لکھنے والوں نے اختیار کیا ہے اور سنسکرت اور ہندی کے بھی وہی الفاظ موجود ہیں جو ادیبوں نے استعمال کئے ہیں، اس زبان کے ہوتے ہوئے پھر ہندی اور اُردو کا جھگڑا کیسا۔

اور پھر آپ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ :-

"نئے نئے الفاظ عربی، فارسی اور سنسکرت سے ہی بنائے جا سکتے ہیں کہیں کہیں انگریزی شبد بھی استعمال کرنے پڑیں گے"۔

اور جب آپ یہ بھی مانتے ہیں کہ :-

"لفظوں کو نکالنے کی کوشش ٹھیک نہیں"۔

تو بندہ پرور! پھر "بیچ کا راستہ" لینے والی اور کون سی زبان ہوگی۔ اگر یہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور اور دکھانے کے اور والی بات نہیں، تو وہ خوفناک اختلاف جو ملک میں زبان کے مسئلہ پر ہو رہا ہے اسے ختم کیوں نہیں کر دیا جاتا۔ پھر آپ کا یہ ارشاد کہ

"ہندوستانی جو سب لوگوں کی زبان ہونے کا دعویٰ کرتی ہے ایسی ہوگی جسے سب سمجھ سکیں"۔

اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تو آپ یُوپی کے کانگرسی وزیرِ تعلیم کی اس زبان کے متعلق کیا فرمائیں گے جس کا تھوڑے دن ہوئے اخبارات میں خوب

رہا ہے۔ کیا آپ اسی زبان کو راشٹر بھاشا کہیں گے جسے یوپی کے رہنے والوں میں سے بھی پچیس فیصدی سے زیادہ نہیں سمجھ سکتے پہلے اپنے گھر کی خبر لیجئے! پھر ملک کے سامنے اس قسم کی تجویزیں پیش کیجئے

تو خیر ایک اور مقام پر بابو صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

"ہندوستان ایک باغ ہے، اس میں طرح طرح کے پودے لگے ہوئے ہیں، اگر ایک دوسرے کی خوراک چھیننے کی کوشش کرے گا تو کچھ سوکھ جائیں گے۔ ممکن ہے کہ بعض کو فائدہ بھی پہنچے۔ لیکن باغ کی خوبصورتی میں فرق آجائے گا۔"

لیکن گستاخی معاف! یہ بھی تو دیکھئے کہ جائز حق چھیننے کی کوشش کس طرف سے ہو رہی ہے۔ اس باغ کی خوبصورتی میں فرق آنے کا الزام آپ ان لوگوں کے سر تو ہرگز نہیں تھوپ سکتے جنہوں نے یہ باغ لگایا اور جو اس وقت تک اس باغ کی نگہبانی کر رہے ہیں۔ یہ باغ اگر سوکھے گا تو اُس کے ہم قوم لوگوں کی تنگ نظری کی وجہ سے سُوکھے گا۔ آخر آپ نے اس کا بھی کچھ علاج سوچا؛ جس طرح اس باغ کو تر و تازہ دیکھنا آپ کا "دھرم" ہے اسی طرح اس باغ کو ناقدر دانوں کی لُوٹ مار سے بچانا ہمارا بھی اخلاقی فرض ہے۔

چوتھی تقریر جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی ہے۔ آپ نے "ہندوستانی کیا ہے" کا جواب نہایت کھلے الفاظ میں یہ دیا ہے کہ:۔

"ہندوستانی وہ زبان ہے جس میں میں آپ سے باتیں کر رہا ہوں اور آپ اسے سمجھ رہے ہیں۔"

یہ ایک ایسا جواب ہے جو ہر کس و ناکس کو ماننا ہی پڑے گا۔ ہندوستان میں جہاں کہیں بھی آپ جائیں اُردو سمجھنے اور بولنے والے آپ کو ضرور ملیں گے، خواہ پڑھنے لکھنے والے کم ہی ہوں۔ لیکن ہندی لکھنے پڑھنے والے کا تو ذکر ہی کیا ہندی بولنے یا سمجھنے والے بھی آپ کو خال خال ہی نظر آئیں گے۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ:۔

"اچھی ہندوستانی کی پہچان یہ ہے کہ نہ اُردو والا اُس میں نقص نکال سکے اور نہ ہندی والا اُنگلی رکھ سکے۔"

اب ڈاکٹر تاراچند اور بابو راجندر پرشاد صاحب خود ہی انصاف فرمائیں کہ وہ زبان جس کا ڈھونگ آپ کے ہم نوا رچاتے پھرتے ہیں کہاں تک اس کسوٹی پر پُوری اُترتی ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر صاحب نے صاف صاف الفاظ میں یہ راز کی بات بھی کہہ دی ہے کہ ہندو تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ زبان ——— "سودیشی اور شدھ ہو"

اور اسی تنگ نظری نے ——— "ہندی اُردو کا جھگڑا پیدا کیا ہے"

آگے چل کر ڈاکٹر صاحب نے اس رازِ درونِ خانہ کی اور بھی وضاحت فرما دی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"جو لوگ ہندوستانی زبان سے عربی فارسی کے الفاظ نکالنا چاہتے ہیں وہ اُسے شُدھ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ کیونکہ کانگرس نے اُردو ہندی کا جو جھگڑا پیدا کر رکھا ہے، ایک

طرف تو یہ ایک گہری سیاسی چال ہے اور دوسری طرف مذہب کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ کیونکہ کئی بار ہندو صاحبان کی طرف سے یہ اعلان ہو چکا ہے کہ اُردو زبان پڑھنے سے دھرم کا ناش ہو جاتا ہے۔

زبان کو شُدھ کرنے کا مسئلہ بہت پختہ کار دماغوں کی اختراع ہے۔ آج آپ کی زبان شُدھ ہو رہی ہے کل آپ کے تمدن اور تہذیب کو بھی شُدھ کیا چلایا جائے گا . . . .

اپنی تقریر میں ڈاکٹر ذاکر حسین کا یہ فرمانا کہ :-

"ہماری زبان میں جو لفظ آ گئے سو آ گئے اور یہی وہ الفاظ ہیں جن کو ہم سمجھتے ہیں"

اس بات کی دلیل ہے کہ مُلک کو کسی جدید زبان کی ضرورت نہیں۔ پھر ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد کہ :-

"سائنس کی کتابوں کے لئے یورپ کی زبانوں سے الفاظ لینے چاہئیں۔ عربی و سنسکرت سے بھی الفاظ لینے ہوں گے اس خیال سے نہیں کہ سنسکرت الفاظ سے زبان شُدھ ہو گی۔ اور عربی اُسے مقدس بنا دے گی"۔

ایک حقیقت ہے لیکن ڈاکٹر صاحب سے یہ کون کہے کہ حضرت! سنسکرت کے الفاظ لینے سے تو کسی کو بھی انکار نہیں، رونا تو یہاں صرف عربی اور اُردو الفاظ کا ہے جن کے متعلق گاندھی بھی کہہ چکے ہیں کہ :-

"یہ مسلمانوں کی زبان ہے مسلمان چاہیں اسے رکھیں یا نہ رکھیں"۔

ڈاکٹر صاحب نے خوب کہا ہے کہ :-

"زبان ایک سماجی چیز ہے، یہ آدمی سے آدمی کا رشتہ جوڑتی ہے"۔

لیکن جناب جہاں کانگرس حکومت کے زعم میں مسلمانوں کی تخریب کے درپے ہو وہاں رشتہ جوڑ کر رکھنے کی ضرورت ہی کب محسوس ہونے لگی۔

پانچویں تقریر جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی صاحب کی ہے۔ اس زمانے میں پنڈت صاحب اُردو کے سرپرست متصور ہوتے ہیں لیکن اس تقریر میں جو آپ نے ریڈیو پر نشر کی ہے ہندی الفاظ کی جو بلا ضرورت آمیزش جائز رکھی ہے۔ آپ کی اکثر تحریریں اور تقریریں اس عیب سے پاک نظر آتی ہیں۔ انگریزی کے لس اُردو ترجمے میں جس کا میں نے بابو راجندر پرشاد صاحب کی تقریر میں ذکر کیا ہے آپ کو بھی "رائے دہندگان" پر اعتراض ہے۔ آپ کے خیال میں "رائے دینے والا" ہونا چاہئے۔ اسی طرح "ابتدائی کارروائی" اور "روشنی ڈالی" بھی آپ کے نقطۂ نظر سے اصلاح کے قابل ہے جس کے یہ معنی ہوئے کہ "ابتدائی کارروائی" اور "روشنی ڈالی" ایسے سادہ اور عام فہم الفاظ کی بھی جدید ہندوستانی میں کھپت نہ ہو سکے گی۔ جب اُردو کے ایک گراں پایہ ادیب کا یہ حال ہے تو دوسروں سے شکایت ہی کیا۔

پنڈت صاحب کا یہ خیال ہے کہ "فلمی زبان" جدید ہندوستانی بنانے میں مدد دے سکے گی، ہندو نقطۂ نگاہ سے صحیح ہے۔ کیونکہ اس وقت اکثر فلمی ڈراموں کی زبان میں ہندی کے الفاظ اس کثرت سے نظر آتے ہیں کہ بعض اوقات مکالمہ سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اُردو کے خلاف ہندو

کے پاس فلم ایک ایسا خوفناک حربہ ہے جس کی روک تھام کی ہم لوگوں میں نہ ہمت ہے نہ وسعت۔ ہندو ڈرامانگار جان بوجھ کر اُردو زبان کا ستیاناس کر رہے ہیں۔ جب سے اُردو ہندی کا جھگڑا پیدا ہوا ہے فلمی ڈراموں کی زبان قریب قریب بالکل ہندوانہ ہوگئی ہے۔ آج مسلمان یہ الفاظ سننے کے خوگر ہو رہے ہیں۔ کل یہی ہندی الفاظ اُن کی زبان پر ہوں گے اور یہی ہندو کی خواہش ہے۔

اپنی تقریر کو جناب کیفی صاحب نے ان الفاظ پر ختم کیا ہے:۔

"جس زبان میں مَیں نے تقریر کی ہے یہی ہندوستانی ہے۔"

لیکن اس سے پہلے جو آپ تقریریں فرما چکے ہیں وہ کسی اور ہی "ہندوستانی" کی یاد دلاتی ہیں۔

چھٹی اور آخری تقریر مسٹر آصف علی صاحب کی ہے:۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ لاہور میں مسلم لیگ کے اس اجلاس کے موقع پر جس کے صدر جناب محمد علی صاحب جناح تھے کسی قرارداد کی تائید میں اُردو میں ایک ایسی تقریر کی تھی جس کی سلاست اور چٹخارے سے بس مزا ہی آگیا تھا۔ آج "ہندوستانی کیا ہے" کے موضوع پر جو آپ نے تقریر فرمائی ہے اس میں وہی مولوی مدن والی بات کہیں نظر نہیں آتی بلکہ اس کے برعکس بھرتی کے نامانوس اور غیر مانوس الفاظ بکثرت ملتے ہیں، بہرکیف آپ کا یہ ارشاد کہ:۔

"آج ہندی والے ان لفظوں کو جو اُردو میں عربی فارسی سے آکر گھل مل گئے ہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکال رہے ہیں اور ان کی جگہ مشکل سنسکرت الفاظ شامل کر رہے ہیں۔"

صاف تبلاتا ہے کہ آپ کے دل میں بھی اپنی مادری زبان کی محبت ابھی تک موجود ہے اور غالباً اسی لئے آپ کو یہ اندیشہ بھی ہے کہ:۔

"اس وقت ہندی اور اُردو جس چال سے بڑھ رہی ہیں ان کا نتیجہ صاف یہ ہے کہ یہ دونوں بالکل علیحدہ ہو جائیں گی۔"

علیحدہ تو جناب یہ ایک دوسرے سے اسی روز ہو چکی تھیں جس روز بقول بابو راجندر پرشاد صاحب کانگرس نے اُسے "راشٹر بھاشا" تسلیم کر لیا تھا۔ یہ راشٹر بھاشا کم از کم مسلمان تو کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس زبان کا قبول کرنا اُردو کی ترقی، سلاست اور دلکشی کو تباہ کرنے کے مترادف ہے۔

آصف علی صاحب چاہتے ہیں کہ جدید زبان بنانے کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائے۔ اس سے پھر یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ آپ بھی اُردو زبان سے کچھ بیزار ہی معلوم ہوتے ہیں۔ یا ممکن ہے کانگرسی نقطۂ نظر سے یہ اظہار فرمایا جا رہا ہے۔ گستاخی معاف! کسی مُلک کی زبان کمیٹیاں نہیں بنایا کرتیں، زبان بنانے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں اہلِ قلم کہا جاتا ہے۔ اس میں مذہب اور قومیت کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ یہاں پوتّر اور شُدھ کا جھگڑا پیدا نہیں ہوتا بلکہ سوال ایک قومی یا مُلکی ضرورت کا ہوتا ہے۔ علم و ادب کی خدمت مدِ نظر ہوتی ہے۔

آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

"اُردو، ہندی اور ہندوستانی تین زبانیں ہیں، اُردو تو بن چکی اور ہندی بھی تقریباً مکمل ہو چکی ہے، ان دونوں

کے سنجوگ سے جو آسان زبان بنے گی وہ ہندوستانی ہے"۔

اِس سے کم از کم اتنا تو معلوم ہو گیا کہ جس زبان میں آپ نے تقریر کی ہے آپ اُسے ہندوستانی کہنے کے لئے تیار نہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ آپ سر تیج بہادر سپرو کی بھی وہ تقریر پڑھ لیتے جس میں اُنہوں نے زبان کے مسئلہ پر نہایت کھُلے الفاظ میں روشنی ڈالی ہے۔

سر تیج بہادر سپرو نے جس طرح اُردو کی حمایت کی ہے اُردو کے مخالفین کا مُنہ بند کرنے کے لئے کافی ہے۔ لیکن اگر اس پر بھی کوئی قائل نہ ہو تو سنئے مسٹر سبھاس چندر بوس کانگرس کے اجلاس کے صدارتی خطبہ میں قومی زبان کے متعلق کیا فرما چکے ہیں:-

"جہاں تک ہماری قومی زبان کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہندی اور اُردو کا فرق مصنوعی ہے۔ ہماری حقیقی اور فطری قومی زبان وہی ہے جسے نہ ہندی کہا جا سکتا ہے اور نہ اُردو۔ بلکہ جو دونوں کا مرکب ہے۔ اور یہ وہی زبان ہے جو ملک کے ایک بڑے حصے میں عام طور پر بولی جاتی ہے"۔

مسٹر آصف علی فرماتے ہیں: "جہاں تک علمی مضامین کا تعلق ہے۔ ہندی اُردو کا جوڑ ہونا ناممکن ہے"۔

لیکن یہ کب سے ناممکن ہو گیا۔ یہ مشکل پیدا کب سے ہوئی۔ میرے خیال میں اگر آپ نے اپنے ملک کے ادب کی تاریخ پر ایک نظر ڈال لی ہوتی تو شاید آپ اس مشکل کا ذکر نہ کرتے۔

آپ فرماتے ہیں: "تمام ہندوستان کی زبان سے اخذ کر کے ایک ایسی کھچڑی تیار کرنی چاہئے جو سب کی سمجھ میں آئے"۔

کیا اچھا ہوتا کہ آپ اس "کھچڑی زبان" کی دو چار مثالیں بھی پیش کر دیتے تا کہ آپ کی مجوزہ کمیٹی کو کھچڑی بنانے میں سہولت ہوتی۔

آپ کہتے ہیں:-

"ہندوستان تو کئی دیسوں کا مہا دیس ہے۔ رہنے سہنے کے طریقے ایک ہونے کے باوجود زبان ایک نہیں۔

تمام ہندوستان کی زبان نہ تو موجودہ ہندی ہی ہو سکتی ہے اور نہ موجودہ اُردو"۔

یہ تو ٹھیک ہے کہ ہندوستان کئی دیسوں کا مہا دیس ہے۔ لیکن جناب والا یوپی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے رہنے سہنے کے طریق ایک ہوں تو ہوں یہاں پنجاب اور صوبہ سرحد میں تو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ آپ ہندوستان کی ایک زبان ہونے کا دکھڑا تو لے بیٹھے لیکن فرمایئے انگلستان میں کیا حالت ہے۔ ان لوگوں کو آپ کی طرح یہ خیال کیوں پیدا نہیں ہوتا کہ سارے انگلستان میں ایک ہی زبان بولی جائے۔ رہا آپ کا یہ ارشاد کہ "تمام ہندوستان کی زبان نہ تو موجودہ ہندی ہی ہو سکتی ہے اور نہ موجودہ اُردو" تو عرض یہ ہے کہ ہندی کے متعلق تو میں کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا، ہاں اُردو کو ضرور ملیامیٹ کر دینا چاہئے۔ کیونکہ کانگرس اسے ملک کی زبان تسلیم نہیں کرتی۔

اِن سطور کے پڑھنے سے اتنا تو ظاہر ہے کہ ہندو صاحبان موجودہ اُردو کو مُلکی یا قومی زبان تسلیم کرنے پر نہ صرف آمادہ نہیں، بلکہ اس کی تخریب کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔

اس قسم کی نفاق انگیز تحریکوں کا سب سے بڑا باعث کانگرس کا ملک کے نظم ونسق میں اقتدار ہے۔ کانگرس سے مسلمانوں کو کسی قسم کی اُمید رکھنا محض طفلانہ آرزو ہے۔ کانگرس نے ہر گام اور ہر میدان میں مسلمانوں سے مل جل کر کام کرنے سے گریز کیا ہے۔

دُوسرا باعث غالباً یہ ہے کہ ہندو ہندوستان کو خالص ہندوؤں کا ملک سمجھتا ہے۔ جیسے کہ ہندو مہا سبھا کے صدر ساورکر نے کہیں بنگال میں کسی کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ:۔

"ہندوستان ہندوؤں کا ہے، اس میں عام قومیں شہولوں کی طرح تو رہ سکتی ہیں لیکن راج ہندوؤں کا ہی ہوگا۔ کیونکہ وہ اس مُلک کے مالک ہیں۔"

اسی طرح اسی کانفرنس میں مسلمانوں کے دیرینہ کرم فرما ڈاکٹر مونجے نے اپنی تقریر کے دَوران میں کہا کہ:۔

"مَیں ایک مدت تک اس سوال پر غور کرتا رہا ہوں کہ ہندوستان کس کا ہے۔ آخر ایک دن والمیکی رامائن پڑھتے ہوئے ایک جگہ یہ فقرہ نظر پڑا:۔

'والمیکی کی موت کے وقت بالی نے اُس سے پوچھا کہ تُو اس ملک میں کیونکر آیا۔ اُس نے جواب دیا کہ مَیں اس مُلک میں اجنبی نہیں ہوں۔ میرے باپ دادا نے اس مُلک کو فتح کیا تھا'

بس اس سے مجھے یقین ہوگیا کہ واقعی یہ مُلک ہندوؤں کا ہے۔"

اب فرمائیے جب ملک میں اس قسم کے لال بجھکڑ موجود ہوں تو اُن سے اور توقع کیا ہو سکتی ہے۔ ابھی تو یہ لوگ زبان کی گتھیاں سلجھانے میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن وہ دن بھی کچھ دُور نہیں جب کھدر کی دھوتی اور گاندھی ٹوپی پہننے پر عام ہندوستانیوں کو مجبور کیا جائے گا۔

اُردو کی مخالفت کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ یہ غریب مسلمانوں سے منسوب ہے۔ ہندوستان میں اس وقت ۱۷۹۲ اخبارات و رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں سے ہندی میں چھپنے والوں کی تعداد ۴۱۰ ہے اور اُردو میں ۸۱۳ شائع ہو رہے ہیں۔ ہندی کے ۱۰۶ ہفتہ وار اخبار ہیں اور اُردو کے ۲۴۲۔ ہندی کے ۳۰ روزانہ چھپنے والے پرچے ہیں اور اُردو کے ۵۷۔ باقی ہندوستان کی اَور زبانوں میں شائع ہوتے ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اُردو کہاں تک مُلک میں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔

اَور لیجئے! ابھی حال ہی میں آل انڈیا ریڈیو بمبئی کی طرف سے اپنے سُننے والوں سے پُوچھا گیا تھا کہ آپ کونسی زبان میں پروگرام سُننا پسند کریں گے۔ اس کا جواب ملاحظہ فرمائیے۔

ہندوستانی	انگریزی	گجراتی	مرہٹی	ہندی
۲۵۶۷	۲۵۳۲	۱۷۴۲	۱۵۵۹	۰

یعنی احاطہ بمبئی کے تقریباً آٹھ ہزار ریڈیو سُننے والوں میں سے باسٹھ فیصدی ہندوستانی کے حق میں ہیں۔ اس کے بعد دوسرا سوال یہ

تھا کہ اگر صرف ایک ہی زبان میں براڈکاسٹ کیا جائے تو آپ کونسی زبان پسند کریں گے۔ اس کا جواب یہ ملا۔

ہندوستانی	انگریزی	گجراتی	مرہٹی	ہندی
۳۶۵۰	۱۷۴۷	۹۲۰	۸۲۵	۰

پھر کلکتہ، دہلی اور مدراس کے ریڈیو سننے والوں سے پُوچھا گیا کہ آپ کس زبان کو پسند کرتے ہیں۔ اس کا جواب ملاحظہ کیجئے:۔

	ہندوستانی	انگریزی	بنگالی	
کلکتہ:۔	۳۵۴۹	۱۷۵۴	۳۹۹	
	ہندوستانی	انگریزی	ہندی	
دہلی:۔	۳۸۴۸	۱۷۳۶	۰	
	ہندوستانی	انگریزی	تامل	تلنگی
مدراس:۔	۳۵۲۵	۱۷۸۱	۳۹۴	۲۱۹

ان اعداد و شمار سے بھی صاف معلوم ہو رہا ہے کہ ملک کا ہر گوشہ کانگرس کی راشٹر بھاشا عرف جدید ہندوستانی کو پسند نہیں کرتا۔

اب ذرا آپ آل انڈیا ریڈیو مدراس کے پروگرام ملاحظہ فرمائیں۔ ان میں آپ کو ایک فی صدی بھی ہندوستانی پروگرام نظر نہ آئے گا۔ گویا مدراس میں اُردو یا ہندوستانی بولنے، سمجھنے، پڑھنے والے نام کو بھی نہیں، یہ سب وہاں کی کانگرسی وزارت کی کرامت ہے کہ اُردو کا سرکاری محکمہ میں سے نام و نشان تک ہٹا دیا گیا ہے۔

آپ آل انڈیا ریڈیو دہلی ہی کو لیجیے۔ ہندوستانی میں جب خبریں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ حضرت جو یہ خبریں نشر کرنے پر مقرر ہیں خوب دل کھول کر ہندی کے ایسے الفاظ جنہیں عام لوگ نہیں سمجھ سکتے استعمال کرتے رہتے ہیں، حالانکہ آل انڈیا ریڈیو دہلی بھی سرکاری محکمہ ہی ہے لیکن ہزار آفریں ہے مسلمانوں پر جو یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ اُردو کی حفاظت کے لئے انجمنیں تو کافی بن چکی ہیں لیکن یہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا کہ ان انجمنوں نے کام کیا کیا ہے۔ حالانکہ یہ ان ہی انجمنوں کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کی غیر آئینی حرکات پر آواز بلند کریں ؎

یہ غفلتیں مبادا کچھ روزِ بد دکھائیں

دُھندلے سے کچھ نشاں ہیں ڈر ہے کہ مٹ جائیں

(ایم اسلم) ——— "ساقی"

کانگریس کی مصنوعی "ہندوستانی" زبان

آدھی اُردو ۔ آدھی ہندی اور کچھ انگریزی الفاظ

منقول از "ریاست" دہلی

مطبوعات

برطانوی ہند کی تاریخ اور اس کے مؤرخین از ڈاکٹر سر شفاعت احمد خاں۔ حجم ۲۰۰ صفحات۔ مجلد۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔ پبلشر کتابستان الہ آباد و لندن۔ قیمت درج نہیں۔

وفاقی مالیات از ڈاکٹر سر شفاعت احمد خاں۔ حجم ۱۴۵ صفحات۔ مجلد۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔ قیمت ۱۲ آنے۔ پبلشر بڑودہ اسٹیٹ پریس۔

یہ دونوں کتابیں انگریزی میں ہیں اور ان کے نام یہ ہیں:-

The History and Historians of British India.

Federal Finance.

دونوں کتابیں فی الحقیقت اُن لکچروں کا مجموعہ ہیں جو فاضل مصنف نے ریاست بڑودہ کے ایما سے ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء میں بڑودہ میں کیے۔ ان کی تعریف تحصیلِ حاصل ہے۔ ماہرین اور طلبہ ان سے یکساں استفادہ کر سکتے ہیں۔ (ب۔ ل)

کالیداس اور ودیا۔ یہ پنڈت جگدیش چندر جوش کا ایک ڈراما ہے۔ کالیداس کے متعلق روایت ہے کہ جب وہ اپنی پڑھی لکھی بیوی کے سامنے گیا تو اس کے گنوارپن سے اکتا کر بیوی نے اسے دھکا دے دیا۔ نیچے کالی کا مندر تھا۔ مندر کی تعمیری وضع ظاہر ہے کہ گرنے والے کو صحیح سالم نہیں رہنے دیتی۔ وہ زخمی ہوا۔ خون میں خود بھی لت پت ہوا اور مندر کو بھی لت پت کر دیا۔ کالی جو ہمیشہ خون کی بھینٹ سے خوش ہوتی ہے اس پر مہربان ہوئی اور اسے عالم بنا دیا۔"

پنڈت صاحب نے اسی روایت پر اپنے ڈرامے کی بنیاد رکھی ہے۔ ڈراما دلچسپ ہے۔ قیمت مجلد ۱ روپیہ۔ پتہ: ودیا پبلشنگ ہاؤس انبالہ چھاؤنی۔

ماتا ہری از خلیل احمد صاحب ایڈیٹر ریحان لاہور۔ یہ یورپ کی مشہور جاسوس قاصہ کی دلچسپ داستانِ زندگی ہے۔ مولانا عبدالمجید سالک مدیر انقلاب نے نہایت خوش اسلوبی سے اس کا دیباچہ لکھا ہے۔ دیباچہ بھی کتاب ہی کی طرح دلچسپ ہے۔ خلیل صاحب نے واقعات کی ترتیب میں خاص اہتمام سے کام لیا ہے۔ کتاب معلومات سے پُر اور پڑھنے کے قابل ہے۔ حجم ۲۰۵ صفحات۔ جلد اور کاغذ عمدہ۔ قیمت درج نہیں۔ مصنف سے طلب فرمائیے۔

ہونہار۔ بچوں کا یہ ماہوار رسالہ انیس الرحمن اور اسلم جی صاحبان کی ادارت میں لہریا سرائے (دربھنگہ بہار) سے نکلتا ہے۔ اس کا حجم تقریباً ۲۰ صفحے ہوتا ہے۔ رسالہ صاف لکھا ہوا اور رنگین اور مصوری کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ نظمیں، مضمون اور افسانے دلچسپ اور مفید ہوتے ہیں۔ زبان سادہ اور سلیس ہے لیکن کہیں کہیں غیر ضروری طور پر نامانوس ہندی الفاظ نظر آتے ہیں جن کی تشریح حاشیہ میں کر دی جاتی ہے۔ مثلاً اندولن کا ترجمہ حاشیہ میں (تحریک) کا لکھا جاتا ہے۔ مضامین ایسے جمع کیے جاتے ہیں جو بچوں کی معلومات میں مفید اضافہ کرتے ہیں۔ تصویریں بھی اچھی ہی ہوتی ہیں۔ یہ رسالہ قابلِ قدر [illegible]

اردو میں جدید افکار و خیالات کی ایک ہنگامہ خیز تصنیف

مضامینِ فلک پیما

یہ خان بہادر میاں عبدالعزیز صاحب ایم اے وزیر مالیات ریاست جے پور کے اُن ہنگامہ خیز مضامین کا مجموعہ ہے جو گزشتہ سترہ سال سے رسالہ "ہمایوں" میں شائع ہو کر اہلِ نظر سے خراجِ تحسین وصول کرتے رہے ہیں۔

فلک پیما کے خیالات میں حقیقی تازگی ہے۔ وُہ ہر بات اور ہر چیز کو ایک ایسے نئے زاویہ سے دیکھتے ہیں جو دوسروں کی رسائی سے بہت بلند ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرسری نظر سے دیکھنے والوں کے لئے اُن کے خیالات میں عموماً اختلاف کی گنجائش ہوتی ہے لیکن نکتہ رس جانتے ہیں کہ فلک پیما کا زورِ بیان اور ندرتِ خیال کیونکر بظاہر ناممکن باتوں کو ممکن کر دکھاتی ہے۔

ایشیا کیلئے فلک پیما کا فلسفہ نیا ہے۔ وُہ دردو غم اور یاس و قنوط کے بجائے زندگی کی سچی خوشیوں اور رجائیت امیدوں کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ وُہ دُنیا کو جہنم نہیں، جنت بنانا چاہتے ہیں۔

مذہب کے متعلق اُن کے خیالات بعض کوتاہ بیں لوگوں کے دل میں غلط فہمی پیدا کر سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ اشارات و کنایات میں مذہب کے اُن جھوٹے اجارہ داروں کی بُری گت بناتے ہیں جنہوں نے مذہب کو اپنے ذاتی مقاصد کے سانچے میں ڈھال رکھا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ فلک پیما کے اس قسم کے مضامین کے بین السطور میں کسی عارفِ کامل کے دِل کی تڑپ اپنی جھلکیاں دکھا رہی ہے۔

ترقی پسندی، اُپج اور پاکیزگی فلک پیما کے مضامین کے امتیازی اوصاف ہیں۔ اگر ہم انہیں ہندوستان کے ترقی پسند اُدبار کا رہنمائے اعظم کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

مضامینِ فلک پیما کا حجم ۳۸۰ صفحات ہے۔ کاغذ کتابت اور طباعت نہایت نفیس ہے۔

قیمت صرف (۲/۸) دو روپے آٹھ آنے ——————— مع محصول ڈاک

مینیجر رسالہ ہمایوں ۲۳ لارنس روڈ لاہور سے منگائیے۔

مقامی ایجنٹ:۔ اُردو اکیڈیمی پنجاب، بیرون لوہاری گیٹ لاہور

ایک سو

برس کی عمر کا راز

جو ۱۸۳۹ء سے ۱۹۳۹ء تک پہنچکر

کارخانہ

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو

نے حاصل کی

مال کی عمدگی دیانتداری اور خوش معاملگی

ہے

قواعد

۱۔ "ھمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں۔

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ۱؍ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جاسکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہئے اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتہً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے لئے ۱؍ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہئے۔

۹۔ قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۸؍

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجیے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھیے۔

مینیجر رسالہ ہمایوں
۲۳۔ لارنس روڈ۔ لاہور

The Title Page and Picture Printed at the Half-Tone Press, Langley Road, Ram Nagar Lahore.

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(رہبر)

بیادگار علامہ فضیلے آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر حامد علی خاں، بی۔ اے

فہرست مضامین

"ہمایوں" بابت ماہ نومبر ۱۹۳۹ء

جلد (۳۶) — نمبر (۵)

تصویر:- ماں اور بچہ

قارئینِ ہمایوں!

جنگِ فرنگ نے کاغذ اور دُوسرے سامانِ طباعت کی گرانی سے جرائد و رسائل کے لئے جو مشکلات پیدا کردی ہیں اُن کا ذکر آپ متواتر سنتے رہے ہیں۔ یہ بارہا دُہرایا ہُوا قصہ ایک بار پھر دُہرا کر ہم نہ "ہمایوں" کا حجم کم کرنے کا داعیہ رکھتے ہیں، نہ گھٹیا کاغذ استعمال کرنے کی سبیل ڈھونڈتے ہیں اور نہ چندے میں اضافے کی راہ نکالنا چاہتے ہیں ہم تا بہ مقدور ہر شعبے میں "ہمایوں" کا موجودہ نفیس معیار قائم رکھنے کی کوشش کریں گے۔

اگر "ہمایوں" آپ کی زبان، ادب، یا معاشرہ کی کوئی خدمت انجام دے رہا ہے تو یہ بات ہم سے زیادہ آپ پر روشن ہوگی اور اُس کی موجودہ حیثیت کو قائم رکھنے کی آپ کو بھی ویسی ہی آرزو ہوگی جیسی ہمیں ہے۔

آپ سے "ہمایوں" کی ترقیٔ اشاعت کے لئے التجا کی جائے تو یہ اب ایک ایسی پھیکی سیٹھی اور بے مزہ بات ہوگئی ہے جو غالباً درخورِ سماعت بھی نہیں رہی۔

ہم آپ پر کوئی بے جا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتے۔ اگر آپ صرف اتنی ہی تکلیف گوارا کریں کہ اپنی میعادِ خریداری کے ختم ہو جانے پر دوبارہ اپنا چندہ بھیج کر سلسلۂ معاونت جاری رکھیں تو بڑی عنایت ہو۔ لیکن یہ درخواست بھی صرف اُسی صُورت میں توجہ کی مستحق ہے کہ "ہمایوں" آپ کی یا آپ کے متعلقین کی ذہنی و روحانی ضروریات کو پُورا کرتا ہو۔

ہمیں توقع ہے کہ یہ چند حروف سننے والے کانوں تک پہنچ سکیں گے۔

جائنٹ ایڈیٹر "ہمایوں"

جہاں نما

جنگ میں ہندوستان کو امکانی خطرات

ہندوستان کے کمانڈر ان چیف نے حال ہی میں شملے سے ایک تقریر نشر کی تھی جس میں اُنہوں نے موجودہ بین الاقوامی کشمکش کو پیشِ نظر رکھ کر اُن خطرات پر ایک نظر ڈالی تھی جن کی زد میں اس کشمکش کے نتیجے کے طور پر یہ ملک بھی آسکتا ہے۔ تقریر کا ملخص حسب ذیل ہے:۔

"جن لوگوں کو ۱۹۱۴ء ۔ ۱۸ء کی جنگ یاد ہے، وہ جانتے ہیں کہ اگرچہ ہندوستانی فوجیں حدودِ ملک سے باہر جاکر عراق، افریقہ اور یورپ میں بھی لڑتی رہیں لیکن ہندوستان جنگ کے مراکز سے بہت دُور رہا اور اس کے لئے کسی قسم کا خطرہ پیدا نہ ہوا تھا۔ اگر ہم موجودہ جنگ میں بھی ہندوستان کو خطرات سے اتنا ہی ماورا تصور کریں تو یہ دانشمندی سے بعید ہوگا۔ مشرق کی طرف نظر ڈالو اور سوچو کہ اگر ملایا اور وہاں کی عظیم الشان چھاؤنی سنگاپور دُشمن کے ہاتھوں میں چلی جائے تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ برطانی بحری بیڑے سے اس کا عظیم الشان مشرقی مرکز چھن جائے گا اور کلکتہ سے لے کر مدراس تک ہندوستان کا تمام مشرقی ساحل بحری اور ہوائی حملوں کی زد میں آجائے گا۔ ملایا کا چھن جانا برما کے لئے بھی خطرات پیدا کردے گا۔ نپولین نے اینٹورپ پر قابض ہونے کے بعد کہا تھا کہ اس کی حیثیت برطانیہ کے لئے ایک پستول کی سی ہے جس کا نشانہ اس کے قلب کی طرف ہے۔ اگر برما دُشمن کے ہاتھوں میں چلا گیا تو یہ بھی بنگال کے قلب کے لئے ایک ویسا ہی پستول بن جائے گا۔

مغرب کی طرف بحیرۂ احمر اور مصر کی طرف ایک نظر ڈالو۔ جب تک ہمارا حلیف مصر آزاد خود مختار اور اغیار کے حملوں کی مدافعت کے قابل ہے اس وقت تک بحرِ ہند اور ہندوستان کے مغربی ساحل خطرات کی زد سے باہر ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کی حفاظت کے لئے یہ بات نہایت اہم ہے کہ مصر اور عدن کبھی دُشمنوں کے قبضے میں نہ جائیں۔

گزشتہ چند سال سے دُنیا کے حالات نے جو پلٹا کھایا ہے اس کی وجہ سے یہ مقامات جو میں نے گنائے ہیں ہندوستان کی حفاظت کے لئے بہت اہم ہوگئے ہیں، یہ گویا ہندوستان کی سرحدی چھاؤنیاں ہیں۔ مشرق کی طرف سنگاپور، ملایا اور برما اور مغرب کی طرف مصر، عدن اور خلیج فارس کے خطے۔ اگر یہ علاقے دشمن کے ہاتھ میں چلے جائیں تو ہندوستان کی

حکومت خطرے میں پڑ جائے گی۔ خوش قسمتی سے ہمیں ان مقامات کی اہمیت کا احساس پیدا ہو چکا ہے، اور ایسے انتظامات کئے جا چکے ہیں کہ ان مقامات کا دشمن کے ہاتھ میں جانا تقریباً ناممکن معلوم ہوتا ہے، بالخصوص اس وقت تک جب تک ہمیں ٹرکی، عراق اور مصر کی حمایت حاصل ہے۔ ہر اس مقام پر جہاں سے ہندوستان کو کوئی خطرہ ہو سکتا ہے، برطانی چھاؤنیاں قائم ہو چکی ہیں اور مصر میں تو مصری فوج بھی ہے۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یورپ میں اس قسم کے حالات بھی پیدا ہو سکتے ہیں کہ برطانیہ کو وہاں اپنی تمام بری بحری اور ہوائی طاقت مرتکز کرنے کی ضرورت پیش آ جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ وقت کے لئے بحری اور بری ذرائع آمد و رفت مسدود ہو جائیں اور سویز کے مشرقی حصے کی طرف برطانیہ بروقت مدد پہنچانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ان حالات میں اُن ملکوں سے جن کا نام میں پہلے لے چکا ہوں۔ ہندوستان کو بروقت کمک حاصل ہو سکتی ہے"۔

"رہنمائے سیاست"

کارل چپیک نے موجودہ زندگی کے مشاہدے سے چند دلچسپ خیالات اخذ کئے ہیں، گو بظاہر یہ مزاحیہ معلوم ہوں، لیکن در اصل یہ آج کل کی بین الاقوامی زندگی کی اصلی صورت کو بڑی خوبی سے بے نقاب کر کے دکھا رہے ہیں:۔

"معاہدے اس لئے کئے جاتے ہیں کہ کمزور قومیں اُن کی پابند رہیں۔

"سیاسی مدبرین کی کوششیں بین الاقوامی عدم تحفظ کو کاملاً قائم رکھنے میں کامیاب ہو گئی ہیں۔

"امن قائم رکھنے کے لئے کمزور اور مظلوم قوموں کے خلاف فوری اور قاطع تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔

"جنگ کو ایک خاص علاقے تک محدود رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ مظلوم کو اُس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

"جنگ کو ختم کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہی مظلوم کے ہاتھ پاؤں بھی کاٹ دیئے جائیں۔

"امن قائم رکھنے کے لئے دُوسرے جو قُربانی بھی کریں کم ہے۔

"کہیں آگ لگے تو بہت سے لوگ اپنی ہنڈیا گرم کرنے لگتے ہیں۔

"چیکوسلوویکیا فروخت نہیں کیا گیا۔ مفت لٹا دیا گیا ہے۔"

اخبارات کی طاقت

[illegible]

بلند مناصب حاصل کرتے رہے ہیں مثلاً لینن اور ٹراٹسکی نے ابتدا میں انقلابی صحائف جاری کر رکھے تھے اور کرنسکی کے عہد اقتدار میں سٹالن بھی پیٹروگراڈ میں ایک اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ اٹلی میں مسولینی کی اشتراکی صحافت نے ایک زمانے میں غلغلہ برپا کر رکھا تھا۔ آخر فرانسیسی حکومت نے اتحادیوں کی حمایت کے لئے ایک اخبار جاری کیا اور اس کی ادارت بھی مسولینی کے سپرد کی گئی۔ اسی دوران میں فاشسزم کی ابتدا ہوئی۔ کسی زمانے میں کمال اتاترک بھی ایک باغیانہ پرچہ شائع کیا کرتا تھا۔ ہٹلر کے اخبار کا نام ہو بیچر تھا۔ فرانس کے ہر وزیر اعظم کا اپنا الگ اخبار ہوتا ہے کیونکہ یورپ میں صحافت ہی وہ حربہ ہے جس سے افراد اور جماعتیں برسرِ اقتدار آنے کے لئے لڑتی ہیں"۔

سینما اور ہندوستان

ہندوستان میں سینما کے کام نے ایک قلیل مدت میں جو ترقی کی ہے اس کو پیش نظر رکھ کر یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ابھی اس صنعت کی توسیع و ترقی کے لئے اس ملک میں عظیم الشان امکانات موجود ہیں۔

ممالک متحدہ امریکا میں ۱۳۰۰۰۰۰۰ کی آبادی کے لئے ۲۰۰۰۰ سینما قائم ہیں اور ان میں ہر ہفتے ۔۔۔۔۔۔۔ تماشائی جاتے ہیں۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ دنیا بھر میں ۶۰۰۰۰ سینما گھر ہیں اور ان میں ہر ہفتے ۲۰۰۰۰۰۰۰۰ تماشائی جاتے ہیں۔

ہندوستان کی آبادی ۳۷۰۰۰۰۰۰۰ افراد پر مشتمل ہے اور یہ آبادی دنیا کی کل آبادی کا ۱/۵ حصہ ہے لیکن اس ملک میں اب تک تقریباً صرف ۱۰۰۰ سینما گھر قائم ہوئے ہیں۔ ملک کی اقتصادی اور تعلیمی ترقی کے ساتھ ساتھ اس تعداد میں یقیناً اضافہ ہو گا۔

کچھ عرصہ ہوا "انڈین پکچر کانگریس" نے اس بات کی سخت شکایت کی تھی کہ ہندوستان میں فلم سازی کی صنعت اقتصادی امداد سے بہت بری طرح محروم ہے۔ اس شکایت کا ازالہ صرف حکومت ہی کر سکتی ہے۔

امنِ عالم کے لئے آفاقی ذہنیت کی ضرورت

"انڈین ریویو" نے دنیا کو عالمگیر اخوت کا ایک نظام قائم کرنے کی دعوت دی ہے اور اس بات پر اظہار افسوس کیا ہے کہ دنیا میں کوئی ایسی قوم موجود نہیں جس کی حکومت کے ارکان یہ آواز بلند کریں کہ ہمیں اپنی ہمسایہ قوم کی فلاح و بہبود کا بھی اسی طرح خیال رکھنا چاہئے جس طرح ہم اپنی قوم کی فلاح و بہبود کا خیال رکھتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے :-

"اگر دُنیا میں ایسی قومیں موجود ہوتیں اور اُن قوموں کی حکومتوں کے ایسے رہنما بھی ہوتے تو حبشہ اور البانیا اٹلی کے قدموں تلے نہ روندے جاتے۔ جاپان چین کی سرزمین پر خدا کا قہر و غضب بن کر نازل نہ ہوتا اور آسٹریا چیکوسلوویکیا اور پولینڈ جرمنی کی جُوع الارض کا شکار نہ ہو جاتے۔

"دُنیا میں امن قائم کرنے کے لئے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ قوموں میں "آفاقی" ذہنیت کے رہنما اور سیاسی مدبرین پیدا ہوں جو اقوام عالم کی ذہنیت کو بھی اپنی طرح "آفاقی" بنا دیں اور امن و صلح کی اس نئی دنیا کے لوگ ہر ایسے موقع پر جب رجعت پسند دنیا میں کوئی جھگڑا پیدا ہو ثالث بالخیر کا فرض انجام دیا کریں"۔

"انڈین ریویو" شاید یہ بھول گیا ہے کہ انگریزی حکومت جو ہر دوسری حکومت کی بھی اپنی ہی طرح خیر خواہ ہے دنیا میں موجود ہے، اور اپنی "آفاقی ذہنیت" کے ساتھ وہ ہر موقع پر صلح و امن کے لئے ثالث بالخیر بننے کو تیار ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ نہ اُس کی جاپان سُنتا ہے نہ مسولینی اور نہ کمبخت ہٹلر!

برطانیہ کو "ڈیلی ہیرلڈ" کی تنبیہ

انگلستان کا اخبار "ڈیلی ہیرلڈ" گاندھی صاحب کے ایک پیغام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

". . . . . . اگر ہمیں جنگ میں ہندوستان کے پورے پورے تعاون کی ضرورت ہے اور اس میں شک نہیں کہ ہم بُری طرح اس کی ضرورت محسوس کر سکتے ہیں تو یہ تعاون رضا کارانہ ہونا چاہئے۔ اس مرتبہ یہ تعاون ہمیں اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک ہم اپنی نیک نیتی کا ویسا ہی ثبوت پیش نہ کریں جیسے ثبوت کا مطالبہ خود ہم نے ہر ہٹلر سے کیا تھا یعنی "محض الفاظ نہیں بلکہ عمل!"

آخر کانگریس کا مطالبہ کیا ہے۔ صرف اس قدر کہ اعلان کر دیا جائے کہ اس جنگ کے مقاصد میں یہ بھی شامل ہے کہ ہندوستان ایک ایسے چارٹر کی دفعات کے مطابق آزاد کر دیا جائے گا جسے خود اس مُلک کے منتخب نمائندے مرتب کریں گے کسی ناقابل عمل طور پر فوری ردّ و بدل کا مطالبہ نہیں کیا گیا، ہاں واضح الفاظ میں اس اعلان کا مطالبہ کیا گیا ہے، کہ جنگ کے بعد ہندوستان کو پوری جمہوری آزادی دے دی جائے گی اور دورانِ جنگ میں بھی طرزِ حکومت کا رُخ حتی الامکان زیادہ سے زیادہ جمہوریت کی طرف پھیر دیا جائے گا"

"ڈیلی ہیرلڈ" کی آواز بلند سہی لیکن انگلستان کے نقار خانے میں اس طوطی کی کون سُنتا ہے۔

رفاہِ عامہ اور ہندوستان کی صوبجاتی حکومتیں

ہندوستان کے مختلف صوبوں کی حکومتیں رفاہِ عامہ کے مختلف شعبوں میں جو کچھ صرف کر رہی ہیں، اس کا اندازہ ذیل کے اعداد و شمار سے ہو سکتا ہے۔ ان اعداد و شمار کا تعلق اقتصادی سال رواں سے ہے۔

رفاہِ عامہ کے امور میں تعلیم، حفظانِ صحت، دواسازی، زراعت، امداد باہمی اور علاج حیوانات وغیرہ کے صیغے شامل ہیں۔ ذیل کے نقشے سے معلوم ہوگا کہ ہر صوبہ کی آمدنی میں سے فی صدی کتنی رقم امورِ رفاہ عامہ پر صرف کی جاتی ہے:۔

صوبہ		
صوبجاتِ متحدہ	۳۰٫۷	فی صدی
پنجاب	۲۹٫۵	" "
مدراس	۲۸٫۷	" "
بہار	۲۷٫۸	" "
بمبئی	۲۶٫۲	" "
اُڑیسہ	۲۵٫۸	" "
آسام	۲۵٫۵	" "
بنگال	۲۴٫۳	" "
صوبہ سرحد	۲۲٫۴	" "
صوبہ متوسط و برار	۲۱٫۱	" "
سندھ	۱۳٫۰۱	" "

صوبجاتِ متحدہ کا نمبر اول ہے اس کے بعد پنجاب نہایت بلند دوسرے درجے پر ہے، لیکن یہ بلند درجے بھی اُس وقت کچھ زیادہ قابلِ فخر معلوم نہیں ہوتے جب ہم آزاد ممالک اور اُن کے ہاں رفاہِ عامہ کے امور کے مصارف کی مقدار پر نظر ڈالتے ہیں، اپنے اوّل اور دوم درجے کے صوبوں کے مصارف کی مقدار کو دیکھ کر ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ ؏

جس کی بہار یہ ہو پھر اُس کی خزاں نہ پوچھ

حامد علی خاں

جینا حقیقت ہے۔ مٹنا فریب اور وہم۔

فضائے عالم کی "کھلی قتل گاہ" میں زندگی ہی کارفرما ہے۔ کچھ بھی محض مٹ جانے کے لئے نہیں مٹتا۔ مٹنے میں جینا ہے۔ عدم میں ہستی۔

خزاں میں یونہی اُلٹ پھیر ہے۔ پھول پھل، پتے مرجھاتے رہتے ہیں، گرتے رہتے ہیں۔ اور یہ اس لئے کہ نئی، ہری بھری خوبصورت کونپلیں اور رنگ برنگ کے پھول کھلیں اور کھلتے رہیں اور فطرت کا حُسن سدا بہار رہے۔

ذہنی اور روحانی دُنیا میں کب کچھ کبھی مٹتا ہے؟۔ یونہی دم بھر کے لئے دماغ میں اُٹھنے والے برق رفتار خیال، تکمیل پانے والے دلفریب ارادے، تشنہ کام جذبات و تصورات، یہ بھی نہیں مٹتے۔ گو شعور کی آنکھ سے اوجھل ہو جائیں لیکن غیر شعوری طور پر دل میں موجود رہتے ہیں۔ شعور نامعلوم طور پر ہمیشہ اُن سے متاثر رہتا ہے۔ زندگی میں تسلسل انہی کے دم سے ہے۔ نہیں یہ نہیں مٹتے۔ ہمیشہ جیتے ہیں۔

حقیقت یوں معلوم ہوتی ہے کہ جو کچھ سب سے زیادہ چھپا ہوا ہے وہ سب سے زیادہ ظاہر بھی ہے اور زندہ بھی۔

انسان مجبورِ محض نہیں۔ یہ قوت ارادہ، یہ اختیار، یہ دُنیا و مافیہا کو سمجھنے کی تڑپ، یہ "اللہ میاں سے باتیں"، یہ "فلک پیمائیاں"، ممکن ہے یہ سبھی کچھ "غلط ترجمانی کا شکار رہوں"۔ دیوانگی ہو، خواب پریشاں ہو۔ لیکن یہ پگلاپن، یہ خواب "بیداری" کی بے پناہ بےبسی سے مجھے کہیں عزیز تر ہے۔ اس خواب میں زندگی ہے اور اس "بیداری" میں موت، بے چارگی اور شکست۔ موت کو کیوں تسلیم کروں؟ زندگی، تگ و دو، محبت۔ کیا میرے لئے یہ کافی نہیں؟

اب کوئی اور جانے:۔

مَوت یا زندگی؟ مٹنا یا جینا؟

سعادت علی

ماں اور بچہ

دوست اور میں

میں ۔ تم خواہ مخواہ اُلجھتے ہو، کیا کہا کہ تم بگڑے؟ بس یہی ناکہ انسان غریب کی ایک ننھا جان اور اُس پر دس بیس قسم کی مختلف دُنیاؤں کی بلائیں۔ تم سمجھتے ہو کہ دُنیا محض ایک ہے۔ کہاں ایک ہے؟ لو میرے ساتھ گِننے بیٹھو۔

اوّل ۔ بچّوں والی دُنیا ۔ میں گھر سے دُور کسی دفتر میں۔ بیوی کسی کے ہاں جانے پر۔ ایک بھولے بھالے مچھّر کی ایک بھولے بھالے بچّے سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ نتیجہ ۔ دعائیں، دوائیں، بل، بےخوابی، بدمزاجی، رنج، سکول سے ناغے، نانی کے ردِّ بلا صدقے۔

نیچر کیوں مچھّروں کو تعلیم نہیں دیتی کہ نانیوں کو کاٹیں نواسوں کو نہ چھوئیں؟ اور یہ تو بتاؤ کہ ایک خوراک دوا سے فائدہ کیوں نہیں ہوتا؟ اور دُوسری خوراک پینے پر بچّے اس قدر روتے کیوں ہیں اور تیسری خوراک پر تو گویا سارے گھر میں بھونچال سا آجاتا ہے۔ اس دُنیا کا تمہاری نفیس ادبی دُنیا سے کیا تعلق ہے؟ کیا تمہارے دو چار اچھے جملے بچّے کے بخار کو گویا باقاعدہ ورزش کا رتبہ بخش دیں گے اور بچہ پلنگ سے رستمِ ثانی ہو کر اُٹھے گا؟ بھولے دوست اللہ اللہ کرو۔ بچّوں والی دُنیا میں ادبیات محض خرافات ہیں۔

بچّے اچھے ہوں تو اور مصیبت ہے۔ جُوتے ہیں کہ اِدھر خریدو اُدھر ختم۔ جرابیں گویا پیدا ہی سُوراخ دار ہوتی ہیں اور بچّے کو صاف رکھنے والا صابن تو آج تک ایجاد ہی نہیں ہوا۔ ذرا اپنے ولیعہد بہادر کے گھٹنے کسی وقت دیکھنا۔ جھانواں ذرا ہی کم کھُردرا اور میلا ہوتا ہے۔ مگر بچے اور صفائی؛ توبہ توبہ۔ اگر پیدا ہوتے ہی بچّوں کی ناک کاٹ دی جائے تو شاید صفائی ممکن ہو۔

دوم ۔ قرض اور سُود والی دُنیا۔ یہ تو سہل ہے کہ قرض لیتے جاؤ سُود دیتے جاؤ۔ قرضدار سے یہ کہہ کر کہ "سپردم بتو مایۂ خویش را" تمسّک لکھتے جاؤ ڈگریاں کراتے جاؤ مگر جب مایۂ خویش چھوڑ مایۂ پدرِ خویش بھی نہ رہے تو پھر انسان کونسی راگنی شروع کرے۔ ہر وقت جو تم ادبیات اور موسیقی اور عالمِ حُسن کے گیت گاتے ہو تو ذرا اس دُنیا کو بھی دیکھو۔ بہی کے حساب کے لئے شیکسپیر کا کونسا Sonnet موزون ہے؟

سوم ۔ سیاسیات کی دُنیا! بس ابھی سے اُکتا گئے اور لی انگڑائی۔ کیوں حضرت آپ کو بھی تو لیڈری کی ہوس ہے۔ کیا کہنے! بس یہ چاہتے ہو کہ تم تقریریں کرتے جاؤ لوگ چندہ دیتے جائیں۔

چہارم ۔ کارخانوں کی دُنیا ۔ صرف ایک ریل کے کارخانے پر لکھنے بیٹھوں تو دس کتابیں لکھ ڈالوں۔ فورمین کو تحفے، مستری کی خوشامد، ہاتھ بھنچنے پر ہسپتال۔ پھر نوکری سے علیحدگی۔ یہ دُنیا تمہیں نہیں بھاتی۔ اچھا اور لو۔

پنجم ۔ کچہریوں اور وکیلوں کی دُنیا ۔ اس سے بھی تم باز آئے۔ اچھا تو وکیلوں کے ایجنٹوں کی دُنیا تو بالکل الگ ہے۔ اس کا ذرا سا

حال سُن لو۔ جاٹ کی دُنیا دیکھو۔ بس ختم کروں، مجھے معلوم ہے کہ تمہارے لئے صرف ایک ہی دُنیا ہے یعنی صنفِ نازک میں دلچسپیوں کی دُنیا مگر میں اس سے کوسوں دُور ہوں۔

بے بس انسان کی اکیلی اُکتائی ہوئی جان اور اس پر یہ سو سو وبال! ......

دوست۔ تمہاری بک بک سب سے بڑا وبال ہے۔ اور اب میں قائل ہوں کہ واقعی دو دُنیائیں ہیں۔ ایک جو خدا نے بنائی اور دوسری جو تم اپنی بکواس سے تعمیر کر دکھاتے ہو۔

میں۔ شوخیوں سے تم چڑاؤ، واقعات سے تم بھاگو، انسان تم سے بات کیا کرے؟

دوست۔ بہتر تو یہ ہے کہ تم بات ہی نہ کرو۔

مَیں۔ جی ہاں۔ مَیں بات نہ کروں اور آپ اوٹ پٹانگ کام کرتے چلے جائیں۔ ساری عمر میں تم نے دو چار سکولوں کی کمیٹیوں پر جو کام کیا ہے اور جس کی نسبت تمہارا خیال ہے کہ قوم ناقدر شناس ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ اگر تم دو چار قتل کر ڈالتے تو اتنا گناہ نہ ہوتا۔ آپ کی دیانت کے بھروسے پر لوگوں نے چندے دیئے، اچھے داخل کرائے مگر نتیجہ یہ ہے کہ اُستاد نالائق، طلبہ "ناکہا مان" اور منتظم کمیٹی گاہے ماہے باایمان۔ جو دو چار بچے واقعی ذہین آپ کے سکول میں داخل ہوئے۔ ان کو شعر کا چسکا لگ گیا۔ یہی ذہین لڑکے اگر کسی اچھے سکول میں جاتے تو شاید کچھ بن جاتے۔ قومی مدرسوں کا پہلا اصول یہ ہونا چاہئے کہ ذہین لڑکے داخل نہ کئے جائیں۔

دوست۔ میری قومی حرکات لغو سہی، آپ فرمایئے کہ آپ نے کیا کر دکھایا؟

مَیں۔ میرا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ ہر مفروضہ نیکی کی بیدھڑک چھان بین کرتا ہوں۔ بات جہاں سے چلی تھی وہ آپ کا مقولہ تھا کہ ادیب لوگ قوم کی بے انتہا خدمت کرتے ہیں اور مَیں نے خدمت والا میں عرض کیا تھا کہ ادیبوں کی دُنیا ایک تنگ و تاریک گوشہ ہے جسے واقعاتی دُنیاؤں سے کوئی تعلق نہیں اور اس لئے ادیب قوم کی خدمت کرنے کے نااہل ہیں۔ ادیبوں کے اعمالِ بد میں سب سے ذلیل ترین یہ ہے کہ وہ طلبہ کی دُنیا میں اپنا پرچار سُن کر خوش ہوتے ہیں۔ اگر رائی برابر ضمیر بھی کسی ادیب میں ہو تو وہ طالب علم کو مبتلائے شعر دیکھ کر رو دے۔

دوست۔ شعر کو رہنے دو۔ کیا افسانے بھی طالب علموں کے لئے مضر ہیں؟

مَیں۔ جی ہاں افسانے بالخصوص یعنی وہ جو آجکل شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ جن میں دھانی دوپٹوں کا، سُرخ نکٹائیوں کا ذکر ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے اب لڑکیاں بھی افسانے پڑھنے لگی ہیں اور ادیبوں کی ستم ظریفی میں یہ اَور اضافہ ہُوا ہے کہ افسانوں میں لڑکیوں کی طرف سے خط لکھے جاتے ہیں۔

دوست ۔ تم سمجھو کہ نئے ادیب واقعی ایک نئی دُنیا قائم کر رہے ہیں

مَیں ۔ بجا ارشاد ہوا مگر ادیبوں کی اس نئی دُنیا میں کیا ہوگا؛ زرق برق رسالے جاری ہوں گے۔ شاندار مشاعرے ہوں گے دھواں دھار تقریریں ہوں گی، ٹوپیوں کا اُترنا ساڑھیوں کا لہرانا ہوگا، مگر ہل کون چلائے گا، لکڑی کون کاٹے گا، پانی کون ڈھو کر لائے گا، چولھا کون پھونکے گا، روٹی کون کھائے گا اور تانگوں موٹروں ریلوں کے لئے پیسے کہاں سے آئیں گے ۔

دوست (غصہ سے) ادب اور پیسے! کیا پرواز ہے؟ تم سا غبی فطرت انسان (یعنی اگر تم انسان ہو) ننگِ کائنات ہے۔ خیالات میں بلندی ہو تو دولت کا کال نہیں رہتا۔ غریب محض اس لئے غریب ہیں کہ اُن کا تخیل مفلس ہے ۔

مَیں ۔ غلط قطعی غلط۔ روز پلاؤ کے خواب دیکھتا ہوں۔ پکتی وہی دال ہے ۔

فلک پیما

تماشا

زیور نصیب نہ ہوے،

نہ جی بھر کے اچھے کپڑے پہننے کو،

اور کسی نے مجھ سے شفقت کا برتاؤ بھی نہ کیا

اس گھر کی دوزخ سے آزاد ہونے کے لئے میں نے پھول کاڑھنے سیکھے ۔

میری راتیں نیند سے محروم رہیں۔

کل مُلازمت کی منظوری آگئی،

اور مَیں کائنات کی اَن جانی پہنائیوں میں ڈوب جانے کو ہوں ———

"ابنِ مریم"

اَے دوست

کل رات عجیب چاندنی تھی — دُنیا اِک مہ جبیں بنی تھی

ہر چیز خوشی میں ہنس رہی تھی — شبنم نہ تھی مے برس رہی تھی

گویا سبدِ گل و سمن تھا — رشکِ باغ عدن چمن تھا

چھائی تھی جہاں پہ دل نشینی — بُو دُوب کی آ رہی تھی بھینی

پھولوں کا نکھار دیدنی تھا — خوش تھے کہ وداعِ کمسنی تھا

دھیمی دھیمی سُلگ رہی تھی — گُلشن میں آگ لگ رہی تھی

کلیوں کی بہار دلکشا تھی — ذرّوں میں بھی شانِ کبریا تھی

ہلکی ہلکی ہوا میں خُنکی — سمجھا؟ اُن "سردیوں" کے جیسی!

مَیں خود تری لَے میں گا رہا تھا — گانا ترا یاد آ رہا تھا

تھی بزمِ طرب بہشت ساماں نغموں میں بسا ہوا تھا ایواں
لے کا جادو، صدا اثر کی مطرب کو بنا گئے پہیلی
دلکش اتنے تھے اہلِ محفل پہلو میں تڑپ کے رہ گیا دل
گلفام، حسین، ماہ پارے بدمستِ شباب چاند تارے
چہروں سے برس رہے تھے ارماں اہلِ دل کا خدا نگہباں
آنکھوں سے مے چھلک رہی تھی ساری محفل بہک رہی تھی
رفتار تھی موجِ زندگانی باتوں میں عشق کی کہانی
پھولوں کی بزم سی جمی تھی بس صدرِ چمن تری کمی تھی
تھا ان میں بھی جوشِ زندگانی بے مثل ہے پر تری جوانی
نکلا نہ کوئی جواب تیرا ان کا جلوہ، حجاب تیرا

حسن اور شباب کیا نہیں تھا
اک تو جو نہ تھا، مزا نہیں تھا

سکندر علی وجد

امیر و داغ کا مقابلہ و موازنہ

منشی امیر احمد مینائی اور نواب مرزا داغ دہلوی میں ہم عصری، ہم عمری اور ہم فنی کے ساتھ ساتھ واقعات و تعلقا
یکسانیت ایسی پائی جاتی ہے کہ اس کا سلسلہ ابتدائے عمر سے انتہائے عمر تک نہیں ٹوٹتا، جس کی مثال دوسرے نامور معا
نظر نہیں آتی۔ مثلاً امیر و داغ ایک ایک دو دو برس کے فرق سے پیدا ہوئے اور آٹھ آٹھ نو نو برس کی عمر میں یتیم ہو گئے
کی جوانی کا زمانہ دہلی اور لکھنؤ کے شاہی درباروں میں گزرا، غدر ۱۸۵۷ء کے بعد دونوں قریب قریب ایک ہی زمانے میں
پہنچے اور نواب یوسف علی خاں کے عہد سے نواب کلب علی خاں کی وفات تک چالیس برس دونوں یکجا رہے۔ اس
اگرچہ نو دس برس تک عارضی جدائی رہی مگر پھر حیدر آباد میں ایسی یکجائی ہوئی کہ عارضی زندگی کے دن گزار کر دوامی حیا
لئے دونوں ایک ہی سرزمین اور ایک ہی قبرستان میں چند گزوں کے فاصلے سے آسودہ نظر آتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ "بود ہم پیشہ باہم پیشہ دشمن" مگر امیر و داغ کے دیکھنے والے جانتے ہیں کہ ان دونوں ہم پیشہ نبرد آ
میں معنوی آویزشوں کے سوا کبھی کسی عنوان سے لفظی نزاع کی آمیزش نہیں پائی گئیں۔ یہ تو بارہا سُنا اور دیکھا کہ جس زمی
جس طرح میں ایک نے غزل کہی تو اس کے جواب میں دوسرے نے بھی طبع آزمائی کی، مگر یہ کبھی نہیں ہوا کہ اپنے کلا
کھلم کھلا تو کیا اشارے اور کنائے میں بھی کوئی سخن گسترانہ بات کہی ہو بلکہ اس کے برخلاف یہ دیکھا گیا کہ داغ کی غزل پر
دو غزلہ کہا اور مقطع میں یہ اقرار کیا ؂

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مصرع ہے ؂ بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

شاعری یا مصوری جذباتی چیز ہے، طبیعت جس طرف جتنی زیادہ راغب ہوگی اسی قدر اس فن کا کمال ظاہر ہوگا
اور آمد کا مفہوم عام ہے، جو بات بے ساختگی سے پیدا ہو جاتی ہے وہ بناوٹ اور کھینچ تان سے ظاہر نہیں ہو سکتی، آمد بے
آتی ہے اور آورد بغیر سیکھے نہیں آ سکتی، امیر مینائی کی فضیلتِ علمی اور جامعیتِ ادبی محتاجِ تشریح نہیں۔ اُن کی ثقاہ
وضع قطع کو دیکھ کر بے تکلف واعظ، مفتی اور صوفی کہا جا سکتا ہے مگر شاعر کہنے میں اجنبی کو بہت "تکلف" ہوتا ہے۔ واقعی یہ
بے مثال کمال ہے کہ اس وضع قطع اس رنگ ڈھنگ پر اُن کی ہمہ گیر طبیعت نے شاعری کے میدانوں کو بڑی پامردی
کیا ہے مگر میں بہت آزادی کے ساتھ یہ کہوں گا کہ شاعری کی جس قدر شہرت اُن کے حصے میں آئی ہے وہ اُن کے کلام

زیادہ اُن کے چند شاگردوں کی بدولت حاصل ہوئی ہے۔ برخلاف اس کے داغ جن کی قابلیتِ علمی پنج رقعہ اور مینا بازار سے آگے نہیں، اپنی شاعرانہ نام وری میں کسی ایک شاگرد کے محتاج نہیں ہوئے۔

امیر نے جن کی ولادت ۱۲۴۴ھ ۱۸۲۸ء میں ہوئی، جب شاعری شروع کی اُس وقت لکھنؤ میں ناسخ و آتش کا رنگ چھایا ہوا تھا وزیر، صبا، رند، اشک زندہ تھے۔ امیر اسیر کے شاگرد ہوئے، اسیر اگرچہ مصحفی کے شاگرد تھے لیکن اُستاد کی روش سے الگ چلے اور لکھنؤ کے رنگ میں رنگ گئے، اس ماحول میں امیر نے بھی وہی رنگ اختیار کیا، جیسا کہ اُن کے ہزارہا اشعار سے ثابت ہے مثلاً

حلقۂ گیسو میں پائی نقدِ دل دے کر جگہ — دے دیا پہلے کرایہ خانۂ زنجیر کا

مرغِ عصیاں اُڑ کے صیدِ بازِ رحمت ہو گیا — دنگ شاہینِ ترازوئے عدالت ہو گیا

پھر بھی اس طرز میں اُنہوں نے ایک حد تک جدت پیدا کی اور اسی رنگ کو نکھار کر ایسے شعر بھی نکالے ہیں:-

ہٹاؤ آئینہ ہم کو بھی دیکھنے دو گے — کہ خود ہی دیکھو گے حُسن اپنی خودنمائی کا

اُن کی ہمہ گیر طبیعت اور اکتسابی شاعری کے جوہر نے حُسنِ بندش اور بلندیِ مضمون کے ساتھ یہ جواہر پارے بھی پیش کئے ہیں ؎

اے برق تو ذرا کبھی تڑپی ٹھہر گئی — یاں عُمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں

کلیم شکر کرو، حشر تک نہ ہوش آتا — ہوئی یہ خیر کہ وُہ شوخ بے نقاب نہ تھا

امیر کے تمام کلام کو دیکھ کر ان کا کوئی مخصوص رنگ نظر نہیں آتا۔ وہ جب تک رام پور نہیں آئے اور جب تک نواب رام پور کے اُستاد بن کر اور دوسرے تلامذہ کے ذریعہ ملک میں مشہور نہیں ہوئے صرف اُسی قدامت پسندی کے عادی رہے جس کو ناسخ و آتش اور وزیر و صبا وغیرہ بہ طورِ یادگار چھوڑ گئے تھے، یعنی ایہام گوئی، مراعاۃ النظیر اور رعایتِ لفظی۔

رام پور آنے کے بعد جو کلام کہا گیا اُس میں بیشک ایسے اشعار خاصی تعداد میں ملتے ہیں جن سے اُن کی جامعیت و قابلیت کا پُورا پُورا ثبوت ملتا ہے لیکن وہ رنگ بھی ایسا نہیں جو مخصوص صرف اُن کا رنگ کہا جا سکے اگر اُن کے کلام کو تخلص نکال کر دوسرے خوش گو شعراء کے کلام میں مخلوط کر دیا جائے تو ایک ایسا مبصر جس کو اُن سے ذاتی واقفیت نہ ہو مگر تنقید و تبصرے کی قابلیت رکھتا ہو، وہ ہرگز ہرگز اُن کے اور دوسرے کے اشعار میں کوئی فرق نہیں بتا سکتا۔ غزل جس کو جذبات و محاکاتِ حُسن و عشق کا مرقع کہنا چاہیئے اُس کی اصلی و صحیح تصویر نظر نہیں آتی۔

داغ ۱۲۴۶ھ ۱۸۳۵ء میں پیدا ہوئے اور قلعۂ دہلی کے شاہی مشاعروں اور وہاں کی رنگینیوں نے بہت جلد اُن کو شاعری کے میدان میں نمایاں کر دیا۔ شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد ہوئے اور کم سنی ہی سے مشاعروں میں شریک ہونے لگے۔ اُن کی چلبلی طبیعت نے زبان کی لطافت اور طرزِ ادا کی جدت کی بدولت بہت جلد اُن کو قبولِ عام کی شاہراہ تک پہنچا دیا اور وہ اپنی ابتدائی

عمر کے مشاعروں میں ایسے ایسے شعر پڑھ جاتے تھے کہ مرزا غالب بھی داد دینے کے لئے مجبور ہو جایا کرتے تھے۔ اُسی زمانے میں وہ اِس قسم کے اشعار کہنے کے مشاق ہو چکے تھے:

ہوئے مغرور وہ جب آہ میری بے اثر دیکھی — کسی کا اس طرح یارب نہ دُنیا میں بھرم نکلے

رُخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں، — اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

امیر کا رنگ داغ کے رنگ سے آسان ہے یعنی وہ رنگ جو امیر کے پہلے دیوان پر چھایا ہوا ہے، رعایتِ لفظی مضمون آفرینی اور خیال آرائی میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہ طرز و اسلوب ہر شاعر معمولی کوشش اور فکر سے پیدا کر سکتا ہے۔ برخلاف داغ کے کہ داغ کا رنگ جدتِ ادا، شوخیِ بیان اور جذباتِ حقیقی سے مرکب ہے جس میں لفظوں کا طلسم نہیں معنی کا جادو ہے، ساخت نہیں بے ساختگی ہے اور یہ سعادت بزورِ بازو نہیں ملتی۔ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔ ناسخ و وزیر کے انداز میں ایک امیر نہیں سینکڑوں باکمال نظر آتے ہیں مگر داغ اپنے رنگ میں منفرد اور یکتا ہیں۔ نہ ان سے پہلے اس انداز میں کوئی کامل نظر آیا۔ نہ اب تک کوئی اُن کی پُوری پوری تقلید کر سکا۔ اس خیال کی تائید چند مثالوں سے ہو سکتی ہے مثلاً

۱۔ معشوق کو اپنے قابو میں لانے کے لئے ہر عاشق آرزومند ہوتا ہے۔ امیر اس خیال کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں ؎

مرے بس میں یا تو یارب وہ ستم شعار ہوتا — یہ نہ تھا تو کاش دل پر مجھے اختیار ہوتا

داغ اس تمنا کا ایک دلچسپ فائدہ بھی بتاتے ہیں ؎

کوئی فتنہ تا قیامت نہ پھر آشکار ہوتا — ترے دل پہ کاش ظالم مجھے اختیار ہوتا

۲۔ اس زمین میں مرزا غالب کی مشہور غزل ہے اور امیر و داغ نے بھی خوب خوب طبع آزمائیاں کی ہیں۔ مرزا غالب نے بادہ خواری کا مضمون اپنے مقطع میں یوں لکھا ہے ؎

یہ مسائلِ تصوّف یہ ترا بیان غالب — تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

امیر نے اس قافیے کو اپنے رنگ میں یوں کہا ہے ؎

مِرے اتّقا کا باعث تو ہے میری ناتوانی — جو میں توبہ توڑ سکتا تو شراب خوار ہوتا

داغ اپنے شعر میں بادہ خواری کی وجہ بتاتے ہیں۔ اس میں بھی اگرچہ حُسنِ تعلیل سے کام لیا ہے مگر طرزِ ادا میں جو جدت پیدا کی ہے وہ کسی لفظ کے خاص استعمال سے نہیں ہے بلکہ نفسِ مضمون ہی عجیب ہے۔ یہی جدت و شوخی داغ کی خصوصیت کو نمایاں کرتی ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

گئے ہوش تیرے زاہد جو وہ چشمِ مست دیکھی — مجھے کیا اُلٹ نہ دیتی جو نہ بادہ خوار ہوتا

۳۔ امیر و داغ کی دو مشہور غزلیں ہیں اُن کو اکثر ارباب نشاط ملا جُلا کر گایا کرتے ہیں۔ ایک ہی قافیے کو دونوں نے اس طرح نظم کیا ہے :-

امیر

مجھ کو گلیوں میں جو دیکھا چھیڑ کر کہنے لگے — کیوں میاں کیا ڈھونڈتے پھرتے ہو کیا جاتا رہا

اسی قافیے کو داغ اس طرح کہتے ہیں

دل چُرا کر آپ تو بیٹھے ہیں اطمینان سے — ڈھونڈنے والے سے پُوچھے کوئی کیا جاتا رہا

یہ دونوں شعر ایک ہی قافیے اور ایک ہی مضمون کے ہیں مگر ارباب ذوق داغ کے تیکھے پن اور امیر کے پھیکے پن کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ خصوصاً کیوں میاں کے استعمال سے، اب چند ہم مضمون شعر دونوں کے بغیر اظہار رائے عرض کیے جاتے ہیں

بُت ہی سُن لیں اگر خدا نہ سُنے (امیر) میری فریاد رائیگاں تو نہ ہو

تم سُنو اے بُتو خدا نہ سُنے (داغ) میری فریاد دوسرا نہ سُنے

حشر کیا فتنہ ہے جس سے میں پریشاں ہوتا (امیر) ایسے ہنگامے بہت دیکھے ہیں اُس کوچے میں

فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں (داغ) حشر کی دھوم ہے سب کہتے ہیں یوں ہی یوں ہے

پہنچی ہے ہم سے لُوٹ کے اب خانقاہ میں (امیر) توبہ بھی کچھ بھروسے کے قابل ہے زاہدو

جو لُوٹ کر شریک ہو میرے گناہ میں (داغ) اُس توبہ پر ہے ناز تجھے زاہد اس قدر

ہمارے آگے تمہاری وہاں سُنے گا کون (امیر) ڈراؤں حشر کی فریاد سے تو کہتے ہیں

فرماتے ہیں وہاں بھی ہیں سچے ہوں تو کیا ہو (داغ) میں نے جو کہا سیر ہو کل روزِ جزا ہو

بیٹھی ہے چھپ کے پردہ روزِ سیاہ میں (امیر) گھر سے مرے بلائے شبِ غم کہاں گئی

ماتم کو آئی ہیں مرے روزِ سیاہ میں (داغ) راتیں مصیبتوں کی جو گزری تھیں آج تک

امیر کے کلام میں داغ کی سی شوخ بیانی اور شگفتگی نہیں ہے مگر مضمون آفرینی کی قوت داغ سے بہت زیادہ ہے اور جب اس کے ساتھ وہ لطافتِ تخیل اور سلاستِ بیان کو ملا دیتے ہیں تو ایسے اشعار اور زیادہ پُر لطف ہو جاتے ہیں مثلاً

غفلت میں نہ کھو شباب اے دل — یہ رات ہے جان عمر بھر کی

وہ مزا دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب — مرے دونوں پہلوؤں میں دلِ بیقرار ہوتا

آپ ہی جل رہے ہیں پروانے — شمع کی سرگزشت کون سُنے

تکیے پہ امیر سر کو رکھے — پہروں گزرے کہ رو رہے ہیں

داغ لطفِ زبان، شوخیٔ بیان، معاملہ بندی اور بانکپن کے ساتھ جدتِ ادا ایسی عجیب و دل کش رکھتے ہیں جس کو سُن کر عوام سر دُھنتے اور خواص مزے لیتے ہیں۔ یہ وہ خاص رنگ ہے جس میں کوئی ان کا حریف و ہم سر نہیں، اُنھوں نے اپنی مخصوص جدتِ بیان کے ساتھ ایسے اشعار کہے ہیں کہ ان سے بڑھ کر کہیں نظر نہیں آتے مثلاً

ہر دل میں نئے درد سے ہے یاد کسی کی — فریاد سے ملتی نہیں فریاد کسی کی

آرام طلب ہوں کرمِ عام کے طالب — یوں مفت میں لُٹتی نہیں بیداد کسی کی

جنھیں اُس نے لکھا ہے حرفِ تسلّی — وہ کم بخت برسوں تڑپتے رہے ہیں

کہتے ہیں وہ کہو تو سہی دل کا حال کچھ — حیران ہم کھڑے ہیں گھڑی بھر سے کیا کہیں

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ فطری اور وہبی شاعری کی جتنی خصوصیتیں ہوسکتی ہیں وُہ سب داغ کے لئے مخصوص ہیں۔ اور اُسی بنا پر ان کو صحیح معنوں میں شاعر کہا جاسکتا ہے اور ان کے کلام کے لئے یہ مصرع صادق آتا ہے ع

لے دل میں چٹکیاں یہ اُسی کا کلام ہے

اور امیر مینائی کی عظمت و ثقاہت اور جامعیت یقیناً داغ سے بہت زیادہ ہے مگر اُن کی اکتسابی سخن گستری داغ کی وہبی شاعری کے مقابلے میں کوئی وزن نہیں رکھتی۔ اس لئے اُن کو ماہر کہا جاسکتا ہے اور ان کی گویائی پر یہ مصرع منطبق ہوتا ہے ؎

قابل درود پڑھنے کے اُن کا کلام ہے

احسن مارہروی

تصحیح

اکتوبر کے "ہمایوں" میں جو افسانہ "نجات" کے عنوان سے صفحہ ۷۱۳ پر شائع ہُوا ہے، اُس میں عنوان کے بعد لکھا ہے:

"گناہ سے توبہ کرنے والا اُس کی مانند ہوجاتا ہے جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو" (قرآن مجید)

افسانہ نگار نے اس حدیث: "اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ، کَمَنْ لَا ذَنْبَ لَہٗ" کے ترجمے کو "قرآن مجید" لکھ کر شدید اور خوفناک غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ مذہب و اخلاق کے علاوہ واقعیت کے اعتبار سے بھی یہ شدید غلطی ہے۔ یہ حدیث جس کا ترجمہ مضمون نگار نے "قرآن مجید" کی آیت بتا کر کیا ہے، بہت مشہور حدیث ہے اور "کنز العمال" میں مندرج ہے۔

افسانہ نگاری ہر چند خیالی خاکوں کا نام ہے، مگر افسانہ نگار کی معلومات بہر حال وسیع ہونی چاہئیں۔ اُس کا قلم "ادب" کے سامنے ذمہ دار ہے۔

ماہر القادری

رموزِ محبّت

(ذِکر و فکر کا ایک ورق)

جب آنکھ کھول کے دیکھا، تو ہو گیا مستُور
یہ میرا دیدۂ بینا ہی اِک حجاب ہُوا

تُو چھُپ گیا مہ و انجم میں، لالہ و گُل میں
ہر ایک جلوۂ رنگیں ترا نقاب ہُوا

جب آنکھ بند ہوئی، تُو ہی جلوہ آرا تھا!

مری زبان کھُلی شرحِ عاشقی کے لئے
مرا بیاں تھا مُرقّع مری خجالت کا

ہر ایک حرف میں تھا غیریت کا افسانہ
مری زباں نے کیا خُوں مری محبّت کا

مرے سکُوت میں طوفانِ عشق برپا تھا!

مرے حواس رہے تیرے وصل میں حائل
جو بے خودی میں ہُوا غرق تُو مِلا مجھ کو

عجیب شے ہے محبّت میں خود فراموشی
فنا ہُوا تو مِلی لذّتِ بقا مجھ کو

مرا وجُود ہی اے دوست! ایک پردا تھا!

آثر صہبائی

بڑے میاں کے ترکے کی تقسیم

(ڈراما)

افراد: مسز جیکب ۔ مسز جان : ——— دو بہنیں

مسٹر جیکب ۔ مسٹر جان : ——— ان کے خاوند

شیلا جیکب : ——— دس سال کی بچی

مسٹر ایڈورڈ : ——— مسز جیکب اور مسز جان کے بوڑھے والد

مسز جیکب۔ (غصے اور تیزی سے) شیلا! شیلا! بہری ہوگئی ہو کیا؟ اندر آتی ہو یا نہیں؟ مجھے تو تمہاری حالت پر افسوس آتا ہے۔ نانا گھر میں مرا پڑا ہے اور تم گلیوں کے چکر کاٹ رہی ہو۔ جاؤ اُوپر اور اپنی خالہ اور خالو کے آنے سے پہلے کپڑے بدل لو۔ تمہیں ان بھڑکیلے کپڑوں میں دیکھ کر وہ کیا کچھ نہ کہیں گے!

شیلا۔ وہ بھلا ہمارے ہاں کیوں آنے لگے! انہیں تو یہاں آئے ہوئے مدتیں گزر گئیں۔

مسز جیکب۔ تمہارے نانا غریب کے معاملات کے متعلق گفت و شنید کی غرض سے آئیں گے۔ جونہی تمہارے نانا نے دم دیا، تمہارے والد نے ان کو تار دے دیا تھا (باہر سے شور سنائی دیتا ہے) ارے! کہیں وہ آ تو نہیں گئے! شکر ہے خدا کا یہ تو تمہارے والد ہیں۔

مسٹر جیکب (ہاتھ میں ایک پلندہ لئے ہوئے) ابھی تک وہ آئے نہیں؟

مسز جیکب۔ کیا تمہیں نظر نہیں آتا کہ وہ نہیں آئے؟ خواہ مخواہ دق کرنے سے فائدہ؟ شیلا! فوراً اُوپر جاؤ اور سفید فراک پہن کر اُس پر سیاہ پٹی باندھ آؤ (خاوند سے) یہ انتظام کچھ تسلی بخش تو نہیں لیکن خیر جب تک پُورا ماتمی لباس سِل کر نہیں آتا۔ کام چل جائے گا۔ اور مسٹر اور مسز جان کو تو ماتمی لباس پہننے کا فی الحال خیال بھی نہیں آئے گا۔ اس معاملے میں ہم ضرور ان سے بازی لے جائیں گے۔ اپنے جُوتے اُتار دو ہنری۔ الزبتھ (مسز جان) تو اس بُری عادت کی ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر ناک بھوں چڑھایا کرتی ہے۔

مسٹر جیکب مجھے تو اُن کے آنے کا بھی یقین نہیں جب پچھلی دفعہ تم الزبتھ سے لڑی تھیں تو اس وقت غالباً الزبتھ نے بڑے وثوق سے کہا تھا کہ وُہ دوبارہ تمہارا مُنہ تک نہیں دیکھے گی۔

مسز جیکب۔ واہ! خوب! وہ تو سر کے بل آئیں اگر ہو سکے تو

کیا اباجان کی جائداد میں اتنی کشش بھی نہیں ؟ اپنے حصّے کے لئے تو وُہ پاگل ہو جائے گی۔ خدا معلوم اتنی حریص طبیعت اس نے کہاں سے پائی !

ہنری (مسٹر جیکب) میرے خیال میں یہ خاندانی ہے !

مسز جیکب۔ کیا مطلب اس سے تمہارا ؟

جیکب۔ میرا اشارہ آپ کے والد کی طرف تھا نہ کہ آپ کی طرف ! میرے سلیپر کہاں ہیں ؟

مسز جیکب۔ کچن میں۔ لیکن تمہیں تو نئے سلیپروں کی ضرورت ہے نا ؟ یہ جوڑا تو از حد بوسیدہ ہو چکا ہے (آنسو بہاتے ہوئے) تمہیں کیا معلوم کہ میری کیا حالت ہے ؟ جب میں اباجان کی چھوٹی چھوٹی چیزیں ادھر ادھر بکھری پڑی دیکھتی ہوں اور یہ خیال آتا ہے کہ وُہ دوبارہ کبھی ان کو استعمال نہیں کریں گے تو کلیجہ مُنہ کو آتا ہے ضبط مشکل ہو جاتا ہے (تیزی سے) یہ لو۔ یہ اباجان کے سلیپر تم پہن لو۔ کیا اچھا اتفاق ہے کہ یہ ابھی نئے ہی ہیں۔

جیکب۔ لیکن یہ تو میرے ناپ کے نہیں پیاری۔ چھوٹے ہیں۔

مسز جیکب۔ تو کیا بڑھ نہ جائیں گے ؟ مجھ سے یہ دیکھا نہیں جاتا کہ ابا کی چیزیں بیکار ضائع ہو جائیں۔ ہنری ! مجھے اس دراز کا بار بار خیال آتا ہے، جو ابا کے سونے کے کمرے میں پڑی ہے، کتنی مدت سے میرا جی اُس کے لئے للچا رہا ہے۔

جیکب۔ تقسیم کے وقت تمہیں الزبتھ سے فیصلہ کر لینا چاہئے۔

مسز جیکب۔ الزبتھ تو اس قدر کنجوس اور بیہودہ قسم کی عورت ہے کہ خدا کی پناہ۔ وہ فوراً یہ کہے گی کہ مجھے بھی اسی دراز کا شوق ہے! لالچی ہونا بھی کتنی بُری بات ہے !

جیکب۔ ممکن ہے اُسے بھی دراز ہی کا شوق ہو !

مسز جیکب۔ جب سے ابا نے یہ دراز خریدی ہے وہ تو یہاں آئی ہی نہیں۔ اور اگر وہ دراز ابا کے کمرے سے یہاں آ جائے تو اُسے اس کا شک بھی نہیں گزرے گا۔ وہ یہی سمجھے گی کہ یہ ہماری ہے۔

جیکب۔ (گھبراہٹ اور حیرت سے) بیوی ! بیوی !!

مسز جیکب۔ اگر ہم دراز یہاں لے آئیں تو کیا ہرج ہے ؟ ان کے آنے سے پہلے یہ ہو جانا چاہئے۔

جیکب۔ مَیں یہ نہیں کر سکتا۔

مسز جیکب۔ اتنے مُلّا تو نہ بنو۔ آخر مضائقہ کیا ہے ؟

جیکب۔ کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

مسز جیکب۔ یہ اپنی ٹوٹی سی الماری اس کی جگہ رکھی جا سکتی ہے۔ الزبتھ اسی کو غنیمت سمجھے گی۔ مَیں مُدّت سے اس الماری سے تنگ آ چکی ہوں۔

جیکب۔ فرض کرو جب ہم اس گورکھ دھندے میں مشغول ہوں وہ آ دھمکیں ! پھر ؟ کرکری ہوگی یا نہیں ؟

مسز جیکب۔ میں دروازے کی کنڈی چڑھائے دیتی ہوں کوٹ اُتار لو، یہ کام جتنی جلدی سے ہو جائے اچھا ہے اور میں اس راستے میں سے کرسیاں بھی ہٹائے دے رہی ہوں۔

شیلا۔ میرا فراک تو پیچھے سے باندھ دیجئے ذرا !

مسز جیکب۔ مجھے فرصت نہیں۔ اپنے باپ سے کہو جاکر۔

شیلا۔ ابا۔ یہ آپ نے کوٹ کیوں اُتار رکھا ہے ؛

جیکب۔ تمہاری اماں اور میں تمہارے نانا والی دراز نیچے لا رہے ہیں۔

شیلا۔ (کچھ تذبذب میں) تو خالہ الزبتھ کے آنے سے پہلے پہلے ہم اُسے اُڑا رہے ہیں!

جیکب۔ (گھبرا کر) نہیں بچی۔ بڑے میاں نے مرنے سے پہلے وُہ دراز تمہاری امی کو دے دی تھی۔

شیلا۔ آج صبح ؛

جیکب۔ ہاں۔

شیلا۔ خوب۔ وہ تو آج صبح خوب نشے میں تھے۔

جیکب۔ خبردار! تمہیں یہ ذکر تک نہیں کرنا چاہئے کہ بڑے میاں مخمور تھے۔

مسز جیکب۔ (ایک ٹائم پیس بغل میں دبائے نیچے آ رہی ہیں) مَیں نے سوچا اسے بھی نیچے لیتی چلوں (کارنس پر رکھ کر) ہمارا ٹائم پیس تو پُرانا ٹھیکرا ایک پیسے کا بھی نہیں مدّت سے میری نظر اس ٹائم پیس پر تھی۔

شیلا۔ (اُونچی آواز سے) یہ ٹائم پیس تو نانا ابا کا ہے!

مسز جیکب۔ چُپ، خموش، خبردار۔ اب یہ ہمارا ہے۔ اِدھر آؤ ہنری، ایک طرف سے تم اُٹھاؤ، اور شیلا! خبردار جو تم نے ایک لفظ بھی ٹائم پیس یا دراز کے متعلق اپنی خالہ سے کہا۔

شیلا۔ (دل ہی دل میں) مجھے پہلے ہی خیال تھا کہ نانا ابا کی چیزیں اُڑائی جائیں گی۔

(کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے)

مسز جیکب۔ (اوپر سے) شیلا! دیکھو تو، اگر تمہارے خالو اور خالہ ہوں تو دروازہ نہ کھولنا۔

شیلا۔ (کھڑکی میں سے جھانک کر) اماں، یہ تو وہی ہیں۔

مسز جیکب۔ جب تک مَیں نیچے نہ آؤں۔ دروازہ مت کھولو۔ (کواڑ دوبارہ پیٹتے ہیں) خود ہی تنگ آ کر واپس چلے جائیں گے۔ (دراز دیوار میں جا لگتی ہے) ہنری! ذرا خیال سے۔ (دروازہ پھر بجتا ہے) خیر اب تو کام ختم ہو گیا۔ شیلا دروازہ کھول دو۔ ہنری، کوٹ پہن لو، لو میں تمہارا ہاتھ بٹاتی ہوں۔

جیکب۔ ہم نے دیوار کا پلستر زیادہ تو نہیں اُکھاڑ دیا۔

مسز جیکب۔ پلستر کا خیال نہ کرو۔ کیا میرے کپڑے ٹھیک ہیں ؛ (آئینہ دیکھتے ہوئے) دیکھنا ہمیں نیم ماتمی لباس میں دیکھ کر کس طرح الزبتھ کا رنگ فق ہوتا ہے ؟ (اس کی طرف اخبار پھینک کر) یہ لو اور بیٹھ جاؤ۔ ایسا مُنہ بناؤ گویا ہم انہیں کا انتظار کر رہے تھے۔

(مسٹر اور مسز جان پورے اور چمکدار ماتمی لباس میں اندر داخل ہوتے ہیں اور مسٹر اور مسز جیکب انہیں یوں بازی لے جاتے دیکھ کر جل ہی تو جاتے ہیں لیکن رسمی طور پر بڑی گرمجوشی سے بغلگیر ہوتے ہیں!)

مسز جان۔ تو آخر بڑے میاں چلتے ہی بنے۔

مسز جیکب۔ ہاں! چل ہی دیئے۔ پچھلے اتوار اُن کی عمر

اکھتر سال چودہ دن تو ہو چکی تھی (آنسو بہانے کی کوشش کرتی ہے)

مسٹر جان۔ دیکھو سُوسی (یعنی مسز جیکب) ہمیں یوں جی نہیں چھوڑ دینا چاہیئے۔ رونے چلّانے سے کیا حاصل۔ ہم سب کو ایک نہ ایک دن اسی گھاٹی سے گزرنا ہے۔ ممکن ہے وُہ اگر زندہ رہتے تو اس سے بھی زیادہ تکلیف کے دن دیکھتے۔

مسز جیکب۔ میں نہیں سمجھتی کیسے!

مسٹر جان۔ ممکن ہے ہم میں سے کوئی چل بستا۔

مسٹر جیکب۔ الزبتھ، کب چلی تھیں؟ بڑا المیا سفر ہے کمبخت بڑی دیر میں پہنچیں۔

مسز جان (الزبتھ) مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا تھا، میں یہ نہیں کر سکتی تھی!

مسز جیکب۔ کیا نہیں ہو سکتا تھا، کیا نہیں کر سکتی تھیں۔

مسز جان۔ میرے لئے ماتمی لباس کے بغیر روانہ ہونا بالکل ناممکن تھا۔ میں ایسی غیر مہذب باتیں نہیں کر سکتی۔ (اور اپنی بہن کو کنکھیوں سے دیکھتی ہے)

مسز جیکب۔ آپ کو یقین ہونا چاہیئے کہ ہم نے بھی ماتمی لباس کا آرڈر دے رکھا ہے۔ (ذرا غصّے میں) میں بنی بنائی بازاری (ریڈی میڈ) چیزیں خریدنے کی قائل نہیں۔

مسز جان۔ اچھا! مجھے تو سیاہ لباس پہننے کا کچھ شوق سا معلوم ہوتا ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ، یہ سب کچھ ہُوا کیسے؟ ڈاکٹر نے کیا کہا؟

مسز جیکب۔ وُہ ابھی تک پہنچا ہی نہیں تھا۔

مسز جان۔ پہنچا نہیں تھا؟

مسٹر جان۔ تو آپ نے ڈاکٹر تک کو نہیں بُلایا؟

مسز جیکب۔ کیوں نہیں، مَیں نے بُلایا تو تھا، کیا آپ مجھے احمق سمجھتی ہیں؟ مَیں نے فوراً ہنری کو ڈاکٹر جیکل کے ہاں دَوڑا دیا تھا، لیکن ڈاکٹر گھر پر تھا ہی نہیں۔

مسٹر جان۔ تو کسی دُوسرے ڈاکٹر کو بُلا لیا ہوتا۔ افسوس الزبتھ افسوس۔

مسز جان۔ یہ غلطی تو سخت افسوسناک ہے۔

مسز جیکب۔ جب وہ زندہ تھے تو ڈاکٹر جیکل اُن کا علاج کرتے تھے، اور جب وہ مر رہے تھے تو اُس وقت بھی ڈاکٹر جیکل ہی کو ان کا علاج کرنا چاہیئے تھا۔

مسٹر جان۔ خیر آپ اپنے معاملات کو خود بہتر سمجھتے ہیں لیکن . . . . . .

مسز جان۔ لیکن یہ غلطی واقعی سخت افسوسناک تھی۔

مسز جیکب۔ بکو نہیں، الزبتھ۔ ڈاکٹر آخر کیا کر لیتا؟ جب عمر پُوری ہو جائے تو۔

مسز جان۔ ہزاروں واقعات ایسے ہوئے ہیں کہ بیمار کو تقریباً مُردہ سمجھ لیا گیا۔ لیکن وُہ گھنٹوں بعد نہ صرف ہوش میں آ گیا بلکہ بچ گیا۔

مسٹر جیکب۔ یہ تو اس وقت ممکن ہے جب کوئی آدمی ڈوب گیا ہو۔ تمہارا باپ ڈُوبا تو نہیں تھا الزبتھ۔

مسٹر جان۔ اس کا تو کوئی خوف ہی نہ تھا، اگر کسی چیز سے

بڑے میاں ڈرتے تھے تو وہ پانی تھا!

مسز جان۔ (غصے میں) جان! (اور بچارے جان پر گھڑوں پانی پڑجاتا ہے۔)

مسز جیکب۔ (طیش میں) میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ اباجان ہر روز باقاعدہ نہاتے تھے۔

مسز جان۔ اگر وہ کبھی وقت ایک دو قطرے زائد بھی خرچ کر لیتے تھے تو اس کا اب ذکر ہی کیا۔

مسز جیکب۔ اباجان آج صبح بہت مزے میں تھے۔ ناشتے کے بعد بیمہ کی قسط ادا کرنے گئے تھے۔

مسٹر جان۔ خوب! یہ تو اُنھوں نے بہت ہی اچھا کیا۔

مسز جان۔ اس معاملے میں وہ ہمیشہ محتاط رہے۔ انہیں اپنی عزت کا اس قدر احساس تھا کہ ان کے لئے ناممکن تھا کہ بغیر قسط ادا کئے سدھار جاتے۔

مسز جیکب۔ بیمہ ادا کرنے کے بعد وہ ضرور ہوٹل گئے ہوں گے، کیونکہ وہ جب واپس آئے تو نشے میں چُور تھے جب وُہ اندر آئے تو میں نے کہا کہ کھانا تیار ہے، تو وہ بولے۔ کونسا کھانا؛ مجھے تو ابھی سونا ہے!

مسٹر جان۔ اُف! اُف!

مسٹر جیکب۔ اور جب میں اندر آیا تو میں نے دیکھا کہ حضرت کپڑے اُتار کر بستر پر لیٹ بھی چکے ہیں۔

مسز جان۔ تو انہیں پہلے ہی پتہ چل گیا تھا اپنے انجام کا۔ کیا اُنھوں نے تمہیں پہچانا بھی؛

جیکب۔ ہاں ہاں، اُنھوں نے تو مجھ سے بات بھی کی!

مسز جان۔ کیا اُنھوں نے اپنے انجام کے متعلق تم سے کچھ کہا؛

جیکب۔ نہیں تو۔ مجھ سے کہا۔ ہنری، ذرا میرے جُوتے تو اُتار دو، بستر میں گھسنے سے پہلے میں انہیں اُتارنا بھُول گیا۔

مسز جان۔ بڑا رہے ہوں گے۔

جیکب۔ بالکل نہیں، جوتے پیروں میں برابر موجود تھے۔

مسز جیکب۔ جب ہم کھانا کھا چکے تو میں نے سوچا کہ لاؤ ابا کے لئے بھی کچھ لے چلوں، لہٰذا میں نے تھوڑا سا کھانا ٹرے میں لگایا، اور اُن کے کمرے میں پہنچی۔ ٹرے کو دراز پر —— نہ، الماری پر —— رکھ کر انہیں جگانے جو لگی تو کیا دیکھتی ہوں کہ وہ تو اکڑے پڑے ہیں۔

جیکب۔ تو اُس وقت میں نے سُنا کہ سُوسی مجھے اُوپر بُلا رہی ہے۔ اور مَیں دوڑ کر اُوپر گیا۔

مسز جیکب۔ تو ایسے موقع پر ہم کر ہی کیا سکتے تھے!

مسز جان۔ وہ مرے پڑے تھے؛

جیکب۔ شک کی گنجائش ہی نہ تھی۔

مسز جان۔ مجھے تو ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ اباجان کی مَوت آناً فاناً واقع ہو گی۔

(سب لوگ آنکھیں پُونچھتے ہیں۔)

مسز جیکب۔ کیا آپ لوگ ابھی اُن کا مُنہ دیکھیں گے یا پہلے چائے پی لیں؛

مسز جان۔ تمہارا کیا خیال ہے جان؛

جان۔ جیسے آپ لوگوں کی مرضی۔

مسز جان۔ اگر چائے تیار ہے تو پہلے چائے سے فارغ ہی
کیوں نہ ہو لیں۔
جیکب۔ ہاں اس بات کا فیصلہ ابھی کر لینا چاہیے کہ اخباروں
میں اطلاع کیسے دی جائے۔
مسز جان۔ میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔ مضمون کیا ہونا چاہیے؟
مسز جیکب۔ اپنی بیٹی کے مکان واقع میورو ڈ پر وغیرہ وغیرہ
جیکب۔ ایک چھوٹی سی نظم بھی کیوں نہ ہو جائے؟
مسز جان۔ مجھے تو "یادِ رفتگاں" بہت پسند ہے۔
جیکب۔ وہ نظم تو مناسب معلوم نہیں ہوتی۔
جان۔ کیا تم انہیں اتنی جلدی بھول گئیں کہ ابھی سے "یاد"
کی ضرورت بھی محسوس ہونے لگی؟
مسز جیکب۔ مجھے تو یہ طرز پسند ہے: "محبت کرنے والا خاوند،
مہربان باپ، باوفا دوست۔۔۔۔۔"
جان۔ مجھے تو یہ بھی کچھ پسند نہیں۔
جیکب۔ مناسب یا غیر مناسب ہونے سے مطلب؟
مسز جان۔ نہیں، مطلب تو یہ ہے کہ لکھا ہُوا اچھا معلوم ہو۔
جیکب۔ میں نے اخبار میں کل ایک مرثیہ دیکھا تھا، مجھے
تو وہ بہت پسند ہے (اخبار اُٹھا کر مرثیہ پڑھتا ہے)
مسز جان۔ نہ، نہ، نہ یہ بھی نہیں، ہمیں تو ایسی نظم چاہیے
جس میں ان سب باتوں کا ذکر ہو کہ ہم ان سے کس قدر
محبت کرتے تھے۔ وہ کتنی خوبیوں کے مالک تھے اور
ان کے چلے جانے سے ہمیں کیسا ناقابلِ تلافی نقصان
ہُوا ہے وغیرہ۔

مسز جیکب۔ تمہارا خیال ہے کہ ایک پوری نظم اُٹھا کر
شائع کرا دی جائے، لیکن اس پر تو خرچ بہت ہوگا۔
مسز جان۔ خیر اس کے متعلق چائے کے بعد سوچ لیا جائے گا
ابھی تو ہمیں اُن کی چیزیں گننی ہیں، ان کی فہرست
بنانی ہے، ان کا کمرہ تو اسباب سے بھرا پڑا ہوگا۔
جیکب۔ اطمینان رکھئے، ایسے قیمتی ہیرے جواہرات ان
کے کمرے میں نہیں ہیں۔
مسز جان۔ سوائے ان کی سُنہری گھڑی کے جس کا انہوں
نے ننھے ولیم سے وعدہ کر رکھا تھا۔
مسز جیکب۔ ولیم سے وعدہ کر رکھا تھا! ہم نے کبھی اس
کا ذکر تک نہ سُنا!!
مسز جان۔ لیکن اُنہوں نے وعدہ کیا تھا ضرور۔ جب وُہ
ہمارے ہاں رہا کرتے تھے۔ ولیم سے انہیں بہت پیار تھا
مسز جیکب۔ ممکن ہے۔ لیکن مجھے تو مطلق علم نہیں۔
جان۔ چھوڑو بھی اس معاملے کو۔ ہاں تو اس قسط کی رسید
کہاں ہے جو اُنہوں نے آج صبح بیمہ کمپنی کو ادا کی تھی
یہ بیمہ کا پیسہ بہت جھگڑے کا معاملہ ہوتا ہے۔
مسز جیکب۔ مَیں نے تو دیکھی نہیں۔
شیلا۔ امی۔ میرا خیال ہے کہ نانا ابا بیمے کی قسط دینے
نہیں گئے تھے۔
مسز جیکب۔ وہ باہر گئے تو تھے۔
شیلا۔ جی ہاں۔ لیکن وُہ شہر نہیں گئے۔ وہ تو یہاں سے مسٹر
ڈیوڈ کے ہاں گئے تھے اور وہ دونوں مل کر گرجے والی

سڑک پر جاتے ہوئے دکھائی دیئے تھے۔

مسز جیکب۔ تو وہ ضرور ہوٹل گئے ہوں گے۔

جان۔ ہوٹل؟

مسز جیکب۔ جی ہاں۔ وہی شراب خانہ جو پیٹر کی بیوہ نے کھول رکھا ہے، ابا وہاں بہت منڈلایا کرتے تھے۔ اب تو مجھے شک ہو رہا ہے کہ اُنہوں نے قسط ادا کی بھی یا نہیں۔

جان۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ انہوں نے ادا نہیں کی؟ کیا میعاد گزر چکی تھی؟

مسز جیکب۔ نہیں، غالباً میعاد تو ابھی تک نہیں گزری تھی۔

مسز جان۔ میرا دل اندر سے کہہ رہا ہے کہ اُنہوں نے قسط ادا نہیں کی۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے، مجھے یقین سا ہے کہ وہ قسط ادا نہیں کی۔

جان۔ آہ بڈھا شرابی!

مسز جان۔ انہوں نے جان بوجھ کر یہ حرکت کی ہے ہمیں ستانے کے لئے۔

مسز جیکب۔ اور میری اس تین سالہ تکلیف کا یہ صلہ؛ یہ تو ٹھگی ہے ٹھگی۔

مسز جان۔ اور مجھے پانچ سال ان کے ساتھ مصیبت جھیلنی پڑی تھی!

مسز جیکب۔ اور تم ہمیشہ کوشش کرتی تھیں کہ انہیں اپنے ہاں سے نکال کر ہمارے سر منڈھ دو۔

جیکب۔ کیوں برس رہی ہو خواہ مخواہ اس غریب پر؛ پہلے یہ تو یقین کر لیا ہوتا کہ اس نے قسط ادا کی ہے یا نہیں؟

مسز جان۔ مجھے معلوم ہے۔ مجھے یقین ہے، میرا دل کہہ رہا ہے کہ انہوں نے ادا نہیں کی۔

مسز جیکب۔ ذرا اُوپر تو جاؤ شیلا۔ اور اپنے نانا کی انگھاڑ میز پر سے کنجیوں کا گچھا اُٹھا لاؤ۔

شیلا۔ (ڈری سی آواز سے) نانا ابا کی میز پر سے؟

مسز جیکب۔ ہاں۔

شیلا۔ میں — میں — میں وہاں نہیں جاؤں گی۔

مسز جیکب۔ بیوقوف۔ فضول باتیں مت کرو۔ کون کھا جائے گا تمہیں وہاں؛ دیکھیں تو شاید رسید دراز میں بند کر رکھی ہو؟

جان۔ کہاں؛ اس میں؛ (دراز کے پاس جا کر)

مسز جان۔ مُوسی! یہ تم نے کہاں سے اُڑائی؛ جب میں پہلے یہاں آئی تھی، اُس وقت تو یہ دراز یہاں نہیں تھی۔ (اور غور سے دراز کو دیکھتی ہے)

مسز جیکب۔ ہنری خرید لائے تھے ایک دن۔

مسز جان۔ مجھے تو یہ بہت پسند ہے، یہ خوبصورت بھی ہے کسی نیلام میں مل گئی تھی کیا؟

جیکب۔ مُوسی۔ بھلا یہ میں نے کہاں سے خریدی تھی؟

مسز جیکب۔ جی ہاں، ایک نیلام پر۔

جان۔ (ہونٹ نکال کر) تو پُرانی ہے سیکنڈ ہینڈ۔

مسز جان۔ جہالت کا ثبوت تو نہ دو جان، اعلےٰ صنعت کی چیزیں عموماً سیکنڈ ہینڈ ہوتی ہیں۔

شیلا۔ اماں، اماں؟

مسز جیکب ۔ کیا ہے، میری بچی ؟

شیلا ۔ نانا ابا تو ہل رہے ہیں !

جان ۔ کیا ؟

مسز جیکب ۔ کیا کہا تم نے ؟

شیلا ۔ نانا ابا اٹھ رہے ہیں ۔

مسز جان ۔ بچی تو پگلی ہے ۔

مسز جیکب ۔ واہی تباہی دبکو ۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے نانا مر چکے ہیں ؟

شیلا ۔ خواہ کچھ ہو، لیکن میں نے انہیں اُٹھتے دیکھا ہے اپنی ان آنکھوں سے دیکھا ہے !

جان ۔ خود جا کر کیوں نہیں دیکھتیں سُوسی ؟

مسز جیکب ۔ میرے ساتھ آؤ ہنری ۔ (ہنری ڈر کر پیچھے ہٹ جاتا ہے)

جان ۔ ہشت اِسٹوتو ! چپ !!!

(آہستہ آہستہ کواڑ کھلتا ہے اور بڑے میاں نمودار ہو جاتے ہیں)

مسٹر ایڈورڈ ۔ ننھی شیلا کو کیا ہو گیا ؟ (جان اور اس کی بیوی کو دیکھ کر) ہیلو ! تم یہاں کیسے ؟ کیا حال ہے جان ؟ اچھی تو ہو الزبتھ ؟ (سب کے رنگ اُڑ جاتے ہیں ! کوئی جواب نہیں دیتا)

مسز جیکب ۔ (ڈرتی ڈرتی قریب آ کر) کیا آپ ہیں ابا ؟ (اور ہاتھ لگا کر دیکھتی ہے کہ سچ مچ وہی ہیں)

مسٹر ایڈورڈ ۔ ضرور ! میں ایڈورڈ ہی تو ہوں ۔ تو پھر نہیں سُوسی، یہ کیا فضول حرکت ہے ؟

جیکب ۔ (دوسروں سے) ابا تو زندہ معلوم ہوتے ہیں ؟

جان ۔ میرا بھی یہی خیال ہوتا جا رہا ہے ۔

ایڈورڈ ۔ (خفا ہو کر) الزبتھ تم نے مجھے کافی دیر سے اپنے گھر سے نکال رکھا ہے اور اب بھی مجھے دیکھ کر کچھ خوش نظر نہیں آتیں ۔

مسز جان ۔ آپ نے تو ہمیں حیران کر دیا ابا ! کیا آپ کی صحت تو ٹھیک رہتی ہے ؟

ایڈورڈ ۔ ہیں ! کیا ؟

جان ۔ آپ اچھے تو ہیں ؟

ایڈورڈ ۔ ہاں بس ذرا سر میں درد سا ہے ۔ میں شرط لگانے کو تیار ہوں کہ اس گھر میں سب سے پہلے مرنے والا میں نہیں ہوں گا ! ہنری کی صحت مجھ سے اچھی تو نہیں ۔

مسز جان ۔ نہیں نہیں میں تو کبھی ایسی شرط نہ بدوں ۔

ایڈورڈ ۔ (آرام کرسی کی طرف جاتے ہوئے) سُوسی ! میرے نئے سلیپر کیا ہوئے آخر ؟ یاد نہیں پڑتا کہ میں نے انہیں کہاں پھینکا ۔

مسز جیکب ۔ (گھبرا کر) انگیٹھی کے پاس تو نہیں ہیں ابا ؟

ایڈورڈ ۔ مجھے تو وہاں نظر نہیں آتے (ہنری کو اُتارتے دیکھ کر) ہوں، تم نے ڈانٹ رکھے ہیں، ہنری !

مسز جیکب ۔ آپ کے تنگ تھے نا ؟ میں نے ہی ہنری سے کہا تھا کہ ذرا پہن لیں تا کہ کچھ کھل جائیں ۔ اب اُتار دو ہنری تا کہ ابا پہن لیں ۔

مسز جان ۔ اتنی جلدی مُردے کے جوتے چڑھا لینا ! توبہ ۔

میں تو اسے انتہا درجے کی بدتہذیبی کہوں گی!

شیلا ۔ نانا ابا، مجھے کتنی خوشی ہوئی یہ دیکھ کر کہ آپ ابھی زندہ ہیں۔

مسز جیکب ۔ بکو نہیں، شیلا! زبان سنبھال کر بولو۔

ایڈورڈ ۔ کیا؟ کون مرگیا آخر؟

مسز جیکب ۔ پگلی ہے! در اصل وہ آپ کی طبیعت کا حال پوچھنا چاہتی ہے۔

ایڈورڈ ۔ میری اچھی بچی! اب سر کے درد کو کچھ افاقہ ہے۔

مسز جیکب ۔ ابا کو کتنی محبت ہے شیلا سے۔

مسز جان ۔ جی ہاں ۔ لیکن انہیں میرے ولیم سے بھی اتنی ہی محبت ہے۔

مسز جیکب ۔ اچھا تو اب پوچھ لو کہ انہوں نے ولیم سے گھڑی کا وعدہ کیا تھا یا نہیں؟

مسز جان ۔ اوں ہوں! یہ کونسا موقع ہے؟

ایڈورڈ ۔ ارے یہ کیا؟ جان، تم تو ماتمی لباس میں ہو! اور الزبتھ بھی، سوسی بھی، ہنری بھی اور ننھی شیلا بھی! آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ ہمارے خاندان میں ضرور کوئی موت واقع ہوئی ہے (اور بڑے میاں ایک خوب زور کا قہقہہ مارتے ہیں)

مسز جیکب ۔ آپ نہیں جانتے ابا ۔ جان کا ایک دُور کا رشتہ دار۔

ایڈورڈ ۔ آخر کون سا رشتہ دار؟

مسز جیکب ۔ اس کا بھائی۔

جان ۔ (مسز جیکب سے) ارے ۔ میرا تو کوئی بھائی ہی نہیں تھا

ایڈورڈ ۔ اچھا اچھا ۔ تو اس کا نام کیا تھا جان؟

جان ۔ اے ۔۔۔ اے ۔۔۔

مسز جیکب ۔ (دبی زبان سے) کرسٹوفر

مسز جان ۔ (دبی زبان سے) مارٹن

جان ۔ اے، اے، کرس ۔۔۔ مار ۔۔۔ جارج ۔۔۔

ایڈورڈ ۔ اچھا! جارج ۔ تو تمہارا بھائی جارج مرا کہاں تھا؟

جان ۔ اے ۔ اے ۔۔۔ آسٹریلیا میں۔

ایڈورڈ ۔ تم سے بڑا ہوگا؟

جان ۔ جی ہاں ۔ پانچ سال۔

ایڈورڈ ۔ تم پُرسے کو جاؤ گے؟

جان ۔ جی ہاں۔

مسز جان
مسز جیکب } نہیں، نہیں۔

جان ۔ جی نہیں۔

ایڈورڈ ۔ غالباً چائے پر میرا ہی انتظار تھا، مجھے تو سخت بھوک لگ رہی ہے۔

مسز جیکب ۔ میں چائے بناتی ہوں۔

ایڈورڈ ۔ آؤ بیٹھو بھی ۔ ذرا عیش تو کریں۔

مسز جیکب ۔ ہنری، ابا کو زبان کا ٹکڑا دو۔

ایڈورڈ ۔ شکریہ ۔ میں خود شروع کروں گا ۔ (توس اور مکھن کی تواضع شروع کر دیتا ہے)

جان ۔ خدا کا شکر ہے کہ اس عمر میں بھی آپ کی بھوک قائم ہے ابا جان ۔ اگرچہ آپ کی طبیعت کچھ سُست ہی رہی ہے۔

ایڈورڈ۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ذرا لیٹا ہُوا تھا۔

مسز جیکب۔ کیا سو گئے تھے آپ؟

ایڈورڈ۔ نہیں تو؟

مسز جیکب }
جیکب } اوہ!

ایڈورڈ۔ مجھے اچھی طرح یاد نہیں، کچھ خمار سا ضرور تھا۔ اور ہاتھ پیر نہیں ملتے تھے۔ باقی تو سب معاملہ ٹھیک تھا۔

جان۔ آپ دیکھ اور سُن تو سکتے تھے غالباً؟

ایڈورڈ۔ ہاں۔ لیکن مجھے کچھ یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کیا کچھ دیکھا! ذرا الجھن تو ادھر بڑھا نا۔

مسز جیکب۔ یہ محض آپ کا خیال ہی ہے ابا، آپ ضرور سو رہے ہوں گے۔

ایڈورڈ۔ ہرگز نہیں سوسی، میں سویا بالکل نہیں۔ کیا مجھے اتنا بھی معلوم نہیں؟

مسز جان۔ کیا آپ نے جیکب یا مسز جیکب کو کمرے میں آتے نہیں دیکھا؟

ایڈورڈ۔ (سر کھجاتے ہوئے) ذرا مجھے سوچ لینے دو ــــــ

مسز جیکب۔ کیوں تنگ کرتی ہو ان کو؟ چھوڑو بھی اِن فضول باتوں کو۔

جیکب۔ کیا فائدہ ابا کو تنگ کرنے سے؟

ایڈورڈ۔ (یکایک یاد کرتے ہوئے) ارے، ارے رے! خدا کی قسم! سوسی؛ ہنری؛ تمہارا کیا مطلب تھا آخر میرے کمرے میں آنے اور میری نئی دراز اُٹھا لے جانے سے؟ کیا بہرے ہو گئے ہو؛ سوسی؛ ہنری؛ جواب کیوں نہیں دیتے؛ دم کیوں سادھ لیا؟

مسز جان۔ کون سی دراز تھی وہ ابا؟

ایڈورڈ۔ وہی دراز! میری دراز! وہی جو میں نے ــــــ

مسز جان۔ (دراز کی طرف اشارہ کرکے) کیا یہی تو نہیں؟

ایڈورڈ۔ یہی، یہی! یہ یہاں کیا کر رہی ہے اس کمرے میں؟

(اتنے میں ٹائم پیس کارنس پر گیارہ بجاتا ہے، اور سب اس کی طرف دیکھتے ہیں)

اور یہ ٹائم پیس بھی تو میرا ہے، اللہ توبہ۔ یہ اس گھر میں آج ہونا کیا رہا ہے آخر؟

جان۔ میں تو اس چیستاں کو کچھ سمجھ نہیں سکتا۔

مسز جان۔ (اُٹھ کر) ابا جان۔ میں بتاتی ہوں اِس گھر میں کیا ہوتا رہا ہے۔ یہاں ڈاکا پڑا ہے ڈاکا!

مسز جیکب۔ چُپ رہو جی۔ بکواس کی ضرورت نہیں۔

مسز جان۔ چُپ کیسے رہوں! مَیں تو چُپ نہیں رہ سکتی۔ ڈاکا، ٹھگی، دھوکا ــــــ

جیکب۔ بس کافی ہے الزبتھ، زیادہ بڑھو نہیں۔

مسز جان۔ اور تم بھی اس میں حصّے دار ہو ہنری؛ کیا اس بیہودہ عورت کے کہنے پر تم بھی اس قسم کی ذلیل حرکتیں کرنے کو تیار ہو جاتے ہو؟

مسز جیکب۔ (اُٹھ کر) الزبتھ تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ تم اس وقت کہاں ہو؟

جیکب۔ خموش۔ خموش۔ لڑائی جھگڑے کی کوئی ضرورت نہیں۔

جان ۔ میری بیوی کو اپنے خیالات کے اظہار کا پُورا پُورا حق حاصل ہے ۔

مسز جیکب ۔ تو گھر سے باہر نکل کر جو چاہے کہیں ۔ لیکن یہاں زبان سنبھال کر بولنا ہوگا ۔

ایڈورڈ ۔ توبہ توبہ ۔ کیا جہنم ہے یہ ؟ خدارا مجھے بھی تو بتاؤ کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے ؟

مسز جان ۔ ضرور ، ضرور ۔ میں بتاتی ہوں ۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ آپ دن دہاڑے لُٹ جائیں ۔

ایڈورڈ ۔ تو آخر مجھے لُوٹتا کون ہے ؟

مسز جان ۔ ہنری اور سُوسی ، اور کون ! اُنھوں نے آپ کا ٹائم پیس اور آپ کی دراز چُرالی ہے ۔ وہ چوروں کی طرح آپ کے کمرے میں گھُس گئے ۔ اور جب آپ مر گئے تھے تو اُنھوں نے اپنا داؤ چلا لیا ۔

جیکب }
مسز جیکب } چُپ ، خموش ، الزبتھ

مسز جان ۔ ہرگز نہیں ، مجھے کوئی چُپ نہیں کرا سکتا ۔ اب تو میں سارے بخیئے اُدھیڑ کر رہوں گی ۔ جب آپ مر گئے تھے تو ـــــ

ایڈورڈ ۔ کون مر گیا تھا ؟

مسز جان ۔ آپ

ایڈورڈ ۔ لیکن میں تو زندہ ہوں ! میں کب مرا تھا ؟

مسز جان ۔ نہیں ، لیکن وہ سمجھے تھے کہ آپ مر چکے ہیں ۔

(ایڈورڈ ایک دفعہ پھر سب کو دیکھتا ہے)

ایڈورڈ ۔ ہاں ۔ تو اب میری سمجھ میں آیا ۔ جبھی آپ سب آج سیاہ پوش ہیں ! آپ سمجھے میں مر گیا ۔ (حضرت ہنستے ہیں) یہ بہت بڑی غلطی تھی ۔

مسز جیکب ۔ (روتے ہوئے) ابّا !

ایڈورڈ ۔ آپ نے میری چیزیں تقسیم کرنے میں تو ایک منٹ کا توقف بھی نہ کیا !

مسز جان ۔ نہیں ابا ، آپ کو میری طرف سے یہ بدگمانی نہیں ہونی چاہئے ، سُوسی نے خود ہی گڑبڑ کرنا اور چیزیں ہتھیانا شروع کر دیا تھا ۔

ایڈورڈ ۔ سُوسی ، تم شروع ہی سے حساب کی بہت پکی رہی ہو ، غالباً تمہارا خیال یہ تھا کہ میں نے جو وصیت کر رکھی ہے وہ ٹھیک نہیں ۔

جیکب ۔ تو کیا آپ نے وصیت کر رکھی ہے ؟

ایڈورڈ ۔ جی ہاں اسی دراز میں بند ہے ۔

مسز جان ۔ اس وصیت میں کیا ہے ، ابا ؟

ایڈورڈ ۔ اب تو اس کا خیال ہی چھوڑ دو ۔ اب تو میں اُس وصیت کو جلا کر نئی لکھوں گا ۔

مسز جیکب ۔ (رو کر) ابا ، آپ مجھ پر سختی نہ کیجئے گا ۔

ایڈورڈ ۔ سُوسی ، برائے مہربانی ایک پیالی چائے ، خوب دُودھ ڈال کر اور دو ٹکڑے کیک کے تو ذرا پکڑا دینا ۔

مسز جیکب ۔ بدل و جان ، ابا ۔

ایڈورڈ ۔ میں کسی پر بھی سختی نہیں کرنا چاہتا ۔ میں تمہیں ابھی بتاتا ہوں کہ میرا ارادہ کیا ہے ۔ جب سے تمہاری والدہ

کا انتقال ہُوا ہے کچھ عرصہ میں الزبتھ کے ساتھ رہا ہوں
اور کچھ عرصہ سُوسی کے ہاں۔ میں نئی وصیت لکھوں گا اور
یہ میری تمام چیزیں اس کی ملکیت سمجھی جائیں گی جس کے
ہاں میں مروں گا۔ تمہارا اس وصیت کے متعلق کیا خیال ہے؟

جیکب۔ یہ تو لاٹری معلوم ہوتی ہے۔

مسز جان۔ اور آج سے آپ کس کے ہاں رہنا پسند فرمائیں گے؟

ایڈورڈ۔ ابھی سنو تو۔ ذرا صبر تو کرو۔ میں ابھی بتاتا ہوں۔

مسز جان۔ اباجان، اب تو آپ کو بہت عرصہ ہمارے
ہاں سے آئے ہو گیا ہے، آپ اب ہمارے پاس
کیوں نہیں چلتے، میں آپ کے ہر آرام کا خیال رکھوں گی

مسز جیکب۔ ہرگز نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ ابھی وہ
اتنا عرصہ تو ہمارے ہاں رہ لیں جتنا عرصہ تمہارے ہاں
رہے ہیں۔

مسز جان۔ جو کچھ یہاں آج ہو چکا ہے میرا خیال نہیں
کہ اس کے بعد ابا تمہارے ہاں رہنا پسند کریں گے۔

ایڈورڈ۔ تو الزبتھ، تمہیں یہ شوق ہے کہ میں تمہارے
ساتھ رہوں؟

مسز جان۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں تو مدت سے اس کے
لئے بے چین ہوں۔

ایڈورڈ۔ تمہارا کیا خیال ہے سُوسی؟

مسز جیکب۔ میرا خیال ہے الزبتھ کا ارادہ بدلے تھوڑا
ہی عرصہ ہُوا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے درمیان
جھگڑا کس بات کا تھا؟

مسز جان۔ سُوسی۔ بیوقوف نہ بنو۔ بیٹھ جاؤ۔

مسز جیکب۔ ہرگز نہیں، اگر ابا میرے پاس نہیں رہیں گے
تو الزبتھ کے پاس بھی نہیں رہ سکتے۔ دو سال ہوئے
ہماری لڑائی اسی لئے ہوئی تھی کہ الزبتھ نے کہا تھا کہ
وہ ابا کو کسی شرط اور کسی قیمت پر بھی اپنے ہاں رکھنے
کو تیار نہیں۔

ایڈورڈ۔ میرا خیال یہ ہے کہ تم دونوں کو اس سلوک پر
شرم آنی چاہیئے جو تم نے اپنے اپنے موقع پر مجھ سے کیا۔

مسز جیکب۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی تو میں اس کے
لئے از حد نادم ہوں اور معافی کی خواستگار۔

مسز جان۔ اور میں بھی اتنی ہی شرمندہ ہوں اور اُسی
طرح معافی چاہتی ہوں۔

ایڈورڈ۔ تم دونوں کو ہوش ذرا دیر میں آیا۔ معافیوں کا
وقت گزر چکا۔ آج سے پہلے دونوں میں سے کسی نے
بھی مجھے ساتھ رکھنے کا شوق ظاہر نہیں کیا۔

مسز جان۔ }
مسز جیکب۔ } نہیں، نہیں، ابا۔

ایڈورڈ۔ بالکل نہیں، جو کچھ تم اس وقت کہہ رہی ہو، وُہ
میرے اس وعدے کا نتیجہ ہے کہ میری جائداد اس کو
ملے گی جس کے ہاں میں مروں گا۔ چونکہ تم لوگوں
کو میری ضرورت نہیں۔ اس لئے میں ایسے شخص کے
ہاں چلا جاؤں گا جس کو میری ضرورت ہو۔

مسز جان۔ یہ کیا، بڑے میاں؟ آپ کو دونوں میں سے

اپنی ایک بیٹی کے ساتھ رہنا چاہئے۔

ایڈورڈ۔ سنو، میری تجویز یہ ہے۔ مجھے اگلے پیر کو تین کام کرنا ہیں:۔ وکیل کے ہاں جاکر اپنی وصیت تبدیل کرانا ہے، بیمہ کمپنی کے دفتر میں جاکر قسط ادا کرنا ہے اور گرجا گھر جاکر شادی کرانا ہے!

جان۔ } کیا؟
جیکب }

مسز جان۔ شادی؟

مسز جیکب۔ ان کا تو دماغ خراب ہوگیا ہے۔ اپنے ہوش میں نہیں۔

ایڈورڈ۔ میں پھر کہتا ہوں کہ مجھے شادی کرنا ہے۔

مسز جیکب۔ کس سے؟

ایڈورڈ۔ مسز پیٹر سے جس نے ہوٹل کھول رکھا ہے، ہمارا ارادہ تو بہت مدت سے تھا لیکن مجھے اس راز کو فاش کرنے کے لئے مناسب موقع کا انتظار تھا۔ (اُٹھتا ہے) مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں آپ لوگوں کے لئے بوجھ سا ہوں، لہٰذا میں نے ایسا شخص ڈھونڈا جو خوشی سے میرا خیال رکھے۔ اگر آپ لوگ میری شادی میں شریک ہوں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی (دروازے کی طرف جاتا ہے) پیر کو، گرجا گھر، عین بارہ بجے دوپہر، (دروازہ کھولتا ہے) یہ بہت اچھا ہوا کہ سُوسی یہ دراز نیچے لے آئی۔ اب یہاں سے ہوٹل پہنچانے میں آسانی ہوگی۔

(باہر چلا جاتا ہے۔) پردہ

(ہاؤٹن)

ف۔م۔ افضل

اقوال

بغیر نیکی کی ملاوٹ کے گناہ بھی گناہ نہیں

رُوح اور مشغولیت اصل میں ایک ہی ہیں۔ بے کار رُوح رُوح ہی نہیں۔

کام میں انسان پہلی اخلاقی فتح اور پہلا اخلاقی سبق حاصل کرتا ہے۔

نیکی کی نمائش بدی کے مترادف ہے۔

غرض اور بے غرضی کی ملاوٹ کامیابی کی کلید ہے۔

سعادت علی (از لدھیانہ)

پانچ شعر

نہ لے جا مجھے عشق کی وادیوں میں مجھے چھوڑ دے او مری بے خیالی!

سراپا عقل بن کر کیوں مجھے برباد کرتے ہو
مَیں دل بن کر سرِ محفل مچل جاؤں تو کیا ہوگا؛

بھٹکے ہوئے یہ بادل، مہکی ہوئی یہ راتیں
یاد آگئیں پھر مجھ کو بھولی ہوئی برساتیں

وُہ ہجومِ شوق کی بجلیاں، جو نہاں تھیں دل کے قرار میں
وُہی آج جلوہ نُما ہوئیں ترے حُسنِ رُخ کی بہار میں!

ابتدائے عشق کی وہ چاندنی راتیں کہاں؟
آہ اُن راتوں کی وُہ لمبی مُلاقاتیں کہاں؟

مظفر حسین شمیم

کاروباری تعلیم

"برعکس نہند نام زنگی کافور" ـــــ دُنیا کو لوگ دلکش کہتے ہیں، اُن کے نزدیک اس کی نیرنگیاں ہر دل کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو جو لوگ زندگی کے پیچھے دیوانے ہیں، اُنہیں زندگی میں کوئی دلکشی نظر نہیں آتی۔ اکثر تو ایسے ہیں جنہوں نے عیش و نشاط کے چند ظاہری نشانات کو دُنیا کی دلکشی سمجھ لیا ہے اور اُن کے نزدیک عیش و نشاط کے تھوڑے سے لمحے بھی زندگی کو اتنا دلکش بنا دیتے ہیں کہ ہزاروں موتیں اس ایک زندگی پر قربان کی جاسکتی ہیں۔ زندگی کی یہ بدمستیاں جن کا تعلق دل اور روح کے 'سرور' سے ذرا بھی نہیں، اگر واقعی سرور و انبساط سمجھی جاسکتی ہیں تو بے شک تھوڑی دیر کے لئے زندگی کو خوشگوار تصوّر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی دُنیا کی عام فضا پر رنج، غم اور افسردگی چھائی ہوئی ہے ظاہری خوشی کے باوجود بھی ہر شخص دل میں افسردہ اور غمگین نظر آتا ہے۔ افسردگی کا شکار ہر شخص ہے ـــ فرق صرف کمی اور زیادتی کا ہے۔

لیکن ان میں سے ایسے لوگ سب سے زیادہ قابلِ رحم ہیں جو زندگی کی کسی چیز میں دلچسپی نہیں محسوس کرتے۔ اُنہیں اپنے کام سے نفرت اور دلچسپیوں سے بیزاری ہے۔ دوستوں کی دوستی اور عزیزوں کی محبّت اُن کے لئے بالکل بے معنی سی چیز ہے۔ وہ اپنے آپ کو دُنیا کی فضا سے بالکل الگ محسوس کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک زندگی اُن کے لئے نہیں۔ وہ اپنے آپ کو دُنیا کے لئے موزوں نہیں پاتے۔ اس لئے اُن کی زندگی موت سے بدتر ہے۔ بدقسمتی سے روز بروز ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ ایسے لوگ جو واقعی اپنے ماحول کے لئے بالکل موزوں نہیں ہیں، روز بروز کیوں بڑھ رہے ہیں؛ اس کی ذمّہ دار فطرت ہے یا خود انسان۔ اگر فطرت ہے تو اُس نے اب تک انسان کا ساتھ کیوں دیا اور اب کیوں وہ اُسے غلط راستے کی طرف لئے جارہی ہے؛ اس میں غالباً خود انسان ہی کا قصور ہے۔ اس کے لئے فطرت نے جو اصول بنائے، دُنیا اپنے تغیّرات کے باوجود بھی، اُنہیں کے راستے پر چل رہی ہے۔ دُنیا کی ترقیاں فطرت کے اصُول کو نہیں بدل سکتیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ انسان خود بدلتی ہوئی دُنیا کا ساتھ دے۔ دُنیا کے قدم تیزی سے آگے کو بڑھ رہے ہیں۔ اگر انسان سُست قدمی سے کام لے گا تو دُنیا اس کے لئے پیچھے مُڑ کر بھی نہیں دیکھے گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ تھوڑے سے سفر کے بعد وُہ اپنے آپ کو

مجبور محسوس کرنے لگے گا۔ اُسے ہر طرف نئی چیزیں نظر آئیں گی، جو اُس کے لئے بالکل غیر مانوس ہوں گی۔ ہر طرف اجنبیت، نیا پن اور بے بسی۔ اور اُس کے بعد سے زندگی کی افسردگیوں کی ابتدا۔

استعارے کو ہٹا کر دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ انسانی سوسائٹی کے بالکل ابتدائی دوروں میں فطرت خود انسان کو سبق سکھاتی تھی۔ سوسائٹی محدود تھی، اُس کے تعلقات محدود تھے، رشتوں کی حدیں ایک جنگل کے رہنے والوں سے شروع ہو کر دوسرے جنگل کے رہنے والوں تک ختم ہو جاتی تھیں۔ کھانے اور شاید کچھ مذہبی رسموں کے علاوہ، زندگی ہر قید سے آزاد تھی، بڑے شکار کرنے جاتے، بچے اُن کا پیچھا کرتے، اُن کی نقلیں اُتارتے۔ اپنے کھیلوں میں سیر و شکار کی نقلیں کرتے، مذہبی ناچ گانوں میں حصّہ لیتے، جنگلی جانوروں سے لڑتے بھڑتے اُن سے ہارتے، اُن پر فتح پاتے، قدرت کے مظاہر کا مقابلہ کرنے کی ضرورت پڑتی، سردی سے بچنے کے لئے بڑے جانوروں کی کھالوں کے لباس بناتے، پتّوں سے اپنا تن ڈھانکتے، کھالوں کی جھونپڑیاں بنایا کرتے، پہاڑوں کے غاروں میں گھُس کر زندگی بسر کرتے۔ اپنے آپ کو خوش کرنے کے لئے ناچتے گاتے، غرض اُن کی زندگیوں میں اس سے زیادہ وسعت نہیں تھی اِس لئے اُن کے بچے ان کے ساتھ رہ کر سب کچھ سیکھتے تھے۔ زندگی خود اُنہیں سبق سکھاتی تھی، اور اپنے لئے موزوں بناتی تھی۔ زندگی ایک مدرسہ تھی جس میں کسی مصنوعی فن کی مدد کے بغیر ہر بچّہ اور بوڑھا زندگی سے سبق لیتا تھا، اور جب تک زندہ رہتا تھا یہ محسوس کرتا تھا کہ اُس کا ماحول اُس کے لئے اور وہ اپنے ماحول کے لئے بنا ہے۔ زندگی کا سچا آرام اور سرور، تہذیب و تمدّن کی بندشوں سے آزاد رہنے والے اُس وحشی انسان کو حاصل تھا۔

دُنیا نے کروٹ لی، فطرت نے نئی نئی ضرورتیں انسان کے سامنے پیش کیں۔ نئے رشتے قائم ہوئے۔ اُن میں وسعتیں پیدا ہوئیں۔ ان رشتوں کی زنجیریں کھنچ کھنچ کر دُور دُور جانے لگیں، پیدائش و موت، رسم و رواج، مذہب و حکومت، شکست و فتح، صنعت و حرفت، سب چیزیں زندگی کے اجزا بن گئیں۔ ہر آدمی کے لئے ان میں شریک ہونا دشوار ہو گیا۔ سماجی زندگی کے تعلّقات کی پیچیدگیوں کا تقاضا ہُوا کہ تقسیم عمل ہو۔ گھر کے بڑے بوڑھوں نے بچوں کو ساتھ رکھنا چھوڑ دیا۔ دونوں کی دلچسپیوں کے مرکز بدل گئے، بچوں کے کھیل کو اصل زندگی سے ہٹ کر صرف اُن کی نقلوں تک محدود ہو کر رہ گئے۔ فطرت نے معلّمی سے دست برداری حاصل کر لی۔ اور اب ضرورت ہوئی کہ بچوں کو باقاعدہ تعلیم دی جائے۔ سب سے پہلے مذہبی باتیں سکھانے کے لئے الگ آدمی مقرر ہوئے اور اُس کے بعد رفتہ رفتہ دوسری طرح کی تعلیم بھی مدرسوں کے ذمّے ہو گئی۔ یہیں سے ابتدا ہوئی غیر فطری تعلیم کی، اور یہیں سے آدمی اپنے آپ کو اپنے ماحول میں اجنبی محسوس کرنے لگا۔ زندگی کی پیچیدگیاں زیادہ بڑھیں۔ انسانی تعلقات کے رشتے اور زنجیریں، گھروں سے قبیلوں تک، قبیلوں سے قوموں تک، قوموں سے مُلکوں تک پھیلیں اور رفتہ رفتہ بین الملکی اور بین الاقوامی بن گئیں۔ مذہب، معاشرت، سیاست، تمدّن نے ایک محدود دائرے سے نکل کر دُنیا کی وسعتوں کی طرف قدم بڑھایا اور بڑھتے بڑھتے سب چیزیں اس طرح ایک دوسرے سے مِل گئیں کہ اُن کا

سُلجھانا غیر ممکن ہے۔

تعلیم اور مدرسے کی ذمہ داری کم سے زیادہ اور زیادہ سے بہت زیادہ ہو گئی لیکن شروع سے اس ذمہ داری کو محسوس نہیں کیا گیا ضرورت اس بات کی تھی کہ مدرسہ فطرت کا ساتھ دیتا جس طرح ابتدائی سوسائٹی میں بچہ اپنے گھر اور باہر کے دھندوں میں شریک ہو کر اُن سے سب کچھ سیکھتا تھا، اُسی طرح مدرسے میں بھی ضرورت تھی کہ حقیقی زندگی کا ماحول پیدا کیا جاتا۔ بچے اس میں محدود نہ کر دیئے جاتے۔ مدرسہ اُن کے لئے ایک چھوٹی سی دُنیا بن جاتا جہاں وہ زندگی کی کشمکشوں میں ایک مختصر پیمانے پر حصّہ لیتے۔ مدرسہ وسیع ماحول میں سے صرف ضروری چیزوں کو چُن لیتا، اور بچوں کو اُس میں رہنے دیتا، اور وہ فطری طریقے پر زندگی کے سبق سیکھتے۔ اور بڑے ہو کر یہ نہ محسوس کرتے کہ اُن کا ماحول اُن کے لئے نہیں بنا۔ وُہ زندگی کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ زندگی مصیبتوں اور افسردگیوں کا مجموعہ ہے۔

اگر مدرسے اس بات کو محسوس کرتے کہ انسان ایک ایسا حیوان ہے جسے صرف سوسائٹی میں رہنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور جس کا ہر عمل دوسرے افراد کے میل جول کا نتیجہ ہے۔ بغیر سوسائٹی کے اُس کی زندگی، زندگی نہیں اور بغیر دوسروں سے ملے جُلے اور دوسروں کی عملی سرگرمیوں میں حصّہ لئے، وُہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور اگر زندہ رہ بھی سکتا ہے تو زندوں کی طرح نہیں بلکہ مُردوں کی طرح۔ صرف اس چیز کے محسوس کرنے کے بعد مدرسے کا ماحول خود بخود فطری ہو جاتا۔ یہ تو وہ اصول ہے جو عام فطرتِ انسانی پر چھایا ہوا ہے اور جسے عام حیاتِ انسانی کا جوہر سمجھنا چاہیئے کہ انسان اپنے گرد و پیش کی زندگی میں حصّہ لے، ہر عمل میں خود شریک ہو اور اُس کے تجربے خود اُس کے ذاتی عمل کا نتیجہ ہوں۔ صرف اس قسم کے تجربے زندگی کا جزو بن سکتے ہیں۔

لیکن اس عالمگیر اصُول کے علاوہ، کچھ نفسیاتی چیزیں ایسی بھی ہیں جو فطرت نے ہر بچّے کو عطا کی ہیں۔ ہر بچہ صرف انہیں فطری صلاحیتوں کی وجہ سے بچہ ہے۔ اور یہی فطری قوتیں اُس کی نشوونما، ترقی اور تربیت میں مدد دیتی ہیں۔ پہلی جبلّت جس کا مختصر طور پر ذکر کر دیا گیا ہے "عمل کا شوق" ہے۔ ہر بچہ چاہتا ہے کہ وہ برابر کچھ نہ کچھ کرتا رہے۔ کھانا کھاتے وقت، سونے کے لئے پلنگ پر جاتے وقت، پڑھتے وقت، یا اسی قسم کے کسی ضروری شغل میں مصروف ہونے کے باوجود بھی اُس کا دماغ کسی نئی شرارت کے خیال میں ڈوبا رہتا ہے۔ بچوں کی شرارت اُن کے ذوقِ عمل کی تکمیل کا دُوسرا نام ہے، یہ چیز بچے کی فطرت ہے۔ اگر کوئی اُسے ایسا کرنے سے روکتا ہے تو وہ فطرت کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرتا ہے۔ اس لئے تعلیم کے لئے سب سے پہلی ضروری چیز یہ ہے کہ وہ بچے کو جسمانی اور دماغی عمل میں شریک ہونے کا زیادہ سے زیادہ موقع دے۔

دوسری جبلّت جس کا تعلق کسی حد تک پہلی سے ہے اُس کا "ذوقِ تعمیر" ہے۔ ہر بچہ کچھ نہ کچھ بنانا چاہتا ہے۔ مٹی کے گھروندے کیچڑ کے کھلونے، آٹے کی گڑیاں، کاغذ کی ناؤ، سیاہ کوئلے کے نقش و نگار، غرض اُس کے لئے کچھ نہ کچھ بنانا بے حد ضروری ہے۔ فطرت اُسے مجبور کرتی ہے تو وہ ایسا کرتا ہے۔ اس لئے معلّم کا فرض ہے کہ بچے کی اس فطرت کو زیادہ سے زیادہ اپنے اظہار کا موقع دے۔

بچہ کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا ہے، وہ کچھ نہ کچھ بنانا چاہتا ہے لیکن ان دونوں باتوں کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کے ہر عمل میں اس کی ہر تجویز میں، اس کی ہر تعمیر میں، اس کے ہم جنس شریک ہوں۔ یہ اس کی فطرت کا تیسرا جزو ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اُسے فکر و عمل میں آزادی ہو۔ وہ جو کچھ سوچے، اور جو کچھ کرنا چاہے، اُس میں کوئی شخص رکاوٹ نہ ڈالے۔

اب تک ہمارے مدرسے نے ان سب باتوں کو اچھی طرح محسوس نہیں کیا ہے۔ وہ فطرت کے راستے سے الگ رہ کر چل رہا ہے اور اسی لئے دُنیا میں روز بروز ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے جو دنیا سے بیزار نظر آرہے ہیں، جو دُنیا کو اپنے لئے اور اپنے آپ کو دُنیا کے لئے موزوں نہیں پاتے۔ اس لئے اس وقت ہمارے سامنے سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہم مدرسوں کی بنیاد فطرت کے ان چند اصولوں پر رکھیں۔ مدرسے کو ایک ایسا ماحول بنادیں جس میں زیادہ سے زیادہ عمل، تعمیر اور مسرت کے موقع حاصل ہوں۔ جہاں بچے کھیل سکے، اپنے ہمجولیوں سے اشتراکِ عمل کر سکے، کام کی چیزیں بنا سکے اور اپنی فطری قوتوں کو ترقی دے سکے اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ اُس کی فضا میں آزادی کی لہریں دوڑتی ہوئی دیکھے۔

لیکن یہ کہنا کہ مدرسوں نے اب تک اپنی ذمہ داری کو محسوس نہیں کیا ہے، صحیح نہیں۔ اس لئے کہ اب سے صدیوں پہلے سے مفکرین تعلیمی اہمیت کو محسوس کرتے رہے ہیں اور اس لئے ہر شخص نے اپنے نظریے کے مطابق تعلیم کے مقاصد بنائے، اور چاہا کہ دُنیا کی تعلیم اُنہیں مقاصد کے سہارے پر چلے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ تعلیم کا مقصد انفرادیت اور شخصیت کی تعمیر اور اُس کی نشوونما ہونا چاہیے۔ کسی کے خیال میں تعلیم کا مقصد یہ رہا کہ بچے کو زندگی کی کشمکشوں کے لئے تیار کیا جائے۔ اور شروع سے اب تک تھوڑے بہت فرق کے ساتھ عموماً مفکرین نے انہیں دو مقاصد پر زیادہ زور دیا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو دونوں مقاصد میں سے ایک بھی بجائے خود مکمل نہیں۔ صرف انفرادیت اور شخصیت کی تعمیر و نشوونما سوسائٹی کے لئے کام کی چیز نہیں۔ انسان فطرۃً معاشرتی ہے اس لئے وہ اپنی ایک دُنیا الگ بنا کر نہیں رہ سکتا۔ دوسرا مقصد بھی بالکل محدود ہے۔ تعلیم اگر انسان کی ذہنی اور اخلاقی نشوونما میں مدد نہ کرے، بلکہ اُس کا مقصد صرف یہ ہو کہ وہ آدمی کو پیٹ بھرنے کے لائق بنادے۔ تو انسان اور دوسری مخلوقات میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے؟ وحشی درندے بھی تعلیمی نعمتوں سے محروم رہنے کے باوجود پیٹ بھرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں، پھر انسان کو ان تعلیمی زنجیروں اور بندشوں میں جکڑنے سے کیا فائدہ؟ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ تعلیم کا مقصد نہ صرف انفرادیت اور شخصیت کی تعمیر و نشوونما ہے اور نہ رزق کی فراہمی بلکہ مشترک طور پر دونوں باتیں۔ نظامِ تعلیم ایسا ہونا چاہیئے جو انسانی نشوونما میں بھی مدد دے اور اُسے سوسائٹی کے لئے مفید بھی بنائے، وہ اپنے لئے بھی اچھا بن سکے اور دوسروں کے لئے بھی۔

ان سب مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر ہمیں دیکھنا ہے کہ ہماری تعلیم میں کون سی کمی ہے جسے پورا کرنے کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلی بات جس کا ہم ذکر کر چکے یہ ہے کہ ہماری تعلیم فطرت سے دُور ہے۔ فطرت انسان کو جو سبق سکھاتی ہے، مدرسے اُس سے بالکل اُلٹے راستے

پر چلتے ہیں۔ فطرت نے بچوں میں جو صلاحیتیں پیدا کی ہیں تعلیم اُن سے فائدہ اُٹھانے کی ضرورت نہیں محسوس کرتی، اور اس لئے اُس کے نتائج مُہلک ہیں۔ نہ بچوں کی فطری قوتوں کی صحیح نشوونما ہوتی ہے اور نہ وہ آئندہ زندگی کی کشمکشوں کا مقابلہ کرنے کے قابل بن سکتے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہمارے مدرسوں میں "دستکاریوں" کی تعلیم ہو۔ ہر بچہ اپنی ضرورت اور دلچسپی کے مطابق جس "دستکاری" میں چاہے حصّہ لے۔ اور فطرت کے راستے پر چلتا ہوا زندگی کی منزلوں کو آسانی سے طے کرسکنے کے قابل ہو سکے۔

بچوں کی انفرادیت اور شخصیت کو صحیح نشوونما کا موقع صرف اُسی صُورت میں مِل سکتا ہے جب اُنہیں عمل کا موقع دیا جائے جب اُن کی "فطرتِ تعمیر" سیراب ہوتی رہے۔ جب اُنہیں فکر و عمل کی آزادی حاصل ہو، اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنے ہمجولیوں سے آزادی کے ساتھ مِل جُل سکیں۔ خود اُن کے کاموں میں شریک ہوسکیں، اُنہیں اپنے کاموں میں حصّہ لینے کی دعوت دیں۔ عمل کا صحیح جذبہ انسان کے دل میں صرف اسی صُورت میں پَیدا ہوسکتا ہے جب وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے، اُس میں دوسرے بھی شریک ہیں، اُس سے دوسروں کو بھی دلچسپی ہے، اُس میں دوسروں کا بھی فائدہ ہے۔ مِل جُل کر کام کرنے سے آدمی میں اتحاد، ہمدردی، محبت، رواداری، اعتماد کے بلند جذبات کے علاوہ اس بات کا صحیح احساس بھی پَیدا ہوتا ہے کہ زندگی "اشتراکِ عمل" اور اس کے ساتھ ساتھ "تقسیمِ عمل" کا دُوسرا نام ہے۔ ہر کام کی تکمیل کے لئے ایک دوسرے کی مدد اور ہمدردی بے حد ضروری چیز ہے۔ اس جذبہ کا صحیح احساس اُس میں اعتمادِ نفس پیدا کرتا ہے۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ کسی کام کا کونسا جزو ایسا ہے جسے وُہ سب سے زیادہ اچھی طرح کرسکتا ہے۔ اس سے اُسے سوچنے اور اپنی فطری قوتوں، صلاحیتوں اور دلچسپیوں کا اندازہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اسی چیز کا نام ہے، انفرادیت کا احساس اور شخصیت کی ترقی۔ انفرادیت یا شخصیت کا پیدا ہونا، اُس کا احساس، ترقی اور نشوونما صرف اشتراکِ عمل کے بعد ممکن ہے۔ پُرانی تعلیم میں اس کے موقعے نہیں تھے اس لئے ضرورت ہے کہ ہمارے مدرسوں میں "دستکاری" کی تعلیم کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہو۔ ہر بچہ جب تک یہ نہیں محسوس کرتا کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے اُس کا مقصد کیا ہے، وہ اس کام میں زیادہ دلچسپی نہیں لے سکتا۔ "دستکاریوں" کی تعلیم سے ایک تو یہ فائدہ ہوگا کہ بچوں کو اپنی فطری قوتوں کی نشوونما کے ساتھ سوسائٹی میں اپنے صحیح درجے اور حیثیت کا احساس ہوگا۔ وہ یہ محسوس کریں گے کہ دُنیا کے نظام میں اُن کا بھی ایک خاص حصّہ ہے۔ یہ چیز انفرادیت کی ترقی کے لئے سب سے بڑا تازیانہ ہوگی۔

اب تک ہم نے "دستکاری" کی تعلیم کی اہمیت کو نفسیاتی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھا اور محسوس کیا کہ ان دونوں حیثیتوں سے صرف "دستکاری" ہی کی تعلیم حقیقت میں فطری تعلیم ہے۔ لیکن ہر زمانے میں چیزوں کی اہمیت کا اندازہ، صرف فطرت، اخلاق اور الٰہیات کے اصول کی بنا پر نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی "عمل" کا دوسرا نام ہے۔ اس لئے یہاں کی ہر چیز اُس وقت تک باقی رہنے کا حق نہیں رکھتی جب تک وہ عملی حیثیت سے بھی "افراد" اور سوسائٹی دونوں کے لئے مفید نہ ہو۔ زمانے کی کشمکش یہ چاہتی ہے کہ ہر شخص کو اُس میں حصّہ لینے کی صلاحیت اور قوّت حاصل ہو، ہر شخص اس قابل ہو سکے کہ نہ صرف وہ دوسروں پر بار نہ ہو، بلکہ دوسروں کو سہارا

بھی دے سکے۔ جن میں زندگی کی تگ ودو میں حصہ لینے کا سکت نہیں، وہ اس کے سہارے پر اس راستے کو طے کرتے رہیں۔ دوسری ضرورت
یہ ہے کہ زندگی کی پیچ در پیچ زنجیریں ہر شخص کو اس بات کی اجازت نہیں دیتیں کہ وہ اس کے ہر شعبہ کا ماہر ہو سکے۔ زندگی کی پیچیدگیوں
اور سماجی زندگی کے تعلقات کی وسعتوں کے ساتھ ساتھ انسانی ضرورتیں بھی بڑھتی اور پیچیدہ ہوتی جاتی ہیں اس لئے کوئی شخص اکیلا
ان گتھیوں کو نہیں سلجھا سکتا۔ مختلف لوگوں کو مختلف کام کرنے پڑیں گے۔ ایک کا کیا ہوا کام دوسرے کے کام آئے گا اور اس طرح زندگی
ہموار اور آسان بنے گی۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے بھی ضروری ہے کہ "دستکاریوں" اور "پیشوں" کو ہماری تعلیم میں اہمیت حاصل ہو۔
انسان خود اپنے لئے بھی کچھ کرے اور اس سے زیادہ دوسروں کے لئے۔ ہر شخص کے دل میں اپنا مخصوص کام کرتے وقت یہ خیال ہو
کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے، وہ اس کا حصہ ہے، جس میں ساری سوسائٹی کو کچھ نہ کچھ ملے گا۔ اس کے کاموں میں "خودغرضی" کا نہیں بلکہ
"قومیت" کا جذبہ جلوہ فرما ہونا چاہیئے۔ یہ جذبہ کام کرنے والوں میں صرف مدرسے پیدا کر سکتے ہیں۔ جہاں انہیں ان کی مخصوص ذہنیتوں
اور دلچسپیوں کے مطابق آزادی سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل جل کر کام کرنے کا موقع ملے۔ وہ ہمدردی، محبت، رواداری
اور بھروسے کا سبق سیکھ کر مدرسوں سے نکلیں اور آئندہ زندگی کی جدوجہد میں شریک ہو کر انسانی خدمت میں حصہ لیں۔

تعلیم کا سب سے پہلا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ہر شخص کو اپنی فطری صلاحیت کے مطابق کام کے انتخاب کا موقع دے، تاکہ وہ اپنی
فطری قوتوں کو ترقی دے کر انہیں ملک اور قوم کی خدمت میں لگا سکے۔ یہ مقصد صرف اس طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ ہماری تعلیم
کی تقسیم "دستکاریوں" اور "پیشوں" کی بنا پر ہو۔

اب تک "دستکاریوں" اور "پیشوں" کی اہمیت کے متعلق جو کچھ کہا گیا، ممکن ہے اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہو کہ مدرسوں میں ان کے
رائج کر دینے کے بعد زندگی "بے کیف" اور بدمزہ ہو کر رہ جائے گی۔ ہر شخص ایسے کام میں مصروف ہوگا جس میں کسی رومانی جذبہ کو ابھرنے کا
موقع تک نہ مل سکے گا۔ زندگی کی دلکشیاں مفقود ہو جائیں گی۔ یہ خیال ممکن ہے سوچنے والوں کو صحیح معلوم ہوتا ہو لیکن حقیقت میں اس
سے زیادہ بے بنیاد خیال کا تصور بھی محال ہے۔ اس لئے کہ "دستکاریوں" اور "پیشوں" کی تعلیم دیتے وقت سب سے پہلے تو اس بات کا
خیال رکھا جائے گا کہ ہر بچے کو فطری طور پر کس کام سے دلچسپی ہے۔ اس کی فطری دلچسپی کا پتہ چلانے کے بعد جب اسے کسی کام میں لگایا
جائے گا تو پھر "بے کیفی" اور "بدمزگی" کا سوال ہی نہیں ہوگا۔ کوئی کام بجائے خود دلچسپ یا غیر دلچسپ نہیں ہوتا۔ یہ چیز بالکل اضافی
ہے اور اس کا تعلق کم و بیش فطرت سے ہے۔ ایک کام مجھے پسند ہے کسی دوسرے کو نہیں تو اس میں نہ میری بدمذاقی ہے اور نہ
کام کا کوئی قصور۔ نطرۃً ایک آدمی ایک کام کے لئے موزوں ہے اور دوسرا نہیں۔ فطرت کا تنوع بھی بڑی غنیمت چیز ہے۔ اگر ایسا نہ
ہوتا تو زندگی ایک عجیب معماہن کر رہ جاتی۔ سمجھ ہی میں نہ آتا کہ اسے کس طرح گزارا جائے۔ اس لئے ضرورت صرف اس بات کی ہے
کہ ہم فطرت کے اس تنوع کو محسوس کریں اور ہر شخص سے صرف وہی کام لیں، جس کے لئے وہ فطرۃً سب سے زیادہ موزوں ہے، اس کا

ایک نتیجہ تو یہ ہوگا کہ کام کرنے والا اس کام میں کھیل کی سی دلچسپی لے گا۔ اُس کی قوتیں ترقی کریں گی۔ اُس کی مسرتوں میں اضافہ ہوگا۔ لیکن اس انفرادی یا شخصی فائدہ کے ساتھ ساتھ سب سے بڑا نفع یہ ہوگا کہ سوسائٹی کے اشتراکِ عمل میں آسانیاں ہوں گی اُس کی رفتار میں رُکاوٹیں نہیں پیدا ہوں گی۔ سوسائٹی اور تمدن جتنا زیادہ ترقی کرتا جاتا ہے، وقت کی اہمیت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ اور اس لئے زمانہ کو اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ ہر کام زیادہ سے زیادہ آسانی سے اور کم سے کم وقت میں ہو سکے۔ یہ بات صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہر شخص کو اُس کی دلچسپی کا کام ملے۔ وُہ اُس میں مہارت حاصل کرے اور زیادہ سے زیادہ آسانی سے اور کم سے کم وقت میں اُسے انجام دے سکے۔ وقت کی اس تیز دَوڑ میں جیتنے کی صرف یہی ایک ترکیب ہے۔

لیکن اب سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ آخر اس بات کا پتہ کس طرح چلایا جائے کہ کسے کس کام، دستکاری یا پیشے سے زیادہ دلچسپی ہے۔ اس لئے اگر بچوں سے اس کے متعلق پوچھ کر صحیح نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی جائے گی تو اکثر صورتوں میں ناکامی ہوگی۔ بچوں کو خود اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا کہ انہیں واقعی کس کام سے سب سے زیادہ دلچسپی ہے۔ ان دقتوں کو محسوس کر کے انگلستان، جرمنی، امریکا اور آسٹریلیا وغیرہ میں اس طرح کی جماعتیں کافی تعداد میں ہیں جو مختلف طریقوں سے بچوں کی فطری دلچسپیوں کے متعلق صحیح نتائج پر پہنچنے کی کوشش کرتی ہیں۔ بچوں کی گھریلو زندگی، مدرسے کے رجحانات، امتحانوں کے نتائج اور دُوسرے نفسیاتی تجربات سے اس بات کا اندازہ لگایا جاتا ہے کہ کون سا بچہ کس کام یا پیشے کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے اور اس کے بعد اُسے اسی قسم کی تعلیم دی جاتی ہے اور تعلیم کے بعد اُسی طرح کی ملازمت یا پیشے کے حاصل کرنے میں اس کی مدد کی جاتی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ اس قسم کی کوششوں کے بعد بچوں کو زندگی کے جن مشاغل کے لئے تیار کیا جاتا ہے، اکثر صورتوں میں وہ اُن میں امتیازی حیثیت حاصل کرتے ہیں۔

اس لئے ضرورت ہے کہ ہمارے مدرسے صرف "کتابی مدرسے" نہ رہیں بلکہ ایسے مرکز بن جائیں جہاں بچے کام کرنا سیکھیں، اُن میں عمل کی قوتیں پیدا ہوں، وہ اپنے ہر عمل کو "سماجی مفہوم" دینے کے قابل ہو جائیں۔ وُہ اپنے ہر کام کو اس نظر سے دیکھیں کہ اس میں قوم، مُلک اور عام انسانوں کی بھلائی ہے۔ مدرسوں کی زندگی بچوں کو فطری معلوم ہو۔ اپنے گھر اور سماج کی زندگی اور مدرسے کی زندگی میں اُنہیں تضاد نظر نہ آئے۔ وُہ یہ سمجھیں کہ جو کچھ اُنہوں نے گھروں میں دیکھا ہے اُسے وہ مدرسے میں سیکھ رہے ہیں اور جو کچھ وہ مدرسے میں سیکھ رہے ہیں وہ سماجی زندگی میں کام آئے گا۔ اُن میں "حکومت" کا نہیں بلکہ "خدمت" کا جذبہ بیدار ہو۔ وہ مل جُل کر کام کرنے کے عادی بنیں۔ جو ایک کام کرے، اس میں دوسرا اُس کی مدد کرے۔ ایک کی غلطی کی اصلاح دوسرا کرے اور غلطی کرنے والا اُسے خوشی سے مان لے۔ خود غرضی کا جذبہ فنا ہو کر قومی اور مُلکی بن جائے۔ ہر شخص یہ محسوس کرے کہ ہر کام میں اس کی غرض عام انسانوں کی دلچسپی اور بہبودی ہے۔ مغرب کے مدرسوں میں یہ سب کچھ ہوتا ہے اور اس سے بچے اور بڑے، قوم اور مُلک ہر ایک کو فائدہ پہنچ رہا ہے کوئی

وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہمارا ملک بھی اگر ان مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر اپنے نظامِ تعلیم کو ترتیب دے تو اس سے زندگی کی دشواریاں اور افسردگیاں کم نہ ہو جائیں۔

اس قسم کی تعلیم کا نصاب پر، طریقۂ تعلیم پر، امتحانوں پر لازماً گہرا اثر پڑے گا اور ممکن ہے کہ سوچنے والوں کو یہ بات کسی قدر دشوار نظر آتی ہو لیکن حقیقت میں ایسا نہیں۔ جن ملکوں میں یہ طریقہ رائج ہے وہاں ہر چیز نہایت کامیابی کے ساتھ اس کے مطابق بنا لی گئی ہے۔ اور کوئی چیز بھی غیر فطری نہیں معلوم ہوتی۔ اس لئے ہم اس جگہ اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔

لیکن مضمون ختم کرنے سے پہلے، ایک بات کا اظہار کسی قدر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ "دستکاری" یا "پیشوں" کی تعلیم کو اپنا مقصد بنا لینے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ مدرسے سے نکلنے والے بچے صرف "دستکار" یا "کاریگر" یا کسی خاص پیشے کے ماہر ہو کر نکلیں۔ ملک کے ہر گوشے میں لوہار، بڑھئی، کپڑا بُننے والے، کسان غرض ہر قسم کے پیشہ ور موجود ہیں جو ہمیشہ سے لوگوں کی خدمت کر رہے ہیں پھر کیا ضرورت ہے کہ مدرسے اس بار کو اپنے سر لیں۔ جس طرح یہ کام اب تک ہوتے چلے آئے، اب بھی ہوتے رہیں گے۔ اگر مدرسوں کا مقصد صرف اس قسم کے "دستکار" اور "کاریگر" بنانا ہے تو مدرسوں پر اتنا روپیہ خرچ کرنا فضول ہے۔ اگر واقعی مدرسے صرف ایسے ہی ہو کر رہ جائیں جیسا کہ اعتراض کرنے والوں کا خیال ہے تو اُن کے ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔ اس لئے ضرورت ہے ایسے مدرسوں کی جو "دستکاری" اور "پیشوں" کی تعلیم دینے کے ساتھ بچوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت بھی کریں۔ اُن میں خدمت کا صحیح جذبہ، رواداری، ہمدردی، محبت اور ایثار پیدا ہو۔ وہ اپنے آپ کو ایک وسیع انسانی جماعت کا ایک ایسا فرد سمجھیں، جس کا کام قومی اور ملکی فلاح اور بہبود میں حصہ لینا ہو۔ اُن میں اپنے ملک کی قدیم روایات کا احترام اور سچی محبت ہو۔ وہ اپنی زندگی کو ملک و ملت کے قدیم تمدن کی ایک کڑی سمجھیں۔ اُن کا ہر کام اُن کے نزدیک قومی و ملی خصوصیات اور روایات کا آئینہ دار ہو —— ان سب باتوں کے لئے ضرورت ہے کہ ملکی تاریخ اور ادب کا سرمایہ اُن کی تعلیم کا ایک خاص جزو ہو۔ مادری زبان پر عبور حاصل کر کے وہ اپنے تمدن کے ان آئینہ خانوں کی سیر کر سکیں۔ اسی میں ابدی سرور اور قومی زندگی کا راز ہے۔

سیّد وقار عظیم ایم۔ اے

چھوٹی سی تُم

(۱)

چھوٹی سی دُنیا
چھوٹا سا سُورج
چھوٹا سا میں

(۲)

چھوٹی سی جنّت
چھوٹا سا رضواں
چھوٹا سا میں
اور چھوٹی سی تُم

الف۔ اکم۔ ساقی

وفاؤں کو میری بھلا دینے والے

فلک رس تخیّل کا لے کر سہارا
تجھے رات بھر چاند تاروں میں ڈھونڈا

دھڑکتے ہوئے دل کو ہمراہ لے کر
تصوّر کی رنگیں بہاروں میں ڈھونڈا

جھجکتے، جھجکتے، خراماں خراماں
ہوا کی طرح مرغزاروں میں ڈھونڈا

تڑپ برق نے جس گھڑی دل کو دیدی
اُبھر کر تجھے ابر پاروں میں ڈھونڈا

جنونِ محبت سے مجبور ہو کر،
بپھرتی ہوئی آبشاروں میں ڈھونڈا

کبھی سر پٹکتا پھرا گلستاں میں
کبھی کہکشانی بہاروں میں ڈھونڈا

غرض اپنی حیران نگاہوں سے ہر سُو
تجھے حُسن کے رہگزاروں میں ڈھونڈا

نظر حیدر آبادی

بُدھ کا سوئمبر

جب کوئی چارہ کارگر ثابت نہ ہُوا تو راجہ نے اپنے تمام وزیروں کو بُلایا اور کہا کہ کوئی ایسا طریقہ بتاؤ جس سے راجکمار سدھارتھ سلطنت کی باگ ڈور سنبھال لے اور اُن تمام لوازم سے بہرہ اندوز کیا جائے جو ایک راجہ کے شایانِ شان ہیں۔

ایک بوڑھے وزیر نے جواب دیا: جہاں پناہ! اس روگ کی دوا محبّت ہی ہے۔ اس کے کنوارے دل پر عورت کی محبّت کے ڈورے ڈالیئے۔ جسے آپ زنجیروں کے ساتھ نہیں جکڑ سکتے وہ دوشیزہ کے دامِ گیسو میں آسانی سے گرفتار ہو سکے گا۔ ایک جشن کا انتظام کیجیئے۔ اس تقریب میں راجدھانی کی تمام پری چہرہ لڑکیاں شامل ہوں۔ شہزادہ ان کے درمیان انعام تقسیم کرے، اور جب وہ تخت کے نزدیک سے گزریں تو اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جائے کہ کس دوشیزہ کے حُسن نے شہزادے کی اُداس آنکھوں میں چمک پیدا کی ہے۔ اِس طرح ہم محبت کی آنکھوں سے ہی انتخاب کر سکیں گے۔"

راجہ کو یہ تجویز پسند آئی۔ اس جشن کے لئے ایک خاص دن مقرر کیا گیا۔ اور منادی کے ذریعہ سے تمام شہر میں اعلان کر دیا گیا۔

مقررہ دن پر کپل وستو کی راجکماریاں بڑی دھوم دھام سے آئیں۔ اپنے دلفریب ناز و انداز اور حُسن کی تمام رعنائیوں کے ساتھ جب وہ خوش وضع اور خوش قطع لباس میں ملبوس، آنکھیں جُھکائے تخت کے نزدیک سے گزرتیں تو شہزادہ ہر ایک کو کوئی نہ کوئی سوغات پیش کرتا۔ اس طرح ایک کے بعد دُوسری آتی اور سوغات حاصل کر کے واپس چلی جاتی۔ سب سے آخر میں راجکماری یشودھرا کی باری آئی۔ وہ آسمانی حُسن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ مست چال، ہرن کی سی آنکھیں، بھولا بھالا چہرہ۔ اُس نے نظر بھر کر شہزادہ کی طرف دیکھا اور مسکرا کر پُوچھا "کیا میرے لئے کوئی سوغات ہے؟" جس وقت یہ نیک بخت کماری نزدیک پہنچی تو شہزادہ کی نظروں میں ایک خاص انداز کی تبدیلی نے درباریوں کو چونکا کر دیا۔

شہزادے نے جواب دیا "تحفے تو ختم ہو گئے ہیں مگر پھر بھی پیاری بہن آپ یہ لیجیئے"۔ یہ کہتے ہوئے شہزادے نے اپنا ہیروں کا بیش قیمت ہار راجکماری کے گلے میں ڈال دیا۔ راجکماری نے مسکرا کر اپنے محسن کی طرف دیکھا بس ایک ہی نگاہ نے شہزادہ کو بسمل کر دیا۔

دربار برخاست ہونے کے بعد درباریوں نے تمام حالات راجہ کے سامنے بیان کر دیئے اور بتایا کہ کنور نے کماری کو اور کماری نے کنور کو جی بھر کے دیکھا ہے۔ راجہ نہایت خوش ہُوا اور حکم دیا کہ خاص ایلچی کے ذریعہ سے کماری یشودھرا کے پتا سے شادی کی اجازت حاصل کی جائے۔

اُس زمانے میں سوئمبر کا رواج تھا اور ہر اُمیدوار کو مردانگی کے جوہر دکھانے کی دعوت دی جاتی تھی۔ شہزادی کے پتا نے بھی یہی شرط

پیش کی۔ یہ سُن کر راجہ کچھ غمگین ہُوا کیونکہ وُہ جانتا تھا کہ دیودت تیراندازی میں، ارجن شاہسواری میں اور نندا شمشیرزنی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اُس کا رِشی شہزادہ اس مقابلہ میں پورا نہ اُتر سکے گا۔ مگر شہزادہ نے آہستہ سے جواب دیا کہ مَیں ان تمام چیزوں سے واقف ہوں، آپ اعلان کر دیجئے۔ مجھے یقین ہے کہ میں کامیاب ہُونگا۔ چنانچہ شہزادہ کی خواہش کے مطابق اعلان کر دیا گیا۔

ساتویں دِن دُور اور نزدیک کے شہزادے سوئمبر کے میدان میں جلوہ افروز ہوئے اور راجکماری یشودھرا بھی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ، باندیوں کے جھُرمٹ میں، ہاتھوں میں پھُولوں کی مالا لئے کہ اس کے مقابلہ کو دیکھنے آئی۔ شاہی گھرانوں میں سے دیودت اُمیدوار تھا۔ ارجن اور نندا بھی امیر خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ تینوں اپنے مُلک کی جوانی کی بہار تھے۔ شہزادہ سدھارتھ اپنے سفید گھوڑے کنتک پر سوار ہو کر آیا۔

وقت ہو گیا اور حاضرین کی پُرشوق نگاہیں شہزادوں پر جم گئیں۔ سب سے پہلے نندا نے تیراندازی کے جوہر دکھانے کے لئے کہا۔ ایک ڈھول چھ کوس دُور رکھا گیا۔ ارجن نے بھی چھ کوس دُور رکھا۔ دیودت نے آٹھ کوس دُور۔ مگر شہزادہ سدھارتھ نے دس کوس دُور رکھنے کے لئے کہا جہاں سے ڈھول ایک چیونٹی کے مانند دکھائی دیتا تھا۔ نندا اور ارجن کے ڈھول چھِد گئے مگر دیودت کا تیر آر پار ہو گیا۔ دیودت کے کمال کا شور مچ گیا۔ راجکماری یشودھرا نے اپنی سنہری ساڑھی کا آنچل آنکھوں پر کھینچا تاکہ شہزادہ سدھارتھ کے تیر کا نشانہ خطا ہوتے نہ دیکھ سکے۔

اب سدھارتھ کی باری تھی۔ شہزادہ نے کمان کی طرف جو چاندی کے تاروں سے کسی ہوئی تھی دیکھا۔ اِسے کوئی طاقتور بازو ہی اُٹھا سکتا تھا۔ کنور نے آہستہ آہستہ مسکراتے ہوئے کمان اُٹھائی، اور ڈوری کو ہلکی سی جنبش دی مگر موٹا بید درمیان سے ٹوٹ کر رہ گیا۔ شہزادے نے کہا "یہ کھیل نہیں کوئی ایسی کمان لاؤ جو بہادر راجاؤں کی شان کے مطابق ہو" ایک بولا "سہانو کی کمان لاؤ جو ایک عرصہ سے مندر میں پڑی ہوئی ہے، اور جسے کوئی بھی کھینچ نہیں سکا" آخر وہ پُرانی کمان لائی گئی۔ یہ سیاہ فولاد کی بنی ہوئی تھی۔ اور اُس کے کناروں پر سونے کے تار چڑھے تھے۔ ہرن کے سینگوں کا ایک نمونہ تھا۔ شہزادہ نے گھٹنوں پر رکھ کر دو دفعہ جانچا اور کہا "اب چلاؤ میرے دوستو!" مگر اس کمان کو نہ تو دیودت، نہ ارجن اور نہ نندا ہی جھکا سکے۔ آخر شہزادہ نے نیچے ہو کر کمان کو دبایا۔ ڈوری کو کھینچا۔ بالکل اس طرح آواز پیدا ہوئی جس طرح عقاب کے پروں سے ہوا تھراتی ہے۔ پھر کنور نے ایک تیر چلایا جو فضا کو چیرتا ہُوا سب سے دُور رکھے ہوئے ڈھول میں سے گزر کر نظروں سے غایب ہو گیا۔

اِس کے بعد دیودت نے تلوار چلانے کی دعوت دی۔ اور اس کے ساتھ ہی چھ انگشت موٹے درخت کو ایک ہی وار میں کاٹ کر رکھ دیا۔ اسی طرح ارجن نے سات اور نندا نے نو انگشت گہرے وار کئے مگر شہزادہ سدھارتھ نے ایک ساتھ کھڑے دو تنوں کو ایک ہی وار میں اس صفائی سے کاٹ دیا کہ تنے بدستور اپنی جگہ کھڑے رہے۔ نندا نے شور مچا دیا کہ تلوار کی دھار خم کھا گئی ہے۔ شہزادی یشودھرا بھی تو ایک دفعہ تنوں کو وہیں کھڑا دیکھ کر گھبرا گئی۔ مگر اچانک ہوا آئی اور دونوں کٹے ہوئے تنے نیچے گر پڑے۔

جب شمشیرزنی کا مقابلہ بھی ختم ہو چکا تو گھوڑے میدان میں لائے گئے تین دفعہ میدان کے گرد چکر لگائے گئے۔ اور ہر دفعہ کنتک

چند نئے الفاظ

یوں کہنے کو اُردو میں ایک دو نہیں دس بیس زبانوں کے الفاظ داخل ہیں لیکن نظرِ حق بیں سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ اردو کی تشکیل و تدوین درا‌صل بھاشا اور فارسی کی رہینِ منت ہے اور یہی وجہ تھی کہ اس عصر تراجم میں بھی تہی مایہ اُردو کی نظریں فطرۃً بھاشا اور فارسی کی طرف اُٹھیں ورنا کام واپس آئیں۔

بھاشا کا دامن جدید مصطلاحات سے تقریباً خالی تھا، پھر ستم یہ کہ مترجمین نے دانستہ یا نادانستہ سنسکرت کی ثقیل ترکیبوں کی آڑلی اور یہ ترکیبیں اُردو والوں کے لئے غیر مانوس تھیں۔ رہی فارسی تو ایرانیوں نے بیسویں صدی کے آغاز تک فرنگی الفاظ کو بجنسہٖ داخلِ زبان کرنا مناسب سمجھا (مثلاً بانک، سانا توریم، آتومبیل وغیرہ) اور جب انہوں نے جدید الفاظ وضع کئے تو ہندوستانیوں کو یہ سوچنا پڑا کہ انگریزی کے رچے بھدے گھلے ملے الفاظ کو فارسی لطافت کی قربان گاہ پر قربان کرنا مناسب ہوگا یا نہیں، شاید یہی وجہ تھی کہ مولانا عبد الحق صاحب زاد مجدہ نے اپنی لغت میں ان انگریزی الفاظ کے مقابل جو ہماری زبان میں رچ گئے ہیں کوئی مفرد فارسی یا اُردو لفظ نہیں لکھا بلکہ وہی الفاظ اُردو رسم خط میں تحریر فرما دیئے لیکن سوال یہ ہے کہ ایشیا کے اس دورِ بیداری میں جبکہ ہر ایشیائی قوم اس سعی میں سرگرم ہے کہ مغربی زبانوں کے الفاظ کے بجائے نئے الفاظ وضع کئے جائیں ہم ادائے مطالب میں کب تک ایک مغربی زبان کے محتاج رہیں گے؛ پھر اگر جلد یا بدیر ہم کو انگریزی الفاظ ترک کرنا ہیں اور بدقسمتی سے کوئی ایسی ادبی انجمن بھی موجود نہیں ہے جس کے وضع کردہ الفاظ سب لوگوں کے لئے قابلِ تسلیم ہوں تو ان الفاظ کے بجائے فارسئ جدید کے مفرد الفاظ کیوں نہ استعمال کئے جائیں جن سے ہمارے کان ناآشنا سہی ہماری زبان کے قواعد ناآشنا نہیں ہیں۔

میں آج کی صحبت میں ۱۳۵۷ھ کے سال نامۂ پارس سے چند ایسے الفاظ کا ترجمہ نقل کرتا ہوں جن کے لئے ہماری زبان میں کوئی مفرد یا مرکب لفظ موجود نہیں ہے اور اُن کے ثقیل یا لطیف ہونے کا فیصلہ سلیم الطبع حضرات کے ذوقِ سلیم کے لئے چھوڑتا ہوں:-

آب بہا	Water Tax	بانک دار	Banker
آتش نشانی	Fire Brigade	بیمارستانِ شہر	Municipal Hospital
آمار	Statistics	پاسبان	Supdt of Police + Police Commissioner
آمار شناس	Statistician	پروانہ	License
آئین	Etiquette	تن پیمائی	Anthropometry
اعتبار نامہ	Letter of Credit	دانش جو	Research Scholar
انگشت نگاری	Dactylography	دو فلزی	Bimetalism
انجمن شہرداری[1]	Municipality	شہربانی	Police Department
بارآور	Productive Capital	شہردار	Chairman of Municipal Board
بازبین	Controller	گزرنامہ	Passport
بازرس	Inspector		

طالب صفوی

[1] اُردو میں خواص میونسپلٹی کو بلدیہ کہتے ہیں۔ اب بیرخانۂ فرہنگستانِ ایران کی ہدایت کے مطابق فارسی میں میونسپلٹی کو انجمن بلدی کے بجائے انجمنِ شہرداری

تصوّر

تصوّر اے تصوّر رحم فرما ہم غریبوں پر
اُداسی سی اُداسی چھا رہی ہی غم نصیبوں پر

بس اتنا ہو جوانی لمحہ بھر کو مُنہ دکھا جائے
ہماری جاگتی بے چینیوں کو نیند آ جائے

کہیں شاداب ٹیلوں کے کنارے سو رہے ہوں ہم
فضا میں سُو بہ سُو گیتوں کی کھیتی بو رہے ہوں ہم

جگر کو تھام کر دھیمے سُروں میں گا رہے ہوں وُہ
تمناؤں کو ٹھکرا کر مری پچھتا رہے ہوں وُہ

کہیں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آنسو بہا دیں ہم
کہیں باہوں میں باہیں ڈال دیں اور مسکرا دیں ہم

کہیں ہم پھول بن کر کھل رہے ہوں لالہ زاروں میں
کہیں بیباکیاں کرتے نظر آئیں بہاروں میں

کہیں ہم لڑکھڑاتے پھر رہے ہوں شاہراہوں پر
نہا کر دھر رہے ہوں وُہ کہیں احسان نگاہوں پر

کہیں زلفوں سے باندھا جا رہا ہو میری باہوں کو
کہیں ہنس ہنس کے روکا جا رہا ہو میری آہوں کو

تصوّر اے تصوّر رحم فرما ہم غریبوں پر
اُداسی سی اُداسی چھا رہی ہی بد نصیبوں پر

الطاف مشہدی

ہندوستان کی قومی زبان

کیا اُردو ہندی کا مسئلہ واقعی ایک فرقہ وارانہ سوال ہے؟[1]

ہندوستان کی اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہوگی کہ اِس بدنصیب مُلک میں اب ہر چیز پر ہندو یا مُسلم کا لیبل چسپاں ہونے لگا ہے۔ مسلمانوں کی سیاسی جماعت الگ، ہندوؤں کی سیاسی جماعت الگ۔ مسلمانوں کے تعلیمی ادارے جُدا، ہندوؤں کے تعلیمی ادارے جُدا۔ کون حسّاس ہندوستانی ہوگا جسے ریلوے سٹیشن پر "ہندو روٹی" اور "مسلمان گوشت" کی دلخراش صدا سُن کر دلی صدمہ نہ پہنچتا ہو؟ سیاست، تعلیم اور معاشرت کو مسخ کرنے کے بعد فرقہ پرستی کے زہریلے سانپ نے اب زبان کو اپنا ہدف بنایا ہے۔ سیدھے سادھے ہندوؤں کی ایک زبردست اکثریت کو اِس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا گیا ہے کہ اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان نہیں بلکہ محض مسلمانوں کی زبان ہے اور اس لحاظ سے قطعاً بدیشی۔ اِدھر بعض مسلمان اِس وہم میں ہیں کہ ان کا تمدّن اور مذہب اُردو زبان سے وابستہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو یہ سمجھتے ہیں کہ جاتی کی نجات اسی بات میں ہے کہ بدیشی اُردو کو بھارت ورش سے نکال کر ہندی کو راشٹر یہ بھاشا بنایا جائے اور جب زمانے کی تیز رفتاری کے باعث انہیں اپنے مقصد میں صاف اور صریح ناکامی ہوتی دکھائی دیتی ہے تو وُہ پریشانی اور اضطراب کے عالم میں پکار اُٹھتے ہیں "اب ہندوؤں کا کیا بنے گا"؟ اس کے برعکس مسلمانوں کے ایک خوش اعتقاد گروہ کا خیال ہے کہ اگر اُردو میں عربی اور فارسی کے ثقیل اور ناقابلِ فہم الفاظ کی بھرتی نہ کی گئی تو اسلامی تمدّن کو زبردست نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ دونوں اقوام کی اِس ذہنیت نے اُردو ہندی کے مسئلہ کو بھی ایک فرقہ وارانہ سوال بنا کر ہماری قومی اُلجھنوں میں ایک اور پریشان کُن اضافہ کر دیا ہے۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو دونوں گروہ اپنی اپنی جگہ غلطی پر ہیں۔

اُردو محض مسلمانوں کی زبان نہیں۔ نہ کبھی ہوئی تھی اور نہ ہو سکتی ہے۔ اسے ہندوؤں پر مسلمانوں سے کہیں زیادہ حق حاصل ہے۔ مسلمان جب اوّل اوّل ہندوستان میں آئے تو ان کی مذہبی زبان عربی اور تمدّنی زبان فارسی تھی۔ رفتہ رفتہ جب ہندو مسلمانوں کا میل جول شروع ہُوا تو روزمرّہ کے استعمال کے لئے ایک ایسی زبان معرضِ وجود میں آئی جس میں اگرچہ عربی فارسی کے الفاظ بھی شامل تھے لیکن جس کی بُنیاد ہندی پر تھی۔ اس کے قواعد اور اس کے اکثر الفاظ ہندی الاصل تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں ہندوؤں نے مسلمانوں سے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ہے۔ آپ کی مزید سمع خراشی کی ضرورت نہیں، کیونکہ اُردو ادب اور زبانِ اُردو کی تاریخ کا معمولی طالب علم بھی نانک، کبیر، تلسی داس، نسیم، سرشار، پیارے لال، سرور، سری رام، چکبست اور پریم چند کے کارناموں سے

[1] یہ مضمون (جو) یومِ اُردو کے لئے (جو ۱۸ دسمبر ۱۹۳۸ء کو انجمن اُردو پنجاب کے ماتحت منایا گیا) لکھا گیا تھا لیکن وہاں پڑھا نہ جا سکا +

واقف ہے اور ان احسانوں کا معترف ہے جو ان بزرگوں نے اُردو زبان پر کئے۔ اس سلسلے میں مَیں اُردو کے ایک جلیل القدر ہندو ادیب کی ایک تقریر کا اقتباس آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میری مُراد علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی کی ذاتِ گرامی سے ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

"ہماری اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترک مساعی اور اتحاد کا نتیجہ ہے۔ اس کی تنظیم و تدوین میں ان دونوں فرقوں کی شرکت ہے۔ یہ تنظیم سلطان اور رعایا، حاکمی اور محکومی، افسری اور ماتحتی کی لم سے مبرّا ہے۔ وُہ ایک مبارک ثمر تھا اُس ادبی کل برکش اور طُوبیٰ کے پیوند کا، جو قدرت نے ہندوستان کی سرزمین پر بھیجے۔ یہاں معاشرت نے انہیں پیوند کیا۔ رواداری نے اس کو تہذیب و تمدن کے امرت سے سینچا اور شائستگی نے اس کی ضروری شاخ تراشی کی۔ حسن سلیقہ اور شعور نفسیاتی نے موافق ہوا مہیا کی۔ تب یہ قلمی پودا پروان چڑھا اور پھُولا پھلا۔ اب انہیں باغبانوں کی نسلیں اگر اس سرسبز نونہال کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنا چاہیں تو سمجھ لیجئے کہ یہ کیا بات ہے؟"

اُردو سے ہندوؤں کا یہ تعلق کچھ اس زبان کے ابتدائی زمانہ تک ہی محدود نہیں بلکہ ہندو ہمیشہ اِس کو اپنی زبان سمجھتے رہے اور اس کو استعمال کرتے رہے۔ منشی شنکر دیال فرحت، منشی رام سہائے تمنا، جناب خوشتر اور کئی دوسرے ہندو شعراء نے مہابھارت، رامائن، گیتا، مہاتم وغیرہ مذہبی کتابیں اُردو میں تصنیف و ترجمہ کیں۔ بہت سے اُپنشد، سارے کے سارے شاستر اور اُردو سمرتیاں اُردو میں منتقل ہو چکے ہیں، ابھی تک ہندوؤں کی سب سے زبردست اور دُنیا کی ایک عظیم الشان فلسفیانہ کتاب بھگوت گیتا کے بیسیوں اڈیشن ہر سال اُردو زبان میں شائع ہوتے ہیں۔ یہ ناقابلِ انکار حقیقت کہ ہندوؤں نے اپنی بے شمار مذہبی اور اعتقادی کتابیں اُردو میں لکھی ہیں، یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ اُردو ہندی کا موجودہ ناخوشگوار قضیہ دراصل ایک ہندو مسلم سوال نہیں اور اہلِ غرض نے بعض مصلحتوں کے پیشِ نظر اس خالص لسانیاتی مسئلہ کو فرقہ وارانہ رنگت دے دی ہے۔

آج سے پچاس برس اُدھر اُردو کے مقابل میں کسی نے ہندی کا نام بھی نہ سُنا ہو گا۔ اس زمانہ میں بڑے سے بڑے جانے مانے ہندو کو بھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ بے چاری ہندی بھی ہندوستان کی قومی زبان ہوسکتی ہے۔ ہمارے محترم بزرگ پنڈت مدن موہن مالوی جی نے جن کے ہندوستان پر بے شمار احسانات ہیں پہلی بار ہندوؤں کو یہ یاد دلایا کہ ہندو ہونے کی حیثیت سے انہیں اُردو سے جو غیر ملکی اور ملیچھ مسلمانوں کے تعلق کے باعث خود بھی غیر ملکی اور ملیچھ ہے کوئی واسطہ نہ رکھنا چاہئے۔ ان کی قومی زبان ہندی ہے جو دیوناگری حروف میں لکھی جاتی ہے اور چونکہ ہندوستان کے اصل وارث ہندو ہی ہیں اور اس ملک میں اکثریت بھی انہیں کو حاصل ہے اس لئے انصاف اور جمہوریت کے اصُولوں کے پیشِ نظر ہندوستان کی قومی زبان بھی ہندی بحروفِ ناگری ہی ہوسکتی ہے۔ مالوی جی کے عقیدت مندوں نے ان سے یہ بات سُن کر گرہ میں باندھ لی اور اُس وقت سے لے کر اب تک اُردو کو مٹانے اور ہندی کو آگے بڑھانے کے لئے ہر ممکن اور ہر جائز و ناجائز کوشش کی گئی ہے اور یہ ناقابلِ تحسین سعی ابھی تک جاری ہے۔ اُردو ہندی کے خود پیدا کردہ قضیہ کو ہندو مسلم سوال بنا دینا بھی اسی مذموم جدوجہد کی ایک کڑی ہے۔

یہ جدّوجہد۔ اور یہ کوشش چونکہ غیر فطری ہے اس لئے ہندی کے حامی سرمایے قوت اور پروپگنڈے کے ہتھیاروں سے مسلح ہونے کے باوجود اپنے اس مشن میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ ایک طرف ہندی کے کارکنوں کا ایک لشکر جرار ہے جس میں گاندھی جی اور بابو راجندر پرشاد ایسے فیلڈ مارشل اور جرنیل سے کے کرہاشے گلگئی جیسے رنگروٹ تک شامل ہیں۔ سیٹھ جمنالال بجاج اور سیٹھ برلا ایسے سیٹھ اور ان کے خزانے اس لشکر کے لئے وقف ہیں۔ پروپگنڈے کے لئے ان کے پاس ایک مضبوط پریس موجود ہے۔ اس کے برعکس اردو کی یہ حالت ہے کہ اس کی نہ کوئی تنظیم ہے اور نہ اس کے پاس کوئی کارکن ہیں۔ اردو کی جو ایک آدھ انجمن کسی صوبہ میں کوئی کام کر رہی ہے اس کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ پریس اوّل تو ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو بہت کمزور۔ رہی لیڈروں کی سرپرستی تو وہ مسلمان جنہیں زبردستی اس مشترکہ زبان کا واحد اجارہ دار بنایا جاتا ہے ان کے سب سے بڑے لیڈر جناح صاحب تو اردو جانتے ہی نہیں۔ دوسرے کیمپ میں سب سے نقتدر ترین شخصیت مولانا ابوالکلام آزاد کی ہے، وہ کانگرس ورکنگ کمیٹی کے رکن ہونے کی حیثیت سے ہندی اَلّھوا ہندوستانی کی حمایت پر مجبور ہیں۔ لیکن اس بے سروسامانی کے باوجود قدم ہمیشہ اردو ہی کا آگے اٹھتا ہے اور ہندی کو ہر جاذ پر شکست ہو رہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر اردو واقعی ایک غیر ملکی زبان ہے تو ہندوؤں پر اس کا انکشاف اتنے عرصے تک پہلے کیوں نہ ہوا؟ اگر ہندی کے ساتھ ہندوؤں کا قومی مستقبل وابستہ ہے تو یہ راز ہندوؤں پر آج ہی کیوں ظاہر ہوا ہے؟ اگر راشٹر بھاشا کے لئے دیوناگری رسم الخط ہی دھرم کی رکھشا کا ضامن ہے تو ہندوؤں کو پہلے کیوں اس کا پتہ نہ چلا؟ آج سے بیس برس پہلے ہندوؤں کے بڑے بڑے اکابر اردو زبان کو اپنی تقریر و تحریر میں اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا کرتے تھے۔ مہاتما ہنسراج کا وہ خط پڑھئے جو انہوں نے آج سے پچیس برس پہلے ڈی اے وی کالج لاہور کی مینجنگ کمیٹی کو اپنے استعفا کے ساتھ بھیجا۔ وہ خط ہندی میں نہیں بلکہ صاف و رشستہ اردو میں ہے جس میں عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش بھی ہے۔ لالہ لاجپت رائے آنجہانی ہندو سنگھٹن کے زبردست حامیوں میں سے تھے مگر انہوں نے بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں رسالہ زمانہ کانپور میں جو مضامین لکھے ہیں ان کی زبان ملاحظہ فرمائیے، اور تو اور خود بھارت بھوشن مالویہ جی ان دنوں اردو زبان میں شعر کہا کرتے تھے، اپنی فارسی دانی سے تو شاید وہ اب بھی انکار نہ کر سکیں کیونکہ پڑھے ہوئے کو بھلانا بہت مشکل کام ہے اور اب تو کایا کلپ کی وجہ سے ان کا حافظہ اور زیادہ اچھا ہو گیا ہوگا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ زبان جو آج سے بیس برس پہلے مالویہ جی، لالہ لاجپت رائے اور مہاتما ہنسراج جیسے ہندو سبھائی بزرگوں کو بھی محبوب تھی آج کیا گناہ کر بیٹھی ہے کہ گاندھی جی ایسے قومی رہنما بھی اس میں کیڑے ڈال رہے ہیں۔

مجھے اس سلسلے میں گاندھی جی اور کانگرس کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے دکھ محسوس ہوتا ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ انہیں قطعاً نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ذاتی طور پر میں ان لوگوں میں سے ہوں جنہیں نظری و عملی کسی قسم کی سیاسیات سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں لیکن جنہیں یقین ہے کہ اگر مسلمان اس ملک میں باعزت زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو انہیں ملکی و سیاسی جدّوجہد میں برادرانِ وطن

سے تعاون کرنا ہوگا لیکن اُردو ہندی کے اس ناخوشگوار قضیئے میں کانگرس خصوصاً گاندھی جی نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں انہیں دیکھ دیکھ کر ہم ایسے نیاز مند بھی یہ سوچنا شروع کر دیتے ہیں کہ "قوم پرستی" کا اصل مفہوم کیا ہے؛ عرصہ ہوا گاندھی جی نے یہ ارشاد فرما کر ایک دُنیا کو حیران کر دیا تھا کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے اور قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اس لئے صرف مسلمانوں ہی کو اس کی حفاظت کرنی چاہیئے تعجب ہے کہ وہ شخص جو پینتیس کروڑ ہندوستانیوں کی نمایندگی کا مدعی ہے اور علی برادران کا صحبت یافتہ ہی نہیں بلکہ ان کی جیب میں رہ چکا ہے اتنا بھی نہیں جانتا کہ اُردو قرآن کے حروف میں نہیں لکھی جاتی اور بالائے تعجب یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد بھی اسے یہ بتانے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ اُردو مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہندوستانیوں کی زبان ہے!

کانگرس کے دربار سے اُردو کو نہیں بلکہ ہندی اتھوا ہندوستانی کو قومی زبان ہونے کی سند بخشی گئی ہے۔ لیکن وُہ زبان جس پر ہندوستان کی قومیت متحدہ کی اساس رکھی جانے والی ہے کس سانچے میں ڈھالی جا رہی ہے اس کا اندازہ لگانے کے لئے اس تلخ حقیقت کو پیشِ نظر رکھئے کہ ہماری "قومیتِ متحدہ" کے علمبردار اُردو زبان کے ان عام فہم الفاظ کو بھی برداشت نہیں کر سکتے جو مدتوں سے عام بول چال اور تحریر و تقریر میں استعمال کئے جا رہے ہیں۔ ان کی جگہ "ہندی اتھوا ہندوستانی" کے جو نئے الفاظ زبان میں داخل کئے جا رہے ہیں ان کا سمجھنا صرف مسلمانوں کے لئے ہی نہیں بلکہ ننانوے فیصدی ہندوؤں کے لئے بھی محال ہے۔ مثال کے لئے چند الفاظ ملاحظہ فرمائیے:۔

صوبۂ متحدہ کی بجائے جُٹ پرانت
تعلیم کی بجائے شِکشا
آزادی کی بجائے سوتنترتا
نافذ کی بجائے لاگو
اعلان کی بجائے گھوشن
مدعی کی بجائے جھگڑا اپیلڑو

ہم نے مانا کہ نافذ، اعلان اور مدعی بدیشی ہیں اور اس لئے ملیچھ۔ لیکن ان بیچاروں کے حق میں کم از کم یہ دلیل تو دی جا سکتی ہے کہ یہ سالہاسال سے آپ کی خدمت کر رہے ہیں۔ اور رائے بھی جانے دیجئے، اگر آپ ہندی کی حمایت میں انصاف کا خون کرنے پر ہی تُلے ہوئے ہیں تو ہم آپ کا ہاتھ روکنے سے تو رہے کیونکہ آپ کو قوت و اقتدار حاصل ہے اور یہ وُہ شراب ہے جس کا نشہ ہر قسم کے نشوں سے زیادہ مدہوش کُن ہوتا ہے لیکن ہماری اتنی عرض ضرور سُن لیجئے کہ لاگو، گھوشن اور جھگڑا اپیلڑ و ایسے الفاظ سے نہ صرف انصاف کا خون ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی ذوقِ سلیم کے گلے پر بھی مفت میں آپ کی "قومی" چھُری پھر جاتی ہے!

اگر اب بھی اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کہ "ہندوستانی" کے پردے میں دراصل ہندی زبان کو قومی زبان بنانے

کوشش کی جارہی ہے، کسی مزید ثبوت کی ضرورت ہے تو اس زبان کے چند نمونے ملاحظہ ہوں جو ہمارے رہنما اپنی تقریروں اور تحریروں میں استعمال فرمارہے ہیں۔ گاندھی جی نے بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے ناگپور کے اجلاس میں اپنی زبانِ فیض ترجمان سے یوں گہرفشانی فرمائی:۔

"اس سبھا کا نمنتر مجھے دینے کا کارن جب میں ڈھونڈتا ہوں تو دو ہی پرتیت ہوتے ہیں۔ ایک میرا ساہتیہ کار نہ ہونا اور اس لئے کم سے کم دویش کا کارن ہونا۔ تھا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم + جو کچھ ہو میں آشا کرتا ہوں کہ ہم کچھ نہ کچھ سیوا کریں گے۔ اور بھوشیہ میں اپنا سیوا کشیتر بڑھائیں گے۔ یدی ہم شری نگر سے لے کر کنیا کماری تک کراچی سے لے کر ڈبروگڑھ تک جو پردیش ہے اسے ایک مانتے ہیں اور اس کے لوگوں کو ایک پرجا سمجھتے ہیں تو اس پردیش کے پرتیک بھاگ کے ساہتیہ کار بھاشا شاستری اتیادی آپس میں کیوں نہ ملیں اور بھن بھن بھاشاؤں دوارا ہندوستان کی نتھا کو کیہ سیوا کیوں نہ کریں۔"

اس بھن بھن بھاشا کا ایک ایک لفظ زبانِ حال سے پکار پکار کر اس پریم کا اعلان کر رہا ہے جو گاندھی جی کو ہندوستان کی سب بھاشاؤں سے ہے!

اس قومی حمام میں یوپی کے سوشلسٹ وزیرِ تعلیم بھی ننگے ہی نظر آتے ہیں۔ ان کی تقریر کا اقتباس یوپی کے محکمۂ اطلاعات کی رپورٹ سے یہاں نقل کیا جاتا ہے:۔

"آدھنک کال جس میں کہ ہم رہ رہے ہیں اس کی یہ بھی ایک شبتا ہے کہ شکستنترشمیا کے پرت لوگوں کا اگر شٹر بہت وشدھ اور بیاپک ہوگیا ہے۔ یہ بات ادھکانش سبئے سنسار پر گھٹت ہوتی ہے اور ترن سار ہم اپنے دیش میں بھی اس بنیو بیاپی اندولن کے بھن بھن پہلوؤں کو دیکھ رہے ہیں اور ان کا اَن بھو کر رہے ہیں۔"

اگر ایسی جناتی زبان کو ہندوستان کی قومی زبان ہونا ہے تو ہندوستان اور ہندوستانی ادب کا خدا ہی حافظ ہے!

لیکن اس ستم ظریفی کا کیا کیا جائے کہ شری سمپورنانند جی کے نزدیک یہ زبان بھی "عام فہم" نہیں ہے اور اسے زیادہ "آسان" بنانے کے لئے اس میں سنسکرت کے کافی الفاظ داخل کرنے کی ضرورت ہے چنانچہ آپ نے ۱۹ اگست ۱۹۳۶ء کو ناگرنی پرچارنی سبھا بنارس کے ایڈریس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:۔

"اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہندی کو جسے ہندوستانی بھی کہا جاتا ہے سارے جنوبی ہند کے ہم وطن آسانی سے سیکھ لیں تو لازم ہے کہ ہم ہندوستانی زبان میں سنسکرت کے کافی الفاظ استعمال کریں۔"

اور اس مقدس مشن میں شری سمپورنانند جی کو ہندوستان کے سب سے بڑے رہنما گاندھی جی کی آشیرواد بھی حاصل ہے کیونکہ اس تقریر کے بعد انہوں نے گاندھی جی کو ایک خط لکھا اور اس میں ہندوستانی زبان کو زیادہ "عام فہم" بنانے کی مذکورہ بالا تجویز کا ذکر کیا۔ آپ

کے جواب میں گاندھی جی نے یہ ارشاد فرمایا :-

"آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ جنوبی ہند کے لوگ ہندوستانی آسانی سے سیکھ لیں تو ہمیں اس میں سنسکرت کے کافی الفاظ استعمال کرنے چاہئیں"

گاندھی جی کے متعلق شاید کہہ دیا جائے کہ وہ تو کانگرس کے چونی والے ممبر بھی نہیں اس لئے ان کے افعال کی ذمہ داری کانگرس پر کیسے آسکتی ہے۔ لیکن جب خود کانگرس کے صدر اپنی سرکاری حیثیت میں "ہندی اٹھوا ہندوستانی کی جے" کے نعرے لگانے شروع کردیں تو ان کے اس طرز عمل کی کیا توجیہہ کی جائے گی؛ ہری پورہ کانگرس کے موقع پر کانگرس کے خزانچی سیٹھ جمنالال بجاج کی صدارت میں راشٹر بھاشا سمیلن یعنی قومی زبان کی کانفرنس کا جو اجلاس منعقد ہوا اس کو کانگرس کے صدر نے یہ پیغام بھیجا :

"صوبوں کے باہمی تعلقات کی ترقی کے لئے ایک مشترک زبان کی ضرورت ہے جو ہندی یا ہندوستانی ہی ہوسکتی ہے۔ جن لوگوں نے ابھی تک ہندی نہیں سیکھی انہیں سیکھنی چاہئے۔ کہ یہ ہندوستانی قوم کی تعمیر میں مددگار ہوگی[۵]"

مجھے ان بزرگوں کے خلوص نیت پر شبہ کرنے کا کوئی حق نہیں، ان کے اعمال وافعال مجھ سے کہیں زیادہ فصاحت کے ساتھ ان کی دیانت واخلاص کا اعلان کر رہے ہیں۔ لیکن میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ خدا کے لئے اپنے طرز عمل پر نظر ثانی فرمایئے۔ یہ راہ قومیت کے مندر کو نہیں بلکہ تنگ نظرانہ فرقہ پرستی کے مرگھٹ کو جاتی ہے۔ آپ کا فرض تو یہ ہے کہ آپ ہندو مسلم کشیدگی کی خلیج کو پاٹنے کی کوشش کریں لیکن آپ نادانستہ طور پر اسے وسیع کر رہے ہیں۔ زبان اور ادب کو سیاست کے معبد پر قربان نہ کیجئے۔ یہ آگ چند وطن دشمنوں نے سلگائی ہے اسے بجھانا آپ کا فرض ہے لیکن آپ اسے اپنے دامن سے ہوا دے رہے ہیں۔ ابھی سنبھلنے کا وقت ہے لیکن اگر ایک دفعہ یہ آگ بھڑک اٹھی تو یاد رکھئے کہ آپ کی قومیت متحدہ کی خیالی عمارت اور ہندو مسلم اتحاد کا مثالی قصر اس کی لپیٹ میں آکر خاک سیاہ ہوجائیں گے ‌‌۔

حمید نظامی

۵۔ ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۲۲ فروری ۱۹۳۸ء

"مُفلس"

کہا جاتا ہے کہ وہ حضرتِ دل جن کے تقاضوں کے مارے ہمارے شاعر نقش پا کے سجدے اکوئے جاناں کے طواف کرتے تھے رقیب
بر سرِ پرخاش اور اپنے آپ سے بیزار رہتے تھے۔ آجکل بنیئے کے ہاں گروی ہیں۔

بنیئے کی دُکان پہلے سبز منڈی میں تھی اب وار دھا میں ہے مگر بہی کھاتہ وہی ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس حساب کتاب میں سب سے پہلا انگوٹھا خلافت کا ہے اور پھر سُرخ پوشوں و تنظیم والوں کے بھی اَکھر ہیں۔
بہر حال بہی کھاتہ لمبا ہے اور انگوٹھے اَکھر والوں کا سرمایہ محدود۔ آخر قرقی ہو کر رہیگی۔ اجرا میں مفلس لیگ کا دِوالہ پٹیگا اور احرار نیلام ہو کر
بخواہ کے حوالے ہوں گے۔ یہ ہے آئندہ دس بیس سال کی بھارت تاریخ۔ کانگرس وہی رہیگی جو اب ہے یعنی مہا سبھا کے پریم کی متوالی۔

یہ سب کچھ کہا جاتا ہے مگر ہرگز باور کرنے کے قابل نہیں قطعی غلط ہے مُسلم اُبھرا کہ اُبھرا۔ سید احمد خاں فیل ہوئے، فضل حسین فیل ہوئے۔
بال پاس نہ ہوئے مگر انقلاب والوں کا امتحان باقی ہے۔

کہا یہ جاتا ہے کہ انقلاب والے بنیئے کو، کانگرس کو ہضم کر کے ڈکار تک نہ لیں گے۔ اس نئے دعوے کے باور کرنے میں دقّت اگر ہے تو
ف یہ ہے کہ "انقلاب" شاید اُردو ہے اور "زندہ باد" قطعی فارسی مگر اُردو فارسی دونوں "مُردہ باد" ہیں۔

ایک بنگالی بابو "حکومت مُردہ باد" سُن کر فرمانے لگے "ہرگز نہیں حکومت کیوں مُراد آباد جائے"! یہ راز تو مُراد آباد والے باصبر سر محمد یعقوب
ربا توکل سر رضا علی جانیں مگر مُسلم کا ایمان انقلاب پر محکم ہے۔ یہی سوچتا ہے کہ میں مزدور ہوں، مزدور کی حکومت آئی کہ آئی۔

کسی زمانہ میں مزدور چین سے پاؤں پھیلا کر سوتا تھا مگر آجکل کے بھوکے مزدور کی نیند سخت بے چین نیند ہے۔ اُسے بچھڑے کے
زاب آتے ہیں۔ چونک اُٹھتا ہے کہ دُودھ گیا، گڑ گیا اور اب بچھڑے سے بھی گھر خالی ہے۔ یہ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ روپیہ تو خیر ولایت جاتا
ہے بچھڑ تو نہیں جاتا۔ یہ کیا بات ہے کہ بچھڑے سے دُکانیں پُر ہیں گھر خالی۔

انقلاب والے مزدور کو یہ لوری سُناتے ہیں:-

"بچھڑے سے گھر خالی، روپیہ سے جیب خالی، عقل سے دماغ خالی، انقلاب آیا کہ آیا۔ انقلاب آیا افلاس گیا"

کہیں یہ نہ ہو کہ انقلاب آجائے اور مُفلس نکل جائیں۔

"مُردہ زندہ باد"

(نوٹ۔ کہا جاتا ہے کہ کاتب کی غلطی سے بعض جگہ "مُفلس" کی جگہ "مُسلم" اور مُسلم کی جگہ مفلس لکھا گیا ہے۔ چنداں فرق تو نہیں
مگر پڑھنے والے ازراہِ کرم صحت فرمالیں۔)

ماں

شادی سے پہلے اُنہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تک نہ تھا۔ ہندوستان میں نوّے فیصدی شادیاں یُونہی ہوتی ہیں، بھدّے کالے کلوٹے بدمذاق نوجوانوں کو اکثر حجلۂ عروسی میں خوبصورت گوری گوری سُگھڑ با مذاق لڑکیاں نظر آتی ہیں۔ اور چڑچڑی ، پھوہڑ، بدصُورت لڑکیوں کو اکثر شریف النفس خوبصُورت نوجوان مِل جاتے ہیں۔ یہ اصُول مسئلہ جنسیات کی صریح طور پر تذلیل ہے لیکن ہندوستان میں وُہ کونسا اصولِ فطرت ہے جس کی خلاف ورزی کو مدّتوں کے رسم و رواج نے مذہبی عقیدوں کا رنگ نہ دے دیا ہو۔

لیکن یہ بے اصُولی کبھی کبھی ایسے نتائج پَیدا کرتی ہے، کہ خود فطرت انگشت بدنداں رہ جاتی ہے۔

اور گو اُنہوں نے شادی سے پہلے ایک دُوسرے کو نہیں دیکھا تھا تاہم پہلی ملاقات ہی میں اُنہیں معلوم ہو گیا کہ اُن کے احساسات مذاق اور مزاج یکساں ہیں۔ اُن کے دلوں کی دھڑکنیں ہر حال میں ہم آہنگ ہیں۔ خارجی طور پر اُن کے وجود الگ الگ سہی لیکن اُن کا خمیر ایک ہی مادہ سے اُٹھایا گیا تھا!

شادی کے بعد ولی محمد نے اپنی زمین بیچ کر ایک خچر خرید لیا۔ اُس کی زمین کے تمام قطعے ڈھلانوں پر تھے جہاں پانی ایک لمحہ بھی نہیں رُک سکتا اور پھر دو سال سے علاقہ پر خشک سالی کا دیو منڈلا رہا تھا۔ خچر خرید لیا اور چوپال پر جا کر اعلان کر دیا کہ اگر کسی شخص کو یہاں سے اسٹیشن جانا ہو تو وہ اُس سے صرف بارہ آنے لے گا۔ اسباب بھی لادے اور خود بھی سوار ہو لے۔ ایک شخص جسے شاید اُونٹوں کی تکلیف دِہ سواری کا خاص طور پر تجربہ حاصل تھا، بولا "ولی محمد کا یہ کام سارے گاؤں کے لئے باعثِ آرام و آسائش ہے، کہاں اُونٹوں کے تنگ کجاوے قدم قدم پر ہچکولے۔ اُن کے بیٹھنے اُٹھنے کے بھونڈے انداز۔ اور پھر کرایہ دو روپیہ، اور کہاں خچر کی پیٹھ۔ سو جاؤ تو اسٹیشن تک آنکھ نہ کھُلے اور پھر کرایہ بارہ آنے!"

ولی محمد کو اپنا مستقبل بہت شاندار دکھائی دینے لگا!

ایک سال میں اُس نے چالیس پچاس روپے جمع کر لئے۔ ننھا پَیدا ہُوا، تو پانچ روپوں کا گُڑ تقسیم کیا۔ ننھے کی ماں کے لئے جاپانی ریشم کا ایک سُرخ رنگ کا قمیص تیار کرایا جس پر جگہ جگہ نیلے نیلے گُل بوٹے تھے۔ گلابو قمیص پہن کر بولی" ہائیں! کیا میں نے قمیص پہن رکھا ہے مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں ابھی ننگی کھڑی ہوں!"

ولی محمد فخریہ انداز میں اکڑ کر بولا "ملائم کپڑا ہے نا۔ اور پھر عورتوں کے لئے تو ایسے ہی کپڑے موزوں ہوتے ہیں۔ تمہیں وُہ کھدّر کا چولا پہنے دیکھ کر میرا کلیجہ جل جاتا تھا ــــ اب مزے اُڑاؤ!"

لیکن گلابو نے عمر بھر میں جاپانی ریشم کا صرف وہی قمیص پہنا!

دوسرے دن چوپال پر ولی محمد نے سُنا کہ اسٹیشن سے لے کر اُن کے گاؤں تک پکّی سڑک بننے والی ہے۔ اب اس پر ٹانگے چلیں گے۔ اُونٹ خچر کا وقت گیا!

ولی محمد نے چاہا الاؤ سے ایک دہکتا ہُوا کوئلہ اُٹھا کر نگل جائے!

وُہی شخص جس نے ولی محمد کے خچر خریدنے پر پُرزور الفاظ میں اظہارِ مسرت کیا تھا۔ بولا" اونٹ کے ہچکولوں سے نجات مِلی تھی مگر بخدا خچر پر سوار ہوتے وقت بہت شرم محسوس ہوتی تھی۔ آخر گدھے اور خچر میں فرق ہی کیا ہے! وُہی چال ڈھال وُہی تراش خراش۔ میرا تو خیال ہے کہ اگر تمہیں کسی سے دشمنی ہو تو اُسے خچر پر سوار کرا دو!"

اُس دن ولی محمد گھر آیا، تو خچر کو چارہ ڈالنا بھُول گیا۔ خچر کچھ دیر تو خاموش کھڑا ولی محمد کو گھُورتا رہا، جو کھاٹ پر کروٹیں بدل رہا تھا، پھر اپنی دُم اُٹھا کر اور تھوتھنی نکال کر ایسی کرخت آواز بلند کی کہ ولی محمد نے اُٹھ کر پھاوڑے سے اُس کی کمر توڑ ڈالی۔ گلابو جاگ رہی تھی، بولی "ہائے ہائے۔ ایک سال تک تم اس کی آواز ہنس ہنس کر سُنتے رہے آج اس سے کیا قصور ہُوا کہ بیچارے کی پیٹھ پر پھاوڑے برسا رہے ہو؟ اپنے رزق کو یوں پالتے ہیں کیا؟"

ولی محمد بولا" اری چُپ رہ، تجھے نہیں معلوم۔ اب یہ کمبخت ہمارے کسی کام کا نہیں۔ اسٹیشن سے یہاں تک سڑک بننے والی ہے، اب یہاں لاریاں ٹانگے چلیں گے، اب خچر وچر کو کوئی نہیں پوچھے گا۔ ہمارے بُرے دن آ گئے!"

وُہ اپنی بیوی کی چارپائی پر بیٹھ گیا اور دھیمی آواز میں بولا" گلابو۔ بتا اب کیسے گزر ہو گی۔ زمینیں بِک گئیں۔ ورنہ پھر ہل اُٹھا لیتے۔ مَیں تو سمجھا تھا اب مرتے دم تک ہاتھ کبھی تنگ نہ ہو گا۔"

گلابو خاموش رہی۔ ننھا بچہ اُس کی چھاتی سے چمٹا ہُوا تھا اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

ولی محمد پھر بولا۔" گلابو۔ شکر ہے: تم میرے پاس ہو، ورنہ میں تو آج روتے روتے دیوانہ ہو جاتا۔"

گلابو نے اپنا ہاتھ ولی محمد کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ دونوں خاموش بیٹھے آنسو بہاتے رہے۔ آسمان پر ایک تارا ٹوٹا اور اپنے پیچھے روشنی کی ایک طویل لکیر چھوڑتا اندھیرے میں کھو گیا!"

سڑک تیار ہو گئی۔ ٹانگے والوں کی بن آئی۔ ولی محمد کے خچر کا تھان پر کھڑے ہو کر اپنی میلی دُم سے مکھیاں اُڑانے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ ولی محمد کی کمائی آہستہ آہستہ برف کے تودے کی طرح پگھلنے لگی۔

اُس کی رفیقۂ حیات اگر گلابو کے علاوہ کوئی اور ہوتی تو وُہ اب تک ضرور خودکشی کر چکا ہوتا۔ لیکن جب باجرے کی موٹی اور بھاری

ں تو سے پرڈالتے ہوئے گلابو اُپلوں کے دُھوئیں سے سُوجی ہوئی آنکھیں اُٹھا کر ولی محمد کی طرف دیکھتی تو ولی محمد کو اپنے پیوند لگے قمیص اور
کھے بے رونق رخساروں کا خیال تک نہ رہتا۔ گلابو کا جاپانی ریشم والا قمیص بھی کئی جگہ سے گل گیا تھا۔ اور کئی جگہ سے اُس کا جسم بھی جھلکنے
تھا۔ جسے وُہ اپنے بازو سے ہر وقت چھپانے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ لیکن اُس کی زبان پر شکایت کا ایک لفظ تک نہ آیا۔ بس وُہ ایک
لی محمد کو دیکھ لیتی۔ تو اُسے یوں محسوس ہونے لگتا جیسے وُہ اطلس اور کمخواب سے اپنی جُوتیاں پونچھ رہی ہے!

ایک دن ولی محمد صحن کے ایک کونے میں بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ اچانک اُسے کوئی خیال آیا۔ حقّے کی نال ہونٹوں سے الگ ہو گئی
کر گلابو کے پاس آیا۔ کہنے لگا "گلابو تیری جوتی تو اب بہت پُرانی ہو گئی ہے"۔

گلابو مُسکرا دی!

وُہ بولا "گلیوں میں چلتے وقت تجھے پتھر چُبھتے ہوں گے، تو ضرور دل میں کہتی ہو گی کہ مجھے کس کنگلے سے پالا پڑا۔ کہ پاؤں میں پہننے
، لئے جُوتی تک نہیں خرید کر دیتا"۔

گلابو کو جیسے کسی ناگ نے ڈس لیا۔ بولی "میں شریف ماں باپ کی بیٹی ہوں اور مجھے اپنے آرام سے زیادہ اپنے ماں باپ کی عزت کا
ں ہے۔ میں تو تمہاری لونڈی ہوں، کیا میں دیکھ نہیں رہی کہ تمہارے جُوتے کو جگہ جگہ پیوند لگے ہیں۔ انسان کو وقت کا ساتھ مجبوراً دینا
تا ہے۔ خُدا جس حال میں رکھے اُس کا شکر ہے۔ اس سے بدتر نہ کرے"۔

ولی محمد دیوار کا سہارا لے کر بولا "مگر گلابو۔ اب بتاؤ میں کیا کروں۔ خچر بیچ ڈالوں! مگر کون خریدے گا اسے؛ ہڈیوں کا ڈھانچہ باقی
گیا ہے۔ دس بارہ روپے ہی ملیں گے۔ چالیس روپے کے خچر کے دس بارہ روپے!"

کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ ننھا گلابو کی گود میں غوں غوں کر رہا تھا۔ خچر اپنے تھان پر آنکھیں کھولے لیٹا ہوا تھا۔ اُس کی تھو [تھکی]
ر آنکھوں پر مکھیوں کی فوجیں بھنبھنا رہی تھیں۔

ناگاہ ولی محمد دو چار قدم آگے ہو کر بولا "گلابو! ایک تجویز میرے دماغ میں آئی ہے۔ اگر تم پسند کرو تو آج ہی سے اس پر عمل
شروع کر دوں، اسٹیشن پر ہر وقت مزدوروں کی ضرورت رہتی ہے، ہمارا پڑوسی تاج محمد بھی تو اسٹیشن پر کام کرتا ہے۔ پچھلے دنوں میں نے اُس
ں بیوی کے پاؤں میں نئے سلیپر دیکھے تھے، آخر کچھ تو بچاتا ہو گا۔ تم سے الگ رہنا میرے لئے عذاب ہو گا۔ لیکن پیٹ کے لئے کیا کچھ
ہیں کرنا پڑتا۔ کہو تو کل اسٹیشن چلا جاؤں"؟

گلابو نے اپنی رضامندی ظاہر کی۔ لیکن بے حد دھیمی اور قدرے بھرّائی ہوئی آواز میں "شاید اس طرح گزری گھڑیاں پھر لوٹ آئیں
م اسٹیشن چلے جانا، میں یہیں رہوں گی۔ جب کبھی وقت بے وقت کسی مسافر کو خچر کی ضرورت پڑ گئی، میں اُسے اسٹیشن تک پہنچا آؤں گی اور
ہ سے بھی مِل لوں گی۔ اندھیرے اُجالے اس راہ پر کئی بار سفر کیا ہے، بھُولوں گی نہیں"۔

ولی محمد نے دُوسرے دن ایک چھوٹا سا بستر کاندھے پر رکھا اور آنسو بہاتا روتی ہوئی گلابو سے رُخصت ہو کر اسٹیشن کی طرف چل دیا۔

گلابو نے اُس کے بعد دو وقت کھانا نہ کھایا۔ اُس کا دُودھ کم ہُوا۔ تو بچہ بلکنے لگا۔ مجبوراً دوسرے روز کچھ لقمے زہر مار کئے، اور تمام دن کھاٹ پر پڑی رہی۔ ایک دوبار پڑوس کی عورتوں میں جا بیٹھی، لیکن جی نہ لگا۔ واپس آ کر اسی کھاٹ پر پڑ رہی جس پر ولی محمد سویا کرتا تھا۔ ننھے سے تادیر باتیں کرتی رہی "ننھے، تمہارا باپ جانے اسٹیشن پر کیا کر رہا ہوگا۔ جب وہ اپنی پیٹھ پر بھاری بھاری بوریاں اُٹھائے گا، تو تم اُسے بہت یاد آؤ گے۔ جب آیا تو تمہارے لئے قسم قسم کے کھلونے، قسم قسم کی مٹھائیاں لے کر آئے گا۔ ارے مُنہ کیوں بسور رہا ہے؟ کیا تجھے مٹھائیاں پسند نہیں؟ دُودھ پیئے گا؟ لے!"

اس طرح وہ ساری ساری رات بچے سے باتیں کرتی رہتی، اور جب سو جاتا، تو گھٹنوں میں سر چھپا کر دیر تک روتی رہتی!

ایک رات وہ بچے کو سُلا کر دیا بُجھانے کے لئے اُٹھی کہ باہر کسی نے اُس کا دروازہ کھٹکھٹایا اور آواز آئی "کیا ولی محمد خچر والے کا مکان یہی ہے؟"

"جی یہی ہے۔"

"کیا اِس وقت اسٹیشن پر خچر لے جا سکو گے؟"

"جی وُہ خود تو گھر نہیں۔"

"افوہ! مجھے تو اسٹیشن پر آج رات ضرور پہنچنا تھا۔ اور اس وقت ٹانگہ ملتا نہیں۔"

گلابو نے جا کر دروازہ کھول دیا۔ ایک نوجوان بہت قیمتی کپڑوں میں ملبوس ہاتھ میں بجلی کی ٹارچ لئے کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے سے وحشت برس رہی تھی۔

گلابو بولی "آپ کیا دیں گے اسٹیشن تک؟"

"مگر خچر کے ساتھ کون جائے گا؟"

"مَیں!"

"تُم؟"

"جی ہاں۔"

"مگر کیا تُم راستہ جانتی ہو؟ اس قدر اندھیرا ہے اور......؟"

"آپ کے پاس چور بتّی جو ہے!"

"مَیں اٹھنی دُوں گا۔"

"اٹھنی؟ اسباب ہے؟"

"نہیں"

"تو میں تیار ہوں، چلئے"

گلابو نے جھٹ خچر پر زین رکھا، خچر کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ مڑ مڑ کر گلابو کی طرف دیکھنے لگا۔ مدت سے اُس کی پیٹھ زین سے آزاد رہی تھی، اس لئے ایک دو بار اس نے ضد بھی کی، دولتیاں بھی جھاڑیں مگر جب دیکھا کہ گلابو زین کس کر ہی دم لے گی تو چپکا ہو رہا۔

گلابو نے ننھے کو سینے سے لگا لیا۔ دروازے کو مقفل کیا، نوجوان خچر پر سوار ہو گیا۔ اور دونوں اندھیری گلیوں سے نکل کر باہر کھلے پر آ گئے۔

اندھیری رات میں ایک اجنبی نوجوان کی ہمراہی میں صرف ایک اٹھتی کے لئے بارہ میل کا پہاڑی سفر کرنا گلابو کی فطرت کے خلاف تھا لیکن وہ سوچتی جا رہی تھی کہ جب ولی محمد اُسے صبح کو دیکھے گا تو خوشی سے یقیناً ناچنے لگے گا۔ ولی محمد کو گاؤں سے گئے صرف آٹھ دن گزرے تھے۔ مگر گلابو سمجھ رہی تھی، جیسے آٹھ سال بلکہ آٹھ صدیاں گزر گئی ہیں!

دو میل بڑی سڑک پر چل کر وہ ایک پگ ڈنڈی پر ہو لئے۔ خچروں اور پیدل چلنے والے لوگوں کے لئے یہ رستہ تھا جو بڑی سڑک سے تین میل کم تھا۔ گنجان جھاڑیوں، ننھے جھرنوں اور تاریک دروں سے گزر کر وہ ایک گہری کھائی میں پہنچ گئے، جہاں سے آگے اسٹیشن تک دو ڈھائی فٹ کی ایک ایسی پگڈنڈی تھی۔ جس کے دونوں طرف گہرے بھیانک کھڈ تھے، اور کناروں پر گول گول پتھر تھے جو ذرا سے دباؤ سے نیچے لڑھک جاتے تھے۔ یہاں سے گلابو نے خچر کی لگام اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اب نوجوان کی چور بتی بڑا کام دے رہی تھی۔

وہ کچھ دُور گئے تھے کہ نوجوان بولا "تمہارا نام کیا ہے؟"

گلابو کو پسینہ آ گیا۔ وہ خاموش رہی۔ وہ ڈرنے لگی۔ کہ کہیں بچہ اُس کے دل کی دھک دھک سے جاگ نہ اُٹھے۔

"تمہارا نام پُوچھا تھا میں نے؟"

"گلابو" گلابو نے یہ لفظ بے حد کوشش سے ادا کیا۔ وہ خوفزدہ ہو گئی۔

"گلابو! تم نے بڑی مہربانی کی۔ ایسی اندھیری رات میں تم میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئیں۔ تم نے بڑی مہربانی کی۔"

گلابو نے سوچا "کیا شکریہ ادا کرنے کا یہی موقع تھا؟ اور یہ نام پوچھنے سے کیا مطلب!"

نوجوان پھر بولا "لو اب تم خچر پر سوار ہو لو۔ میں پیدل چلوں گا ـــــ تمہارے لئے۔"

گلابو نے چاہا۔ نیچے کھڈ میں چھلانگ لگا دے۔ لیکن چھاتی سے چمٹے ہوئے بچے نے نیند میں کہا "مم۔ مم" اُس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔

فضا بالکل خاموش تھی۔ صرف کبھی کبھی کوئی پتھر خچر کے سم سے ٹکرا کر نیچے کھڈ میں لڑھک جاتا تھا۔ نوجوان کی چور بتی گلابو کے سر

رہی تھی۔ اور گلابو کا لمبا سایہ سامنے تنگ پگڈنڈی پر بہت دُور تک بچھا ہُوا تھا! اُس نے زندگی میں پہلی بار ایک غیر شخص کی زبانی یہ الفاظ سُنے تھے۔ اُس کی غیرت کو سخت ٹھیس لگی۔

ہمت کر کے بولی "ذرا سنبھل کر بیٹھیے۔ راستہ بڑا پُرپیچ اور خطرناک ہے۔ جان کا ڈر ہے یہاں"۔

نوجوان زیرک تھا سنبھل گیا۔ اسٹیشن تک اُس نے کوئی بات نہ کی۔

لیکن گلابو کو اسٹیشن پہنچنے تک بخار سا ہو گیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اپنے خاوند کو کیسے مُنہ دکھائے گی۔ کیا وہ اُس کی گھبرائی ہوئی آنکھوں اور اُڑے ہوئے رنگ سے رات کے واقعہ کا مطالعہ نہ کر لے گا؟

اسٹیشن پر نوجوان سے اٹھنی لے کر وہ ایک طرف ایک شیشم کے درخت سے خچر باندھ کر بیٹھ گئی۔ پو پھٹ رہی تھی تو اُس کے قریب سے ایک شخص گزرا۔ گلابو نے اُٹھ کر پُوچھا "بھائی کیا تم اسٹیشن پر رہتے ہو؟"

وہ رُک گیا۔ اور بولا "ہاں"

"یہاں ایک نیا نیا مزدور آیا ہے۔ ولی محمد۔ کیا تم اُسے جانتے ہو؟"

"ہاں"

"وُہ اس وقت کہاں ہو گا؟"

"سامنے مسافر خانے میں۔ وہ اُس تختے پر سو رہا ہے۔ وُہ!"

خچر وہیں چھوڑ کر وُہ مسافر خانے میں گئی۔ مدھم روشنی میں اُس نے ولی محمد کو پہچان لیا۔ اُس نے اپنے گھُٹنے سینے سے چمٹا رکھے تھے اور اُس کے خشک بال اُس کے بے رونق چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ وُہ پہلے تو جھجکی کہ کہیں آنکھ کھولتے ہی وہ اُس کے چہرے سے رات کا دلخراش واقعہ نہ پڑھ لے لیکن آخر زبان کو دانتوں تلے دبا کر لرزتے ڈرتے اُس نے ولی محمد کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے ہلایا۔

"کون؟"

"میں۔ گلابو"

وُہ آنکھیں ملے بغیر اُٹھ بیٹھا "اری۔ کیسے آئیں۔ ننھا تو اچھا ہے نا!"

"اچھا ہے۔ یہ سو رہا ہے۔ ایک مسافر لائی ہوں"

"تھک گئی ہو گی تم؟"

"نہیں آہستہ آہستہ چلتی آئی —— کوئی کام بنا؟"

"ہفتے میں تین آنے کمائے۔ اُن کی روٹی کھا لی۔ آج بھُوکا سو رہا ہوں"

دروازے سے لوگ آ جا رہے تھے۔ ورنہ گلابو پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگتی۔ اُس نے بڑی مشکل سے ضبط کیا۔

ولی محمد بولا "لیکن اُمید ہے کچھ دنوں میں کام بن جائے گا۔ ایک بابو نے وعدہ تو کیا ہے۔"

گلابو نے اُسے اٹھنّی دینا چاہی لیکن ولی محمد نے انکار کر دیا اور بولا "خچر کے لئے چارہ خرید لینا تیل نمک کی بھی ضرورت ہوگی۔ میری فکر نہ کرو"۔ لیکن آخر گلابو نے اُسے چونّی لینے پر مجبور کر دیا۔ ننھے کو ولی محمد کی گود میں رکھ کر روتی رہی اور پھر خچر پر سوار ہو کر گاؤں لوٹ آئی۔

اُسے مہینے میں دو بار پھر اسٹیشن جانا پڑا۔ ابھی ولی محمد کا مستقل کام نہیں بنا تھا۔ مستقل اسامی کا انتظار کھینچنا بجائے خود ایک بیماری ہے۔ اس پر مستزاد متواتر فاقے! ولی محمد کی صحت بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اُسے واپس گاؤں لانے کی گلابو نے بہت کوشش کی لیکن وُہ یہی عذر پیش کرتا رہا "کیا وہاں مجھے قارون کا خزانہ مل جائے گا، یہاں ایک وقت پیٹ بھر لیتا ہوں۔ وہاں بھوکوں مر جاؤں گا۔"

ایک دن اچانک ننھا بیمار پڑ گیا۔ اُس کا گلا سُوج گیا اور سانس رُک رُک کر آنے لگی۔ گلابو اُسے گاؤں کے بوڑھے حکیم کے پاس لے گئی۔ اُس نے کہا "اس بیماری کا علاج ایک انگریزی دوا ہے جو یہاں نہیں مل سکتی۔ اُس پر دس آنے خرچ آتے ہیں۔ اگر وہ لا سکو تو ننھا اچھا ہو جائے گا۔"

گلابو کے ہاتھ پاؤں پھُول گئے گھر میں ایک کوڑی تک نہ تھی۔ جی میں آئی۔ سر دیوار پر پٹک کر پھوڑ دے اور مر جائے۔ یوں بچے کو سسکتے ہوئے مرتے دیکھنا تو بہت بڑا عذاب ہے۔ اب اگر اسٹیشن جاتی ہے کہ ننھے کے ابّا سے کچھ پیسے مانگ کر دوا خرید لائے۔ تو ننھا اکیلا رہتا ہے اور اگر ساتھ لے جائے تو حکیم کے کہنے کے مطابق سرد ہوا کی وجہ سے بیماری کے بڑھ جانے کا ڈر ہے! ساتھ نہ لے جائے تو جانے پیچھے کیا ہو جائے! اُس کے دماغ میں شعلے اُٹھنے لگے! وُہ دیوانوں کی طرح گلیوں میں بے مطلب بھاگنے لگی۔

آخر ننھے کو ایک پڑوسن کے حوالے کر کے خچر پر سوار ہوئی اور اسٹیشن کی طرف چل دی۔ آسمان پر گہرے سیاہ رنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے سخت ٹھنڈی ہوا نہایت تُندی سے چل رہی تھی۔ برق رفتار جھونکے تلوار کی طرح گلابو کی چھاتی کو چیر رہے تھے۔ بوندیاں پڑنے لگیں۔ بادل اس زور سے گرجا جیسے علاقے کے سارے پہاڑ آپس میں ٹکرا کر زمین میں غرق ہو گئے ہیں۔ اِس کے بعد موسلا دھار مینہ، بجلی، کڑک، آندھی ــــ بے رُخے جھونکے خچر کے قدم اُکھڑ اُکھڑ جاتے تھے۔ گلابو کے کپڑے اُس کے جسم سے چمٹ گئے بارش اور ہوا کے تھپیڑوں سے وہ جھک جھک جاتی تھی۔ درختوں کی چوٹیاں زمین کو چھو رہی تھیں۔ پہاڑی نالے بپھرے ہوئے شیروں کی طرح دہاڑنے لگے۔ جب خچر کسی نالے میں پھنس جاتا تو گلابو مایوس ہو کر اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دیتی۔ پگڈنڈی کے نشانات مِٹ گئے۔ گلابو اللہ کے آسرے پر ناک کی سیدھ میں چلی جا رہی تھی!

اسٹیشن پر پہنچ کر اُسے معلوم ہُوا کہ ولی محمد بعارضۂ نمونیہ سخت بیمار ہے اور تاج محمد قلی کی کوٹھڑی میں پڑا ہے۔ اُس کی نظروں میں کائنات قلابازیاں کھانے لگی۔ ذرّے ذرّے سے ایک منحوس سی مسلسل گونج اُٹھنے لگی۔ ہانپتی ہوئی تاج محمد کی کوٹھڑی میں پہنچی۔ ولی محمد اکیلا کھاٹ پر پڑا چھت پر نظریں گاڑے کراہ رہا تھا! گلابو کو دیکھ کر بولا "تمہیں کس نے بتایا؟"

گلابو دہل گئی۔ نہ اُس کی زبان ہلی۔ نہ اُس کی آنکھوں سے آنسو پھُوٹا۔ مُنہ کھولے ولی محمد کے خشک ہونٹوں کو دیکھتی رہی!

ولی محمد نے پوچھا "خچر لائی ہو؟"

"ہاں" ــــ جیسے خود اپنے آپ سے سرگوشی کر رہی ہے!

"تو مجھے گاؤں لے چلو۔"

وُہ خاموش رہی۔

"لے چلوگی؟"

"ہاں۔ مگر ننھا سخت بیمار ہے۔"

"کیا؟"

"ننھا سخت بیمار ہے۔ میں اُس کی دوا کے لئے تم سے دس آنے مانگنے آئی تھی۔"

"میرے پاس تو ایک کوڑی تک نہیں۔"

گلابو کا جیسے کسی نے گلا دبا دیا ہے! اُس کی آنکھیں شدتِ غم سے جیسے باہر اُبل پڑیں گی!

یکایک باہر سے آواز آئی۔ "ارے بھئی یہ خچر کس کا ہے؟"

گلابو دوڑ کر باہر گئی۔ "میرا"

مسافر کو گلابو کے گاؤں جانا تھا۔ بارش کی وجہ سے ٹانگے سب مسافروں سے بھر کر جا چکے تھے۔ اور کوئی سواری نہیں تھی۔

گلابو نے پوچھا "کیا ملے گا؟"

"آٹھ آنے!"

"دس آنے دے دیں گے آپ؟ میرا ننھا بیمار ہے۔ اُس کے لئے دس آنے کی دوا خریدنی ہے۔"

مسافر کوئی نیک دل انسان تھا۔ دس آنے نکال دیئے۔ حکیم نے اُسے دوائی کا آسان سا نام بتا دیا تھا۔ بازار دوڑی گئی۔ بوتل خریدی بھاگی بھاگی واپس آئی۔ مسافر کو خچر پر سوار کیا۔ اور لگام پکڑ کر آگے آگے چل دی۔ وُہ اس قدر تیز چل رہی تھی۔ جیسے اُس کے پاؤں میں بجلیاں بھر گئی ہیں۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔

تاج محمد نے مسافر خانے سے مسافر اور گلابو کو دُور جاتے ہوئے دیکھا۔ تو ولی محمد کے پاس دوڑا آیا۔ "ولی محمد۔ ولی محمد۔ گلابو ملی ہے تمہیں؟"

"ہاں!"

"مگر وہ تو ایک مسافر کو خچر پر سوار کئے گاؤں کو اُڑی جا رہی ہے۔"

"اچھا؟"

ولی محمد نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور تاج محمد سے پانی مانگا۔

تاج محمد نے پانی ڈالتے ہوئے کہا "مگر گلابو نے یہ کیا کیا؟"

ولی محمد نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا "تم نہیں سمجھتے تاج محمد یہ اُس کا فرض تھا۔ عورت پہلے ماں ہے اور پھر بیوی!"

محفلِ ادب

کشتی کھینچنے والے مزدوروں کا گانا

ایک رانی کی کشتی کو بھادوں کی گرمی میں مزدور پانی کے بہاؤ کے خلاف دور سے کھینچ کر لا رہے ہیں پہلے دور کی آواز کم کم سنائی دیتی ہے
وہ جتنے قریب آتے جاتے ہیں آواز بڑھتی جاتی ہے۔ اسی طرح جوں جوں وہ آگے بڑھتے اور دور ہوتے جاتے ہیں۔ آواز گھٹتی جاتی ہے۔۔۔۔ (مطلبی)

او ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ او ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

او ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ او ۔ ۔ ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہو

او ۔۔۔ او ۔ ۔ او ۔۔۔۔ او ہو ۔۔ ہو ۔۔ ہو ۔۔۔ ہو ۔ ۔ ۔ ہو

لو ۔۔۔۔ لو ۔۔۔۔ لو ۔۔۔۔۔ لو ڑھو ۔۔۔ ڑھو ۔۔ ڑھو ۔۔۔ ڑھو

لو، ڑھو ، ڑھو ، ڑھو

چلو ، چلو ، چلو بڑھو ، بڑھو ، بڑھو ، بڑھو

چلو بڑھو ، بڑھو ، بڑھو

(۱)

ناؤ میں بیٹھی راجہ کی نار[1] پاتر[2] ناچیں بارم بار[3]
پائل[4] دیویں[5] رہی جھنکار ڈھولک بولے گڑگڑ تار
تالی باجے بولیں تار گونج رہے دریا ، سنسار
رانی کی ناؤ کے کھیون[6] ہار دھوپ میں بھاری ناؤ منجدھار

چلو ، چلو ، چلو ، چلو
چلو بڑھو ، بڑھو ، بڑھو

چلو بڑھو ، بڑھو بڑھو

---

[1] عورت، زوجہ، راجہ کی رانی [2] گانے والیاں [3] باری باری [4] پازیب [5] دے [6] کھینے والے، کھینچنے والے۔

(۲)

پیٹ کی آگ سے ناؤ چلے   چلے، چلے، چلو سب چلے
رسّی کے گھتوں سے چھاتی جلے   جلے، جلے، چھاتی سب جلے
منزل ماریں گے دیولے بلے   دیوے بلے، دیوے سب بلے
کشتی بُرے، ناکشتی بھلے   ہم بُرے، وُہ سب بھلے

چلو، چلو، چلو، چلو
بڑھو بڑھو بڑھو بڑھو
چلو بڑھو - بڑھو بڑھو

(۳)

ناؤ میں سوتی کامِن نار   پار جا کر سب جھٹے تیار
بھادوں کی گھام جلے سنسار   پیروں کی دھرتی ہوئی انگار
رکیں تو ہووے مارا مار   رَوَل کرے ہیں ہوئی اوار
چابک دونوں رہے پھٹکار   آگے ٹنڈیل پا سچھے جامادار

چلو، چلو، چلو، چلو
بڑھو، بڑھو، بڑھو، بڑھو
چلو بڑھو، بڑھو بڑھو

(۴)

مزدوری کر کر پچھتائے   پچھتائے پر کرنے آئے
چھاتی کٹائی پیر جلائے   رات ہوئی لٹی مہندی لگائے
دن نکلا پھر چلنے آئے   دو دو آنے سب نے پائے
دن دِن پیٹ کی آگ جلائے   اِس اگنی کو کون بجھائے

چلو، چلو، چلو، چلو
بڑھو، بڑھو، بڑھو، بڑھو
چلو بڑھو بڑھو بڑھو

(۵)

جگ بیتا یہ جنم گجارا   کوئی نہیں بنتا گُن تارا

[illegible]

نا آیا کوئی آون ہارا کون کرے ہمارا نستارا
پلٹ پڑے کوئی ایسی دھارا وار پار ہو ، ہو نہ کنارا
کشتی کشٹ کا بجے نگارا ڈوبتا جیون لیوے اُبھارا

چلو ، چلو ، چلو ، چلو
بڑھو ، بڑھو ، بڑھو ، بڑھو
چلو بڑھو بڑھو بڑھو

(۶)

کوئی تو ناؤ پڑے سکھ پاویں کوئی رات دنا دکھیا ویں
کوئی من مانی اپنی کھاویں کوئی بھیک مانگ کر دن بہلاویں
کوئی لتا پھاڑ پھاڑ مر جاویں کوئی مرے بھی کفن نہ پاویں
آؤ اس دنیا کو آگ لگاویں بلّی توڑ دیں۔ بیڑا ڈباویں

چلو ، چلو ، چلو ، چلو
بڑھو ، بڑھو ، بڑھو ، بڑھو
چلو ۔ بڑھو ، بڑھو ، بڑھو

(کشتی دُور ہوتی جا رہی ہے ۔)

چلو ۔ چلو ۔ چلو ۔ چلو بڑھو ۔ بڑھو ۔ بڑھو ۔ بڑھو
چلو ۔ ڑھو ۔ ڑھو ۔ ڑھو

لو ــــ لو ــــ لو ــــ لو ڑھو ۔ ڑھو ۔ ڑھو ۔ ڑھو
او ۔ ہو ۔ ہو ۔ ہو

او . . . . . او . . . . . ہو . . . . ہو . . . . .
او . . . . . . ہو

او . . . . . .
ہو . . . .
. . . .

(سیّد مطلبی) "چنگاری"

حضرتِ اکبر الہ آبادی

(از خان بہادر سید عشرت حسین ریٹائرڈ کلکٹر و مجسٹریٹ)

میرے والد حضرت اکبر الہ آبادی کے انتقال کے وقت میری عمر چالیس سال تھی۔ میری پیدائش اور میرے والد کی تقرری بہ عہدۂ منصفی تریب قریب ساتھ ساتھ ہوئی۔ گویا ملازمت اور پنشن کا زمانہ سارا میری نظر کے سامنے سے گزرا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ میری آنکھ علی گڑھ میں کُھلی، جہاں میرے والد ۱۸۸۲ء سے ۱۸۸۸ء تک مُنصِف رہے۔ میرے والد پر اس قیام کا اثر بلاشبہ بہت زیادہ ہوا۔ علی گڑھ مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب کا مرکز تھا، جہاں سرسید، حالی، سمیع اللہ خاں صاحب وغیرہ سے دن رات کی ملاقاتیں اور تبادلۂ خیالات کے مواقع تھے۔ علی گڑھ میں قیام کے زمانہ میں میرے والد نے بلنٹ کی مشہور کتاب "فیوچر آف اسلام" کا اُردو میں ترجمہ کیا اور چھپوایا، اور مسٹر بلنٹ سے ملاقاتیں بھی ہوئیں جن کا ذکر مسٹر بلنٹ نے اپنی کتاب "ہندوستان بعہد لارڈ رپن" (India under Ripon) میں کئی جگہ کیا ہے۔ علیگڑھ ہی میں کنور عبدالغفور خاں صاحب رئیس دھرم پور سے ملاقات ہوئی اور آخر عمر تک اس خاندان سے مراسم قائم رہے۔ کنور عبدالغفور خاں صاحب کے خلوص کی تعریف ممکن نہیں برابر آمد و رفت رہتی تھی۔ کنور عبدالغفور خاں صاحب کو موسیقی کا بڑا شوق تھا۔ میرے والد بھی اس فن سے ناواقف نہ تھے۔ میں نے کبھی کبھی اپنے والد کو اشعار گاتے ہوئے سُنا۔ ستار بجانے کا بھی شوق تھا۔ مجھے یاد ہے کہ کنور عبدالغفور خاں صاحب جب تشریف لاتے تھے تو کبھی ستار بجانے والے ایک اُستاد کو بھی ساتھ لاتے تھے، خوب صحبتیں رہتی تھیں۔ کھماج اور دیس راگنیاں میرے والد کو خاص طور پر پسند تھیں۔ کبھی کسی بینڈ پر یا سُر لگنے پر خاص اثر ہوتا تھا۔ فرماتے تھے کہ یہ سیارے جو آفتاب کے گرد گھومتے ہیں ان میں ہر ایک میں اُن کی رفتار کے باعث سے ایک آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہ آواز جب کسی ساز کی آواز سے مِل جاتی ہے تو قلب پر غیر معمولی اثر ڈالتی ہے۔

کنور عبدالغفور خاں صاحب کو میں نے اُن کے شباب کے زمانہ میں دیکھا ہے جب اُن کی مونچھیں اور گل مُچھّے تھے اور پھر اُس زمانہ میں بھی دیکھا جب داڑھی مونچھ وغیرہ سب اُنھوں نے منڈوا ڈالی تھی۔ میرے والد فرماتے ہیں:

دیکھ عبدالغفور خاں کی طرف — مردِ خوش حال اس کو کہتے ہیں
چار ابرو کا یاں صفایا ہے — فارغ البال اس کو کہتے ہیں

کنور عبدالغفور خاں صاحب کو سیر و سفر کا بڑا شوق تھا۔ یورپ اور امریکہ کی سیاحت کے بعد تمام ہندوستان میں گشت کر رہے تھے۔ چنانچہ اسی سفر میں اُن کا انتقال ہوگیا۔

علیگڑھ کے قیام کے زمانہ میں میں چھوٹا تھا۔ تاہم کچھ واقعات یاد ہیں اور قابلِ ذکر ہیں۔ ہم لوگ علیگڈھ میں چھتاری کے مکان میں رہتے تھے۔ کنور لطف علی خاں صاحب اُس وقت رئیس چھتاری تھے، مجھے وہ بھی اچھی طرح یاد ہیں اور وہ مکان بھی۔ میرے والد مجھ سے فرماتے تھے کہ جب وہ صبح کو فیصلے وغیرہ لکھنے بیٹھتے تھے تو میں میز پر جا کر بیٹھ جایا کرتا تھا اور کام نہ کرنے دیتا تھا۔ مجھے

یہ بات یاد نہیں، لیکن یہ یاد ہے کہ میرے لئے بکرے کی ایک چھوٹی سی گاڑی بنوا دی گئی تھی، میں اسے دوڑاتا پھرتا تھا۔ ایک مرتبہ راستے کی گہری نالی کے اوپر سے جو زور سے دوڑاتا ہوا گاڑی کو نکالا تو گاڑی بیچ سے ٹوٹ گئی، میں گرا اور کافی چوٹ آئی۔ آدھی گاڑی بکرا کھینچتا ہوا بھاگتا چلا گیا۔

۱۸۸۷ء میں ملکہ وکٹوریہ قیصر ہند کی جوبلی تمام ہندوستان میں منائی گئی۔ علیگڈھ میں بھی جلسے اور دربار ہوئے۔ میں چھ سال کا تھا میرے والد نے دو شعر اِس موقع کے لئے کہہ کر مجھے یاد کرادیئے، اور خود بھی مسٹر ہاول جج علیگڈھ کی فرمائش کے مطابق ایک قصیدہ کہا۔ یہ قصیدہ کلیات اکبر حصہ اول میں چھپا ہوا ہے۔ جس موقع پر یہ قصیدہ پڑھا گیا۔ اُس کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ اپنی یاد سے کام لیتا ہوں اور کچھ اپنے والد سے سُنی ہوئی بات ہے۔

ایک بہت بڑا شامیانہ ہے۔ پھول پتوں سے اور شیشہ آلات سے آراستہ کیا گیا ہے، ہر طرف جگمگاہٹ ہے۔ حکام اور رؤسا اور ضلع کے دیگر معززین اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ صدر کون ہے؛ ایک جگہ سنگ مرمر کی ایک میز ہے۔ وہیں آکر لوگ تقریریں کرتے ہیں، نظمیں پڑھتے ہیں۔ میری باری آئی۔ میرا نام پکارا گیا۔ میں میز کے پاس جاکر کھڑا ہوا لیکن اتنا چھوٹا ہوں کہ لوگ مجھے دیکھ نہیں سکتے میز مجھ سے اونچی ہے۔ سرسید نے اُٹھا کر مجھے میز پر کھڑا دیا اور میں نے دو شعر پڑھ دیئے۔ دربار کا دستور ہے کہ تقریروں اور نظموں کے بعد تالیاں بجتی ہیں۔ تقریروں اور نظموں کے درمیان میں لوگ خاموشی سے سُنتے ہیں۔ میرے والد کی باری آئی۔ اُنہوں نے قصیدہ پڑھنا شروع کیا لیکن دو ایک اشعار کے بعد لوگوں سے ضبط نہ ہوا۔ مشاعرے کا سا رنگ ہوگیا۔ یعنی لوگ اشعار کو دُہراتے تھے اور تعریفوں کے نعرے بلند ہوتے تھے۔

علیگڈھ کے حالات تو بہت طولانی ہیں۔ ایک اور واقعہ یہاں ذکر کے قابل ہے۔

میرے دادا صاحب سید تفضل حسین صاحب ایک بڑے بزرگ عابد و عامل تھے۔ ایک دن اُن کا خط میرے والد کے پاس آیا۔ کہ "تم منصف درجۂ اوّل ہوگئے"۔ میرے والد نے لکھا کہ یہ کیونکر ہوسکتا ہے، کئی صاحبوں کا نمبر مجھ سے اُوپر ہے۔ آپ کی اطلاع کا ذریعہ کیا ہے؛ میرے دادا صاحب نے جواب دیا کہ "میں نے خطِ جلی میں یعنی بڑے حروف میں لکھا دیکھا ہے سید اکبر حسین منصف درجہ اول"۔

تھوڑے ہی دنوں کے بعد میرے والد کی ترقی درجہ اوّل کی منصفی کا حکم آگیا۔

۱۸۸۸ء میں میرے والد قائمقام سب جج غازی پور مقرر ہوئے۔ تھوڑے دنوں کے بعد کانپور کا تبادلہ ہوگیا اور چار سال کے قریب کانپور میں قیام رہا۔ کانپور سے چار میل کے فاصلے پر ایک مقام ہے جس کا نام گوتیا ہے اُس زمانہ میں ڈپٹی ڈائرکٹر زراعت کا دفتر وغیرہ وہاں تھا۔ مولوی محمد حسین صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر تھے۔ بڑے علم دوست اور با مذاق۔ سید محمد ہادی صاحب اُن کے اسسٹنٹ تھے۔ وہی سید محمد ہادی صاحب جنہوں نے بعد میں شکر بنانے کی مشین ایجاد کی اور ۱۹۱۰ء میں الہ آباد کی نمائش میں یہ مشین دکھلائی۔ میں الہ آباد آیا ہوا تھا۔ نمائش دیکھنے

جا رہا تھا۔ میرے والد نے پوچھا کہ ہادی صاحب سے ملاقات ہو گی؛ میں نے کہا کہ ضرور ہی ملوں گا۔ فرمایا کہ یہ میرا شعر اُن کو سُنا دینا ؎

ہادیٔ دیں تو نمائش میں کوئی تھا ہی نہیں ہادیٔ دُنیا تھے وہ ہل جوتنا سکھلا گئے

ذکر تو کچھ اور ہی کر رہا تھا لیکن خان بہادر سید محمد ہادی صاحب کے نام کے سلسلہ میں الہ آباد کی نمائش کا ذکر آ گیا۔ اس نمائش کے موقع کا ایک اور شعر ہے۔ گوہر جان کلکتہ کی مشہور گانے والی نمائش میں بُلائی گئی تھیں۔ ان کی آواز اور ان کے علمِ موسیقی کا شہرہ تمام ہندوستان میں تھا۔ میرے والد فرماتے ہیں ؎

خوش نصیب آج یہاں کون ہے گوہر کے سوا سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

میں گونڈا کا ذکر کر رہا تھا۔ یہاں ایک پینی ریڈنگ کلب قائم ہوا۔ ہفتہ وار جلسے ہوتے تھے علمی اور اخلاقی مضامین اور نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ کانپور ہی میں رابرٹ سودی کی نظم "لوڈور" میرے والد نے دیکھی اور اپنی نظم "روانیٔ لوڈور" تصنیف کی۔ سودی نے انگریزی کے تمام مصادر جو دریا کی روانی کے متعلق ہیں، بڑی تحقیق اور بڑی قابلیت سے اپنی نظم میں اکٹھے کئے ہیں۔ یہی کام میرے والد نے اُردو میں کیا۔ یہ نظم ریڈنگ کلب گونڈا میں پڑھی گئی۔ اور اس نظم میں بھائی حسن سے مُراد میرے حقیقی چچا سید اکبر حسن صاحب مرحوم سے ہے۔

کانپور میں دیا نرائن نگم صاحب ایڈیٹر زمانہ کے جدِ بزرگوار منشی شیو سہائے گور سہائے صاحب، لالہ جگی مل صاحب، شیخ احمد علی صاحب، مولوی احسان اللہ صاحب وغیرہ سے مراسم ہو گئے تھے جو برابر قائم رہے۔ دیا نرائن نگم صاحب کا برادرانہ برتاؤ میرے ساتھ اس وقت تک قائم ہے۔

آج اتنا وقت نہیں کہ میں بقیہ حالات عرض کروں البتہ ایک مشہور نظم کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے :۔

اک بتِ سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد

مجھے یہ کہتے ہوئے کسی قدر تکلف ہوتا ہے کہ یہ نظم میرے ولایت جانے سے پہلے تصنیف ہو چکی تھی؛ تکلف کی وجہ یہ ہے کہ عام خیال ہے کہ یہ نظم میرے متعلق ہے۔ لوگ مجھ سے اس کے متعلق سوالات کرتے ہیں۔

کانپور کے بعد ۱۹۰۳ء تک جب میرے والد کی پنشن ہوئی مسلسل تبادلے ہوتے رہے اُس کی وجہ یہ تھی کہ اُسی زمانہ میں گورنمنٹ نے یہ تجویز کی کہ سب جج بھی ڈسٹرکٹ جج مقرر کئے جائیں۔ چنانچہ ۱۸۹۴ء میں میرے والد اس صوبے میں سب سے پہلے سب جج تھے جو قائم مقام ڈسٹرکٹ اور سشن جج مقرر ہوئے۔ حالانکہ کئی افسر نمبر میں اُن کے اُوپر تھے لیکن گورنمنٹ نے اُن کا انتخاب کیا۔ اِس کے متعلق اُس وقت کی کونسل میں سوال بھی ہوا لیکن گورنمنٹ نے یہی جواب دیا کہ اس تقرری میں نمبر کی بحث نہیں ہے بلکہ جس کو ہم نے سب سے زیادہ قابل سمجھا اُس کا تقرر کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر سال گرمیوں میں کسی نہ کسی ضلع کی ججی پر اُن کو جانا پڑتا تھا۔ انہیں وقتوں کا شعر ہے ؎

پہلے تھے سب جج ہوئے اب جج حضور یعنی بس اب سب سے جُدا ہو گئے

۱۸۹۶ء میں گونڈہ تعینات کئے گئے۔ آب و ہوا ناموافق ہوئی۔ غزل کہی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

اب تلک گونڈے سے اُمیدِ رہائی نہیں کچھ — ہوگئی لیجئے ختم آج تو جولائی بھی

آخر ملازمت کے قریب اُن کا نام ہائیکورٹ کی ججی کے لئے بھی بھیجا گیا۔ لیکن چونکہ مسٹر جسٹس اکیمن قائمقامی کر رہے تھے۔ اِس لئے یہ تجویز ہوئی کہ اُن کی پنشن کے بعد تقرری ہو۔ لیکن اُس وقت کے آنے سے پہلے ہی میرے والد کی پنشن ہوگئی اور اُس جگہ پر بعد میں مسٹر جسٹس کرامت حسین کا تقرر ہُوا۔

مَیں کانپور میں چند دِنوں کے لئے گورنمنٹ اسکول میں داخل کر دیا گیا تھا۔ کانپور کے بعد میری تعلیم کا اہم زمانہ آگیا تھا۔ میرے والد نے دیکھا کہ اُن کے ساتھ رہ کر میری تعلیم ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ اِس لئے میری والدہ اور مَیں الہ آباد میں مستقل طور پر قیام پذیر ہوئے۔ عشرت منزل کی بُنیاد پڑی۔ میرے والد مجھ سے فرماتے تھے کہ اِس مکان کے نام میں مَیں نے یہ مناسبت خطی رکھی ہے کہ اگر تم زندہ نہ رہتے تو اِس کا نام عبرت منزل کر دیتا اور اگر تمہاری حالت خراب و ابتر ہوتی، تو اس کا نام عسرت منزل ہو جاتا۔ خُدا کا شکر ہے کہ میرے والد کی زندگی میں یہ مکان عشرت منزل ہی رہا۔ وُہ دن میری نظر کے سامنے ہیں جب یہ مکان زیرِ تعمیر تھا۔ کبھی مزدوروں اور راجوں میں گھُس کر اُن کے ساتھ کام کرتا تھا۔ کبھی مزدوروں کو احاطۂ عشرت منزل میں اپنے ساتھ کرکٹ کھیلاتا تھا۔ غُل مچتا تھا کہ دیکھئے چھوٹے میاں کام نہیں کرنے دیتے۔ پھر مکان تکمیل کو پہنچا۔ میرے والد الہ آباد کے مستقل جج خفیفہ مقرر ہوئے۔ اور یہی مستقل جائے قیام قرار پائی۔ یہیں سے ہر سال چند مہینوں کے لئے ججی پر جاتے تھے اور پھر یہیں واپس آجاتے تھے۔ یہیں سے پنشن ہوئی۔ اگر یہاں کی چلتی ہوئی تصویر لی گئی ہوتی، تو کیا کیا منظر اِس وقت دِکھائی دیتے۔ جلسے، دعوتیں، بزمہائے سخن، احباب و رقدر دانوں کی آمد و رفت کا لاانتہا ہی سلسلہ۔ اگر مَیں اِن سب کے مختصر حالات بھی بیان کرنا شروع کروں تو دفتر ہو جائے۔ البتہ دو نام لیتا ہوں، تاکہ کچھ اشعار پڑھ سکوں۔ ایک تو حضرتِ شبلی۔ علیگڈھ میں میرے والد نے اُن کو یہ اشعار لکھے تھے ؎

آتا نہیں مجھ کو قبلہ قبلی — بس صاف یہ ہے کہ بھائی شبلی
تکلیف اُٹھاؤ آج کی رات — کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات
حاضر جو کچھ ہو دال دلیا — اُس کو سمجھو پلاؤ قلیا

دوسرے حضرت صفی لکھنوی۔ جس وقت یہ بحث تھی کہ شیعہ کالج کہاں قائم کیا جائے تو الہ آباد کا نام بھی پیش کیا گیا تھا۔ الہ آباد ہی میں شیعہ کانفرنس کا عظیم الشان جلسہ ہُوا جس میں حضرت صفی لکھنوی نے ایک نظم پڑھی تھی۔ اور الہ آباد کی خصوصیات بیان کی تھیں۔ اُس کا ایک بند یہ ہے ؎

جس کی خوشبو منزلوں پھیلی ہے وہ گلشن ہے تُو — تازہ رس گلہائے رنگارنگ کا خرمن ہے تُو
بذلہ سنجی کا جواہر خیز اِک معدن ہے تُو — حضرت اکبر لسان العصر کا مسکن ہے تُو
نطق تیرے سکۂ رائج سے مالا مال ہے
ہند میں نقدِ ظرافت کی یہیں ٹکسال ہے

خود حضرتِ اکبر الہ آباد کے متعلق فرماتے ہیں ؎

کچھ الہ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے　　یاں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے

میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ ابھی تو اُس زمانہ کا ذکر ہے کہ جب میں اسکول اور کالج میں تعلیم پا رہا ہوں، انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد میری شادی کی فکر ہوئی۔ چنانچہ بالآخر نواب شیخ حسین صاحب او۔ بی۔ ای۔ خان بہادر۔ رئیس پریانواں، ضلع پرتاب گڑھ کی بڑی صاحبزادی سے شادی قرار پائی۔

۳۰ مارچ ۱۸۹۹ء کو بڑی دھوم سے شادی ہوئی۔ البتہ ناچ نہ تھا۔ سر اسرار حسن خاں صاحب مدار المہام بھوپال نے ناچ ہونے کے متعلق تحریک کی۔

میرے والد نے جو خط جواب میں لکھا وہ پیش کرتا ہوں:۔

"میرے پیارے عنایت فرما۔ محبت نامہ کے مضامین نے دل کو باغ باغ کر دیا۔ میرے ایک عزیز جو دبی زبان سے اسی بات کے لئے اشارے کر رہے تھے، آپ کے خط کو سُن کر پھڑک گئے۔ فرمانے لگے کہ بس یہ شخص آپ کا سچا محب اور زندہ دل دوست ہے۔ فی الواقع مجھ کو بھی ایسا ہی یقین ہوا۔

"بیس سال سے زیادہ ہوئے مَیں نے عقل اور مصلحت سے فتویٰ حاصل کر کے ناچ مجرا دیکھنا چھوڑ دیا۔ موسیقی کا مذاق رگ وپے میں سمایا ہوا ہے۔ لیکن گانے والیوں سے جو دل کے ساتھ گھر بھی برباد کر دیتی ہیں، ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عشرت سلمہ ان خیالات ہی سے ناواقف رہے اور اب اُن کو اس سے کُلی احتراز ہے۔

"مسلمانوں کو ناچ دیکھنا جائز تو کبھی نہ تھا لیکن اب مصلحت کے بھی خلاف ہے۔ ہم کو مضبوطی کے ساتھ ایسی مثالیں قائم کرنی چاہئیں کہ غربا شادی میں ناچ نہ کرانے کو اپنی ذلت نہ سمجھیں اور وضعدار نہ ہوں۔ درحقیقت شرفا میں ہماری طرف یہ رسم اب کم ہوتی جاتی ہے۔ سمدھیانے میں کچھ چوں و چرا ہوئی تھی لیکن یہ سُن کر کہ لڑکا ناچ نہیں دیکھتا۔ اُن لوگوں کو فخر و مسرّت کا موقع ملا۔

"آپ کہیں گے کہ حضور لیکچر دے رہے ہیں یا یارانِ بے تکلف کو خط کا جواب لکھ رہے ہیں۔ اچھا صاحب لکچر موقوف کان پکڑتا ہوں۔ ہزار بار توبہ۔ اب کفر نہ پھانکوں گا۔ پوری اندر سبھا پر ایمان لایا۔

"بھائی صاحب! چیت کا مہینہ آغاز بلکہ عین موسم بہار ہو گا۔ کیسے کیسے وضعدار نوجوان ہمارے دوست رونقِ محفل ہوں گے۔ عشرت سلمہ زرد جوڑا پہنے ہوئے زینتِ مسندِ عروسی ہوں گے۔ دل تو یہ چاہتا ہے کہ ایک شوخ طرار پرکالۂ آتش یہ گاتی ہوئی سامنے آئے ؎

ہے جلوۂ تن سے در و دیوار بسنتی　　پہنے ہے جو پوشاک مرا یار بسنتی

"آپ گھوڑے سے، میں اجلاس سے، مولوی برکت اللہ صاحب منبر سے گر پڑتے۔ لیکن اس کے انتظام میں بڑی دشواریاں ہیں۔ بیحد صرف اور نہایت کم لطف۔

"جس قدر مجھ کو اِس بات کی مسرت ہے کہ سعدی صاحب ایک نہایت ذی علم، اولوالعزم، خوش مزاج، خوش اخلاق، بے تکلف رئیس ہیں، اُسی قدر اِس بات کا افسوس ہے کہ اُس دارالریاست کی راہ بہت دُور اور دشوار گزار ہے۔ رائے بریلی سے پندرہ کوس، پرتاب گڑھ سے چوبیس کوس، سراتھو اسٹیشن سے جو الہ آباد سے الہ آباد کا اسٹیشن چھوڑ کر تیسرا اسٹیشن ہے آٹھ کوس ہے، ہم لوگ اسی راہ سے جائیں گے۔ سراتھو سے تین میل پختہ سڑک ہے۔ پھر سات میل خام سڑک، ناہموار بیہڑ۔ اونچی، نیچی، نالے، گڑھے، اس کے بعد میل بھر بلکہ زیادہ ریتا، پھر گنگا مائی، پھر بیہڑ۔ اُس کے بعد دو میل عمدہ سڑک بوجہ حسن انتظام خان بہادر صاحب، تب پریاواں۔

"اگر رائے بریلی سے کوئی شخص قصد کرے تو اگرچہ سڑک خام ہے، لیکن چوڑی ہے، ہموار ہے، صاف ہے، تیز رَو اِکّے ملتے ہیں، پانچ چھ گھنٹے میں پریاواں پہنچ جائے۔ وہ سڑک مصطفےٰ آباد ہو کر، پریاواں ہو کر مانکپور کو گئی ہے۔ ۲۸ مارچ کو چار بجے تڑکے ہم لوگ انشاءاللہ یہاں سے چل کر سہ پہر کو پریاواں پہنچیں گے۔ آپ براہِ رائے بریلی گیارہ بجے دن کو بھی چلیں، تو پانچ بجے ہمارے کیمپ میں پہنچ جائیں۔ سراتھو میں ہماری راہ ہو سکتی ہے اور وہاں پورا شاعرانہ اور گورنمنٹی زور لگا کر بھی تیس اِکّوں اور چند پالکیوں اور دس بارہ ہاتھیوں سے زیادہ کا انتظام ناممکن ہے: بمجبوری خاص خاص اعزّہ اور احباب کو ساتھ لوں گا۔

"اگرچہ ہمارے ساتھ یہیں سے آپ ہوں تو زیادہ لطف ہو۔ اور خواہ مخواہ آپ کے لئے سواری کا بندوبست کر دیا جائے لیکن بوجہ مذکورہ بالا آپ کو مشورہ دیا گیا کہ رائے بریلی سے تشریف لائیے۔ مقصود تو یہ ہے کہ ہم آپ ساتھ مل کر عشرت کو بیاہنے جائیں، اور یہ حاصل ہو جائے گا۔ ہمارا کیمپ علیحدہ ہوگا۔ بارات رات کو جائے گی۔ آپ اس کو ترتیب دینے والے ہوں گے۔ اِنشاءاللہ،

"اب فرمائیے کیا مزا ہے کہ جنت کی قمریاں پگڈنڈیوں پر پھٹپھٹاتی پھریں۔ ہم لوگ خود سفر کئے ہوئے کچھ آرام کریںگے پھر بارات جائے گی۔ پھر نکاح ہوگا۔ بیچاری گرمیوں کی ماری لیلائے شب کی بساط ہی کیا۔ چار انگڑائیاں لیں اور بھور۔ صبح سے طعامِ دعوت کا اہتمام ہوگا۔ پھر رخصتی کی جلدی ہوگی۔ پھر اگر دو بجے وہاں سے نہ چلیں گے تو گیارہ بجے شب کو الہ آباد نہ پہنچ سکیں گے، جہاں کُنبہ کی ساری بیبیاں منتظرِ واپسی بارات ہوں گی۔

"بتائیے کیا وقت ملے گا کہ اطمینان سے خنجرِ نگاہ کے زخمی ہوں؛ اور قاتل کو داد دیں۔

" آپ کارگزار افسر ہیں۔ ممکن ہے کہ اس کام کی فرصت نکال لیں۔ لیکن جب تک مرگِ انبوہ نہ ہو کیا مزا ہے۔

" اِن خیالات؛ دشوارئ منزل اور دِقتِ راہ وفقدانِ سواری وضیقِ وقت کے سبب سے میں نے تو باجے گاجے سے بھی کنارہ کشی چاہی تھی۔ لیکن یہ ناممکن ہؤا۔ عشرت میاں کو آتشبازی کا بہت شوق ہے۔ خود بھی خوب بناتے ہیں۔ اور صرف اسی پر تو نہیں چھچھوندروں کو مُنہ لگاتے ہیں۔ لہٰذا باجے، آرائش، آتشبازی کا انتظام جہاں تک ہو سکے گا کیا جائے گا۔

" لوگ کہتے ہیں اور سچ کہتے ہیں کہ نوشہ میاں تو رسم رسوم اور خیالِ عروس اور سہرے کے سائے میں بسر کریں گے باراتی بیچارے کیا کر کے رات گزاریں گے؛ میں یہ کہوں گا کہ نفلیں پڑھو، تہجد ادا کرو، اور اس میں بدشگونی سمجھو تو گپ اُڑاؤ اور شعر خوانی کرو۔

" آپ کے ولولے حق بجانب، آپ کی محبت کا میں معترف، لیکن اس کو دُوسرے وقت پر اُٹھا رکھئے۔ بہت سے مواقع ہیں۔ ہم سے آپ سے اس باب میں گفتگو ہو جائے گی۔

" اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو بارات کے ساتھ الٰہ آباد تشریف لایئے گا۔ اور یہاں سے یکم خواہ دوم اپریل کو تشریف لے جایئے گا۔

" مولوی برکت اللہ صاحب کی مجھ کو کچھ خبر نہیں۔ آپ اِس خط کی نقل اُن کے پاس بھیج دیجئے گا۔

" ۳۰ مارچ کو پانچ بجے شام کو ہم آپ کو اپنے کیمپ میں پاویں۔ ساری داستان کا خلاصہ یہ ہے۔

" میں خود رخصت اتفاقیہ لُوں گا۔ بنارس جانا جبر ہوگا۔ لیکن کیا کروں۔ باہر سے میں نے معدُودے چند خاص احباب کو تکلیف دینے کا ارادہ کیا ہے۔ جیلر صاحب کو کسی طرح نہ چھوڑوں گا۔ مولوی برکت اللہ صاحب ضرور ہی تشریف لائیں گے۔

" مراتب مندرجہ خط پر دانشمندانہ نگاہ ڈالئے۔ پھر جو فیصلہ کیجئے۔ ہم کو عذر نہیں۔ آپ کو خود مختار کرتا ہوں۔ جو انتظام کیجئے۔ بل میں پاس کر دوں گا۔ جہاں تک مقدور ہے۔ باقی کے لئے وعدہ جب آپ کا پوتا سول سروس ہو۔

اکبر حسین "

"زمانہ"

مطبوعات

معارفِ جمیل - یہ حضرتِ آزاد انصاری کا مجموعۂ کلام ہے جو حال ہی میں محمد تراب علی خاں صاحب بازگھانسی بازار حیدرآباد دکن کے اہتمام میں شائع ہوا ہے۔ حضرتِ آزاد عہدِ حاضر کے ایک نغز گو اور صحیح معنوں میں قادر الکلام شاعر ہیں۔ موجودہ شعراء میں جوش ملیح آبادی کے سوا غالباً کوئی شاعر ایسا نہیں جس کو آزاد انصاری کے برابر زبان اور فن پر قدرت حاصل ہو اور جس کا کلام فنی و لغوی اسقام سے اس قدر پاک ہو کہ بمشکل ہی کہیں اُنگلی رکھی جا سکے۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ آزاد صاحب اپنے مصرعوں میں بالالتزام حروف کی وہی ترتیب قائم رکھتے ہیں جو نثر میں ہوتی ہے اور ضرورتِ شعری کہیں انہیں اپنی اس ڈگر کو چھوڑنے پر مجبور نہیں کرتی۔ یہ قدرتِ کلام کا ایک عدیم النظیر مظاہرہ ہے۔ اس پر کمال یہ ہے کہ زبان اور الفاظ کا یہ رکھ رکھاؤ جذبات کے پُرخلوص اظہار پر اثر انداز نہیں ہوتا اور آزاد صاحب کا کلام سوز و اثر میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ شاعر نے خود لکھا ہے جو ایسا دلچسپ اور نکتہ آموز ہے کہ ایسے بہت کم دیباچے دیکھنے میں آئے ہیں۔ یہ دیباچہ پڑھنے کے بعد آزاد صاحب کے کلام کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

حجم ۲۵۶ صفحات - قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے - غیر مجلد دو روپے - پتہ اوپر درج ہے۔

"سائنس" دہلی - یہ انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی کا سہ ماہی علمی رسالہ ہے، جو ایک مدت سے نہایت خاموشی کے ساتھ ملک کی علمی و لسانی خدمات انجام دے رہا ہے۔ رسالے کا معیارِ مضامین انجمن ترقیٔ اُردو کے نام کے شایانِ شان ہے۔ مضامین بلند پایہ اور پُراز معلومات ہوتے ہیں اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ علمی رسالہ ہونے کے باوجود "سائنس" دلچسپ بھی ہے اور اس سے عام پڑھے لکھے لوگ بھی بہ آسانی استفادہ کر سکتے ہیں۔ یہ رسالہ اُردو زبان کے لئے باعثِ ناز ہے۔ ملک کا فرض ہے کہ اس کی قدر کرے۔ اس سے بے پروائی اپنی کور ذوقی کا ثبوت ہے۔ بعض مضامین کے ساتھ تصویریں بھی شائع کی جاتی ہیں۔ حجم تقریباً ڈیڑھ سو صفحات - چندہ سالانہ چھ روپے مع محصول - فی پرچہ ۱۲/ - پتہ: منیجر "سائنس" - دفتر انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) دہلی۔

طلوعِ اسلام - یہ قابلِ قدر اسلامی رسالہ پہلے لاہور سے شائع ہوتا رہا ہے اور اب دلی سے نکلتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا مقصد علامہ اقبال کی اسلامی تعلیمات اور فلسفۂ عمل کی تبلیغ ہے۔ "طلوعِ اسلام" پاکستان کی تحریک کا علمبردار بھی ہے۔ اس کے ایڈیٹر محمد ظہیر الدین صاحب صدیقی ہیں جو اسے نہایت سلیقے سے مرتب کرتے ہیں۔ یہ رسالہ بہت مفید کام کر رہا ہے۔ مسلمانوں کو اس کی خاص طور پر قدر اور حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔ چندہ سالانہ صہ ششماہی ۳/ - پتہ:- ناظم "طلوعِ اسلام" بلّی ماراں۔ دہلی۔

طلسمِ زندگی

میاں بشیر احمد صاحب کی مشہور و معروف کتاب

جس پر ملک کے اُدبا اور جرائد و رسائل نے نہایت حوصلہ افزا ریویو کئے ہیں۔ اور جو اپنے بیش قیمت کاغذ اعلےٰ کتابت وطباعت اَگرانمایہ رنگین تصاویر، صفحاتِ جمیل اور مطلّا جلد کے لحاظ سے ہندوستانی مطبوعات کیا یورپ کی حسین ترین کتابوں کے مقابلے میں پیش کی جا سکتی ہے

اس مہینے اس کی

بقیہ جلدیں نصف قیمت پر فروخت ہوں گی

یعنی پانچ روپے کے بجائے صرف ڈھائی روپے

ڈھائی روپے اس کتاب کی اصل لاگت سے بھی کم ہیں امید ہے کہ شائقین اس موقع سے فائدہ اُٹھائیں گے

المشتہر

مینیجر ہمایوں ۲۳ لارنس روڈ۔ لاہور

مقامی ایجنٹ

"اُردو اکیڈمی"

بیرون لوہاری دروازہ ــــــ لاہور

گراموفون کے

پُرانے ریکارڈ

اگر آپ کے پاس ہوں تو اُنھیں مت پھینکئے۔ سائنسدانوں نے ایک مصالحہ حال میں دریافت کیا ہے۔ جس کو

ZED

زیڈ

کہتے ہیں۔ اس کے لگانے سے ریکارڈوں میں گھسی ہوئی لکیریں گہری ہو جاتی ہیں۔ اور آواز بہت تیز ہو جاتی ہے وہی دلکش نغمے جو بہت بجنے لگتے ہیں از سر نو عود کر آتے ہیں۔ گھڑگھڑاہٹ بالکل مٹ جاتی ہے۔ نئے ریکارڈوں پر لگانے سے اُن کی عمر بڑھ جاتی ہے اور وہ عرصہ تک نہیں گھستے۔ خوب بک رہا ہے آپ بھی خرید کیجئے

قیمت ایک شیشی دو روپے

گرین فیلڈز (انڈیا) کمپنی

پنڈری ـــ سی۔ پی

شاعر مشرق (بزبان انگریزی)
یعنی
The Poet of the East
مصنفہ مسٹر عبداللہ انور بیگ ۔ ایم ۔ اے ۔ ایل ۔ ایل ۔ بی
مشرق کے جلیل القدر شاعر اور فلسفی ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال مرحوم و مغفور کے سوانح حیات، شاعرانہ کلام اور فلسفیانہ تخیل پر ایک بلند مرتبہ تصنیف ہے۔ جس میں مرحوم کے اوائل حیات سے لے کر تا دم واپسیں مفصل حالات دیئے گئے ہیں۔ آپ کے شاعرانہ افکار پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ اور آپ کی تعلیمات کو دل آویز پیرائے میں مشرق و مغرب کے مفکرین کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔
کتاب کا دیباچہ کیمبرج یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر ڈاکٹر آر۔ اے۔ نکلسن نے لکھا ہے۔ اور مسٹر جے سی۔ دم (سول ملٹری گزٹ) نے ایک طویل تعارف نامہ سپرد قلم کیا ہے۔ کتاب ادبیات مشرق میں بلند پایہ رکھتی ہے۔ کاغذ نہایت عمدہ۔ جلد نفیس۔ قیمت صرف چار روپے۔
یا کا چھلکا
اور دیگر افسانے
مصنفہ چراغ حسن حسرت (سندباد جہازی)
چھپ کر تیار ہو گئی ہے۔ دنیا کے مزاح میں گرانقدر اضافہ۔ قیمت عہ معہ محصول ڈاک۔
ملنے کا پتہ
اردو اکیڈمی (پنجاب) لوہاری گیٹ لاہور

ایک سو ۱۰۰

برس کی عمر کا راز

جو ۱۸۳۹ء سے ۱۹۳۹ء تک پہنچکر

کارخانہ

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ

نے حاصل کی

مال کی عمدگی، دیانتداری اور خوش معاملگی

[illegible] مرکنٹائل پریس [illegible] میں چھپا کر [illegible] شائع کیا

قواعد

۱۔ "ہمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

۲۔ علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درج کئے جا

۳۔ دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے۔

۴۔ ناپسندیدہ مضمون ۱/ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۵۔ خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے۔

۶۔ ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے۔

۷۔ رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۱۷ سے پہلے پہنچ جا
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۸۔ جواب طلب امور کے [illegible] یا جوابی کارڈ آنا چاہیے۔

۹۔ [illegible] سالانہ [illegible] ششماہی تین روپے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ

۱۰۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر [illegible] پتا تحریر کیجیے۔

۱۱۔ خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھ

مینیجر رسالہ ہمایوں

۲۳۔ لارنس روڈ، لاہور

The Title Page and Picture Printed at the Half-Tone Press,
Langley Road, Ram Nagar Lahore